فروری 2021
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
www.pklibrary.com
290
100 روپے

تمام ایجنٹ حضرات / قارئین کرام کو مطلع کیا جاتا ہے

ماہنامہ **سسپنس ڈائجسٹ**

صفحات 362

قیمت 150/= روپے

جنوری 2021ء کا شمارہ

کامیابی کے

سنہرے پچاس سال

گولڈن جوبلی نمبر

ہر کہانی خاص کہانی

pklibrary.com

گولڈن مصنفین کا جھرمٹ

طاہر جاوید مغل، نجمہ مودی، ناہید سلطانہ اختر، منظر امام، ایچ اقبال، احمد اقبال ....

پروین زبیر .... اسما قادری، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی .... اور امجد رئیس ایک ساتھ

اس کے علاوہ

سسپنس کلاسک

محی الدین نواب، عبدالقیوم شاد، ش م جمیل .... احمد صغیر صدیقی،

اثر نعمانی و دیگر مصنفین کی یادگار تحریروں کا انتخاب

نوٹ: گولڈن جوبلی نمبر میں کہانیوں کی طوالت کے باعث صفحات میں مزید اضافہ کیا جا رہا ہے اب صفحات 322 سے بھی بڑھا کر 362 کیے جا رہے ہیں مگر قیمت 150 ہی رہے گی۔

مدیراعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

pklibrary.com

جلد 51 • شمارہ 02 • فروری 2021 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

pklibrary.com

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

سال کا دوسرا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ گرمیوں کے بعد آخر کار موسم سرما نے ملک بھر میں ڈیرے جما ہی لیے۔ انگیٹھی، آتش دان، ڈرائی فروٹ اور لحاف کا یہ موسم جہاں بہت سے لوگوں کے لیے آرام و آسائش کے سامان ساتھ لاتا ہے...... وہیں بے گھر اور بے بضاعت لوگوں کے لیے کڑا امتحان بن جاتا ہے۔ اگر اللہ نے آپ کو بہت کچھ عطا کیا ہے تو ان خاک نشینوں کو بھی کچھ سہارا فراہم کریں جو زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن ان کی آنکھوں میں بہت سے سوال مچلتے رہتے ہیں...... چند روز پہلے ملک بھر میں بجلی کا بڑا تعطل ہوا۔ کم و بیش بارہ گھنٹے تک پورا ملک تاریکی میں ڈوبا رہا۔ اس امتحان میں پوری قوم سرخ رُو رہی ہے۔ کہیں سے بھی کسی ہنگامے یا جرم کی کوئی خبر نہیں آئی۔ بھولے بھٹکے مغرب میں اگر یوں ملک گیر اندھیرے کا راج ہوتا ہے تو سارے شیطان صفت سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ سیکڑوں خواتین اغوا ہو کر جنسی تشدد کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ شیشے اور شٹر توڑ کر شاپنگ مالز اور دکانیں لوٹ لی جاتی ہیں...... خوشی کی بات ہے کہ ہم نے اس موقع پر اپنے شریفانہ قومی مزاج کا مظاہرہ کیا جس کا اعتراف سوشل میڈیا سے اخبارات تک میں کیا گیا۔ اس بحران کے نتیجے میں افسوس ناک معاملات بھی سامنے آئے ہیں۔ بجلی کی پیداواری صلاحیت 32 ہزار میگاواٹ ہے مگر ہم سب کے گھروں اور صنعتوں کو بجلی کی ترسیل کی گنجائش صرف 24 ہزار میگاواٹ ہے۔ سبب یہ ہے کہ ہم نے بجلی گھروں کو لگانے کی کھلی چھوٹ دی اور شرائط اتنی پُرکشش رکھیں کہ سب بجلی بنانے پر لگ گئے۔ کیسا طرفہ تماشا ہے کہ آپ ایک سو میگاواٹ کا بجلی گھر لگائیں اور صرف دس میگاواٹ بجلی قوم یا عوام کو فراہم کریں لیکن آپ کو قیمت ایک سو میگاواٹ کی ادا کی جائے گی۔ یہ کوئی مفروضہ یا مثال نہیں افسوس ناک حقیقت ہے کہ بجلی پیدا کرنے والے اداروں سے ان کی اصل پیداوار کے بجائے پیداواری گنجائش کے مطابق ادائیگیوں کے معاہدے کیے گئے۔ ایسے ہی اقدامات کا نتیجہ ہے کہ بجلی نہایت مہنگی ہے۔ یہ سارا بوجھ ہمیں اور آپ کو اٹھانا ہوتا ہے۔ اس مختصر تشریح کے بعد اب چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں فکرمندوں اور بےفکروں کی تحریریں ہماری منتظر ہیں......

لاہور سے راؤ ریحان کی ناپسندیدگی ”طویل عرصے بعد سال نو کا شمارہ خریدنے کا اشتیاق دلِ ناداں میں بیدار ہوا اور جھٹ سے ڈائجسٹ خریدا اور پٹ سے پڑھ لیا۔ میرے خیال میں جھٹ پٹ کا یہ استعمال اردو ادب میں صرف میں نے ہی کیا ہے۔ (کمال کیا آپ نے) سرورق پر گہری نگاہ ڈالی۔ پنسل سے لکھی نئے سال کی مبارک باد نے ڈرا دیا پھر تراشیدہ ابرو اور دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ انھوں سے کوئی ماری حسینہ پر نظر پڑی تو دل نے کہا تیرے نینا بڑے قاتل ہیں مار ہی ڈالیں گے۔ اس کے بعد زلفوں سے پھوٹتے آدمی کو دیکھتے ہی مردوں کی بھیانک تصویر کی پر سریٹ لینے کو دل چاہا۔ کاش یہاں کوئی عمران دانش جیسا خوبرو جوان ہوتا (یا پھر آپ جیسا......) چینی نکتہ چینی میں جھانکا تو کچھ شناسا نام سامنے آہی گئے۔ محمد قدیر کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ ایمانے زارا شاہ نے بھی مفصل اور خوب تبصرہ لکھا۔ کہانیوں کا آغاز فاتح یا مفتوح سے کیا۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی تھی مگر امریکا کے نائب صدر کا اتنی آسانی سے شکنجے میں آجانا کچھ ہضم نہیں ہوا، پھر اینڈ میں بنا کوئی نقصان اٹھائے سیکیورٹی گارڈز کو نائٹیں تائیں فش کر دینا...... کوئی فائٹ نہیں...... کوئی جدوجہد کے آثار نہیں...... بس زہریلی سوئیاں برساتے جانا اور مشن کا مکمل ہو جانا، یہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ سرخ رُو اوسط درجے کی کہانی تھی۔ عمران قریشی نے خوب مغالطے میں ڈالا، سونی نے آخر میں بھی کامیاب جل دیا مگر اس بار ان کے شوہر نے بھی دانشمندانہ فیصلہ کر ہی لیا۔ جھوٹ میں ہنری نے بالآخر کل میڈ کو پہچان ہی لیا مگر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے سراغ رسانی پر مشتمل کیس ڈسکس کرنا اور خوامخواہ اسے گلے کا ہار بنائے رکھنا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ شاکر لطیف نے لوگوں کی توہم پرستی اور ناپختہ اعتقادات کو موضوع بنایا۔ بلاشبہ لارڈ ہنگس جیسے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں لیکن مورس جیسے آفیسر کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مغل صاحب کا میں بہت بڑا فین ہوں مگر آج کل جس طرح وہ عمران دانش کے کردار کا ستیاناس کر رہے ہیں، مجھے بہت برا لگ رہا ہے۔ ایک عظیم کردار کو اس طرح کے معمولی پلاٹ کے ساتھ واپس لانا اور کلب یا گلی محلے کے غنڈوں جیسے چھوٹے موٹے کام کروانا عمران کے فینز کے تصورات کے بلند و بالا محلات کو کھنڈر بنانے والی بات ہے۔ مغل اعظم صاحب سے ان کا فین ہونے کے ناتے دست بستہ گزارش ہے کہ کوئی ہنگامہ خیز طویل سلسلہ شروع کریں اور عمران کے شایانِ شان کوئی مشن لے کر آئیں۔ کہتے ہیں کہ تصویریں بولتی ہیں، اس کا عملی مظاہرہ سزا میں ہوا۔ محبِ زنداں اعتزاز سلیم وصلی کی اچھی کاوش تھی۔ کولین کا انتظار بے سود رہا کیونکہ کیمرون جیسے درندوں کی فطرت نہیں بدلتی۔ سرورق کی پہلی کہانی وہ رات شمارے کی سب سے بہترین کہانی تھی۔ علیزے کی جرأت و بہادری، مضبوط اعصاب اور خود اعتمادی نے بالآخر چاروں درندوں کو جہنم واصل کر دیا۔ کاش میرے ملک کی سب خواتین علیزے جیسی ہو جائیں۔ سرورق کی دوسری کہانی سلگتے خواب بھی تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی نمائندگی کرتی بہترین کہانی تھی۔ ان سلگتے خوابوں نے لاکھوں کشمیریوں کے دلوں میں جذبۂ آزادی کی جو حرارت پیدا کر رکھی ہے، وہ ان شاء اللہ ایک دن ضرور دشمن کو خاکستر بنا کر رہے گی۔ کہانی کے اختتام نے آنکھیں بھگو دیں۔ اناگیر اور الاؤ اس بار تو نہیں پڑھ سکا کیونکہ پچھلی اقساط رہتی ہیں لیکن اگلی بار ضرور ان پر کچھ دھواں دار تبصرہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“ (انشاءاللہ)

کھاریاں سے بابر عباس اینڈ فیملی کی دستک ”جاسوسی کا نیا شمارہ جو ماہ جنوری 2021ء کے سلوگن سے مزین تھا۔ سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ اس بار صدارت اپنے محمد قدیر آف راولپنڈی کو ملی، مبارک ہو۔ سرجی آپ ایما نے زارا شاہ کو خواہ مخواہ شعلہ جوالہ کہہ کر بانس پر چڑھا رہے ہیں۔ آپ کی بات سے زارا شاہ پھول کر کپا ہو جائیں گی۔ باقی زارا شاہ، سرجی نے مجھے بولڈ نہیں کیا تھا بلکہ تیسرے ایمپائر کی وجہ سے غلط آؤٹ دیا تھا۔ آؤٹ ہوں میرے دشمن۔ مینا راجپوت صاحبہ اسے کہتے ہیں عقل مندی کسی کو چھیڑے بغیر ہی آپ نے محفل میں پہلی انٹری دے دی۔ مومنہ کشف صاحبہ اتنی غالباً آپ کی عمر نہیں جتنی سسپنس اور جاسوسی کی ہوگئی ہے یعنی دونوں نے اپنی عمر کی پچاس، پچاس بہاریں دیکھ لی ہیں۔ ہر اچھے اور بڑے رائٹر کو میں نے پڑھا ہے تعریف بھی کی ہے اور تنقید بھی۔ زویا اچھا لکھے گی تو تعریف بھی کروں گا فی الحال تو زویا کو زبردستی کا رائٹر بنایا جا رہا ہے۔ (جی ہمارے سینگ نکل آئے ہیں نا) بلقیس خان صاحبہ ارے بھئی ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں، جن لوگوں کے آپ نے غالباً نام لیے یقین کریں، میں ان سے بھی پرانا ہوں آپ مجھے آثار قدیمہ کہہ سکتے ہیں۔ (سو فیصد پکا سچ) محمد احسن خان درویش بھائی آپ بڑے پہنچے ہوئے درویش ہیں۔ وزیر آباد اور کھاریاں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے آپ تو منتر پڑھ کر بھی کھاریاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس بار آغازِ سفر میں شروع کے صفحات میں ایکشن، تھرل کے ساتھ تیز ترین کہانی خولہ اور خضر کا کارنامہ روبینہ رشید کے قلم سے۔ ایک عالمی دہشت گردی کا احوال ویل ڈن روبینہ جی...... آغاز سے لے کر آخر تک فاتح یا مفتوح نے اپنے آپ میں جکڑے رکھا۔ واقعی آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کے پاس بھی دماغ ہے (بھی...... یعنی آپ کے پاس بھی......) اناگیر بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ آخر کار اپنے پیارے سے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بھی اپنے ہیرو کو انڈیا لے کر جا رہے ہیں۔ بہت اچھے ڈاکٹر صاحب، ہر کہانی کا ہیرو انڈیا جا کر کندن ہو جاتا ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ محمود احمد مودی کی نصف بہتر یعنی نجمہ مودی صاحبہ کا وہ رات ایک رات پر بنی کہانی، وہ رات اپنی تیزی کی وجہ سے تو بہت اچھی بہتر کہانی تھی۔ دوسرا رنگ یعقوب بھٹی کا سلگتے ہوئے موضوع پر سلگتے ہوئے خواب کشمیر کے بارے میں تھا۔ یعقوب بھٹی کی اچھی تحریر تھی۔ حسام بٹ کی بھرم نے اس بار متاثر کیا اور دل اداس ہو گیا۔ اولاد بھی کیا چیز ہے، انسان اس کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا، زبردست حسام بٹ صاحب۔ اس بار آپ نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ عمران قریشی کی تحریر کردہ مغالطہ، دو ہم شکل بہنوں کی کہانی۔ ایک نکٹ میں دو مزے والی کہانی تھی بس سو سو تھی۔ طاہر جاوید مغل بھائی اس بار عمران جونیئر اور تابش کی جوڑی کی کہانی انوکھی میزبان لے کر آئے۔ کہانی تو ٹھیک تھی ہونی بھی چاہیے کیونکہ طاہر بھائی نے لکھی تھی۔ سیر ینا راض کی سزا واقعی سزا تھی۔ معیاری تحریر تھی اس لیے سیر ینا راض یقیناً مبارک باد کی مستحق ہیں۔ شاکر لطیف بھیا آپ کی آسیب پڑھ کر مجھے اپنے اردگرد بھی آسیب نظر آنے لگے تھے یا پھر میں خود آسیب زدہ ہو گیا۔ بہر کیف آسیب پسند آئی۔ جمال دستی کی جھوٹ [illegible] کاٹے، میرا مطلب ہے...... جھوٹ نے کوئی خاص متاثر نہیں کیا کیونکہ جھوٹ تو جھوٹ ہوتا ہے جلد کھل جاتا ہے۔ سرخ رُو مغرب سے درآمد شدہ تو یر ریاض کی پیشکش سرخ روہی ثابت ہوئی۔

آزاد کشمیر سے احتشام الحق کی [illegible] نوازی ”جاسوسی ڈائجسٹ جنوری 2021ء کا شمارہ 23 دسمبر کو [illegible] بازار سے دستیاب ہوا۔ سرورق اس مرتبہ لاجواب تھا۔ حسینہ عالم کے پیچھے کھڑا شخص فون پر کسی کو بتا رہا تھا کہ نیا سال شروع ہونے والا ہے اور اوپر نئے سال کی خوشی میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ سرورق سے نظریں چرا کر ہم سیدھے چیخی نکتہ چینی میں پہنچے جہاں محمد قدیر محفل کی صدارت کر رہے تھے۔ بہت بہت مبارک ہو سرجی۔ مزید آگے بڑھے تو پرویز احمد لانگاہ بھائی اپنے نئے برانڈ ”سانوں کی“ کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت ہنسایا موصوف نے۔ سب سے پہلے اعتراز سلیم وصلی کی محبِ زنداں پڑھی۔ کولین اسٹان کی اسٹوری نے ہلا کر رکھ دیا کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے آخر میں کیمرون کا انجام پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ عمران قریشی کی مغالطہ نے دماغ کا غم غلط کر ڈالا۔ سونی موٹی تھی اور مونی سوئی تھی لیکن مصنف نے شاندار اختتام کیا۔ حسام بٹ کی بھرم نے رلا دیا۔ باپ اپنے ہی ہاتھوں سے بیٹے کے خط لکھتا رہا اور خود کو مطمئن کرتا رہا۔ سرورق کی پہلی کہانی، وہ رات نجمہ مودی نے بہت ہی اعلیٰ معیار کی پیش کی۔ سرورق کی دوسری کہانی سلگتے خواب از یعقوب بھٹی مار خور اور کھیل اور کھلاڑی کے بعد ایک شاندار رنگ کے طور پر حاضر ہوئے۔ یہ سچی بات ہے کہ انڈیا کشمیریوں کے دلوں سے کبھی بھی آزادی کی تڑپ نہیں مٹا سکتا۔ مصروفیت کی وجہ سے اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔“

داؤد خیل، میانوالی سے ریاست خان کے شاہانہ ٹھاٹ ”جنوری کا شمارہ 27 کو ملا۔ سرورق شاندار تھا۔ پسٹل کے ساتھ نئے سال کی مبارکباد دی جا رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ ولن بھی غالباً اپنی محبوبہ کو نئے سال کی مبارکباد دے رہا تھا۔ تبصرہ نگاروں کی محفل گرم ہے اور سب سے پہلے قدیر واہ بھئی بہت بہت مبارکباد۔ جناب نئے سال کے شمارے کی ابتدا آپ کے نام سے، بہت بہت مبارکباد۔ آپ بارش میں بھیگ کے شمارہ لینے گئے اس سردی میں بڑی بات ہے...... ویسے شمارہ تو بھیگنے سے بچ گیا تھا نا۔ اسلام آباد والی آپا اس بار شعلہ جوالہ بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کے بعد کیمبل پور سے کوئی پرانی محترمہ مینا حاضر ہیں، لگ تو پرانی رہی ہیں۔ لکھا تو پہلا پروانہ محبت ہے خیر اگر کافی عرصے بعد واپسی ہے تو خوش آمدید آپ کو شاید پہلی والی بات نظر نہ آئے لیکن ہمارے رنگ میں رنگ کر تو دیکھیں۔ جامشورہ سے مسٹر درہم برہم حاضر ہیں۔ سب سے پہلے آپ کا سلام قبول کیا اور حیرت کی بات ہے آپ سندھ میں ہیں اور آپ کو شمارہ بھی نہیں ملتا، کوشش تو کریں۔ مومنہ کشف سرورق کی حسینہ کو غور سے دیکھتی ہیں اور اس کا خود سے موازنہ کرتی ہیں اس لیے خود میں کیڑے نہیں نکالیں گی اب میرا مشورہ ہے کہ اس بار تھوڑی زیادہ تعریف کر دیں، ہو سکتا ہے اگلی بار...... ممتاز احمد کی کچھ سمجھ نہیں آئی پہلے تبصروں پر بات شروع کی پھر کہانی میں گھوم گئے۔ پھر خود گھوم گئے سردی مزاج پوچھ رہی ہے۔ واہ کینٹ سے ہماری سینئر تبصرہ نگار کافی عرصے بعد نظر آئیں، کافی پرانے تبصرہ نگار تھے جواب پتا نہیں کس حال میں ہوں گے۔ ہم بھی فی الحال ڈٹے ہوئے

pklibrary.com

ہیں جب تک ادارہ تنگ نہیں ہوتا۔ (ہم بھی تنگ نہیں ہوں گے...... آمد کا سلسلہ جاری رکھیں) وزیر آباد والے بھائی شکر ہے اس بار حاضر تھے۔ کھاریاں سے بابر عباس اور ان کی مسز حاضر ہیں بھئی مجھے علم نہیں تھا کہ اتنے پرانے تبصرہ نگار بھی یہاں موجود ہیں میں تو سب کو امپریس کر رہا تھا کہ میں پرانا ہو گیا ہوں۔ واقعی اناڑی ہوں میں تو، کھلاڑی تو آپ ہیں اتنے عرصے سے کریز پر جمے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ رائٹر کی ''...'' پڑھی۔ انوکھی میزبان للکار کے کرداروں کی ایک اور پیشکش۔ اس میں ایک اور کردار کا اضافہ ہوا ماہین، شاہین کی بہن۔ عمران اور شاہین کی تکرار نے مزہ دیا۔ ابتدائی صفحات کی کہانی بلاشبہ کمال ہوتی ہے اور اس بار بھی لاجواب تھی۔ فاتح یا مفتوح لالچ ہوس دولت طاقتور اور سپر پاور بننے کے جنون نے ان کو انسانیت سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کی پیداوار اور اب یہ نئے پلان یہ دنیا کو تباہی کے دہانے پر لائیں گے۔ خولہ احمد اور خضر کے کردار نے بہت لطف دیا۔ الاؤ کی پندرھویں قسط، ڈاکٹر صاحب کہانی میں بہت زیادہ رنگ بھر رہے ہیں۔ کہانی کو ذرا سادہ بنائیں۔ ہیرو ہیروئن کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ دوسرا اسیف سرے سے ہیرو لگ ہی نہیں رہا ایسا لگتا ہے کہ کوئی پارٹ ٹائم ہیرو کو شامل کیا گیا ہے۔ رومی کا کردار جاندار ہے لیکن ساتھ حمیرا کو بھی ہونا چاہیے۔ سرورق کی پہلی کہانی وہ رات کہانی کا نام خوفناک ڈائجسٹ کی اسٹوری جیسا لگ رہا تھا لیکن کہانی جاسوسی کے معیار کی تھی۔ علیزے نے بڑی ہمت اور جرأت سے غنڈوں کو مارا اور آخر میں اپنے شوہر کی محبت بھی حاصل کر لی۔ سلگتے خواب کشمیریوں کے وہ سلگتے خواب جو وہ ہمیشہ سے دیکھتے آ رہے ہیں لیکن ان کے خوابوں کو بے دردی سے ختم کر دیا جاتا ہے آزاد میڈیا جو وہاں کو رتج کرنے جاتا ہے، پیسوں کے بل پر اس کو خرید لیا جاتا ہے اور ایک نام نہاد مضمون چھاپ دیا جاتا ہے کہ سب ٹھیک ہے کیا دنیا کو نہیں پتا کہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے سب پتا ہے لیکن ان کے منہ بند ہیں کیوں بند ہیں، وہ بھی سب کو علم ہے۔ تحریر لاجواب تھی۔''

چنیوٹ سے کنول کی تشنگی ''جنوری کا سرورق اچھا تھا، پسند آیا۔ اگر کہانیوں کی بات کریں تو اعتراز سلیم وصلی کی تحریر محب زنداں کافی اچھی تحریر ہوتی اگر مغربی کہانی میں مشرقی سانچ نہ آ رہا ہوتا اور اختتام ذرا الگ ہوتا۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر انوکھی میزبان اچھی لگی۔ عمران قریشی کی تحریر مغالطہ نے تو دماغ گھما کر رکھ دیا۔ تنویر ریاض کی سرخرو اچھی تحریر تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی وہ رات نجمہ مودی کی زبردست اور تھرلنگ تحریر تھی، پسند آئی۔ ابتدائی صفحات پر میری پسندیدہ لکھاری روبینہ رشید کی تحریر فاتح مفتوح موجود تھی۔ بہت شوق سے پڑھنی شروع کی تھی لیکن اس بار کہانی امیدوں پر پوری نہیں اتری۔ خولہ اور خضر اچھے کردار ہیں اس کہانی میں ان کی واپسی ہوئی ہے اور اس سلسلے کو جاری رکھنا چاہیے لیکن میرا خیال ہے پرائیویٹ ڈیٹیکٹیوز اور حکومت کی طاقت اور انٹیلی جنس ایجنسیز کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اس لیے مجھے تحریر کچھ عجب لگی۔ مزہ نہیں آیا لیکن یہ میری رائے ہے ہو سکتا ہے باقی سب کو پسند آئے۔'' (یقیناً ایسا ہی ہے)

راولپنڈی سے محمد قدیر کی امید ''اس بار شمارہ اپنے مقررہ دن سے ایک دن پہلے ہی مل گیا۔ نئے سال کی مناسبت سے سرورق خوبصورت لگا۔ چہرے پر زخم کا نشان لیے فون ہاتھ میں اٹھائے بابر عباس صاحب کھاریاں سے امریکا کی [illegible] نظر آئے۔ [illegible] غصہ [illegible] چھوڑنے لگے۔ چینی نکتہ چینی پر جمپ لگائی تو حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا پھر دو سیکنڈ بعد بند کر لیا منہ مبادا کہ مکھی ہی نہ نگل لوں لیکن یاد آیا کہ وہ تو گرمیوں میں ہوتی ہیں۔ اس بار صدارت کا مزہ بھی چکھ لیا۔ مطلب ادارے میں جوہری موجود ہیں جو ہیرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اچھا زیادہ ہو گیا ہاہا۔ (جی......) تبصروں میں ریاست خان کی آمد۔ ریاست خان نے اچھا تبصرہ کیا۔ پھر اگلا تبصرہ ایمانے زارا شاہ کا۔ جامع اور بہترین تبصرہ تھا۔ اسائنس میں کیا بھیجوں، بتایئے گا۔ اسلام آباد سے بینا راجپوت کو پہلی انٹری کی مبارک ہو۔ اور یہ کہ چوبیس گھنٹے میں واقعی ڈائجسٹ ختم کر لیا۔ کاش ہم بھی ایسا کر پاتے۔ جامشورو سے پرویز احمد لانگاہ نے۔۔ درہم برہم کے بعد نواں ٹرینڈ سانوں کی متعارف کروا دیا۔ ان کا تبصرہ بھی لاجواب رہا۔ خیر سانوں کی۔ بہاول پور سے مومنہ کشف نے اچھا تبصرہ کیا۔ واقعی اسما قادری اچھا لکھتی ہیں۔ پھر ممتاز احمد فیروز پوری کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ بلقیس خان اور احسن زمان کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ پہلی کہانی فاتح مفتوح شروع میں کافی سسپنس بھری تھی پھر اس میں ایکشن کا تڑکا لگا تو گویا کہانی میں جان ہی آ گئی۔ خولہ اور خضر نے اپنے ہمدردوں سے مل کر پروجیکٹ فاتح کی ایسی کی تیسی کر دی۔ شروع اور درمیان میں کہانی کافی انٹرسٹنگ رہی لیکن آخر میں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ یورپ کے بیک راؤنڈ میں یہ انجام مشکل سا لگتا ہے۔ ایک لیب کو اور ایک ادارے کو ایسے شکست دینا ہاں اگر کوئی ایشیائی دشمن ملک ہوتا تو کمال کا اینڈ تھا۔ سرورق کی دوسری کہانی سرخ رُو اچھی کہانی تھی۔ شروع میں لگا کہ خون خرابا نہیں ہوگا لیکن اختتام میں خون خرابے نے کہانی میں جان ڈال دی۔ اگلی کہانی مغالطہ جو عمران قریشی نے لکھی، یہ بھی اچھی رہی پہلے سوئی موئی نے الجھایا پھر سلجھا دیا۔ اتا گیر از امجد جاوید یہ قسط باقیوں سے بہتر رہی۔ اگلی قسط کے لیے تجسس کو برقرار رکھا۔ جمال دستی صاحب کی کہانی جھوٹ گزارے لائق تھی۔ آسیب از شاکر لطیف یہ کہانی اچھی لگی۔ بھوت پریت والا ڈراما کھیل کر لارڈ صاحب نے زمین ہتھیالی تھی لیکن پھر مورس اور ڈیوڈ کے شکنجے میں آ ہی گیا۔ اگلی کہانی طاہر جاوید مغل صاحب کی تھی، اچھا پیچ دیا۔ اس بار عمران جونیئر کے ہاتھ شاہین کا کھوج کھرا لگا۔ لیکن ماہین نے جو ٹھکائی کی، وہ بھی کمال کی تھی۔ عمدہ کہانی رہی یہ بھی۔ الاؤ کو پینڈنگ پر رکھتے ہوئے آگے بڑھا تو حسام بٹ صاحب کی کہانی بھرم دھی کر گئی۔ جس اولاد سے والدین کے اتنے ارمان جڑے ہوتے ہیں وہ سات سمندر پار جا کر واپس آنا گوارا نہیں کرتے۔ سید بینا راض کی کہانی سزا بھی بہترین رہی کوپر نے ریڈکلف سے وصول رقم کا حق ادا کر دیا اور پارٹن کو وہی موت دی جس کا وہ حق دار تھا۔ محب زنداں کہانی بھی گزارے لائق رہی۔ رنگوں میں پہلی کہانی نجمہ مودی کی بڑی خوفناک قسم کی کہانی تھی۔ وقار کی کاہلی اور علیزے کی جلد بازی نے دونوں کو ایک یادگار سبق سکھایا۔ کہانی پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ جو سلوک علیزے نے انسان نما بھیڑیوں کے ساتھ کیا، ہر لڑکی کو علیزے جیسا دل گردہ رکھنا چاہیے۔ موٹروے والا۔ واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔ سرورق کی دوسری کہانی یعقوب بھٹی کی سلگتے خواب ایک اچھی کہانی تھی۔ کشمیر میں لڑتے آزادی کے متوالوں کی شجاعت پر بہترین لکھا۔ نئے

سال کے پہلے شمارے کی ابتدا تو اچھی کہانیوں سے ہوئی آگے بھی یہی توقع ہے۔"

ساہیوال سے محمد عثمان ذوالفقار کی شکر گزاری "نئے سال کے جاسوسی میں سب سے پہلے نکتہ چینی میں داخل ہونے کی جرأت کی۔ تا کہ تھوڑی سی چینی ہم بھی حاصل کر سکیں جو کہ بڑی مہنگی ہے لیکن توقع کے برعکس ہمیں مرچیں ہی ملیں (ہاہاہا)۔ اور چینی تو ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ یہ تو صاف صاف دھوکا ہے بھئی نام کچھ اور، اندر کچھ اور۔ اداریہ پڑھا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا۔ واقعی یہ سال جلدی گزر گیا، اور اب نیا سال ہمارے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سال ہم سب کے لیے خیر و عافیت والا بنائے، آمین۔ اس بار بہت تنگ و دو سے محمد قدیر صاحب کرسیٔ صدارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ معاشرے کے ساتھ ساتھ کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ میانوالی کے ریاست صاحب کا میرا ذکر کرنے کا شکریہ، جی ہم سوچنے والے بندے ہیں۔ اسلام آباد کی ایمانے زارا شاہ صاحبہ نے خوب شرارے چھوڑے۔ آخر کار انہوں نے مجھے پہچان لیا شکر کہ کوئی تو ہمیں جانتا ہے۔ اگر کوئی نہیں جانتا، تے سانوں کی؟ مینا راجپوت صاحبہ کو پہلا خط شائع ہونے پر بہت بہت مبارک ہو۔ لانگاہ صاحب نے تو ہماری طرف نظر التفات ہی نہیں کی۔ اگر وہ نہیں کرتے، تے سانوں کی؟ بلقیس خان صاحبہ کو طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آنے پر خوش آمدید، اب چکر لگاتی رہیے گا۔ بابر عباس صاحب کا مجھے عقل مند سمجھنے کا شکریہ، ان کا پتا معلوم نہیں اس لیے ادارے کو شکریے کا ایک ٹوکرا بھیج رہا ہوں، وصول کر لیجیے گا۔ کہانیوں میں ابتدائی صفحات پر روبینہ رشید کی فاتح یا مفتوح تھی۔ جس میں ایک بار پھر عالمی سازشوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس بار اس کہانی میں ان کے کردار خولہ و خضر پھر سامنے آئے۔ اور دشمنوں سے لڑے۔ عمران قریشی کی مغالطہ نے خوب لطف دیا۔ جس میں دو بہنوں کو ہم شکل بنا کر پیش کیا گیا تھا، اور ان کے شوہر یہ سوچتے رہ گئے کہ ان کی بیوی کون ہے۔ اچھی کہانی تھی لیکن اختتام کچھ پسند نہیں آیا۔ شاکر لطیف صاحب کی آسیب میں قتل کی انوکھی واردات دکھائی۔ مورس اور اس کے ماتحت ڈیوڈ نے اپنی بھرپور کوشش کے بعد آخر کار اس انسان کو ڈھونڈ لیا جو آسیب بن کر لوگوں کو قتل کر رہا تھا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انوکھی میزبان کو ایک پچھلی مختصر کہانی سے جوڑا گیا تھا۔ اس میں للکار کے پرانے کرداروں کو پھر سے یاد دلایا گیا۔ اناگیر کا علی زین اپنے دشمنوں سے لڑنے میں مشغول ہے۔ پیروزاں اس کے قابو آ ہی گئی جس کے لیے علی دوبارہ روہی آیا تھا۔ آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ الاؤ بھی ٹھیک جا رہی ہے۔ لیکن اس میں وہ کاٹ نہیں ہے۔ جو اس کا خاصہ تھی۔ حسام بٹ کی بھرم میں ہمارے معاشرے کو دکھایا گیا کہ کس طرح ایک باپ اپنا بھرم قائم رکھتا ہے۔ اعتزاز سلیم وصلی کی محبِ زنداں بھی کیا خوب تحریر تھی۔ ایک ہی طرح کی زندگی گزارتے ہوئے انسان کو اس کی عادت سی ہو جاتی ہے۔ بہترین تحریر تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی نجمہ مودی کی وہ رات تھی۔ جس میں ہیروئن غیر متوقع حالات و خطرات میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ دوسری کہانی جو کہ یعقوب بھٹی صاحب کی سلگتے خواب تھی، وہ بہت پسند آئی۔ کیونکہ انہوں نے کشمیر کی موجودہ صورت حال اور [illegible] کو جس اچھے انداز میں بیان کیا ہے، وہ [illegible]۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔" (ان شاء اللہ)

رحیم یار خان سے ماورا [illegible] کی دل تسکین "سنتے تھے کہ دنیا گول ہے آج دیکھ بھی لیا۔ غالباً للکار وہ آخری کہانی تھی جو میں نے پڑھ کر جاسوسی کو الوداع کہہ دیا تھا۔ عمران کی ناگہانی موت کی وجہ سے غالب امکان تھا کہ طاہر جاوید کو کہیں ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے (اللہ نہ کرے) (عمران کی موت کی وجہ سے) خیر دسمبر 2020ء میں پھر دل کیا کہ جاسوسی پڑھا جائے۔ دسمبر کا شمارہ دیر سے ملنے کے باعث مکمل نہ پڑھ سکی کہ جنوری 2021ء کا شمارہ مل گیا۔ رسالہ ملتے ہی میں فہرست کھول کر مصنف کے نام پڑھنے لگی جب کہ عموماً (اور خصوصاً) ایسا نہیں ہوتا، فہرست میں طاہر جاوید کا نام دیکھ کر پتا نہیں کیوں میں ان ہی کی کہانی کو کھول کر پڑھنے لگی، کہانی پڑھتے ہی حیرت کے جھٹکے، ناممکن کہ وہ عمران کی ہی کہانی تھی۔ طاہر جاوید مغل پر غصہ بڑا تھا مگر عمران کی واپسی (جس طرح بھی) پر اب قدرے سکون سے ہوں اور امید ہے کہ اب یہ ایک سیریز کی طرح چلے گی ہے نہ طاہر انکل۔ ویسے یہ میرا پہلا ای میل ہے کسی رسالے میں اب مجھے نہیں پتا کہ شائع ہوگا یا ڈیلیٹ مگر ای میل لکھ کے میری خود کی تسلی ہوگئی ہے۔" (خوش آمدید)

گوجر خان سے عرفان راجا کی تنقید و توصیف "نئے سال کا پہلا شمارہ 2020ء کی آخری شام 31 دسمبر کو ملا۔ سرورق بس گزارہ ہی تھا۔ محفل میں اپنے شہر کے محمد قدیر کو صدارت مبارک۔ ریاست خان نے اچھا تبصرہ لکھا۔ پڑوسی شہر سے ایمانے زارا شاہ کی طویل خیال آرائی خوب رہی۔ جامشورو سے پرویز لانگاہ درہم برہم کے بعد "سانوں کی" لے آئے۔ بہت خوب۔ چونیاں سے اپنے ہم پیشہ قاری ممتاز احمد فیروز پوری کی آمد دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بلقیس خان کو واپسی مبارک۔ آتی رہیے گا۔ وزیر آباد سے احسن زمان نے بھی اچھا تبصرہ لکھا۔ بابر عباس بھی اپنے مخصوص انداز میں شامل ہوئے۔ ابتدائی صفحات اس بار خولہ اور خضر سیریز کے نام ہوئے۔ روبینہ رشید نے اس بار مغربی سازشوں اور ہمارے جانبازوں کے ٹکراؤ کا احوال بیان کیا۔ نجمہ مودی کے قلم سے وہ رات اچھی کہانی تھی۔ ایک صنفِ نازک نے بہادری سے مجرموں کا مقابلہ کیا۔ دوسرے رنگ نے خوب رنگ جمایا۔ یعقوب بھٹی صاحب ویلڈن۔ آپ نے مرحوم کاشف زبیر کی یاد تازہ کروادی۔ سلگتے خواب کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں گمن چند سربکف مجاہدوں کی بہترین داستان تھی۔ اناگیر کی اس قسط میں علی زین کا تھوڑا سا ماضی سامنے آیا ہے۔ امجد صاحب اب کہانی کو ذرا ماضی میں لے جائیں۔ الاؤ کی یہ قسط تیز رفتار رہی۔ لگتا ہے ڈاکٹر سیف کو مجرموں کی تشخیص اور علاج کے لیے انڈیا جانا پڑے گا۔ بھرم میں حسام بٹ نے پردیسیوں کے والدین کا دکھ بیان کیا۔ انوکھی میزبان، مغل صاحب نے ماضی کی یاد تازہ کروادی۔ کچھ مزہ نہیں آرہا جناب۔ ابتدائی صفحات یا رنگوں میں تشریف لائیں نا۔ ہمیں جذبوں، نزاکتوں اور ہنگاموں کے منظر نگار طاہر جاوید مغل چاہئیں۔ محبِ زنداں بس گزارا تھی۔ شاکر لطیف کی

آسیب ایک بہترین کہانی تھی۔ عمران قریشی کی مغالطہ بالکل فضول ثابت ہوئی۔ حالانکہ ان کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔"

اسلام آباد سے نازو نازنین ایمانے زاراشاہ کے انداز "2021ء آچکا ہے لیکن اس بار بھی ڈائجسٹ حسب معمول بہت تگ و دو کے بعد حاصل ہوا۔ ٹائٹل اچھا تھا لیکن اتنا زیادہ بھی اچھا نہیں کہ تعریفوں کے ڈونگرے برسا سکیں۔ یعنی تھوڑا تھوڑا اچھا تھا۔ (تھوڑا تھوڑا شکریہ) ویسے یہ تو آپ نے سچ ہی کہا ہے قلم اور کی بورڈ پچھلا سن لکھنے کے عادی نہیں ہوئے تھے کہ نیا سال سر پر آن کھڑا ہے۔ جوں جوں قیامت کا وقت نزدیک آتا جا رہا ہے، وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ کب دن ہوتا ہے۔ کب رات، کچھ خبر نہیں۔ یونہی زندگی تمام ہونے کو ہے۔ بہرحال اس مرتبہ ہمارے موڈریٹر قدیر اسپیشل شمارے کے ٹاپ رہے۔ قدیر آتے ہی چھا گئے۔ ہمیں تو یہ سیٹ بھی مشکل سے ملی تھی۔ اب تو اس بات کو صدیاں بیت گئیں۔ خیر بہت مبارکباد۔ تبصرہ واقعی بہت عمدہ تھا کہ ٹاپ کرتا جچتا تھا۔ ابھی پچھلی ...... مٹھائی پہنچی نہیں۔ یہاں اگلی بھی ڈیو ہو گئی ہے۔ ہاہاہا۔ آپ جلد کنگال ہونے والے ہیں۔ ریاست خان ماضی پرست بن کر 50 سال قبل کے زمانے کا حال سے موازنہ کر رہے تھے۔ اپنے تبصرے کی بات کریں تو ہمیں تو چھپنے کی امید ہی نہ تھی۔ کجا کہ ایڈیٹر کے مزیدار جوابات بھی بونس میں مل گئے۔ ویسے پہلے ہم حیران تھے کہ ایڈیٹر صاحب نے اس بار سب کے ساتھ نوک جھوک کا مظاہرہ کیا ہے مگر کیسے...... کیوں...... پھر جلد ہی اس کا جواب مل گیا کہ جنوری کا اسپیشل شمارہ ہے تو اسے یادگار بنانے کے لیے کیا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ ہر مرتبہ سب کی یونہی کلاس لیا کریں۔ (یعنی آپ ہر دفعہ ستائیں گی) مینا راجپوت کو خوش آمدید۔ شکر ہے کوئی اور بھی اسلام آباد سے آیا۔ ہر جگہ اکیلے توپوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ (مرد حضرات کمر کس لیں) سسرانکل آپ کے یہ ساتوں کی والا تکیہ کلام ہمیں نہیں بھایا۔ اس چکر میں آپ اور آپ کا سپوت ہمیں بھی بھول گئے۔ (ایسا تو کسی صورت ممکن نہیں) اور پرے کندھے اچکا کر ساتوں کی بھی کہہ دیا۔ ہم ناراض ہیں آپ سے۔ پکا والا۔ پاکستان آکر ایسے آنکھیں پھیریں گے ہمیں امید نہ تھی۔ بے وفا نکلے آپ۔ مومنہ کشف والی خواہش ہماری بھی ہے اسما قادری کی تحاریر عرصہ دراز سے نہیں پڑھیں۔ ممتاز صاحب نے تو کہانیوں کے خلاصے بیان کر دیے۔ جس نے کہانیاں نہیں پڑھیں وہ ان کا تبصرہ پڑھ کر مدد لے سکتا ہے۔ (ہاہاہا...... ارے اب اتنا نہ ہنسائیں) بلقیس خان آپ نہ جانے کون سی صنف ہیں مگر جو بھی ہیں ویلکم بیک۔ پرانے لوگوں کو یاد کرنے کے بجائے نئے لوگوں سے گزارہ کیجیے۔ وقت رکتا نہیں ہے۔ سدا چلتا رہتا ہے۔ حال کو قبول کیجیے۔ اب ہم اتنے گئے گزرے لوگ تو نہیں ہیں۔ (بالکل بھی نہیں) کہانیوں میں اس بار سب سے پہلے فاتح مفتوح پڑھی۔ جو ہماری فیورٹ رائٹر میں سے ایک ہیں۔ بہت یونیک موضوع پر لکھی گئی اچھی کہانی۔ لیکن بالکل بھی بلائنڈ فولڈ نہ تھا۔ کہانی اندازوں کے عین مطابق آگے بڑھتی رہی۔ خولہ اور خضر۔ ان کرداروں پر پہلے بھی لکھا ہے۔ کیا [illegible] شرلاک ہومز کی طرح [illegible] مشتمل ہوگی؟ اور ہم امید کریں اگلی بار کوئی اور سنسنی خیز کیس پڑھنے [illegible] (یعنی) مغالطہ پڑھنے کے بعد [illegible] تھا مغالطے میں تو ہم بھی چلے گئے۔ کہانی [illegible] کیا گیا کہ [illegible] بحران تو اپنی جگہ۔ ہم قارئین سے بھی دماغ کی دہی کر دی [illegible] (نہ جانے عمران قریشی کو دہی اتنا پسند کیوں ہے۔ کافی تگ و دو کے بعد حاصل ہوتا ہے) لکھنے کی کوشش [illegible] کامیاب [illegible]۔ بھوت [illegible] ترجمہ شدہ کاوش تھی۔ [illegible] آسیب پڑھ کر ہمارے [illegible] نہیں رہے۔ بھوت پریت پر گوروں کا بھی اتنا سخت ایمان کہ پولیس آفیسر بھی بے وقوف بن گیا۔ کہانی کافی سیدھی تھی۔ سو فیصد ممکنہ اختتام ہی ہوا۔ مغل صاحب ہمیں آپ کی کہانیاں بہت بہت پسند ہیں۔ للکار وہ شاہکار تھا جس سے ہم نے جے ڈی پی سے تعلق جوڑا تھا اور عمران دانش آج تک کا فیورٹ ہیرو...... اور ہم نے اس کی موت پر صبر کر لیا تھا اور آپ نے اسے مار کر ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ اب وہ زندہ ہوتا تو اپنے بیٹے کی یہ زبان دانی دیکھ کر صدمے سے گنگ ہو جاتا۔ یعنی باپ تو باپ۔ بیٹا بھی سبحان اللہ! اس لیے یہی کہوں گی کہ اس سیریز کے علاوہ کچھ لکھیے جو ہمارے دلوں کو چھو جائے ہمیشہ کی طرح۔ انوکھی میزبان نارمل کہانی تھی۔ ماہین نے ایسا کیوں کیا، اس کی کوئی خاص توجیہہ نہ تھی۔ اور لائیو ویڈیو پر شاہین کو کیسے دیکھ لیا تابش اور عمران جونیئر نے؟ کیا شاہین کو وہ نظر نہیں آئے۔ (نہیں) حسام بٹ کی بھرم ایموشنل تحریر رہی۔ سزا بھی سو سو رہی۔ نجمہ مودی کا رنگ وہ رات میں سنسنی اور تھرل عروج پر رہا۔ علیزے کے ساتھ ساتھ ہم بھی اس آنکھ مچولی کا حصہ رہے۔ واہ واہ علیزے ویلڈن۔ خواتین مشکل وقت میں اعصاب پر قابو نہیں رکھتیں مگر اس نے کمال کیا۔ (ہمیں آپ یاد آگئیں) ہمیں کچھ سال پہلے کا واقعہ یاد دلا دیا۔ جب اسلام آباد کی سپر مارکیٹ میں ایک لڑکی نے پانچ چھ لڑکوں کی وہ پٹائی کی تھی کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آگیا تھا۔ ہمارا خیال ہے ہر لڑکی کو اتنا بہادر ہونا چاہیے۔ بہادر ہونے سے زیادہ ذہنی مضبوط! محب زنداں ایک ایسا کیس جسے بہت مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ اور ایک حقیقی حادثہ جس کے بھی کردار اب تک زندہ اور اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ ان کی کہانی کو مشرقی جذباتیت کا ٹچ دینا کہاں کا انصاف ہے؟ اسٹاک ہوم سنڈروم نفسیاتی کج رویوں میں سے ایک بہت پرامینینٹ ڈس آرڈر ہے۔ اب آتے ہیں شمارے کی بہترین کہانی اور دوسرے رنگ کی جانب۔ سلگتے خواب ہوں یا سلگتے چنار۔ دونوں ہی کشمیر کے نصیب میں لکھ دیے گئے ہیں۔ 2019ء کے بعد سے کشمیر پر کوئی کہانی نہیں پڑھی نہ ہی آرٹیکل۔ کیونکہ اب کچھ بھی لکھا بیکار لگتا ہے۔ اگر پڑھوں بھی تو وہ مکمل فکشن اور وہی گھسی پٹی باتوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن یہ رنگ حقیقت کے انتہائی قریب تھا۔ خاص کر آرٹیکل 370 کے تحلیل کرنے کے بعد کے سینیریو پر لکھی جانے والی بہترین کہانی۔ حقیقت پسندی سے تمام نکات کا احاطہ کیا گیا۔ حریت پسندوں کو صرف جذباتی ہی نہیں۔ عقل کا استعمال کرتے دکھانا ہی اصل رخ ہے۔ صفوں میں شامل غداروں کا اصل چہرہ بھی نظر آیا جو یہ لبادہ اوڑھے تحریک کو نقصان پہنچانے کے در پے رہے ہیں اور رہتے ہیں۔ ہم صرف جذبات لکھ کر بیچتے ہیں۔ کیونکہ کشمیر کو کہانی سمجھتے ہیں۔ مگر وہ کہانی نہیں ہے۔ زندہ انسانوں کے خوابوں کی حقیقت۔ باقی یہی کہوں گی کہ بہت شاندار کہانی تھی۔ کیپ اِٹ اَپ یعقوب بھٹی صاحب۔"

خلیل احمد انجم کی بزم آرائی "نئے سال کا نیا ماہنامہ پرانے سال میں 23 دسمبر کو دستیاب ہوا۔ سرورق جاسوسی اور ایڈونچر کے مشترکہ

امتزاج سے مزین تھا۔ حسینہ کی چالاک نگاہیں دشمنوں کی جاسوس ہونے کا عندیہ دے رہی تھیں جبکہ صنفِ مخالف اس کے مذموم عزائم سے حکام بالا کی آنکھیں کھولنے کی سعی میں غرقاب ہے۔ فہرست پر طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے روبینہ رشید صاحبہ کی فاتح یا مفتوح پر ڈیرے جمائے۔ حقیقی معنوں میں تحریر اور اندازِ تحریر نے شعور و لاشعور کی تمام تر کیفیتوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ قدم قدم، سطر سطر سنسنی اور تحیر نے جکڑے رکھا۔ تحریر میں سپر پاور کے بگ باس کی تمام تر شر انگیزیوں کا پردہ چاک کیا گیا جو ہم جیسے ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو درہم برہم کرنے کی سازشوں پر تلے رہتے ہیں۔ غریبوں سے جینے کا حق چھینتے ہیں۔ ایسی آگ میں ہمیں جھونک دیتے ہیں کہ ہم آپس میں ہی لڑنے مرنے پر تل جاتے ہیں۔ ایک ناکردہ گناہ کی سزا سے دوچار کر دیتے ہیں مزید برآں اپنے مفادات کی خاطر نوعِ انساں کو ظلم و جبر کا نشانہ بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے خواہ وہ ان کے اپنے ہی کیوں نہ ہوں۔ فاتح یا مفتوح اس کا عملی نمونہ پیش کر رہی ہے۔ روبینہ رشید صاحبہ کو اتنی اچھی کاوش کی تخلیق پر میں تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں اور جاسوسی پبلی کیشنز کو بھی جنہوں نے سالِ نو کے اعزاز میں اولین صفحات پر اس تخلیق کو تحفتاً پیش کیا۔ اعتزاز سلیم وصلی کی محبت زنداں اچھی تحریر تھی۔ کولین کے کردار پر ترس آیا۔ عمران قریشی کی مغالطہ حقیقت سے مبرا تحریر تھی۔ سونی اور مونی کے ہم شکل کردار ڈبل رول فلم کے مصداق محسوس ہوئے۔ عمران قریشی صاحب سے گزارش ہے کہ چھوٹی اسٹوریز سے ہٹ کر بڑے ناول بھی تخلیق کریں۔ تنویر ریاض کی سرخرو اچھی تحریر تھی۔ جمی بلیک کے کردار نے محبت و دانائی کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا اور کسی بڑے نقصان سے جولیا کو بچا لیا۔ طاہر جاوید مغل کی انوکھی میزبان خاصے کی تحریر تھی۔ ماہین کا کردار حیرت انگیز تھا۔ حسام بٹ صاحب کی بھرم نے افسردہ کر دیا۔ توفیق صاحب جیسے باظرف کردار ہمارے اردگرد خال خال ہی ملتے ہیں۔ تحریر چھوٹی تھی لیکن بڑے دکھ کی داستان سنا رہی تھی۔ جمال دستی کی جھوٹ شاکر لطیف کی آسیب اور سیر بنا راض کی سزا مغربی امتزاج سے مزین دلکش تحاریر تھیں۔ وہ رات، سرورق کا پہلا رنگ نجمہ مودی صاحبہ کی زبردست تحریر پڑھنے کو ملی۔ تحریر کی روانی نے ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ علیزے کی بہادرانہ و دلیرانہ فہم و فراست دل کو بھا گئی۔ سلگتے خواب یعقوب بھٹی کی خوب صورت، دلکش اور سنسنی خیز تحریر پڑھنے کو ملی۔ وادی خوں رنگ پر مبنی تحریر حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خدائے ذوالجلال سے خوابوں کی تعبیر کی دعا ہے۔ امن کے علمبردار تو بے خبر سو رہے ہیں۔ سلسلے وار تحاریر بھی اچھی جا رہی ہیں۔ انا گیر کی اس قسط نے بہت محظوظ کیا۔ اب تھوڑا سا تبصرہ و خیال مدیرِ اعلیٰ کی محفل پر۔ آپ کے خیالات نے معلومات میں اضافہ کیا۔ محمد قدیر صاحب کو کرسیٔ صدارت کی مبارک باد۔ ایمانے زارا شاہ اور پرویز لانگاہ کے فرمودات نے محظوظ کیا۔ ریاست خان صاحب، بینا راجپوت صاحبہ اور ممتاز فیروزپوری کے خطوط پسند آئے۔ مومنہ کشف صاحبہ ابھی تو آپ کو شارٹ اسٹوری لکھنی پڑے گی۔ اٹھائیں قلم اور آزمائیں ہمت...... محمد احسن زمان، بھائی آپ کے دکھ میں ہم شریک ہیں۔ اللہ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ بلقیس خان کا تبصرہ خاص تحفے کا تھا۔ بابر عباس صاحب سے گزارش ہے کہ زرویا اعجاز صاحبہ بہت اچھی قلمکار ہیں۔ خواہ مخواہ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے کے بجائے کوئی اصلاحی پہلو اجاگر کریں۔ ان کو اپنی آرا سے نوازیں۔ اس طرح تنقید برائے تنقید سے قلمکار و فنکار کا دل کھٹا ہو جاتا ہے۔ ان کو اپنی پسند کا موضوع دیں اگر آپ کو اچھا لگے تو پھر بات کریں۔ زرویا اعجاز صاحبہ بہت زبردست تخلیق کار ہیں۔ وہ ہر موضوع پر بہت گہرائی کے ساتھ طبع آزمائی فرماتی ہیں اور بلاشبہ انہوں نے بہت جلد اپنا مقام پیدا کیا ہے اور یہ خودی کی دلیل ہے۔“

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی تیز رفتاری ”روبینہ رشید کی فاتح یا مفتوح زبردست کہانی تھی۔ پاکستانیوں نے پروجیکٹ فاتح کو جس طرح فیل کیا تھا، قابلِ تحسین تھا۔ جم والٹر پھر سے پروجیکٹ کے لیے پُرامید تھا مگر وہ بھی دیوانے کی بڑ لگ رہا تھا۔ وہ رات میں اکیلی علیزے نے چار خونخوار اور جان کے درپے شکاریوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا، انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار دیا اور خود بھی بچ کے آ گئی۔ اسے کہتے ہیں ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ نجمہ مودی کی سرورق کہانی بہت پسند آئی۔ الاؤ میں رومی اور سیف کی بیویانہ نوک جھوک دلچسپ ہوتی ہے خیر اس دفعہ رومی تو اپنا ایکشن دکھا کر انڈیا چلی گئی۔ سیف نے مارگریٹ کی ہیلپ کی تو روڈی جان سے گیا۔ زوہریہ کی تیاردار خوب صورت حسینہ نے سیف کو زیر کر لیا۔ صحرا صحرا انا گیر ہے، دشمنی ایک دوجے سے بغلگیر ہے۔ محبوب ساوری محب علی ہے پیار محبت ساتھ شریر ہے۔ زن، زر، زمین کا جھگڑا، بے بس پیروزاں تو کہیں جہانگیر ہے۔ سپر کہانی ہے، پانچ سو برس پرانا آسیب ڈین کی صورت واپس لوٹا اور قتل کی وارداتیں ہونے لگیں۔ آسیب دلچسپ کہانی تھی۔ نکتہ چینی سے قدیر احمد کو مبارک باد۔ ایمانے زارا سرورق صنفِ نازک کی تعریف سے پھسل کر اس کا تیل نکلتا ہے ہاہاہا، باقی بینا راجپوت، پرویز لانگاہ، مومنہ، ممتاز احمد، بلقیس خان، احسن زماں اور بابر عباس بھی کے تبصرے عمدہ رہے۔“

وزیر آباد سے محمد احسن زمان کا ارمان نامہ ”سال کا پہلا شمارہ 23 دسمبر کو موصول ہوا، بہت ہی پُررونق سرورق تھا۔ اپنی محفل اس بار خوب گرما گرم تھی، تمام احباب نے قلم کا حق خوب ادا کیا تھا، باہمی نوک جھوک نہ ہو تو یہ محفل بھی بے رنگ و نور اور بے بُو ہو جائے۔ پہلے قدم پر پنڈی سے قدیر صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ آگے دیکھا تو ریاست خان صاحب سے ملاقات ہوئی، اب جو دیکھا تو سامنے ایمانے زارا شاہ کو شرارے برساتے پایا، صفحہ پلٹا تو شہر اقتدار سے بینا صاحبہ فروکش تھیں۔ پرویز لانگاہ صاحب کا تبصرہ بھی عمدہ تھا، پر سانوں کی؟ مومنہ کشف کا تعریف کا ٹوکرا ہم سے نہیں اٹھایا گیا، بلقیس خان کو واپسی پر خوش آمدید۔ کھاریاں والے عباس اینڈ کو کا خط بھی اچھا تھا۔ اب کچھ بات جاسوسی کی۔ پہلی کہانی ایک طاقتور ملک کی سائنسی ترقی پر مبنی تھی لیکن اس کا غلط استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے ڈاکٹر سوزین کے سلسلے میں ہوئی مار دھاڑ نے بہت مزہ دیا۔ خولہ اور خضر انجانے میں ایک ہی کشتی کے سوار ہوئے اور پھر ہیڈ کوارٹر جانے کے لیے مصنف نے کرداروں میں علی عمران اور جولیا کی روح حلول کر دی، وہ تباہی اور اٹھا پٹخ کی کہ الامان الحفیظ، خیر اس ساری دوڑ دھوپ کا نتیجہ تو دشمن مشن کی ناکامی کی صورت نکلا لیکن آخر میں اژدہا

پھر سر اٹھار ہا تھا۔ سرخ رُو میں بچی بھی باز یاب ہوگئی اور آٹھ ملین ڈالر بھی ہاتھ آئے، کیا نقد سودا کیا تھا جی نے۔ مغالطہ جو عمران قریشی کی تحریر تھی۔ ہیرو صاحب سونی اور مونی کے درمیان گھن چکر بنے ہوئے تھے۔ طلاق دینے کے بعد 'جتنے دا کھوتا او تھے آن کھلوتا' کے مصداق پھر انہی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔ اچھی اور مزیدار تحریر تھی۔ انا گیر میں تو علی زین اس بار قیامت ڈھا گیا۔ خصوصاً سردار نور حیات والی پنچایت میں علی نے اپنے کارڈ بہت ہنر مندی سے کھیلے اور آخر میں پیروزاں کے ساتھ بھی ہاتھ کر گیا اب دیکھتے ہیں کہ ساوری کیا گل کھلاتی ہے۔ جھوٹ ایک اچھی کہانی تھی جس نے آخر تک الجھا کر رکھا۔ شاکر لطیف کی آسیب کا آغاز کرتے ہوئے دل دھک دھک کر رہا تھا کہ نہ جانے کہانی میں آسیب کب رونما ہوگا لیکن جب سنڈے سروس میں لارڈ جنکس نے تقریر جھاڑی تو اسی لمحے سمجھ گیا کہ سارا کھٹ راگ اسی نا ہنجار کا پھیلایا ہوا ہے بہر حال مورس اور ڈیوڈ نے آسیب کے غبارے سے جب ہوا نکالی تو ساری واردات کے پیچھے لارڈ ہی نکلا، اب جو دیکھا تو سامنے عمران کا کردار تھا جو انوکھی میزبان میں اپنی کارکردگی کے جوہر دکھا رہا تھا، اچھی بنت کے ساتھ ٹی بے جے ایم نے پیش کیا۔ کہتے ہیں کہ جب ارادے سچے ہوں تو منزل مل ہی جاتی ہے، الاؤ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ حسام بٹ کی تحریر بھرم بہت دھگی کر گئی۔ میر ینا راش کی بیزا جاسوسی کے معیار کی کہانی تھی۔ آخر میں جا کر پتا چلا کہ قاتل کون تھا ورنہ تو ہر شخص فلورنس کی موت کو خودکشی ہی سمجھ رہا تھا۔ محبِ زنداں بھی بہت عمدہ کہانی تھی۔ وہ مجرم کی آنکھوں میں شرمندگی دیکھنا چاہتی تھی، کمال کا صبر تھا۔ (جی ہاں) اب باری آگئی نجمہ مودی کی وہ رات کی، کمال ہی ہو گیا علیزے نے بہت ہی جاندار اور شاندار طریقے سے اپنی جان اور عزت بچائی۔ کاش ہر عورت ایسی یہ جرأت کا مظاہرہ کرے تو آدھے غنڈے اپنے بلوں میں ہی گھسے رہیں۔ یعقوب بھٹی کی سلگتے خواب کشمیر کی وادی میں جاری کشت و خون اور ظلم و بربریت کی کہانی تھی۔ مجاہدین اپنے خونِ جگر کی آبیاری کر کے اس تحریک کو جلا بخش رہے ہیں اور ان شاء اللہ وادی میں جلد ہی آزادی کا سورج طلوع ہوگا۔ آخر میں اس درویش کی وہی صدا کہ اس ملک اور ملت کی حفاظت اور سربلندی کے لیے سب دعا گو رہیں۔" (ضرور......)

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی سوغات "جنوری کا جاسوسی گہرے رنگوں سے مزین ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ نیا سال مبارک۔ 2021ء کے الفاظ پستول کے دہانے سے نکلے۔ سرورق پر موجود لڑکی مسرور انداز میں نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ اس مرتبہ جلد بندی میں کچھ نقص تھا جس سے سلوٹیں پیدا ہو گئیں۔ باریک کاغذ پر کمپوزنگ اجاگر نہیں ہوئی۔ خطوط کی محفل جامع اور بھرپور تھی۔ جن احباب نے تذکرہ قلم بند کیا، ان کا مشکور ہوں۔ آسیب میں آسیب کی دہشت رائٹر نے خوب جمائی مگر جیکب بڑی آسانی سے قابو میں آگیا۔ مغالطہ، جھوٹ، بھرم، محبِ زنداں، وہ رات اور سلگتے خواب خوب تھیں۔ ابتدائی ناول ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ الاؤ ہنگاموں سے بھرپور تھی۔ فہرست میں ڈیزائن جاذبِ نظر تھا۔ کچھ تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ جلد ہی کراچی آنے کا ارادہ ہے۔"

فیصل آباد سے [illegible] رمشا کی مبارک باد "2021ء کے پہلے شمارے میں اپنا تبصرہ شائع [illegible] دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ [illegible] آپ مجھے تبصرہ بھیجنے کی آخری تاریخ بتا دیں۔ چھوٹا تبصرہ ہی تو لکھا تھا میں نے پھر بھی جلد [illegible]۔ (دیر سے ملا تھا) [illegible] کی محفل [illegible] قدیر بھائی صدارت پر براجمان نظر آئے [illegible] کامیابی کی دعا دینے کے لیے مشکور ہوں [illegible] بھائی کی [illegible] اور ان کے شہر کا نام بھی شائع ہو گیا۔ ایمان زارا کے شرارے دلچسپ لگے۔ بیسٹ وشز کے لیے [illegible]۔ میرے ساتھ بھی اس دفعہ یہی سین ہوا۔ نہ بلیک لسٹ میں نام اور نہ ہی نکتہ چینی میں۔ (پرچہ چھپنے کے لیے چلا گیا تھا اور تب تک خط موصول نہیں ہوا تھا ناراض حسینہ) بینا راجپوت کو خوش آمدید۔ ارے آپ تو اپنی کاسٹ کی ہی نکلیں۔ میں بھی راجپوت ہوں۔ پرویز لانگاہ بھائی نے میرا ذکر نہیں کیا۔ نورین میں تمہاری اس بات سے ایگری ہوں کہ بابر عباس تو صرف زویا اعجاز کی برائی کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔ میری تو فیورٹ رائٹر بن گئی ہیں زویا اعجاز۔ عشق زہرناک، زویا کی تادیر یاد رہ جانے والی کہانی ہے۔ پریتی اور سیم ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ممتاز بھائی آپ نے پھر مجھے دو بنا دیا۔ میں ایک ہی انسان ہوں۔ بلقیس خان، شاہ زیب کی برائی کر رہی تھیں لیکن انگارے کا اصل ہیرو تو شاہ زیب ہی تھا نہ کہ انیق۔ اس بار بابر عباس بھائی اپنی مسز کے ساتھ مشترکہ تبصرہ لکھتے نظر آئے۔ عمران قریشی کی مغالطہ پڑھ کے سونی اور مونی پر بہت غصہ آیا۔ یہ دونوں تو واقعی بدکردار تھیں۔ انوکھی میزبان میں چلو عمران ٹو کی ہیروئن ماہین بھی آگئی ہیں۔ عمران سیریز میں نے نہیں پڑھی۔ (یہ للکار کہانی کے کردار ہیں) اس لیے عمران اور شاہین کے کردار کے بارے میں نہیں جانتی۔ ظاہری بات ہے تب میں پیدا نہیں ہوئی تھی نا۔ (جی نہیں، تب پیدا ہو چکی تھیں۔ یہاں ابنِ صفی کے عمران کی بات نہیں ہو رہی...... بے خبر گڑیا) نئے زمانے کے عمران اور ماہین زبردست ہیں۔ عمران ٹو کا کردار میرا پسندیدہ ہے۔ حسام بٹ کی بھرم پڑھ کے توفیق احمد پر ترس آیا۔ ناصر اور سارے بیٹوں پر غصہ آیا۔ بس توفیق احمد نے اپنا بھرم رکھا ہوا تھا۔ اعتراز سلیم وصلی کی محبِ زنداں زبردست رہی۔ کیمرون شیطان تھا۔ جینس کی سمجھ نہیں آئی کوئی بیوی ایسی بھی ہو سکتی ہے پر مغربی معاشرے میں سب کچھ ممکن ہے۔ (اب تو یہاں بھی کچھ ناممکن نہیں رہا......) کولین اسٹان سب سے مظلوم کردار تھا لیکن اسے یہ سب کچھ نہیں سہنا چاہیے تھا۔ کیمرون سے محبت ہی وہ وجہ ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ قید برداشت کرتی رہی۔ نجمہ مودی کی وہ رات زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ علیزے کو بھلا کیا ضرورت تھی اتنی رات میں اکیلے جانے کی۔ دوسرا اتنے خطرناک غنڈوں کی خطرناکی علیزے کے سامنے ختم ہو گئی۔ کچھ باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ (دوبارہ پڑھ لو۔ سمجھ میں آ جائیں گی) میری طرف سے سب کو ہیپی نیو ایئر۔"

انتقالِ پُر ملال

معروف مصنف، ناقابلِ فراموش کہانیوں کے خالق محترم انوار صدیقی کی اہلیہ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں ہیں۔
ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے

قاتل کسوٹی

امجد رئیس

گناہوں اور غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصیبتیں کم نہیں ہوتیں بلکہ بڑھتی چلی جاتی ہیں... جذبات کی رو میں بہہ کر اس سے بھی ایک لغزش سرزد ہوچکی تھی... بس ایک غلطی کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہر دن اسے ایک نئی مشکل سے نبرد آزما ہونا پڑرہا تھا... ہمدرد دوستوں کی ہمدردیاں اس کے ہمراہ نہیں... ایک طرف جرم تھا... دوسری طرف قانون... سچا جھوٹ اور کڑوے سچ کے درمیان مسلسل آنکھ مچولی جاری تھی... مغرب کی فضاؤں میں سانس لیتے دلچسپ... تیز رفتار ناول کی تلخیص...

ابتدا سے انتہا تک پیچ در پیچ سنسنی خیز کشمکش کی انوکھی ہنگامہ آرائی......

pklibrary.com

وہ ایک شاندار آئیڈیا تھا۔ پرل اسٹریٹ پر پال کے آفس میں لنچ۔ واہ کیا سرپرائز ہوگا۔ میں نے پال کا پسندیدہ لباس زیب تن کیا۔ میں نے پال کی اسسٹنٹ جین سے تصدیق کرلی تھی کہ وہ آفس میں ہے لیکن میں یہ غلطی نہیں کرسکتی تھی کہ جین کو کہتی کہ میری اچانک آمد کو خفیہ رکھے۔ بہر حال وہ پال کی سیکریٹری تھی، میری نہیں۔

میں تصورات میں لطف اندوز ہوتی ہوئی اپنی منی کوپر میں وہاں پہنچی تھی۔ میں نے پال کو آفس سے نکلتے دیکھا اور فاصلے پر بریک لگانے کے لیے مجبور ہوگئی۔ کیونکہ پال کے ہمراہ سرخ زلفوں والی ایک حسینہ...... فتنہ گر بھی تھی۔ میرے خوش کن رنگ برنگ احساسات و جذبات پل میں دھواں بن کے تحلیل ہوگئے۔ میں آفس کے اسٹاف سے واقف تھی۔ وہ نازنین کوئی اور تھی۔ دونوں میں بے تکلفی عیاں تھی...... وہ اطراف سے بے نیاز ہنستے مسکراتے جارہے تھے۔ پال نے ایک ٹیکسی روکی۔

میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ تعاقب شروع کیا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے سینے پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ٹیکسی سینٹ ریگس

ہوٹل کے سامنے رکی...... دونوں اترے۔ پال اس کا بازو تھامے ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

رات ڈنر پر میں یاس کے عالم میں سوچ رہی تھی کہ شاید کوئی اور بات ہو۔ شاید پال لنچ کے بارے میں بتائے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میری امید خام خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بالآخر میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''پال آج کا ظہرانہ کیسا تھا، کیا کھایا؟''

میرا سر نیچے پلیٹ کی طرف تھا۔ تاہم میں نے محسوس کرلیا کہ وہ چونک کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ وقفہ دے کر اس نے جواب دیا۔ ''سینڈوچ، لورین تم جانتی ہو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔''

وہ میرے منہ پر جھوٹ بول رہا تھا۔ چمچ میرے ہاتھ سے چھوٹ کے پلیٹ میں گرا۔ کیا وہ شروع سے بے وفائی کررہا ہے۔

''کیوں، کیا بات ہے؟'' اس نے بھی عام انداز اختیار کیا۔

میں لاعلم تھی کہ کیونکر میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی تھی جبکہ میرا خون اُبل رہا تھا۔ ''کچھ نہیں، بس بات برائے بات۔''

☆☆☆

پال اپنے کلائنٹ سے ملاقات کے لیے بوسٹن گیا ہوا تھا۔ میں ماضی کی یادوں میں گم تھی۔ خاص طور پر شادی سے پہلے کی یادیں۔ یہ ایک محبت کی شادی تھی۔ پیار بھری مہکتی یادیں، سرخی مائل بالوں والی حسینہ کو مسترد کررہی تھیں۔ میں شعوری یا لاشعوری طور پر کوئی وجہ تلاش کررہی تھی۔ خود کو بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے غور کیا، وہ کئی ہفتوں سے مجھے نظرانداز کررہا تھا۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ اپنی نئی سرمایہ کاری کے باعث مصروف ہے۔ میرے گمان میں نہیں تھا کہ مصروفیت کی نوعیت کیا ہے۔ میں کتنی احمق تھی۔ وہ ہر سال شادی کی سالگرہ پر مجھے قیمتی تحفہ دیتا تھا۔ دو ہفتے قبل سالگرہ گزری تھی لیکن پہلی بار اس نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔ بھول گیا تھا یا تحفہ سرخ بالوں والی حسینہ کے حصے میں آیا تھا۔ میرا غصہ، غضب اور پھر اشتعال میں بدل گیا۔ پال بے وفا نہیں تھا۔ دغاباز تھا...... میں نے دغابازی کا جواب دغابازی سے دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ''سوری پال، ابتدا تم نے کی ہے۔''

☆☆☆

اسکاٹ کی سرخ ریسنگ بائیک ڈکاٹی نصف بلاک کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ موسم بھیگا بھیگا تھا۔ میں نے تیزی دکھائی تاہم بائیک تک پہنچتے پہنچتے بھیگ چکی تھی۔ اسکاٹ نے کک ماری، انجن جنگلی جانور کے مانند غرایا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد تھے۔ اسکاٹ نے اپنا ہیلمٹ مجھے پکڑا دیا۔ وزنی بائیک نے گیلی سڑک پر پھسلنا شروع کیا۔ مجھے اس کی مہارت پر بھروسا تھا، اگرچہ میں بارش کی وجہ سے کچھ خوف زدہ تھی۔ ہنری ہڈسن پارک وے سے ہم برونکس کے پڑوس میں ریورڈیل میں آئے۔ پہاڑی علاقے کے نیچے ہڈسن کی موجیں اچھل رہی تھیں۔ سڑک پر گہرے رنگ کے مینشن تھے۔

''یہ گھر ہیں یا گودام؟ تم یہاں رہتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' کافی بڑی جگہ تھی۔ کشادہ گیراج میں پورشے، بینٹلے اور فیراری کھڑی تھیں۔

''یہ تمہاری ہیں؟'' میرا منہ کھلا رہ گیا۔

''کاش میری ہوتیں...... میں یہاں مہمان ہوں۔''

میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ عمارت میں کئی اپارٹمنٹ تھے۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر ایک خوشبودار تولیا میرے حوالے کیا۔ ہم دونوں کی نظریں، نظریں میں رنگ، رنگ میں مسکراہٹ اور مسکراہٹ ... کررہی تھی۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، اس وقت ایسا کچھ نہیں تھا۔ بس کام سے کام...... حالانکہ ہم ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ یک لخت سب بدلتے جا رہا تھا۔ ذہن میں احساسِ جرم نے سر اٹھایا۔ پھر تصور میں پال اور سرخی مائل زلفوں والی حسینہ کا سراپا ابھرا۔ مجھے لگا، میں بالکل ٹھیک کررہی ہوں......

☆☆☆

اس وقت پال کی کیمری وسیع گیراج سے فاصلے پر اندھیرے میں کھڑی تھی۔ وہ اسکاٹ کی چمک دار بائیک ڈکاٹی (Dukati) کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے آج آپریشن کا دن تھا۔ اس نے گیراج کے اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا۔ نشست کے ساتھ نیچے پنگ 3 آہنی گالف کلب اٹھائی۔ کلب کا منہ انسانی ہاتھ کی مٹھی جتنا تھا۔ پال انتہائی فیصلہ کرچکا تھا۔ کوئی اس کے گھر میں گھس کے اس کی سب سے بیش قیمت چیز لے جائے۔ پال کا خون اُبل رہا تھا۔ اس نے دستانے چڑھا کے گالف کلب کا وزن اور توازن جانچا اور بوندا باندی میں قدم بڑھائے۔

معاوضہ رک گیا۔ اسکاٹ باہر آرہا تھا۔ چلو اچھا ہے۔ پال کا کام آسان ہوگیا تھا۔ لیکن باہر کیا کرنے آیا ہے؟ پال نے سوچا۔ اور چھپ چھپا کے آگے بڑھتا رہا۔ سڑک سنسان تھی۔ بوندا باندی اچانک بارش میں تبدیل ہوگئی۔ پال نے تیزی دکھائی۔ فاصلہ دس فٹ تھا۔ پھر سات فٹ...... پانچ...... دفعتاً پال کا سیل فون بول اٹھا۔ ''لعنت ہے، اسے گاڑی میں کیوں نہیں چھوڑا میں نے۔'' پال نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے ارتکاز میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ اس کا ہاتھ جیب میں گیا اور اسکاٹ کا ندھے کے بل کسی بُل کے مانند اس کی پسلیوں سے ٹکرایا۔

☆☆☆

بارش کی بوچھار کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا رہی تھی۔ تاہم دھندلے منظر کو سمجھنا دشوار نہیں تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے گیراج کے سامنے کا خوفناک منظر دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوگیا...... لیکن یہی ہو رہا تھا۔ وہ پال ہی تھا۔ پال اور اسکاٹ بارش میں سڑک پر گتھم گتھا تھے۔ وزنی بائیک گرنے کی آواز پر میں کھڑکی میں آئی تھی۔ میں کتنی احمق تھی جو سیل فون پر اسکاٹ سے کئی بار باتیں کرتی رہی تھی۔ خوف کے ساتھ جرم کا کوبرا تصور میں سر اٹھا رہا تھا۔ لیکن اسکاٹ کو بستر میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ پہلے مجھے پوری طرح تصدیق کرلینی چاہیے تھی...... سڑک کا دہشت ناک منظر نگاہوں کی رسائی سے باہر ہوگیا۔ میں یہ جھگڑا کیسے روکوں؟ میں پال کا سامنا کیسے کروں گی؟ اچانک دونوں پھر کھڑکی میں نظر آئے اور ایک زمین بوس ہوگیا۔ گرنے والا کون تھا؟ وہ ساکت نہیں تھا۔ آسمانی بجلی کی روشنی میں، میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اسکاٹ تھا۔ پال اس کے سر پر کھڑا تھا۔ پال کے ہاتھ میں شاید ڈنڈا تھا۔ وہ جنونی انداز میں اسکاٹ کو کوٹ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسکاٹ ساکت ہوگیا۔ میں پسینے میں شرابور تھی۔

اُف یہ کیا ہوگیا۔ بددیانتی کا یہ انجام۔ میرا بدن لرز رہا تھا۔ میں نیچے بیٹھ گئی۔ وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ پال پر دیوانگی طاری تھی۔ کیا وہ میرے پیچھے آئے گا۔ میں 911 کو بھی فون نہیں کرسکتی۔ ہزاروں سوالات خدشات اور امکانات حشرات الارض کے مانند دماغ میں رینگ رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ پال کی ٹویوٹا کیمری ڈکاٹی بائیک کے قریب کھڑی تھی۔ میرا دل گویا سینے سے باہر دھڑک رہا تھا۔ پال نے اسکاٹ کو کیمری کی عقبی نشست پر ڈالا۔ کراہنے کی مدھم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

گک...... کیا وہ زندہ ہے؟ اُف، میرے خدا، میں کیا کروں...... کچھ کرنا پڑے گا...... کچھ...... میں سیڑھیوں کی طرف بھاگی، سیڑھیوں کے اختتام پر مجھے اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ میں واپس اوپر کی طرف دوڑی۔ جلدی جلدی ٹی شرٹ اور جینز چڑھائی۔ باہر سے گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ میں کھڑکی کی طرف بھاگی۔ کیمری کی عقبی روشنیاں تیزی سے غائب ہوگئیں۔ وہ اسے کہاں لے کر گیا ہے؟

☆☆☆

میں کچھ دیر تک دماغ ٹھنڈا کر کے سوچتی رہی۔ آہستہ آہستہ دل کی دھڑکن کم ہونے لگی۔ اسکاٹ زندہ ہے۔ پال قتل جیسا گھناؤنا جرم نہیں کرسکتا...... نہ اسکاٹ اتنا کمزور ہے کہ دو ڈنڈوں سے پٹ کر ختم ہوجائے۔ منطقی طور پر پال اسے کسی اسپتال میں لے گیا ہوگا۔ نتیجہ اخذ کرنے میں، میں نے تین چار منٹ لیے۔ پال مستقل طور پر جنونی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ اسکاٹ کے گرتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔

میں نے باہر کا رخ کیا، ٹیکسی منگوائی اور گھر کی طرف چل پڑی۔ چالیس منٹ بعد میں گھر کے اندر تھی۔ خاموش اور خالی گھر۔ پال کہاں ہے؟ لارنس اسپتال، اسکاٹ کی [illegible] گاڑی سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ ایک [illegible] ہو رہا تھا۔ کیا پال گرفتار ہو گیا ہے۔ میں نے ایئررنگ [illegible] چیک کی۔ کھڑکی سے باہر سڑک دیکھتی رہی۔ پھر پال کو کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن الفاظ نہیں تھے...... کیا کہوں گی اس کو؟ فیصلے کی گھڑی تھی۔ میں نے خود کو حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا، میں نے گن اٹھا کے ہینڈ بیگ میں رکھی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

لارنس اسپتال کے فرنٹ پر چمکتی ایمبولینس کھڑی تھی۔ تھینک گاڈ۔ میں نے اپنی منی کوپر اس کے ساتھ لگا دی۔ تشدد شدہ آدمی کہاں ہے؟'' میں نے اندر نرسنگ اسٹیشن پر سوال کیا۔

''تشدد؟'' نرس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ایمرجنسی میں کوئی آیا ہے؟'' میں نے سوال بدلا اور پُرسکون ماحول کا جائزہ لیا۔

''نہیں کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔'' نرس نے جواب دیا۔

میں سوالات کے جواب تلاش کرتی واپس ہوئی۔

پال اسے کہاں لے گیا ہے؟ دوسرا قریبی اسپتال لیڈی مری میڈیکل اسپتال تھا...... جنوب میں برونکس ریور پارک وے۔ وہاں کچھ سرگرمی نظر آئی۔ ایمرجنسی میں تین مریض تھے۔ ایک عورت، ایک لڑکا اور ایک سفید فام اجنبی مرد۔ برونکس یونیفارم میں دو کوپس بھی بیٹھے تھے۔

''لیڈی کیا مسئلہ ہے؟'' ایک نے سوال کیا۔ میں نے جھوٹ کی تیاری کی اور اسی وقت اس کے ریڈیو سے دو مرتبہ بیپ کی آواز آئی۔ اس نے مجھے نظرانداز کر کے ریڈیو آن کیا۔ میں پلٹ چکی تھی کہ چند الفاظ نے میرے قدم پکڑ لیے۔ کسی آدمی کی باڈی دریافت ہوئی تھی۔ مکمل پتا میں نہ سن سکی۔ تاہم سینٹ جیمز پارک، فورڈہم روڈ اور جیروم ایونیو کافی تھے...... میں نکل گئی۔ میرا ذہن چیخ رہا تھا کہ یہ ناممکن ہے...... کوئی اور معاملہ ہے۔ کچھ دیر بعد میں فورڈہم روڈ پر تھی۔ میں نگاہیں دوڑاتی ہوئی گزرتی گئی۔ رفتار تیز تھی۔ جیروم روڈ پر میں نے اسٹیئرنگ کاٹا اور میرے دونوں پیر بریک پر چلے گئے۔

☆☆☆

نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کی پولیس کارز اتنی تعداد میں ایک مقام پر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کارز کی نیلی، سرخ اور زرد روشنیاں تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ کرائم سین ٹیپ نے بڑے حصے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ کوئی ڈاکٹر کسی اسپتال میں اسکاٹ کی مرہم پٹی کر رہا ہوگا، کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''پال نے اسے واپس گھر چھوڑ دیا ہوگا...... یہاں سے نکل جاؤ ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گی۔ بڑی مشکل میں۔'' لیکن میں تسلی کیے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔ میں جگہ بناتی ہوئی منی کوپر میں آگے بڑھتی رہی۔

نقرئی بالوں والا کوپ، ٹریفک قابو کر رہا تھا۔ میری پیش قدمی نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ منی کوپر اس کے سر پر تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور سفید بالوں والے کے ہاتھ ہتھکڑیوں کی طرف گئے۔ میں نے اترتے ہی ہینڈ بیگ کھولا۔ کوپ کا ارادہ بدلا، اس نے ہتھکڑیوں کے بجائے اپنے گلوک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ بیگ سے باہر آیا تو اس میں سنہری رنگت کا بیج تھا۔ بیج مجھے اس وقت دیا گیا تھا جب NYPD نے مجھے ڈیٹکٹیو کے عہدے پر ترقی دی تھی...... وردی پوش کوپ نے حیرت سے مجھے اور بیج کو دیکھا اور زرد ٹیپ کو کچھ بلند کر دیا۔ میں ٹیپ کے نیچے سے گزر کے کرائم سین کی طرف بڑھی۔

''میرے علم میں نہیں تھا کہ تم بھی کیس پر ہو؟'' عقب سے وردی پوش کی آواز آئی۔

☆☆☆

پولیس سروس میں مجھے سات سال ہو گئے تھے۔ برونکس ہومی سائڈ ٹاسک فورس میں ڈیڑھ برس قبل بطور اے گریڈ ڈیٹکٹیو میری ترقی ہوئی تھی۔ اسکاٹ، برونکس نارکوٹکس میں اسی عہدے پر تیسرے گریڈ میں تھا...... کیا کہوں؟ آفس آئیٹرز NYPD میں بھی ہوتے تھے لیکن ایک ہفتہ قبل میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ میں بھی...... میں چلتی رہی...... میں نے بہت کرائم سین دیکھے تھے۔ لیکن یہاں کچھ اور ہی معاملہ تھا۔ پولیس کی اتنی بڑی تعداد...... اتنی سرگرمی، آخر کیا قیامت آ گئی۔ فلڈ لائٹس نے دن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ نیلی ترپال کے نیچے کیا تھا؟ میں رک گئی۔ کسی کا ہاتھ میرے شانے پر آیا، میں گویا اچھل پڑی۔

''لورین تم...... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ڈیٹکٹیو مائیک کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ مائیک ایک برس سے میرا پارٹنر تھا۔ اپنی جسامت کے باعث اکثر افراد اسے ''راک'' سے تشبیہ دیتے تھے۔

''ہماری سروس ہی ایسی ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

مائیک نے میرے لیے ربر کے دستانوں کا بندوبست کیا۔ میں نے دستانے چڑھائے اور دو قدم لے کر ترپال کے قریب بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے وہاں لاش تھی...... کس کی؟ ڈرگ ڈیلر، کوئی مجرم یا عام آدمی...... منظرنامہ کہہ رہا تھا کہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ میں نے سانس روک کے ترپال کو تھوڑا سا ہٹایا۔ حقیقتاً میری سانس رک گئی۔ شاید دھڑکن بھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر تن گئی۔ کب ہوش آیا، شاید ایک یا دو منٹ...... اسکاٹ کی بے جان آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

''اسکاٹ تھائر، برونکس نارکوٹکس۔'' مائیک کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آئی۔ ''لورین وہ ہم میں سے تھا۔ بہت برا ہوا۔ ہمارا آدمی مارا گیا ہے۔''

میں نے ہاتھوں سے آنکھوں کے گوشے خشک کیے۔

''اسکاٹ کو تشدد کا نشانہ بنا کے گولی ماری گئی ہے۔'' مائیک کی آواز آئی، گویا مریخ سے یا پلوٹو سے۔

''گولی ماری ہے؟'' میرے ذہن میں سوال اٹھا۔

''گولی بائیں جبڑے کے نیچے سے اندر داخل ہوئی ہے۔'' مائیک کی آواز میں اداسی کی آمیزش تھی۔ میں نے جھرجھری لے کر سر ہلایا۔

''اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اس کے مخنے کے اوپر ہولسٹر سے گن غایب ہے۔ فی الحال یقین نہیں ہے کہ سروس گن استعمال کی گئی تھی۔''

میں نے اٹھ کے گاڑی سے ٹیک لگا لی۔ کیسے؟ کیوں؟ کیوں؟ وہ زندہ تھا، جب پال اسے گاڑی میں ڈال رہا تھا۔ میں نے بمشکل آنسو پیے۔ مجھے احساس ہوا کہ اسکاٹ کے اوپر تر پال نہیں، کمبل تھا۔ مجھے ٹھیک یاد تھا۔ نیلا کمبل میں نے ہی خریدا تھا...... شادی کا پہلا سال تھا۔ پکنک پر جاتے ہوئے میں نے وہ کمبل خریدا تھا۔ مائیک مجھے تسلی دے رہا تھا۔ میرے احساسِ جرم کو وہ غم سمجھ رہا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ سب کچھ اگل دو۔ زبان اکڑ گئی تھی۔ حلق خشک تھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ نئی خواہش نے جنم لیا کہ پال اور خود کو بچاؤ۔ نہیں معلوم میں نے ایسا کیوں سوچا؟ خوف کے باعث یا جبلی تحریک تھی۔

کوئی میرے سامنے تھا۔ میں نے سر اٹھایا۔ معصوم چہرے والا ہمارا باس ڈیرک میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا آدھا سر بالوں سے محروم تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم اطلاع ملتے ہی پہنچ گئی ہو، ورنہ مجھے ایک کال اور کرنا پڑتی۔ میں چاہوں گا کہ تم اور مائیک مل کر ابتدائی تفتیش کرو۔'' ڈیرک نے کہا۔ میرے اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ بجھے واقعات برق رفتاری سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ اب باس مجھے تفتیش کے لیے نامزد کر رہا تھا۔

''رپورٹ تو میں گھڑے گھڑے دے دوں گی، سر۔'' یہ میرا خیال تھا، زبان سے میں نے کچھ اور کہا۔ ''یس سر۔'' حقیقتاً میں انکار کرنا چاہتی تھی۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ پیٹ میں انتڑیاں آپس میں الجھ گئی تھیں۔

''تم دونوں اسکاٹ سے واقف ہو؟'' باس، مائیک کی طرف متوجہ ہوا۔ مائیک نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لورین اسٹل ول، تم؟''

''نام سنا ہے۔'' ربر گلوز اتارتے ہوئے میں نے جھوٹ بولا۔ پہلا جھوٹ۔ مجھے احساس تھا کہ آگے بہت سے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ مائیک میری جانب سے مطمئن تھا۔ ہومی سائڈ میں میری کامیابی کی شرح متاثر کن حد تک بلند تھی۔ مائیک مجھے ''لیڈی لائر کوپ'' کہتا تھا۔ میں اپنی قانونی تربیت کو منظم اور کتابی انداز میں ٹاسک فورس میں استعمال کرتی تھی۔

☆☆☆

ہم ڈیرک کے آفس میں تھے۔

''جلد کمشنر کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ''مجھے ابتدائی معلومات درکار ہیں۔ کیا اندازہ لگایا ہے؟''

''بُرا تشدد کرنے کے بعد گولی ماری گئی ہے۔ میڈیکل رپورٹ کا انتظار ہے۔'' مائیک نے جواب دیا۔

''کیلیبر؟''

''غالباً اعشاریہ تین، آٹھ۔'' مائیک نے شانے اچکائے۔

''سروس ویپن اور بیج؟''

''دونوں نہیں ہیں...... کسی نے ہلاک کر کے باڈی وہاں ڈال دی۔''

''لورین تمہارا ابھی یہی خیال ہے؟''

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔''

''کیوں کہتے ہو کہ باڈی وہاں ڈمپ کی گئی تھی؟ مطلب قتل کہیں اور ہوا؟''

''ایسا ہی ہے۔'' مائیک نے کہا۔ ''کیونکہ وہاں خون بہت کم ہے اور لباس پر گھاس، کیچڑ کی علامات ہیں...... جبکہ وہاں دور دور تک گھاس وغیرہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھرتی دکھاؤ اسکاٹ کا آفس چیک کرو۔ دیکھو اس کی کرنٹ سرگرمیاں کون سی تھیں۔ ڈرگ انفورسمنٹ ٹاسک فورس کے تمام ممبرز کے ساتھ بات کرو۔''

ڈیرک نے ہدایات جاری کیں۔

☆☆☆

میں پہلی بار بدحواسی سے باہر آ کے ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہی تھی۔ یہ احساس خوفناک تھا کہ میں نے اب تک یہ نہیں سوچا کہ پال کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کی خیریت مشکوک تھی...... میں نے سیل فون پر اس کا نمبر ملایا۔ جواب وائس میل کی شکل میں آیا اور میرے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''لعنت ہے، میں بھول ہی گئی۔'' میں نے مائیک کی طرف دیکھا۔

''مجھے آدھا گھنٹا دو۔ میں اوون میں کچھ بھول آئی ہوں۔''

''وہاٹ؟ ہمارا سب سے بڑا کیس ہے اور تم...... خیر کیا ہے اوون میں؟''

''براؤنیز۔''

''او کے، جاؤ...... ویسے بھی میڈیکل رپورٹ کا انتظار ہے۔ اگر کسی نے دریافت کیا تو کہہ دوں گا کہ تم اسکاٹ کے آفس گئی ہو۔ اگر ڈیرک سے مڈبھیڑ ہو گئی تو کچھ نہ کچھ کہنا پڑے گا۔''

pklibrary.com

میں شکریہ ادا کر کے روانہ ہوگئی۔ گھر تک پہنچنے میں دس منٹ خرچ ہوئے۔ ڈرائیوے میں پال کی کار موجود تھی۔ خوابگاہ کی کھڑکی روشن تھی۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ کم ازکم وہ گھر پر تھا۔ معاً مجھے نیا خیال سوجھا۔ کار کی روشنیاں بند کر کے میں نے اسے فاصلے پر چھوڑ دیا۔ مجھے اپنے ہی گھر میں چوروں کے مانند گھسنا پڑے گا۔ میری نظر کھڑکی پر تھی۔ بیگ سے چابی نکال کر میں وکٹ گیٹ کی طرف بڑھی۔ کیمری کے ڈورز لاک تھے۔ میں نے پن ٹارچ نکالی۔ میری قوت شامہ نے پائن کلینرز اور بلیچ کی بُو محسوس کی۔ کسی نے صفائی کا کام کیا تھا۔ یہ میرا گھر تھا۔ ہر چیز کی دوسری چابی میرے پاس بھی تھی۔ نہ ہوتی تب بھی میں کیمری کا لاک کھول سکتی تھی۔ عقبی نشست کے نیچے اور پسنجر سائڈ کے پیچھے فلور میٹ کے نیچے خون کے چند قطروں کی علامات موجود تھیں۔ صفائی کرنے والے نے ستھرا کام نہیں کیا تھا۔ تین منٹ کے اندر میں نے ڈرائیور کے ہیڈ ریسٹ کے نیچے گولی کا سوراخ دریافت کرلیا۔ گولی آر پار نہیں گئی تھی۔ میں نے لیدر مین ٹول کی مدد سے گولی نکالی اور بیگ میں محفوظ کرلی۔ آنکھیں بند کر کے میں نے یکسوئی کے ساتھ تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ پال ڈرائیونگ کررہا تھا۔ عقبی نشست پر اسکاٹ زخمی حالت میں موجود ہے۔ وہ اس جان کے خطرے میں [illegible] ہے اور [illegible] سے گن نکال کر فائر کرتا ہے۔ پال بچ گیا...... وجہ اسکاٹ کی حالت تھی۔ گولی ترچھے زاویے سے اندر گھسی اور ایک حد تک جانے رک گئی۔ یقیناً اسکاٹ نے لیٹے لیٹے فائر کیا تھا۔ پال نے گاڑی روکی اور گن حاصل کرنے کے لیے دھینگا مشتی شروع ہوگئی دوبارہ فائر ہوا اور گولی اسکاٹ کے جبڑے کے نیچے سے اندر گئی...... اس کے بعد پال بدحواس ہوگیا۔ ایک پولیس مین ہلاک ہوا تھا۔ ذاتی دفاع کی تھیوری کسی کام نہ آتی۔ لہٰذا اس نے دوسرا منصوبہ بنایا۔ پولیس پر کون فائر کرسکتا ہے۔ زیادہ تر ڈرگ ڈیلرز! لہٰذا پال نے برونکس کا رخ کیا اور ایک معروف ڈرگ ایریا کے نزدیک اسکاٹ کو چھوڑ کے واپس آیا اور اپنی استعداد کے مطابق کار کی صفائی کی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک غلط فیصلے یا اندازے نے تین زندگیاں تباہ کردی تھیں۔ تین میں سے دو زندہ تھے۔ حقائق نہایت بدرنگ تصویر بنا رہے تھے۔ سب کچھ میری آئندہ کی حرکات پر منحصر تھا۔

میں عام عورت نہیں تھی۔ میں نے بہ آسانی گارڈن ٹول شیڈ سے اسکاٹ کی گن اور بیج تلاش کرلیا۔ میں نے خوب اچھی طرح گیراج کا جائزہ لیا اور چھوٹی موٹی نشانیاں تلف کر دیں۔ اعشاریہ تین، آٹھ چھوٹی نال کا ریوالور تھا...... دو گولیاں غائب تھیں۔ سیڑھی اٹھا کے میں نے بلند روشن دان کے نیچے رکھی...... گن اور بیج روشن دان میں رکھ دیا۔ وقت کم تھا۔ میں نے سوچا، بعد میں دونوں اشیا وہاں سے ہٹالوں گی۔ بعد ازاں میں نے شیڈ کا بھی جائزہ لیا اور اسے لاک کر کے براستہ ڈرائیوے، فرنٹ ڈور کی طرف قدم بڑھائے۔ اسی وقت سیل فون نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ میں نے آئی ڈی چیک کی۔ پال کال کررہا تھا۔

وہ کیا چاہتا ہے؟ کیا مجھے کال وصول کرنی چاہیے؟ کیا اس نے مجھے دیکھ لیا ہے؟ میں نے وائس میل کے ذریعے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد اس کا جواب آیا۔ ''ہائے، لورین۔ میں گھر پر ہوں۔ مجھے جانا تھا لیکن فلائٹ مس ہوگئی۔ بعد میں وضاحت کروں گا۔ تمہاری کار موجود نہیں ہے۔ کیا تم ڈیوٹی پر ہو؟ موقع ملتے ہی مجھے فون کرنا۔ میں تمہاری طرف سے پریشان ہوں۔''

''میری طرف سے پریشانی...... کیوں؟'' میں نے [illegible] ''میں نے کسی کو بلاک نہیں کیا [illegible] میں نے فون بند کر [illegible] کم ازکم وہ جسمانی طور پر ٹھیک تھا۔ ذہنی کیفیت کیا [illegible] کے بعد [illegible] میں نے [illegible] وقت کم تھا۔ اس وقت اندر جانا مناسب نہیں تھا۔ فیصلہ کرنے سے پہلے ہی سیل فون دوبارہ بول اٹھا۔

''مائیک؟'' میں گیراج کے سائے میں چلی گئی۔

''وقت ختم ہورہا ہے۔ باس حرکت میں ہے۔ میں زیادہ بہانے بازی نہیں کرسکتا۔ جلد واپس آؤ۔''

''میں پہنچ رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

میں نے منی کو پر گرانڈ کون کورس پر چھوڑی اور جیروم کی جانب کمانڈ سینٹر کی طرف چل پڑی۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا...... اس تباہ کن صورت حال سے نکلنے کے راستے تلاش کررہا تھا۔ وہاں میں نے نیوز چینلز کی چھ گاڑیاں دیکھیں، گریٹ۔

''کسی نے میری غیر موجودگی محسوس کی؟'' میں نے مائیک سے سوال کیا۔

''کمشنر تمہارے پہنچنے سے دس منٹ قبل آن ٹپکا تھا اور برہم تھا۔'' مائیک نے جواب دیا۔ ''تاہم میں نے یہ کہہ کر اسے ٹھنڈا کردیا کہ وہ ہمیں اپنا کام کرنے دے۔ یہ باتی
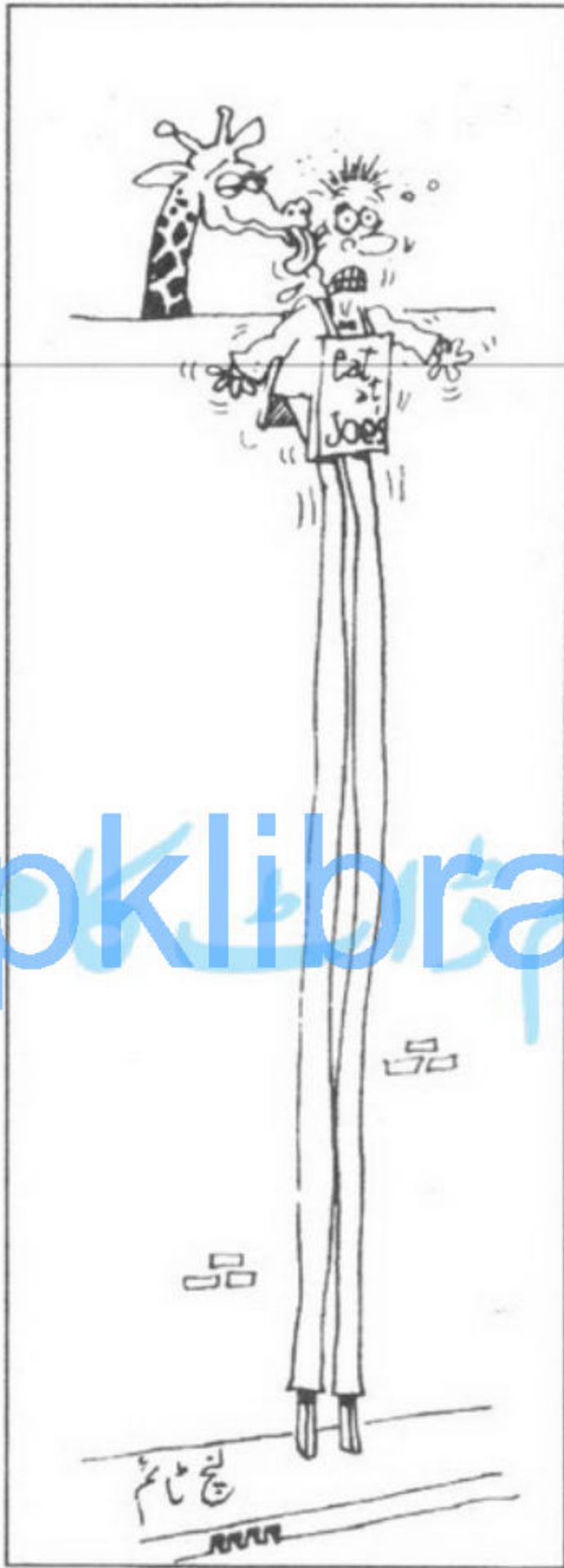
pklibrary.com

پروفائل کیس ہے۔ پولیس راتوں رات کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتی۔''

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے ستائش کی۔ وہ بے خبر تھا کہ میری ستائش کا کیا مطلب ہے، میں نے پرانی طرز کی عمارات پر نظر ڈالی جہاں منشیات کا دھندا چلتا تھا۔ اطراف میں موجود افراد کو دیکھا۔ پولیس کی موجودگی کا مطلب تھا کہ دھندا فی الحال رکے گا نہیں تو اس کا حجم کم ہو جائے گا۔

''سارجنٹ، کیا اچھی خبر ہے؟'' مائیک نے پولیس وین کے قریب ایک فربہ کوپ سے دریافت کیا۔ اس نے سر اٹھایا۔ تاثرات میں مایوسی تھی۔ گڈ، میں نے سوچا۔ مایوسی اچھی ہے۔ مطلب کوئی کلیو نہیں ملا۔

''ایک اسّی سالہ افریقن امریکن عورت ہے، ایملی۔'' سارجنٹ نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ''ایملی کا کہنا ہے کہ اس نے ایک کار دیکھی تھی اور ایک آدمی...... جو کار میں سے کچھ نکال رہا تھا۔''

ایملی، برونکس ہائی اسکول سے ریٹائرڈ ہوئی تھی۔ وہ وہاں سائنس پڑھاتی تھی۔ مائیک نے اسے بتایا کہ ایک پولیس مین کا مرڈر ہوا ہے اور مدد کی درخواست کی جیسے لیے یہ بوڑھی گواہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ مائیک نے اس سے کار کے بارے میں سوال کیا۔ جواب میں ایملی نے 'ٹویوٹا' کہا اور میں نے اپنا غصہ دبایا۔ بڑھیا نے کیمری کی نشاندہی بھی کر دی۔ ٹویوٹا کیمری۔

''وہ آدمی کالا تھا، سفید فام یا ہسپانک؟''

ایملی اچانک اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ اسے معلومات فراہم کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ ''وہ سفید فام تھا۔ قد چھ فٹ سے کچھ کم ہوگا۔ لباس گہرے رنگ کا تھا۔ چہرے پر سیاہ چشمہ تھا۔''

میں بڑھیا کے مشاہدے پر حیران پریشان تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھی۔

''پہلے میں سمجھی کہ گلیوں میں چکرانے والے لڑکوں سے کوئی ڈرگ خریدنے آیا ہے۔'' ایملی نے کہا۔ ''لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے نیلی چادر میں لپٹی کوئی بڑی سی چیز نکال کر ایک طرف ڈالی اور ٹویوٹا میں بیٹھ کر چلا گیا۔''

میں نے کن انکھیوں سے مائیک کی طرف دیکھا۔ وہ غیر متوقع معلومات پر حیران تھا جبکہ میرا حلق کڑوا ہو گیا تھا۔ میں دادی کی عمر والی ایملی کی غیر معمولی یادداشت کو کوس رہی

تھی۔ جب کہیں سے کوئی اشارہ، کوئی گواہ نہیں ملا تو ایملی خلائی مخلوق کے مانند ظاہر ہو گئی تھی۔

''کیا تم نے پلیٹ نمبر دیکھا تھا؟'' مائیک نے پُرامید انداز میں سوال کیا۔

''نہیں، گاڈ پلیز...... نہیں دیکھا تھا۔'' میرا ذہن چیخ اٹھا۔

''نہیں۔'' ایملی نے جواب دیا اور میں نے آہستہ سے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

''تم نے پولیس کو کال کیوں نہیں کی؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔

''اس علاقے میں لوگ ایک دوسرے کے معاملات سے دور رہتے ہیں اور پولیس سے بھی۔''

''پھر دستک دینے پر تم نے پولیس کو کیوں بتایا؟'' مائیک نے سوال کیا۔

''انہوں نے سوال کیا تھا اور میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

''اگر ہم تصاویر دکھائیں تو تم اس آدمی کو پہچان لو گی؟'' میں نے کہا۔

''کیوں نہیں۔''

'بہت خوب، تمہیں ریٹائر نہیں ہونا چاہیے تھا۔' میں نے دل میں کہا اور اپنا کارڈ اسے پکڑا دیا۔ ''ہم رابطے میں رہیں گے۔''

☆☆☆

مائیک خوشگوار انداز میں [illegible] بونوٹس پڑھتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ یقیناً وہ پیش رفت سے مطمئن تھا اور خود کو قاتل کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ بطور ڈیٹیکٹیو میں اس کے احساسات سمجھ سکتی تھی جبکہ مقتول بھی پولیس فورس کا حصہ تھا۔ المیہ یہ تھا کہ میرے محسوسات مختلف تھے۔ مائیک اور دیگر کوپس سے جھوٹ بولنا میرے لیے دہشت ناک عمل تھا۔ وہ سب آنسو بہائے بنا رو رہے تھے۔ میں سچ بول کر ان کی اذیت کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میرا سر جھکا تھا، منہ بند تھا۔

ایک جانب سیاہ رنگ کی میڈیکل ایگزامنر کی اسٹیشن ویگن تھی اور میڈیکل ٹیم باڈی کے قریب مصروف کار تھی۔ کچھ دیر بعد اسکاٹ کے بے جان جسم کو ویگن میں منتقل کر دیا گیا۔ میری آنکھوں کے آنسو خشک تھے۔ معاً ایک نرم گداز بازو میرے گرد لپٹ گیا۔

''اوہ لورین۔'' بونی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''کتنا بھیانک ہے...... ناقابلِ یقین۔'' بونی کرائم سین یونٹ میں سارجنٹ تھی۔ میں نے مائیک کا تعارف کرایا۔

''میں اطلاع ملتے ہی روانہ ہو گئی تھی۔'' بونی نے کہا اور گلے میں لٹکتا ہوا فریزر بیگ ہاتھ میں لیا۔ گلے میں دو کیمرے بھی لٹک رہے تھے۔

''لورین تم ٹھیک ہو؟'' بونی نے کہا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میرے تاثرات کیا کہہ رہے ہیں۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں تم ٹھیک نہیں ہو۔ میں شروع سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ ہمارا پہلا کیس ہے جس میں ہماری برادری کا آدمی مارا گیا ہے۔ تم اب تک اس صدمے سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرے نزدیک یہ فطری امر ہے۔'' مائیک نے افسردگی سے کہا۔ حالات کی ستم ظریفی پر میں دل مسوس کے رہ گئی۔ دل نے پھر کہا کہ سب اُگل دو...... لیکن میں کچھ نہ کہہ سکی۔ میرے آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی۔ اس گمبھیرتا سے مجھے کوئی نہیں نکال سکتا تھا۔

''لورین قاتل کی غلطیاں سامنے آ رہی ہیں، اس نے صفائی سے کام نہیں کیا۔ ہم ایک اناڑی کے پیچھے ہیں اور تیزی سے قریب تر ہو رہے ہیں...... سام ایڈیمز کے مطابق ایک دو دن میں ہم اسے دبوچ لیں گے۔ اب تم مسکرا دو۔''

''او کے، مائیک۔''

☆☆☆

کمانڈ سینٹر جس کا منظر پیغا گون یا ٹی وی شو 24 کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہر کوپ کے پاس لیپ ٹاپ تھا۔ سیل فون [illegible] اسکرین کے ذریعے علاقے کا نقشہ نمایاں تھا۔ میری دھڑکنیں بار بار بے قابو ہو رہی تھیں۔ باس [illegible] میرا تعارف [illegible] کے معروف پولیس [illegible] رونا لنڈر ہم سے کرا رہا تھا۔

''تمہاری چند رپورٹس میرے پاس آئی ہیں۔ تم اچھا کام کر رہی ہو۔'' باس نے تعریف کی۔ مائی گاڈ، مجھے چکر سا آیا۔

''تھینک یو سر۔'' میں نے کہا۔

''اور کوئی نئی بات؟''

میں نے ایملی کی باتیں دہرائیں۔ پال کی کار کے بارے میں بتایا۔ گویا اپنی بربادی کا نقشہ کھینچ دیا۔ ڈیرک متاثر دکھائی دیا۔ ''اسکاٹ کی اوپن فائلز دیکھ لیں؟''

''اگلا قدم یہی دیکھنا ہے کہ وہ کن کیسز پر کام کر رہا تھا۔''

''ویری گڈ، میں یاد کرانا چاہتا ہوں کہ اسکاٹ کی فیملی کو خبر کر دو۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ میرے دانت آپس میں کٹکٹا کیوں نہیں اٹھے۔ میں بھول گئی تھی۔ انہیں خبر پہنچانا میری ذمے داری تھی۔ اسکاٹ نے ذکر کیا تھا اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے بارے میں۔ مجھے ان کو اطلاع دینی پڑے گی۔

اُف...... اس سے بہتر تھا کہ میں اپنا ہاتھ لکڑی کاٹنے والی مشین میں دے دوں لیکن اس کی فیملی......

''یس سر۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری جاب کا یہ تکلیف دہ حصہ ہے لیکن بہتر ہو گا کہ کہیں اور سے اطلاع جانے کے بجائے...... آفس کی طرف سے جائے۔'' کمشنر ڈرہم نے کہا۔ ''میں ان کا شاک کم کرنے کے لیے بعد میں جاؤں گا...... مشکل ترین مرحلہ اسکاٹ کی بیوی اور اس کے تین بچوں کا سامنا رہے گا۔''

اسکاٹ شادی شدہ تھا۔ یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اسکاٹ نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا۔

''یہ ایک ٹریجڈی ہے۔'' کمشنر نے پھر کہا۔ ''اس کے بچے بہت چھوٹے ہیں۔''

ایڈریس مجھے ڈیرک نے مہیا کیا اور میں روانہ ہو گئی۔ سینے میں دھواں بھرا تھا۔ دماغ ماؤف تھا۔ کمانڈ سینٹر چھوڑنے کے بعد بیس منٹ میں ہم اسکاٹ کے گھر پر تھے۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ ہم دونوں گاڑی سے اترے۔

''لورین تیار ہو؟'' مائیک نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''حوصلہ رکھو۔'' مائیک نے کہا۔

میں نے دروازے پر موجود بیل کے کندے کی مدد سے دستک دی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ ایک حسین عورت میرے سامنے تھی۔ اس کی عمر تیس سال سے کم تھی۔ میرے پاس بے وفائی کی وجہ تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی حسین عورت کی موجودگی میں اسکاٹ نے چیٹنگ کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ ''یس؟'' مسز اسکاٹ کی آنکھوں میں پریشانی تھی۔ میں نے حلق تر کرنے کی کوشش کی اور بیج نکال کے اپنا تعارف کرایا۔

''اوہ میرے خدا۔'' بروک (مسز اسکاٹ) معاً پوری طرح بیدار ہو گئی۔ ''کیا ہوا؟ اسکاٹی کو کیا ہوا؟ کیا وہ زخمی ہے؟ بتاؤ کیا وہ زخمی ہے؟''

ڈیتھ نوٹس ڈلیور کرنے کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ بعض بلاتمہید، براہِ راست بتا دیتے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک یہ کھردری ایمانداری ہے۔ دوسرے آہستہ آہستہ بتاتے ہیں...... حادثہ...... زخم...... فائٹ اور ڈیتھ۔ آج پہلی مرتبہ مجھے سیدھی ایمانداری دکھانی تھی۔

''اسے گولی ماری گئی ہے، بروک۔ آئی ایم سوری۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جو یک لخت مردہ ہو گئی تھیں۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں خوف زدہ تھی۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور گھٹنوں کے بل گری۔ ''نہیں۔'' وہ چلائی۔ میں گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی۔ میرا ہاتھ اس کی پشت پر تھا۔ جھوٹی تسلی...... جھوٹا ہاتھ...... منافقت۔

''نہیں...... ں...... نہیں...... ں...... نہیں......'' بروک چیخی۔

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''تم نہیں جانتیں۔'' وہ چلائی اور مجھ پر حملہ کیا۔ میں پیچھے ہٹی۔ اس کے ناخن نے میرے چہرے پر ایک خراش ڈال دی۔ بروک زمین بوس ہو گئی۔ مائیک نے اسے اٹھا کے کاؤچ پر لٹا دیا۔ میں نے فرنٹ ڈور بند کر دیا۔ اسی وقت میری نظر سیڑھیوں کے اوپر گئی۔ چھوٹی سی خوب صورت لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ ''ہنی تم سو جاؤ۔ تمہاری مام ٹھیک ہو جائیں گی۔ میرا نام لورین ہے۔'' میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ تب وہ بری طرح چلائی۔ مجھے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے۔ بروک اٹھ کے بھاگی۔ میرے پاس سے گزر کے وہ اوپر گئی۔ لڑکی کے حلق سے برآمد ہونے والا سائرن معدوم ہو گیا۔ وہ ماں کی بانہوں میں سمٹ گئی۔

تصور میں بیگ میں موجود گن میرے ہاتھ میں تھی۔ بس کنپٹی پر رکھ کے گولی چلانی تھی۔ لیکن میں بے بس تھی، کمزور تھی۔ کچھ نہ کر سکی۔ اس کے بجائے میں خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک ہفتہ قبل میں ٹھیک تھی۔ پال نے مجھے غلط راستے پر ڈالا تھا۔

☆☆☆

تینوں بچے کم عمر تھے۔ دو سال، چار سال، تیسرا نومولود تھا۔ بروک بمشکل ستائیس برس کی ہو گی۔ مائیک نے نمبر معلوم کر کے اس کی ماں کو فون کر دیا تھا۔ بروک نے ہسٹریائی کیفیت سے باہر آنا شروع کیا۔ اسے احساس تھا کہ بچوں کی خاطر اسے حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ تاہم یہ اتنا سہل نہیں تھا۔ پوری طرح سنبھلنے میں اسے وقت درکار تھا۔ مجھے بذاتِ خود ایک نہایت پیچیدہ صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اگر بات کھل جاتی تو پال کو مرنا تھا اور میں ذلت کے ہاتھوں ماری جاتی۔ لیکن میں خود ایک کوپ ہونے کی وجہ سے بروک کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط تھی۔ متحرک تھی اور حل بھی تلاش کر رہی تھی۔ حل تلاش کرنا تھا۔ کیونکہ میں نے جھوٹ بول کے راستہ منتخب کر لیا تھا۔

جب بروک نے اپنے رویّے پر معذرت کی تو میں پانی پانی ہو گئی۔ اس کی نظر میرے چہرے کی خراش پر تھی۔ ''پلیز بروک، تمہیں معذرت کی نہیں، مدد کی ضرورت

pklibrary.com

ہے۔'' میں نے نوٹ بک کھولی۔

''عام طور پر..... ایسے مواقع پر پولیس متاثرین کے احساسات کے تحفظ کی فکر کرتی ہے۔ تم نے براہِ راست ایمانداری سے بتا دیا۔ مجھے حقائق کی ضرورت ہے۔'' بروک نے کہا۔ ''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، کیا ہوا تھا؟''

''اس وقت ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں اس کی باڈی، برونکس کے سینٹ جیمس پارک میں ملی تھی۔ وہ علاقہ ڈرگ ایریا کے طور پر معروف ہے۔''

میری سمجھ نہیں آیا آگے کیا کہوں۔ خاموشی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی......

''تم نے آخری بار اسکاٹ کو کب دیکھا تھا؟'' میں نے سراغ رسانی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''وہ رات میں چند گھنٹے کے لیے آٹھ بجے روانہ ہوا تھا۔''

''کوئی کال آئی تھی؟ کیا اُس نے بتایا تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟''

''نہیں، کیا تم اس کے یونٹ میں ہو؟''

''نہیں، میرا تعلق برونکس ہومی سائڈ سے ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم اسے جانتی تھیں؟'' بروک نے عام سا سوال کیا تھا لیکن میرے حلق میں کانٹے سے اُگ آئے۔ میں تو اسکاٹ کے ساتھ سوئی تھی۔

''نہیں، ہم نے کبھی ساتھ کام نہیں کیا۔'' میرے منہ سے نکلا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے۔ میں اچانک کھڑی ہو گئی۔

''کیا میں باتھ روم استعمال کر سکتی ہوں؟''

''ہال کے سرے پر دائیں جانب۔'' بروک نے اشارہ کیا۔ باتھ روم تک پہنچتے پہنچتے میرے حلق میں تھی...... اندر پہنچتے ہی میں نے دونوں نلکے پورے کھول دیے۔ نلکوں کی تیز دھار کے شور میں میرے حلق سے نکلنے والی آوازیں دب گئیں۔ صفائی کے لیے میں نے ٹوائلٹ پیپر کا پورا رول استعمال کیا۔ اسکاٹ کی فیملی سے ملنے کے بعد مجھے خیال آ رہا تھا کہ اسے اتنی اچھی فیملی کے ساتھ بے وفائی کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ کیا یہ خیال میری اپنی خلش مٹانے کے لیے ذہن میں در آیا تھا......؟

واپسی پر بروک کہہ رہی تھی۔ ''اسکاٹی کے قاتل کو مت چھوڑنا۔''

☆☆☆

برونکس کی جانب واپسی پر بروک کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گھنٹیاں بجا رہے تھے۔ اسکاٹ کی ملٹی ایجنسی ڈرگ انفورسمنٹ ٹاسک فورس ہماری منتظر تھی۔ اسکواڈ روم اڑتالیسویں منزل پر تھا۔ ہومی سائڈ یونٹ چوتھی منزل پر...... DETF کا سربراہ ایجنٹ جیف تراہان تھا۔ وہ اسکاٹ کا بیک اَپ بھی تھا۔ سب ہی صدمے اور غصے کا شکار تھے...... میں بھی۔ میرے ساتھ استثنائی صورتِ حال اسکاٹ اور میرے خفیہ تعلقات تھے۔

نارکوٹک ٹیم ایک انڈر کور ایجنٹ کھو چکی تھی۔

''ہم یہاں قاتل تک پہنچنے کے لیے کسی بھی طرح ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔'' تعارف کے بعد کاہنگ نے آغاز کیا۔ ''بتاؤ ہم اسکاٹ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

میں نے نوٹ بک نکال کے ابتدا کی۔ میری تقریر میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔

تراہان نے گہری سانس لی اور بولنا شروع کیا۔ ''اسکاٹ ہمارا پرائمری انڈر کور ایجنٹ تھا۔ ہم ہنٹ پوائنٹ پر چند ڈیلرز کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ''اوڈونز برادرز'' کے نام سے معروف تھے۔ بڑا بھائی ائیر فورس پائلٹ ہے۔ جرمنی میں سپلائی کے لیے اس نے کئی مرتبہ C130 استعمال کیا۔ اس کے ساتھ اسکاٹ نے کئی بار درمیانے درجے کی خریداری کی تھی۔ ایک موقع پر دوسرا بھائی بھی موجود تھا۔ ہم پلان کر رہے تھے کہ اگلی مرتبہ کوارٹر ملین ڈالرز کی ڈیل کی جائے۔ آنے والے ہفتے میں ہم انہیں جکڑنے کے لیے تیار تھے۔''

''حال ہی میں اسکاٹ نے اُن میں کسی سے رابطہ کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تین روز قبل اُس نے ایک کال کی تھی۔'' کاہنگ نے کہا۔ ''لیکن آج رات ایک کال موصول ہونے کا امکان تھا۔''

''کیا وہ تمہیں بتائے بغیر کسی سے ملنے جاتا تھا؟''

''نہیں، لیکن انڈر کور ایجنٹ کا کام خطرناک ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ وہ بیک اَپ کے لیے کال کرے۔''

''یعنی یہ ممکن ہے، کوئی غیر متوقع طور پر اسکاٹ سے ملے اور اسکاٹ کے پاس کال کا وقت ہی نہ ہو اور اگر وہ کال کرتا ہے تو اس کی پوزیشن مشکوک ہو جاتی ہے؟'' مائیک نے سوال کیا۔

’’بالکل یہی مطلب ہے۔‘‘ پرائس نے جواب دیا۔

’’یہ غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔‘‘

ترابان نے اضافہ کیا۔’’یا پھر کوئی اسکاٹ کو اپروچ کرسکتا ہے...... کوئی پرانا کیس۔ جس میں اسکاٹ نے اپروچ کرنے والے کو جیل کی سیر کرائی ہو...... یا قیدی کا کوئی دوست۔‘‘

میں نے مائیک کے تاثرات بگڑتے دیکھے۔

’’مطلب مشتبہ افراد کی تعداد سیکڑوں میں چلی جائے گی۔‘‘

’’لیکن تفتیش کے لیے پہلے ’’اورڈونر برادرز‘‘ سے سوال جواب کرنا ضروری ہے۔‘‘ ترابان نے کہا۔’’ہونے والی ڈیل میں رقم بڑی تھی۔ انہوں نے اسکاٹ کو اٹھالیا۔ تشدد کرکے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کوارٹر ملین کہاں رکھے ہیں۔ ناکامی پر گولی ماردی۔ ہم ان دونوں کو اٹھالیتے ہیں۔ وہ کہاں ہوں گے؟‘‘

’’پائلٹ، نیو جرسی میں...... لیکن چھوٹا بھائی وکٹر کے برونکس اور بروکلین میں متعدد اپارٹمنٹس ہیں۔ رشتے دار اور ایک سے زیادہ گرل فرینڈز ہیں۔‘‘ پرائس نے کہا۔’’چند گھنٹوں میں، میں صحیح مقام تلاش کرلوں گا۔‘‘

’’اس دوران ہم وہ فائلیں دیکھیں گے کہ اسکاٹ نے ماضی میں کس کس کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ ابتدا میں ہمارا [illegible] وہ افراد [illegible] گے جو حال ہی میں جیل سے باہر آئے ہیں۔‘‘ مائیک نے ارادہ ظاہر کیا۔

’’بہت فائلیں ہیں۔‘‘ ترابان نے کہا۔

’’فی الحال ہم ان کو دیکھیں گے جو رہا ہوئے ہیں۔‘‘

ترابان کی سرخ آنکھوں میں کرب تھا۔ گویا اس نے ساتھی نہیں کوئی گہرا دوست کھودیا ہے۔ میں نے نگاہیں پھیر لیں۔

مائیک نے سیل فون نکالا۔

’’کسے کال کررہے ہو؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’مجھے قانونی اجازت نامہ چاہیے۔ فون کمپنی سے اسکاٹ کے گھر اور سیل فون کا ریکارڈ نکلوانا پڑے گا۔‘‘

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسکاٹ مجھے بھی فون کرتا رہا تھا۔

’’لورین تمہاری آنکھیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’کیا ہوا؟‘‘

’’تم متواتر مصروف ہو۔ تمہاری آنکھوں میں تھکن بس گئی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں آرام کے لیے وقفہ لینا چاہیے۔‘‘

میں وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ میں بے خبر تھی کہ میری غیر موجودگی میں کہاں عقدہ کشائی ہوگی۔ لیکن حقیقتاً میں جسمانی اور جذباتی طور پر بری طرح تھک چکی تھی۔ ٹینشن نے نچوڑ لیا تھا، میرے گرنے سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ میں نے فیصلہ کیا۔

’’اوکے، مائیک، میں گھر جاتی ہوں۔ لیکن کوئی نئی بات سامنے آئے تو مجھے بتانے میں کوئی لمحہ ضائع مت کرنا۔ میں جارہی ہوں۔‘‘

☆☆☆

میں انجن بند کرکے باہر نکلی۔ دائیں کارنر سے عجیب آواز سنائی دی۔ گن میرے ہاتھ میں منتقل ہوگئی۔ منی کوپر کی آڑ سے میں نے دیکھا۔ کچھ دیر میں مجھے یقین ہوگیا کہ وہاں پال بیٹھا تھا۔ روشنی کرکے گلوک میں نے واپس ہولسٹر میں رکھ لیا۔ پال لان چیئر پر نیم دراز تھا۔ نیچے جانی واکر اسکاچ کی بوتل رکھی تھی۔ جو تقریباً خالی تھی۔ اس کے جسم پر برائے نام کپڑے تھے۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ کچھ دیر تک میں اسے گھورتی رہی پھر اس کا شانہ ہلایا۔ اس نے کوئی خاص ردعمل نہیں دیا۔ ایک ہاتھ کھینچ کر میں نے اسے کھڑا کیا اور جیسے تیسے اسے خواب گاہ میں بستر تک لے آئی۔ وہ بھی اس طرح [illegible] میں وحشت نہیں ہوا تھا [illegible] روم میں [illegible] کے دوران انگشت بہار رہی تھی۔ [illegible] جال تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں صاف نکل جاؤں گی۔ مجھے بروک اور اس کے بچوں کا خیال آیا۔ دل نے پھر کہا کہ ناقابل برداشت بوجھ اتار دو۔ سچ بیان کردو۔ لیکن سزا مجھے ہی نہیں ملے گی...... پال تو مارا جائے گا۔ میرا تجزیہ کہہ رہا تھا کہ پال اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری محبت میں اسکاٹ سے بھڑ گیا۔ لیکن میری چاہت اس وقت کہاں تھی جب وہ سرخ بالوں والی مہ پارہ سے پیچ لڑا رہا تھا۔ درحقیقت نقصان صرف بروک نے اٹھایا تھا۔

مجھے کچھ کرنا تھا لیکن کیا؟ بروک کی وجہ سے پیچیدہ نکون وجود میں آگئی تھی۔ بروک فیملی پر میرا سچ پہاڑ بن کر گرتا۔ یہ انکشاف ہمارے لیے بدترین تھا لیکن بروک معصوم تھی۔ اسے کس بات کی سزا ملتی۔ وہ زندہ لاش میں تبدیل ہو جاتی۔

☆☆☆

میں اسکواڈ روم میں داخل ہوئی تو مائیک کچھ لکھ رہا تھا۔ خوف نے میرے اندر مستقل جگہ بنالی تھی۔ شیشے کے باعث میں باس ڈیرک کو اس کے آفس میں دیکھ رہی تھی۔ وہ

فون پر بات کر رہا تھا۔

"کوئی خبر ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"پائنٹ ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ اپارٹمنٹ بھی خالی ہے۔ چھوٹا بھائی وکٹر بھی غائب ہے۔" مائیک نے ایک فولڈر مجھے پکڑایا۔ "ایم دیکھو" پائنٹ کا نام مارک تھا۔ اس کا ریکارڈ تقریباً شفاف تھا لیکن وکٹر کی مجرمانہ سرگرمیاں طویل اور دلچسپ تھیں۔ سولہ سال کی عمر میں ہی اس نے جیل آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ برگلری، نارکوٹکس، ریپ، اسالٹ...... خطرناک ہتھیاروں کا استعمال......

میرے لیے اس پر مرڈر چارج ہونا چاہیے تھا۔ کوپ مرڈر۔ سترہ سال کی عمر میں وہ یہ کوشش کر چکا تھا لیکن ناکام رہا اور پکڑا گیا۔ اس کے مکروہ کارناموں کا مطالعہ کر کے مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وکٹر اور ڈونز، اسکاٹ کے قتل کے لیے نہایت موزوں تھا۔ میں قائل ہو گئی کہ یہ کام اسی نے کیا ہے۔ میرا ذہن تیزی سے لائن آف ایکشن تیار کر رہا تھا۔

"اسکاٹ کے ساتھ کیس؟" میں نے سوال کیا۔ مائیک نے سر ہلایا، چشمہ اتار کے ڈیسک پر رکھا اور آنکھیں مسلنے لگا۔

"ابھی ہمیں توجہ دونوں بھائیوں پر مرکوز رکھنی چاہیے۔" وہ بولا۔ "ابھی خبر [illegible] ہے کہ میں فون کمپنی سے اسکاٹ کا ریکارڈ حاصل کرنے والا ہوں...... دس منٹ میں فیکس آ جائے گا۔"

میں سنگی مجسمے کے مانند بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اسکاٹ نے مجھے کتنی کالز کی ہوں گی؟ دس...... پندرہ......؟ میں کیا بلف کروں گی۔ دماغ میں بھونرے بھن بھن کر رہے تھے۔

"میں آتا ہوں ابھی۔" مائیک اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اسی وقت فیکس مشین کی مخصوص آواز آئی۔ ایک سفید رنگ کی شیٹ آہستگی سے باہر آ رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے مائیک کو رکتے دیکھا۔

"پارٹنر تم جاؤ۔" میرا ذہن چیخا۔ لیکن وہ پلٹ رہا تھا۔ میں بخوبی محسوس کر رہی تھی کہ میرا چہرہ گرم ہو گیا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ شیٹ مائیک کے ہاتھ میں ہوتی۔ یہ ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ میں کیا کروں؟ کیا کہوں؟ سر میں برف جمی تھی۔ مائیک نے پہلی شیٹ اٹھائی۔ میں گھوم کر اس کے پیچھے آ گئی۔ میں نے دیکھا وہ چندھیائی نظروں سے شیٹ کو تک رہا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ پیشانی کی طرف گیا۔ یک لخت میرا ذہن بیدار ہوا۔ مائیک کی قریب کی نظر کمزور تھی اور چشمہ چند منٹ پہلے اس نے ڈیسک پر رکھا تھا۔ میں تھوڑا اور گھومی اور اس کے مخالف پہلو میں آ گئی۔ مائیک کے ساتھ لگ کر میں نے سر سے سر ملا کے شیٹ دیکھی...... اس دوران بالائی دراز کھول کے میں نے چشمہ اندر رکھ دیا۔ دراز دھیرے سے بند کر دی۔ میری سانس رکی ہوئی تھی۔

"میں نے کہا تھا نہ کہ تمھیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ وہ چشمے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"اوکے، چیک کرو...... اب میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

☆☆☆

میں پنسل منہ میں چباتے ہوئے نمبروں پر مشتمل شیٹ کو گھور رہی تھی۔ یہ نمبر نہیں، زہریلے کیڑے مکوڑے تھے۔ باس اپنے چیمبر میں مصروف تھا۔ آٹھ اعداد پر مشتمل میرا نمبر تیرہ بار دہرایا گیا تھا۔ میں ان کو کیسے غائب کروں گی؟

"لورین۔" ایک آواز آئی اور پنسل میرے حلق میں پھنستے پھنستے رہ گئی۔ باس باہر آ کے ڈیسک پر جھکا۔ شیٹ کے نمبر ڈیرک کے لیے معکوس سمت میں تھے۔ "اگر دشواری ہے تو چند افراد کو بلوا لیتا ہوں؟"

"باس گولی مار دو مجھے۔" لیکن میں نہ کہہ سکی۔

"باس ایک گھنٹا میرے لیے بہت ہے......"

باس [illegible] چیمبر میں چلا گیا تھا۔ میں کی بورڈ پر جھک کر سوچنے لگی۔ کیا کرنا ہے...... [illegible] فون ریکارڈ بہت اہم [illegible] ایک منٹ میں، میں نے حل نکال لیا...... مائیکروسافٹ ورڈ کھول کر میں نے نمبر ٹائپ کیا اور اسے فہرست سے ملایا۔ کمپیوٹر کا نمبر کچھ بڑا تھا۔ میں نے پوائنٹ سائز کم کیا اور دوبارہ چیک کیا۔ پرفیکٹ، میں نے نمبر ٹائپ کرنے شروع کیے اور اپنے نمبرز حذف کرتی گئی۔ ایک گھنٹے سے قبل کام ختم کر کے میں نے تحریف شدہ پرنٹ آؤٹ نکالا۔ فیکس والی شیٹ، شریڈر (کاغذات کو پرزے کرنے والی مشین) کی نذر کی۔ گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

کمپیوٹر پرنٹ مائیک کی ڈیسک پر رکھا اور اس کا چشمہ نکال کر پرنٹ پر رکھ دیا۔

☆☆☆

میں نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ پال کاؤچ پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ٹی وی بند کر دیا۔

"ہائے۔" وہ مسکرایا۔ وہی دلکش انداز۔ لیکن موقع موزوں نہیں تھا۔ اندازہ کیونکر ہوتا۔ پال نے پہلے بھی میرے محبوب کا مرڈر نہیں کیا تھا...... حالانکہ وہ میرا محبوب

نہیں تھا۔

''کام کیسا چل رہا ہے؟'' پال نے استفسار کیا۔

''ٹھیک چل رہا ہے۔ پال تمہارا نہیں خیال کہ ہم گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں بات کریں؟'' پال نے فرش کی طرف دیکھا۔

میں چاہتی تھی کہ پال سچ بول دے۔ اپنا بوجھ ہلکا کر لے۔ بتادے کہ ہوا کیا تھا۔ اس طرح الجھنیں کم ہو جائیں گی۔ میں کہہ سکوں گی کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... کیونکہ میں پہلے ہی ہر بات کا خیال رکھ رہی ہوں۔

''پال، کیا ہوا تھا؟'' میں نے سرگوشی کی۔ ''تم مجھے بتا سکتے ہو۔''

پال نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ ''مائی گاڈ، لورین۔'' وہ بولا۔ ''تم جانتی ہو میری فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ مجھے کافی پریشانی اٹھانی پڑی۔''

میری گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ وہ مجھ سے کیوں جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اداکاری کر رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ دوسری طرف عموماً قاتل تردید کرتے ہیں۔ ان کی ڈھٹائی کیفیت [illegible] معصومیت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔

''پال۔'' میں نے کہا۔ ''پلیز!''

پال نے اُلجھن سے مجھے دیکھا۔ ''پلیز وھاٹ؟''

میرے خدا، میں نے سوچا۔ اس کے لیے میرے ساتھ گیم کھیلنا سہل ہے یا وہ لاعلم تھا کہ میں بھی وہاں موجود تھی۔ کیا وہ اسکاٹ کو تنہا سمجھ رہا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے منہ پر چلا گیا۔ یہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے اتفاقاً میری کالز دیکھی ہوں گی۔ وہ مشتعل ہو کے اسکاٹ کی طرف گیا کہ وہ مجھ سے دور رہے۔ پال اسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ میرا ذہن برق رفتاری سے تجزیہ کر رہا تھا۔

پال نہیں جانتا تھا کہ میں اس کے ساتھ بے ایمانی کر رہی ہوں۔ ماضی کی یادیں امنڈ کر آئیں۔ وہ میرا کتنا خیال رکھتا تھا۔ چھٹیوں میں وہ دن میں تین بار میرے لیے کوکنگ کرتا، کتابیں پڑھ کر سناتا۔ میں بھول نہیں سکتی تھی کہ وہ میرے بال بھی دھو کر ڈرائی کرتا...... وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے فیصلہ کرنے میں جلد بازی کی تھی۔

☆☆☆

صبح وہ کام پر چلا گیا۔ میرا اگلا قدم اسکاٹ کی گن سے متعلق تھا۔ مجھے شاطر جیف بنسنک یاد آیا۔ اس کے ساتھ ملاقات کل ہی ڈیرک کے آفس میں ہوئی تھی۔ جیف ڈسٹرکٹ آفس میں ہومی سائڈ بیورو چیف تھا۔ جیف کے ساتھ میں نے تین مرتبہ کام کیا تھا۔ ہر مرتبہ اس نے دفاع کو رگڑ کر رکھ دیا تھا۔ تینوں ملزمان پچیس سال کے لیے اسٹیٹ پریزن کی سکونت اختیار کر چکے تھے۔ باس ڈیرک کے سامنے اس نے مجھ سے بہت سوال کیے۔ جیف نے مجھے نروس کر دیا تھا۔ وہ اسکاٹ کی گن کے علاوہ ''اور ڈونز برادرز'' میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ایملی کی عمر کے حساب سے وہ اس کے بیان سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔

پال کے رخصت ہوتے ہی میں ٹول شیڈ میں آ گئی۔ میرے ذہن میں تھا کہ سب سے پہلے گن کو کسی دریا کی نذر کروں۔ میرے گمان میں نہ تھا کہ میں کیا دیکھنے والی ہوں۔ روشن دان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کیا کرنا چاہیے۔ میں نے پُرسکون انداز میں پال کی طرح سوچنے کی کوشش کی۔ اس نے گن یہاں سے ہٹا کے کہاں چھپائی ہوگی یا اسکاٹ کی گن اب گھر میں نہیں ہے۔ فی الحال میں یہی سوچ رہی تھی کہ گن گھر میں ہے لیکن [illegible] ذہن کے ساتھ نظر بھی [illegible] تھی۔ نظر کونے میں بیلچے پر [illegible] اس کے چوڑے پھل پر [illegible] مٹی [illegible] کہاں [illegible] تھی۔ [illegible] اسے چھوڑ دیکھا اور بیلچہ اٹھا کے بیک یارڈ کی طرف بھاگی......!

میں باریک بینی سے بیک یارڈ کا جائزہ لے رہی تھی۔ پودے، گملے اور گھاس کے قطعات...... بیلچہ استعمال کیا گیا تھا۔ ایک دو مشکوک مقامات پر میں نے کوشش بھی کی لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ پال اتنا ہوشیار ثابت ہوگا۔ اب میں نے ایک سراغ رساں کی طرح سے سوچنا شروع کیا۔ میں سمجھ گئی کہ پال نے بلف کیا تھا۔ میں واپس ٹول شیڈ میں آ گئی۔ سر اٹھا کے شیڈ کی چھت کی جانب دیکھا۔ سیڑھی اٹھا کے چھت کے بیم کے نیچے آئی۔ دوطرفہ سیڑھی کھول کے ایڈجسٹ کی۔ دیکھا کہ کہاں کہاں بیم اور چھت کے درمیان رخنہ ہے۔ سیڑھی پر چڑھ کے میں نے ایک رخنے میں ہاتھ ڈالا اور واپس اتر آئی۔ سیڑھی دوسرے مقام پر رکھی...... تیسری کوشش میں پنکھے کے قریب گیپ میں بیم کے اوپر اسکاٹ کی گن موجود تھی۔ گن پلاسٹک بیگ میں کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ نیچے اتر کے میں نے گن اپنے پرس میں محفوظ کی۔ بیگ اور کپڑا امپالا کے ٹرنک میں اسپیئر وہیل کے نیچے رکھ

دیا۔ امیلالا، کوپ کار تھی۔ جسے میں مشن کے موقع پر استعمال کرتی تھی۔ میری پیشانی پر پسینا تھا۔ ہاتھ جھاڑ کر میں پلٹنے والی تھی کہ اچانک بیلچے کا خیال آیا' سوچا اسے جگہ پر رکھ دینا چاہیے۔ چند قدم طے کر کے میں نے بیلچہ اٹھایا اور ٹول شیڈ میں جانے کے لیے گھومی تو سماعت سے آوازیں ٹکرائیں۔ میں پھر پلٹی اور حرکتِ قلب رک گئی۔ وہ مائیک تھا۔ مائیک؟ یہاں، میرے گھر میں؟ اس کے عقب میں ڈرگ انفورسمنٹ فورس گروپ کے اراکین جیف ترااہان اور رائے کاہنگ تھے۔ تینوں نے بلیکٹ آرمر زیب تن کی ہوئی تھی۔ میرے جسم میں موجود پسینے کے تمام مسامات نے منہ کھول دیا۔ تو یہ تھا کھیل کا اختتامی مرحلہ۔ وہ جانتے تھے اور میری نگرانی کرتے رہے تھے...... شاید شروع سے۔ مجھے ایک دو مرتبہ معمولی شک ہوا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ معدوم ہوتا گیا اور اب کھیل ختم ہوگیا تھا۔ میری ہیئت کذائی بھی عجیب تھی۔ میں گنگ رہ گئی۔

''کیا مسئلہ ہے، لورین؟ تم فون کا جواب بھی نہیں دے رہی ہو؟ اور یہ باغبانی کب سے شروع کر دی؟'' مائیک نے کہا اور میری دھڑکن بحال ہوگئی۔

''کچھ دیر پہلے ہمیں مخبر نے اطلاع دی ہے کہ اور ڈونز برادرز اپنے کلب میں موجود ہیں۔ ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ تیاری پکڑو۔ مارٹ اور پراکس باہر وین میں منتظر ہیں۔'' ترااہان نے کہا۔

☆☆☆

ہم پلمبنگ کمپنی کے بھیس میں محوِ سفر تھے۔ میں مائیک کے فراہم کردہ دونوں بھائیوں کے فوٹو دیکھ رہی تھی۔ وکٹر ایک سال چھوٹا ہوگا۔ دونوں جڑواں دکھائی دیتے تھے۔ دیگر ممبران کے مانند میں نے بھی لباس کے نیچے مکمل زرہ چڑھائی ہوئی تھی۔

''لورین، وکٹر ہمارا نشانہ ہے۔'' مائیک نے کہا۔ ''پندرہ برس پہلے بھی اس نے پولیس کے آدمی کو مارنے کی کوشش کی تھی اور اب اس نے اسکاٹ کو ختم کر دیا...... مجھے تقریباً یقین ہے۔'' اس کے لہجے میں نفرت اور غضب کی آمیزش تھی۔ ''دونوں کا وہ حال ہونا چاہیے کہ ان کی ماں دعا کرے کہ ان کی پیدائش پر اس نے دونوں کا گلا کیوں نہیں گھونٹا۔''

میرا ہاتھ بے ساختہ اپنی گردن پر چلا گیا۔ مجھے یاد تھا کہ مائیک کا باپ بھی دورانِ ڈیوٹی مارا گیا تھا اور اب ہم کوپ کلرز کی گردن دبوچنے جا رہے تھے۔

''ہم تیار ہیں۔'' ترااہان کی آواز آئی۔ وین کی رفتار کم ہونے لگی۔ سب نے اپنے اپنے ہتھیار چیک کیے۔ وین ولس ایونیو پر ایک سو اکتالیس اسٹریٹ کے آس پاس رکی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آگے کیا ہوگا۔ ترااہان نے ایک چار منزلہ پرانی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''کلب وہیں ہے۔''

کلب؟ میں اُلجھن میں پڑ گئی۔ مجھے کلب کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ترااہان نے میرے تاثرات بھانپ لیے۔

''بظاہر یہ دو عدد اسٹورز کا فرنٹ ہے۔ اندر کچھ اور ہے۔'' وہ بولا اور سیل فون نکال کے کال ملائی۔ کچھ دیر بعد اس نے فون بند کر دیا۔ ''وہ رابطہ نہیں کر رہی ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''مخبر عورت ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' مارٹ نے کہا۔ ''وہ بہترین مخبر ہے۔ مارک اور ڈونز کے ساتھ سوتی ہے...... ہمارا پلان تھا کہ بلا تاخیر اور اچانک بھرپور ہلا بولا جائے۔ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملے...... مخبر نے خبر دی تھی کہ کلب فل ہے۔ اس مرحلے پر دونوں بھائیوں کی موجودگی کی تصدیق ضروری ہے۔ ہم رسک نہیں لے سکتے اور مخبر کی جانب سے جواب نہیں آرہا ہے۔''

''ایک سیکنڈ۔'' میں نے کہا۔ ''ایمرجنسی سروس یونٹ کہاں ہے؟''

''اسکاٹ ہمارے بھائی کی طرح تھا۔'' کاہنگ کی آواز میں سنگی صلابت تھی۔ ''معاملہ فیملی کے اندر رہنا چاہیے۔''

گڈ لارڈ۔ میں نے بے چینی محسوس کی۔ یہ وار پچویشن تھی۔ کیس میں جذبات شامل ہو گئے تھے۔ ''ہم تصدیق کیسے کریں گے؟''

مارٹ نے کہا۔ ''اگر انہوں نے اسکاٹ کو مارا ہے تو وہ پاگل پن کی حد تک وسوسوں کا شکار ہوں گے۔ کسی پر بھی شک ہوا تو چڑھائی کر دیں گے۔ ان کے لیے ہم تو ہیں ہی مشکوک۔ پھن اٹھانے سے پہلے ہمیں ان کا سر کچل دینا چاہیے۔''

''میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ اندر جانا جہنم کے اندر قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ میں نے عمارت کی طرف دیکھا۔ لیکن حالات کو اس نہج پر لانے کی ذمے دار بھی میں ہی تھی۔ اگر میری جگہ کوئی اور زد میں آیا تو

pklibrary.com

کیا کروں گی۔ خود مجھے نہیں معلوم تھا۔

''مجھے وائرلیس کی ضرورت ہے۔'' میں نے آئیڈیا ظاہر کردیا۔

تراہان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''وائرمی۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔

''پاگل ہوگئی ہو۔'' مائیک نے کہا۔ ''تم تنہا بھیڑیوں کے غول میں جاؤ گی...... نہیں، میں جاؤں گا۔''

میں نے اپنے ساتھی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے جو کہا، وہ اس کی آنکھوں میں واضح تھا۔ میں آگاہ تھی کہ وہ بیسٹ ہے۔

''تم نے سن لیا جو میں کہہ چکی ہوں۔'' میں بولی۔ ''وہ مجھے نہیں جانتے نہ وہ کسی عورت کی آمد کی توقع کررہے ہوں گے۔ رہی پاگل پن کی بات تو ہاں میں پاگل ہوں۔''

☆☆☆

پرائس نے باریک تار اور ٹائی فون مائیک میرے لباس میں پوشیدہ کیا۔ ''اندر بہت گند ہے لیکن امید ہے کہ کل کا سورج اچھی خبر لائے گا۔ دستک کے جواب میں استفسار کرنے والے سے کہنا تم اپنے بوائے فرینڈ ڈی جے لوئیس سے ملنے آئی ہو۔ بے فکری سے کہنا کیونکہ لوئیس وہاں نہیں ہے۔ غالب امکان ہے کہ تمہیں اندر جانے دیا جائے گا۔''

''ایسا امکان کیوں ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''تم جیسی خوب صورت خواتین ہٹ لسٹ پر نہیں ہوتیں۔''

تراہان نے مزید کہا۔ ''وکٹر اور مارک نظر آئیں تو تم ''کوڈ ریڈ'' کہو گی۔ خطرے کی صورت میں بھی تم ''کوڈ ریڈ'' کہو گی اور محفوظ جگہ پر رہو گی۔ دوسرا سانس لینے سے پہلے ہم اندر ہوں گے۔''

''سمجھ گئی۔'' میں نے کہا...... کوڈ ریڈ۔ واہ میں تو اسی رات سے کوڈ ریڈ میں تھی جب پال نے اسکاٹ کو قتل کیا تھا۔

''اور ہاں، اپنا گلوک اور بیج مجھے دے دو۔ ممکن ہے وہ تلاشی لیں۔'' میں نے ایسا ہی کیا لیکن اسکاٹ کی گن میرے بیگ میں تھی۔ میں مجبور تھی۔ پرس کھول کے میں نے اپنی گن اور بیج تراہان کو دے دیا۔ کیا قسمت پھر ساتھ دے گی؟ میں نے سوچا۔ ''گڈ لک۔'' مائیک نے کہا۔

''لورین ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا۔'' تراہان نے تنبیہ کی۔

''بھروسا رکھو۔'' میں نے جواباً کہا۔

☆☆☆

مجھے دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک قوی ہیکل ساڑھے چھ فٹ لمبا آدمی وہاں نظر آیا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور چہرے پر چشمہ تھا۔ اس کے عقب میں کنکریٹ کی سیڑھیوں کا کنواں تھا...... لوئیس موجود ہے اندر؟'' میں نے سوال کیا۔

دراز قامت نے بڑے سے سر کو نفی میں ہلایا۔

''حیرت ہے...... کیا میں اندر جاسکتی ہوں؟''

''منحصر ہے......''

''کس بات پر منحصر ہے؟''

''یہی کہ تمہاری ضرورت کی نوعیت کیا ہے؟''

''رومینٹک!'' میں مسکرائی۔

''ویلکم ٹو ونڈر لینڈ۔'' وہ بولا۔

میں حیران تھی کہ کلب گراؤنڈ فلور پر تھا نہ فرسٹ فلور پر۔ میں سیڑھیوں سے اوپر کے بجائے نیچے جارہی تھی۔ کلب کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اکثریت ہسپانک نفوس پر مشتمل تھی۔ مختلف رنگوں کی روشنیاں، تیز موسیقی...... ڈانس فلور پر بھیڑ تھی۔ میں خاتون بارٹینڈر کی طرف چلی گئی۔ میرے مطلوبہ مشروب کے لیے اس نے بارہ ڈالر کا مطالبہ کیا۔ میں نے ایک ٹیک لگا کر نظریں گھمانا شروع کیں۔ ان دونوں میں سے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ڈانس فلور سے پرے نگورکی بوتھ تھے۔ میں نے اس طرف قدم بڑھائے۔ میں ڈانس فلور پر بوتھ کے قریب تھی۔ جب میں نے ایک نزدیکی دروازے سے وکٹر کو برآمد ہوتے دیکھا۔ میں ڈانس فلور کے کنارے پر رک گئی۔ وکٹر میرے سامنے آکے رک گیا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ قبل اس کے میں حرکت کرتی، ایک وزنی ہاتھ میرے شانے پر آگیا۔ میں پلٹی اور داخلی دروازے پر ملنے والے دراز قامت کو دیکھا۔

''لیڈی، میں ہوں...... پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''تم وی آئی پی کے اطراف میں کیا کررہی ہو؟ یہ پرائیویٹ پارٹی ہے۔'' وکٹر نے کہا۔ ''لیکن تم ہماری مہمان ہو۔'' وہ مجھے لے کر اسی دروازے میں داخل ہوگیا جہاں سے برآمد ہوا تھا۔ دراز قامت میرے عقب میں تھا۔

''یہ سیکیورٹی کا معاملہ ہے۔'' وکٹر نے کہا۔ ''میرا آدمی تمہاری تلاشی لینا بھول گیا تھا...... اگاسی تلاشی لو۔''

''اپنے آدمی کو سزا دو گے یا میری تلاشی لو گے؟''

وکٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کے دراز قامت کو اشارہ کیا۔ میرے بیگ کی اشیا میز پر پلٹ دی گئیں۔ میری نگاہیں فرار کا راستہ تلاش کر رہی تھیں۔ کیا مجھے اسکاٹ کی گن جھپٹ لینی چاہیے؟ اور فائرنگ کر کے اسی دروازے سے باہر نکل جاؤں؟

''یہ کیا ہے؟'' وکٹر نے اسکاٹ کی گن اٹھالی۔ میں بدحواس ہو چلی تھی۔ کالر کے پیچھے ننھا مائیک کھلا تھا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ باہر موجود ٹیم تک بات پہنچے۔ وکٹر نے گن کے بجائے صرف اتنا پوچھا تھا کہ ''یہ کیا ہے؟ یہ سوال ٹیم نے سن لیا ہوگا۔

''یہ کوڈ ریڈ کے مانند ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''کوڈ ریڈ؟ کیا مطلب ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''وہ گن جو تم نے میرے اوپر تانی ہوئی ہے، یہ کوڈ ریڈ جیسی لگتی ہے۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ میرا انحصار پوشیدہ مائیک پر تھا۔ وکٹر نے مجھے زمین پر گرایا۔

''کتیا، کون ہے تو؟ یہاں کیا کرنے آئی ہے؟'' وہ چلایا۔

''باس [illegible] نہیں [illegible] ہو کہ یہ پولیس [illegible] گن [illegible] لیڈی کو [illegible] ہے۔''

''بوائن بند کرو۔ مجھے سوچنے دو۔'' [illegible] پھر چیخا۔ اس نے گن کا رخ میری جانب کیا...... سراسیمگی کی کیفیت میں، میں نے دیواروں پر غور کیا...... میں تہ خانے میں تھی۔ کیا یہ مقام ریڈیو بلائنڈ اسپاٹ ہے؟

''کوڈ ریڈ۔'' میں ناامیدی کے عالم میں حلق کے بل چلائی اور اٹھ کے دروازے کی طرف بھاگی۔ لیکن اگاسی نے مجھے راستے میں ہی دبوچ لیا۔ اسی وقت کوئی چلایا اور دروازہ دھماکے سے اُڑ گیا۔ مٹی اور لکڑی کے ٹکڑوں کے ساتھ موسیقی کا شور شرابا بھی کمرے میں در آیا۔ میں نے زندگی کا بہترین منظر دیکھا۔ مائیک شاٹ گن کے ساتھ ٹوٹے ہوئے دروازے پر ایستادہ تھا۔ اس نے بلاتوقف آگے بڑھ کے مجھے پکڑنے والے عفریت کے چہرے پر شاٹ گن کے دستے سے بے رحمانہ ضرب لگائی۔ مغلظات بکتے ہوئے اس نے ہتھکڑیاں اور میرا گلوک میرے حوالے کیا۔ ''وہ دونوں کہاں ہیں؟''

''صرف وکٹر تھا۔ ایک سیکنڈ قبل یہیں تھا۔'' میں نے عقب میں اشارہ کیا۔ مائیک نے باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھا اور بڑھ کر زوردار لات رسید کی۔ دروازہ اکھڑ گیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا...... وہاں باتھ روم کی جگہ کوریڈور تھا۔ ''مجھے بیک اپ دو۔'' وہ نیم تاریک سرنگ میں گھس گیا۔ میں نے دراز قامت کو ہتھکڑیاں ڈالیں اور مائیک کے پیچھے بھاگی۔ کچھ فاصلے پر میں نے دروازے کی آواز کے ساتھ روشنی دیکھی۔ میں ہانپتی ہوئی باہر نکلی۔ دن کی روشنی نے وقتی طور پر نگاہ کو متاثر کیا۔ مائیک نصف بلاک آگے ایک سو چالیسویں اسٹریٹ پر تھا۔ اس کے آگے اتنے ہی فاصلے پر وکٹر بھاگ رہا تھا۔ دو بلاک کے بعد تیسری انٹرسیکشن پر میں نے مائیک سے فاصلہ کم کیا۔ وہ دونوں جنک یارڈ کے گیٹ سے آگے پیچھے گزرے۔ مائیک بہ آسانی شاٹ گن کے ذریعے اسے گرا سکتا تھا لیکن وہ قاتل نہیں پولیس مین تھا۔ وہ کتنا ہی مشتعل ہو صرف اپنے دفاع میں گولی چلا سکتا تھا۔ جنک یارڈ کے پیچھے زنگ آلود ٹن کی دیوار سی تھی۔ میں نے دھاتی رگڑ کی آواز سنی پھر جیسے دھات سے دھات ٹکرائی۔

بوم۔ کیا ہو رہا ہے۔ یارڈ کے آخری کونے پر وکٹر نظر آیا۔ اس کے راستے میں جالی دار گرل تھی۔ اس نے جگہ بنائی اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل دوسری طرف نکل گیا۔ [illegible] مائیک [illegible] ہوا اور [illegible] دوسری طرف چلا گیا۔ [illegible] ریل [illegible] وہاں متعدد ٹرینیں دیکھیں۔ وکٹر سب وے ریل یارڈ میں جا نکلا تھا۔

☆☆☆

میں دو ٹرینوں کے درمیان تنگ گلی میں بھاگ رہی تھی۔ نظریں دیوانہ وار وکٹر اور مائیک کو تلاش کر رہی تھیں۔ دفعتاً گویا لوہے سے لوہا ٹکرایا۔ میرے سر کے اوپر ٹرین کی کھڑکی بکھر گئی۔

''ہائے، سفید حسینہ...... یہ لو۔'' میں نے بروقت رخ پھیرا، وکٹر دو عدد ریل کارز دور کنڈکٹر کی کھڑکی میں سے فائر کر رہا تھا۔ میرے کان کے قریب جیسے بھونرا بھنبھنا کر گیا۔ میں نے گلوک دونوں ہاتھوں میں لیا اور وکٹر کی سمت پورا کلپ خالی کر دیا۔ خالی کلپ نکالا...... معاً مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ گرم سیال میری گردن پر بہہ رہا تھا۔ میرے گھٹنے مڑے اور میں اچانک زمین بوس ہوگئی۔

گاڈ، مجھے گولی لگی ہے۔ ذہن نے بتایا۔

''شاک سے بچو لورین۔ فوراً کچھ کرو۔'' میں لڑکھڑا کے کھڑی ہوئی۔ جیکٹ کی آستین زخم پر رکھی۔ ایک بار پھر

گھٹنوں پر آئی اور دوبارہ کھڑی ہوگئی...... ریل کار کا کھلا در میرے سامنے تھا۔ میں اندر جا کے پیٹ کے بل گری اور لڑھک کر نشستوں کے نیچے چلی گئی۔

تب فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ میرا بدن لرز رہا تھا۔ غالباً تین کارز کے فاصلے پر اوپر تلے شاٹ گن کے دھماکے ہوئے۔ ذرا وقفے کے بعد میرے سر پر دھماکا ہوا جس کار میں، میں تھی...... اس کی کھڑکی اُڑ گئی۔ معاً وکٹر کی چیخ قریب سے سنائی دی۔ غالباً میرے ساتھ والی کار سے......

''اوکے، اوکے۔'' میں سرنڈر کر رہا ہوں۔'' وہ چلایا۔ پھر کوئی چیز فرش پر گری۔ ''اسکاٹ کی گن؟'' میرے ذہن نے سوال کیا۔ ''مجھے وکیل کی ضرورت ہے۔'' چند سیکنڈ کے لیے سناٹا چھا گیا۔ کلک، کلک، شاٹ گن لوڈ ہوئی۔

''غلیظ جانور...... کوپ کلر۔ تمہیں ایک گورکن کی ضرورت ہے۔''

''کوپ کلر؟'' وکٹر کی آواز میں الجھن کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ پھر میں نے شاٹ گن کا آخری دھماکا سنا۔

☆☆☆

میں شاید کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی تھی۔ کوئی پوچھ رہا تھا۔ ''کہاں ہو، تم سن رہی ہو؟'' وہ مائیک تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرا سر اس کی گود میں تھا۔ ''لورین تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ زخم جان لیوا نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، ساتھ ہی وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

''میں زندہ ہوں؟''

''ہاں، اور زندہ رہو گی۔''

''وکٹر کا کیا ہوا؟ تم نے اُسے......''

مائیک نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''یاد رکھو پارٹنر...... اس نے مجھ پر گولی چلائی اور میں نے اس پر...... اوکے؟''

میں نے پلکیں جھپکائیں۔ ناقابلِ یقین۔ حیرت انگیز۔ میں یہاں ٹرین میں نارمل زندگی کی طرف جا رہی تھی۔

''کوئی اور راستہ نہیں تھا۔'' مائیک نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سمجھ گئی، میں نے سب سنا تھا۔''

''وہ یہاں ہیں۔'' کسی کی ہیجان زدہ آواز سنائی دی۔ چاپ...... چاپ...... چاپ کی آواز بھی آرہی تھی۔ ایمرجنسی میڈیکل ٹیک اور ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن والوں نے ٹرین کار پر ہلّا بول دیا تھا۔ تراہان نے ایمرجنسی سروس یونٹ بلا لیا تھا۔ NYPD اور SWAT کے اہلکار بھی تھے۔ K-9 کا یونٹ...... یوں معلوم ہو رہا تھا کہ بار بر پٹرول کے علاوہ ہر طرف سے ردِعمل آیا تھا۔ دوسرے ایجنٹ یعنی میری موت ناقابلِ برداشت تھی۔ ابتدائی مرہم پٹی ٹرین کار میں ہی شروع کر دی گئی تھی۔

''تم نے شاندار کام کیا ہے۔'' باس ڈیرک نے لورین سے کہا۔ ''وکٹر کے پاس سے جو گن ملی ہے، اس کے سیریل نمبر نے تصدیق کر دی ہے کہ وہ بگڑے ہوئے دوست اسکاٹ کی تھی۔ ہمارا اندازہ ٹھیک نکلا۔ میں اس انوکھے انجام اور قسمت کی ستم ظریفی پر حیران تھی۔ سب کچھ اس انداز میں حل ہو جائے گا، میں نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ وکٹر کی موت پر افسوس کی ضرورت نہیں تھی۔ حالانکہ اس نے اسکاٹ کو قتل نہیں کیا تھا اور اسکاٹ کی موت...... کیا اسے بروک سے بے وفائی کی سزا ملی؟ سب کچھ غیر متوقع طور پر خوب صورتی سے انجام پذیر ہوا تھا لیکن میرا دل کیوں رو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح خوشگوار اور روشن تھی۔ میں سینٹ مائیکل، اسٹریٹ اکتالیس کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ سیکڑوں پولیس اہلکاروں نے سڑک کو عوام سے الگ کر دیا تھا اور اسکاٹ کے لواحقین کا انتظار کر رہے تھے...... بروک سب سے آخر میں آئی۔ چار سالہ بچی اس کے ساتھ تھی اور بچہ گود میں تھا۔ دو سال کا لڑکا بھی سیاہ لباس میں تھا۔ میں اپنے حقیقی تاثرات سے بے خبر تھی۔ اسکاٹ کی تدفین پورے اعزاز کے ساتھ کی گئی۔ سیکڑوں گلاب کے پھولوں میں میرا پھول بھی شامل تھا۔

بروک نے مجھے لپٹا لیا تھا۔ ''میں جانتی ہوں تم نے میرے لیے کیا کیا ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''میں اب سو سکوں گی۔ شکریہ لورین۔''

میں نے ہونقوں کے مانند سر ہلایا۔ میں نے تباہ کن غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں پال اور مائیک خوامخواہ قاتل بن گئے تھے...... یہ اور بات تھی کہ کسی کو خبر نہیں تھی اور دو آدمی بلاوجہ مارے گئے تھے۔ اسکاٹ اور وکٹر...... دونوں میں بڑا تضاد تھا، اسکاٹ قانون کا رکھوالا اور وکٹر جرائم پیشہ...... میں نے سب کو دھوکا دیا تھا۔ حالات کے پیشِ نظر میں اور کیا کر سکتی تھی۔ نتائج میری توقع سے بہتر برآمد ہوئے تھے۔ ہاں سینے میں خلش تھی۔ آخری اچھی بات یہ تھی کہ مجھے اور پال کو دوسرا موقع ملا تھا۔

☆☆☆

اسکاٹ کی تدفین کے دوسرے روز صبح گھر پر نو بجے کال آئی۔ ڈاکٹر مارکس کی کال تھی...... غیر متوقع...... بعید از قیاس۔ اسکاٹ کی ہلاکت سے چند روز قبل میں بظاہر غیر ضروری طور پر ڈاکٹر کے پاس ''ٹیسٹ'' کے لیے گئی تھی۔ اس کی ''خوش خبری'' کے مطابق اس ٹیسٹ کے مطابق میں پریگننٹ تھی۔

اس اطلاع پر میری قوتِ گویائی سلب ہو کے رہ گئی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی۔

''لورین؟'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''تم فون پر ہو؟''

میں موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ پال اور میں ابتدا میں بچوں کے لیے کوشش کرتے رہے۔ علاج اور ٹیسٹ کراتے رہے۔ طبی ماہرین کے مطابق PH کے عدم توازن کے باعث حمل قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ میری خاندانی ہسٹری میں رحم کا کینسر موجود تھا۔ ہم نے چیز ٹرائی کی اور بالآخر حقیقت تسلیم کر لی۔

''ڈاکٹر، کیا تمہیں یقین ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے اپنے ڈاکٹر سے سوال کیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ میں تو بانجھ تھی۔

''میرے پاس جواب نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''کیا تم نے کوئی نئی دوا استعمال کی تھی؟''

یقیناً مجھے اولاد کی خواہش تھی لیکن......

''میں حاملہ ہوں۔'' میں نے فون میں سرگوشی کی۔ سر کے ساتھ کمرا ابھی گھوم رہا تھا۔

''تم کیا ہو؟'' پال ناشتے کی ٹرے لے کر خواب گاہ میں آیا۔

میرا حلق خشک تھا۔ میں نے فون اس کے حوالے کر دیا۔ میں اس کے رنگ بدلتے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ جو آخر میں مسکراہٹ، پھر قہقہے میں تبدیل ہو گئے۔

''اوہ مائی گاڈ......'' اس نے فون بند کر کے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ ''اوہ گاڈ...... تھینک یو...... گاڈ...... گریٹ......''

میں تیزی سے ذہن میں حساب جوڑ رہی تھی۔ کب آخری بار ڈاکٹر کے پاس گئی تھی؟ کب آخری بار پال کے ساتھ رات گزاری تھی؟ پال، بچہ پال کا تھا۔ اسکاٹ کے ساتھ میں نے ایک ہی بار صحبت اختیار کی تھی...... چھ دن قبل۔ میری رگوں میں جمنے والا خون رواں ہونے لگا۔ جرم، پشیمانی اور اینگزائٹی ختم ہو رہی تھی۔ میں اور پال برسوں اولاد کی خواہش کرتے رہے...... ہر جوڑے کی خواہش ہوتی ہے۔ ایک ہپی فیملی...... لیکن ہم دو سے تین بننے میں ناکام رہے۔ اگر طلاق ہو جاتی تو کوئی انہونی بات نہ ہوتی۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہمیں اپنی چاہت پر یقین تھا۔ پال پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ میں رو پڑی۔ تیرگی میں سے امید کی کرن پھوٹی تھی۔ ایک نئی زندگی ہم دونوں کی منتظر تھی۔

''پال آئی لو یو۔''

''آئی لو یو لورین۔'' اس نے میرے بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆

میں نے ڈیوٹی جوائن کی تو باس کے آفس میں میری پہلی ملاقات دو افراد سے ہوئی۔ ان کا ہیئر کٹ، نفیس سوٹ...... وہ ایگزیکٹو دکھائی دے رہے تھے۔ فوراً میرے دماغی خلیے جگہ بدلنے لگے۔ اسکاٹ، ڈپارٹمنٹ آف جسٹس کے سیکشن میں بھی کام کر چکا تھا۔ مجھے اپنی ڈیسک تک جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ باس ڈیرک نے چند منٹ کے لیے مجھے بلا لیا۔ مجھے شک ہوا کہ میں ایف بی آئی کے سامنے ہوں۔ تعارف کرایا گیا۔ ایک کا نام نارمن، دوسرے کا گرے تھا۔ میں بیٹھ گئی۔

''وکٹر کی موت نے کچھ سوالات اٹھا دیے ہیں۔'' نارمن نے کہا۔

''وکٹر یا اسکاٹ؟'' میں نے طنز کیا۔

''وکٹر، ہمیں حقائق درکار ہیں۔''

''معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے کان پر ہاتھ رکھا۔ ''کم سنائی دے رہا تھا۔ دونوں مجھے گھورتے رہے۔ میں نے بھی نگاہ نہیں ہٹائی۔

''ڈیٹکٹیو، تم چاہتی ہو کہ تحقیقات کا دائرہ وسیع کیا جائے؟''

''تم بھول رہے ہو کہ وکٹر نامی وائرس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ دائرہ وسیع کرنا ہے...... شاید تم مائیک کی بات کر رہے ہو۔ دلچسپ...... بہت دلچسپ۔ لکھو، مائیک نے میری جان بچائی۔ اس وقت میں کھڑی ہوئی ٹرینوں کے درمیان تھی اور وکٹر کی گولی سے زخمی ہونے کے بعد ٹرین کار میں چلی گئی تھی۔ وکٹر نے مائیک پر بھی گولی چلائی تھی۔ وہ مجھے مارنے کے لیے ٹرین کار میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب مائیک نے اسے گولی ماری۔''

''کتنے فائر ہوئے تھے؟'' گرے نے سوال کیا۔ ''بوم، بوم، بوم یا صرف بوم؟''

میں ہنس پڑی۔ کافی کی چسکی لی۔ ''وہ ٹرین یارڈ میں

گن فائٹ تھی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے گولی لگی تھی۔ میں ٹرین کار میں فرش چوم رہی تھی۔ قاتل میرے پیچھے تھا۔ میں ساؤنڈ انجینئر کا رول ادا نہیں کر رہی تھی۔''

گرے نے نوٹ بک بند کر دی۔ ''فائن۔'' وہ بولا۔ ''لیکن ریکارڈ کے لیے تم ایک سوال کا جواب دو گی۔ تم کیس کی پرائمری انویسٹی گیٹر تھیں اور دو مشکوک لیکن خطرناک ملزموں کے پیچھے تھیں۔ تم نے ایمرجنسی سروس یونٹ کو نہیں بلایا؟''

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔ بینڈیج کا تحفہ جلد اتر جائے گا۔ سماعت بھی ٹھیک ہے۔''

مائیک مسکرایا۔ ''کیا خیال ہے، ان دونوں کے بارے میں۔ کیا رپورٹ بنائیں گے؟''

''کہہ نہیں سکتی۔ لیکن حالات ایسے بن گئے تھے کہ رپورٹ ہمارے خلاف نہیں جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا...... خدا ہی جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ معاً ڈیرک نے مداخلت کی اور میرا منہ بند ہو گیا۔

''میں نے اتھارٹی دی تھی۔'' باس ڈیرک نے کہا۔

میں نے باس کی طرف دیکھا۔ نظریں چار ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں واضح پیغام تھا۔ ''اپنا منہ بند رکھو۔''

''انتظار کا وقت نہیں تھا۔ میں پرعزم تھا۔ ہمیں حرکت میں آنا ہی تھا۔'' باس اتنا کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے تک گیا اور اسے کھول دیا۔ یہ ان دونوں کے لیے جانے کا اشارہ تھا۔ ''چھٹیوں کے دوران لورین کی ٹیبل پر کام جمع ہو گیا ہے۔'' باس کا اختتامی فقرہ تھا۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد میں نے باس کا شکریہ ادا کیا۔

''تم دونوں ہیرو ہو۔ ان کو گولی مارو۔ کام ختم ہونے کے بعد ٹپک پڑتے ہیں۔''

☆☆☆

میں وہاں سے نکلی تو مائیک کی کال آئی۔ ''دونوں چوہے دفع ہو گئے؟'' وہ جاننا چاہ رہا تھا۔

''دو ٹانگوں والے، ہاں وہ چلے گئے۔'' میں نے کہا۔

''پائپر میں میری طرف سے ٹریٹ ہے۔ لنچ پر ملو۔'' اس نے کہا۔

''اوکے، خیر ہے؟''

''ہاں، بائے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے آفس میں آکے ڈیسک کا جائزہ لیا۔ چند فائلیں دیکھیں۔ میلو چیک کیں۔ زیادہ وقت گزرے ہوئے چند طوفانی دنوں کی یاد میں گزرا۔ پائپر کلٹ کے لیے میں جلدی روانہ ہو گئی۔ بیس منٹ بعد دو سو اکتیس اسٹریٹ پر میں ریسٹورنٹ میں تھی۔ جگہ تقریباً خالی تھی۔ البتہ انتہائی کونے کے بوتھ میں مائیک منتظر تھا......

ویٹرس نے طعام سرو کرنا شروع کیا۔ چیز برگر نمایاں تھا۔

''بیکن بھی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر ٹرین یارڈ کے واقعے پر مائیک کا شکریہ ادا کیا۔

''اوہ کم آن۔'' وہ بولا۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کا بیک اپ ہیں۔'' کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ''لورین، مجھے ایک بات یاد آرہی ہے۔ اس کی نشست پر کاغذ کی شیٹ تھی۔ وہ اس نے اٹھا کے میز پر رکھی تو میری نظر پڑی۔ اور برگر کا ٹکڑا میرے حلق میں پھنس گیا۔ وہ فیکس شیٹ تھی جس کے نمبر مکھیوں کے مانند میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔

''کل یہ مجھے فیکس مشین میں ملی ہے۔ پتا نہیں کیوں کسی نے دوسری کاپی نکال دی۔ یہ ویسی ہی ہے...... جیسی تم نے میری ڈیسک پر چھوڑی تھی۔ تم نے کمپیوٹر شیٹ وہاں رکھی تھی۔ دونوں تقریباً ایک جیسی ہیں۔ البتہ کمپیوٹر شیٹ پر تمہارے نمبر نہیں ہیں۔ کیا یہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے؟ پارٹنر اپنی روح کا بوجھ ہلکا کر لو۔''

میں لب بستہ تھی۔ مائیک کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ میرا ساتھی تھا۔ کئی بار اس نے مجھے بچایا تھا اور میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ حقیقت چھپاتی رہی۔ خوشگوار اختتام ہونے کے بعد نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے میز کی سطح پر اطراف میں دیکھا۔ ہر طرف دیکھا سوائے مائیک کی طرف۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے تسلیم کر لینا چاہیے۔ میں جھوٹ بولنے پر مجبور تھی لیکن جھوٹ کی وجہ سے مائیک نے ایک آدمی مار دیا۔

رک جاؤ، لورین۔ میرے دل نے کہا اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ پال قید خانے میں ہو گا۔ مائیک کے بیوی بچے تھے اور مجھے بھی پھنس جانا تھا اور بروک کا کیا حال ہو گا۔ صورت حال کئی گنا بدتر ہو جائے گی۔ میں نے فیصلہ کیا اور مائیک کی آنکھوں میں دیکھا۔

pklibrary.com

"پارٹنر، اسے بھول جاؤ۔"

مائیک کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے لگا کہ اس کے ہاتھ میں بوتل ٹوٹ کے بکھر جائے گی۔

"بب...... بھول جاؤں؟" اس نے بمشکل کہا۔

"تم نے اسکاٹ کے ساتھ وقت گزارا تھا؟ مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا ساتھی اور دوست ہوں۔"

"مائیک۔" میں نے التجا کی۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ "پلیز بھول جاؤ۔"

"لورین میرے ہاتھوں پر خون ہے...... میں ڈکٹر کو گرفتار کرسکتا تھا۔"

میں بیگ اٹھا کے کھڑی ہوگئی۔ میں مائیک کو دھمکی دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن میں کارنر ہو گئی تھی اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ "تم نے اسے مارا...... میرے سوا کوئی گواہ نہیں ہے۔ سب کو بھولنا پڑے گا۔"

☆☆☆

گھر جانے سے پہلے میں نے باس سے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں، مجھے ایک دن کی اور چھٹی دی جائے۔ چند روز میں، میں نے پہلا سچ بولا۔ گھر پہنچ کر میں نے آنسرنگ مشین چیک کی۔ [illegible] منتشر اعصاب کے سکون کے لیے وائن [illegible] تیار کیا۔ مائیک کو دھمکی دے کر مجھے خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں یہ بوجھ کسی سے اور [illegible] شیئر کروں۔ پاپر کلٹ میں مائیک سے ملاقات کے بعد میں بریکنگ پوائنٹ پر تھی۔ آہ، لنکن نے صحیح کہا تھا کہ آپ ہمیشہ ہر شخص کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

مجھے پال کو بتانا پڑے گا۔ ہمیں ایک پیج پر آنا پڑے گا۔ ایک دوسرے کی مدد کرنی ہوگی۔ ایک دوسرے کے راز کی حفاظت کرنی ہوگی۔

رات میں نے پال کی پسندیدہ ڈش تیار کی۔ یہ امکان میرے ذہن میں تھا کہ یہ ہمارا آخری ڈنر ثابت نہ ہو...... پال سیدھا کچن میں آیا اور مجھے لپٹا کے ہوا میں گھمایا۔

لورین، اب یا کبھی نہیں۔ میں نے خود سے کہا۔

"پال۔" میں نے کہا۔ "ہمیں بات کرنی چاہیے۔"

"رک جاؤ۔" وہ بولا۔ "پہلے میں۔" اس نے بریف کیس سے ایک خوب صورت فولڈر نکالا۔ اس کے کور پر سر سبز پہاڑیوں کی تصویر تھی۔ اندر بڑے بنگلوز کے پلان تھے۔ یہ دراصل لگژری ہاؤسنگ ڈیویلپمنٹ کا سیلز کلر فولڈر تھا۔ علاقہ کنیکٹی کٹ ریاست کے قرب وجوار میں تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

پال نے کچن ٹیبل پر پانچ مختلف پلان رکھے۔

"ایک اٹھالو۔" اس نے کہا۔ "اپنا ڈریم ہاؤس اٹھالو۔ مجھے تو سب ہی پسند ہیں۔"

"پال میری بات......"

اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ یہ لطیفہ ہے نہ خیالی دنیا۔ میں تیاری کر چکا ہوں۔ یہ ایک اور فرم ہے، ہیج فنڈ...... میں تین گنا معاوضے پر کام کروں گا۔"

"کیا؟" میں نے فولڈر کی طرف دیکھا۔ فولڈر میں کئی کاغذی سلپ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ بالائی سلپ پر "ایسٹر کورٹ" لکھا تھا۔ اس کے نیچے سینٹ ریجس ہوٹل کی سلپ تھی۔ سینٹ ریجس؟ میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ پیچیدہ، بل کھاتی کہانی کا آغاز اسی ہوٹل سے ہوا تھا۔ جہاں میں نے پال کو سرخ بالوں والی حسینہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ کیا افسانہ ہے؟ میں نے وہ سلپ کھینچ لی۔ اس پر ہاتھ سے نمبرز لکھے ہوئے تھے۔

"پال یہ کیا ہے؟ تمہاری ہینڈ رائٹنگ نہیں ہے؟"

مجھے توقع تھی کہ پال خوش ہو جائے گا لیکن اس نے سرسری انداز میں نمبر دیکھا۔ "ہیج فنڈ برانچ [illegible] وکی سوانسن ان کی [illegible] سینٹ ریجس [illegible] ایسٹر کورٹ میں لنچ کے موقع پر وکی نے یہ...... نمبر لکھا تھا۔" اس نے بتایا۔

چند سیکنڈ تک میں پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔

"وکی سوانسن؟" میں نے کہا۔ "دیکھنے میں کیسی ہے؟"

"تم جانتی ہو؟"

"شاید۔"

"سرخ بال، عمر پچیس سے تیس کے درمیان، قدرے لمبا قد۔"

"اوہ نو، وہ کوئی اور ہے۔" میں نے کہا۔ اوہ گاڈ یہ کیسا خوفناک خواب تھا جو ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ایک کے بعد، دوسرا موڑ...... تیسرا...... چوتھا...... اُف...... پال نے میرے ساتھ بے وفائی نہیں کی تھی۔ بے وفائی کرنے والی میں تھی۔ صرف میں۔ جس کی وجہ سے یہ بھیانک خونی ڈراما شروع ہوا تھا۔ اسکاٹ نے بروک سے بے وفائی کی، اس کی ذمے دار بھی میں تھی...... میرے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پورا وجود ہی زلزلے کی زد میں تھا۔ پال سراسر بے

قصور تھا۔

''ابتدا میں، میں سمجھا کہ وکی مذاق کر رہی ہے لیکن یہ حقیقت نکلی۔'' پال نے کہا۔ ''بس کاغذی کارروائی باقی ہے۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ ہمیں کنکٹی کٹ شفٹ ہونا پڑے گا۔''

میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے پٹا ہوا باکسر رِنگ کے کونے میں اسٹول پر بیٹھتا ہے۔

☆☆☆

پال جانتا تھا کہ مجھے اپنے کام سے محبت تھی۔ اس نے ہمیشہ مجھے سپورٹ کیا۔ وہ اب بھی میری جاب کی خاطر نئی آفر ٹھکرانے پر تیار تھا لیکن ہم ایک مکمل فیملی کی جانب محوِ سفر تھے۔ فیملی کی زیادہ اہمیت تھی۔ میں نے اس کی محبت پر شک کیا۔ میرے عاجلانہ فیصلے نے شیشۂ دل کی قیمت ارزاں کر دی تھی۔ اظہار کا یارا تھا، آنکھ بھی تر نہ تھی۔ دلِ محزوں پر ترس کھانے والا کوئی نہ تھا۔ صرف میں تھی۔ احساس کی تلخیاں بڑھانا لاحاصل تھا۔ نئی منزل سامنے تھی۔ روزِ طرب باقی تھا اور مجھے قدم بڑھانا تھا۔

☆☆☆

میں آفس پہنچی تو ٹائیک کی ڈیسک خالی تھی۔ [illegible] دل نے [illegible] اور ایک ٹائیک میرا ساتھی، میرا دوست۔ وہ افسردہ ہوگا، شاک میں ہوگا۔ پولیس عموماً اچھی ہوتی ہے لیکن اچھے افراد جھوٹ نہیں بولتے...... پال کی جانب سے میں فیصلہ کرنے میں آزاد تھی۔ میں نے کمپیوٹر کو دیکھا۔ میں اب یہاں کے لائق نہیں تھی۔ قبل اس کے کوئی اور کیس شروع ہو، مجھے یہاں سے نکل جانا تھا۔ نئی دنیا...... نئی مصروفیت۔

میں نے اسکاٹ کی فائل کھولی۔ ایک گھنٹا صرف ہوا، میں نے اپنی لکھی ہوئی تمام رپورٹس کا مطالعہ کیا۔ وقت سے پہلے ریٹائر ہونے کے لیے دو نکات کافی تھے۔ پال کی نئی جاب اور میری طبی رپورٹ۔ تاہم میں کوئی نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کاغذی کارروائی میں، میں نے مزید چالیس منٹ خرچ کیے اور مطمئن ہوگئی۔ عین اس وقت باس ڈیرک میرے پاس آیا......

''اسکاٹ کی بیوہ بروک کی کال آئی تھی۔ اس نے درخواست کی ہے کہ کوئی فرد اسکاٹ کے لاکر کی اشیا گھر پہنچا دے۔'' باس نے کہا اور ایک چابی میرے حوالے کی۔

''ٹاسک فورس ہے...... رائے نہیں جائے گا یا ترا ہان؟''

''بروک نے خصوصاً تمہارا نام لیا ہے۔''

مجھے کوئی عار نہیں تھا بلکہ بروک سے ہمدردی تھی لیکن میں کوئی اور فیصلہ کرتے جا رہی تھی۔ بہرحال میں نے کھڑے ہو کر باس کو سیلیوٹ کیا۔ ''اوکے، باس۔'' میں چابی لے کر ایلیویٹر کی طرف چل دی۔

میں دوسری منزل پر آئی۔ خوش قسمتی سے دوسری منزل پر ڈرگ ٹاسک فورس کے دفاتر خالی تھے۔ میں لاکر روم میں گھس گئی۔ کسی خیال کے تحت دستانے چڑھا کر چابی سے میں نے اسکاٹ کا لاکر کھولا۔ اندر ایک فالتو یونیفارم رکھا تھا۔ کارڈ بورڈ کے چند ڈبے، اعشاریہ تین، آٹھ کے راؤنڈز، بلٹ پروف اور جوتوں کی جوڑی۔ جوتوں کے نیچے ایک صحت مند لفافہ...... بلا مبالغہ میرے ہاتھوں سے جوتے گر گئے۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ لفافہ چیخ رہا تھا کہ اندر کیا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اسے کھولنے پر مجبور تھی۔ اندر ایک موٹی رقم موجود تھی۔ لگ بھگ پندرہ ہزار ڈالرز ہوں گے۔ اوہ گاڈ...... نارکوٹک کوپ کے لاکر میں؟ کیا وہ بینکر تھا؟ نہیں، کوپ دو طرح کے ہوتے ہیں...... گڈ اینڈ بیڈ۔ اسکاٹ ایک بیڈ کوپ تھا۔ اب میں کیا کروں۔ رقم باس کے حوالے کر دوں؟ اسکاٹ کا کیس کلوز ہو چکا تھا۔ رقم کا انکشاف ساتھیوں کی بند [illegible] کا ڈھانا ثابت ہونے کے مترادف تھا۔ سادہ سا حل یہ تھا کہ میں نے رقم کا لفافہ جوتے کے اندر دور تک ٹھونس کر جوتے ڈبے میں رکھے اور لاکر بند کر دیا۔ اگر بروک کھلوانا چاہے تو اس کی مرضی...... اب یہ اس پر منحصر تھا۔ تمام چیزیں یکجا کر کے چابی میں نے باس کو واپس کی اور روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

بروک کا گھر سی سائڈ پر تھا۔ مجھے ڈوربیل دو مرتبہ بجانی پڑی۔ اس کے باوجود مجھے مزید تین منٹ انتظار کرنا پڑا۔ شاید گھر خالی تھا۔ میں پلٹنے والی تھی۔ جب مجھے اندر سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ میں نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔

''بروک، میں لورین ہوں...... کیا بات ہے؟'' اندر سے مجھے رونے کی آواز آئی۔ میں نے ناب پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول کے اندر چلی گئی۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔ قریب ایک گلاس ٹوٹا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں، میں گھبرا گئی کہ وہ زخمی تو نہیں۔ تاہم ایسی بات نہیں تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ''بروک، کیا بات ہے...... میں لورین ہوں۔ تمہاری وجہ سے آئی ہوں۔ خود کو سنبھالو۔ تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے......'' میں

اسے دلاسا دیتی رہی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ گھر اجڑا ہوا تھا۔ بروک دھیرے دھیرے نارمل ہو گئی۔ اسی کے ذریعے مجھے علم ہوا کہ بچے بروک کی سوتیلی ماں کے پاس ہیں۔ اس کی ساس اور ماں اسے سہارا دے رہے تھے۔

"پلیز ان چیزوں کو اسکاٹ کے آفس میں رکھ دو۔ میں ابھی اس قابل بھی نہیں کہ وہاں جا سکوں۔ آفس تہ خانے میں ہے۔"

"تم ایک بہادر خاتون ہو بروک۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

"تم میرے ساتھ کافی پیو گی؟" اس نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ میں یہ اشیا پہنچا کے آتی ہوں۔ تم اب رونا مت۔" بروک تہ خانے کا راستہ بتا کے کچن کی طرف چلی گئی۔

میں نے تہ خانے کی سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے لانڈری روم اور واٹر ہیٹر کے قریب سے گزر کے چوبی دروازے تک پہنچی جس پر ایک قدِ آدم پوسٹر چسپاں تھا۔ یہاں تک تہ خانہ عمومی نوعیت کا تھا لیکن چوبی دروازہ کھول کے میں نے روشنی کی تو میں دنگ رہ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے [illegible] دفتر میں قدم رکھ دیا ہے۔ دیواروں کے پینلز پر بلوط کی لکڑی کی آرائش تھی۔ مہاگنی کی وزنی ڈیسک پر ایپل کی پاور بک (لیپ ٹاپ) موجود تھی۔ ایک جانب سیاہ رنگ کی چرمی کاؤچ رکھی تھی۔ میرے دائیں جانب دیوار پر بیالیس انچ کا پلازما ٹی وی نظر آ رہا تھا۔ ڈیسک کے عقب میں چھوٹا بک شیلف تھا۔ جہاں کتابوں کے بجائے تین عدد سیل فون اور ایک بلیک بیری چیک رہا تھا۔ ساتھ لایا ہوا باکس میں نے ڈیسک پر پاور بک کے ساتھ رکھ دیا۔ میرے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ پہلے لاکر سے رقم برآمد ہوئی اور اب یہ شاندار آفس، گھر کے تہ خانے میں۔ میں ڈیسک کی چرمی نشست پر بیٹھ گئی اور چند سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ ذہن میں گھنٹیاں بج رہی تھیں، میں نے اٹھ کر تیزی سے پاور بک، سیل فون اور بلیک بیری چیک کیے۔ میرا نام اور نمبر کہیں نہیں تھا۔ ابھی میں نے سکون کی سانس لی تھی کہ میری نظر فائل کیبنٹ اور آہنی لاکر پر پڑی۔ دونوں چیزیں بائیں جانب کونے میں تھیں۔ وہیں مجھے پنسل ہولڈر کے ساتھ کی رِنگ نظر آیا۔ چابی سے کیبنٹ کھل گیا لیکن لاکر کے لیے چابی ناکارہ ثابت ہوئی۔ میں نے پہلی بھاری دراز کھولی۔ وہاں عام فائلیں رکھی ہوئی تھیں...... انکم ٹیکس، کریڈٹ کارڈز، کار ریپیئر، دندان ساز......

"لورین۔" بروک کی آواز آئی۔ وہ غالباً سیڑھیوں پر تھی۔

"میں آ رہی ہوں۔" میں نے پھرتی سے بقیہ دونوں درازیں چیک کیں۔ جانے کا ارادہ کرتے کرتے میں نے پھر بالائی دراز پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہومی سائڈ کوپ میں بعض عادات تشکیل پا جاتی ہیں۔ بالائی دراز کی ٹاپ، ڈیسک کی زیریں سطح تھی۔ میں نے وہاں ہاتھ گھمایا۔ وہاں کوئی شے ٹیپ کی مدد سے چپکی ہوئی تھی۔ جسے بلا جھجک میں نے الگ کرلیا۔ میں حیرت سے DVD کو دیکھ رہی تھی۔ لاکر کی طرف متوجہ ہونے کا وقت نہیں تھا۔ DVD والا ہاتھ ہولے سے لرزا۔ اس پر نیلے مارکر سے انشورنس لکھا ہوا تھا۔ کس قسم کی انشورنس تھی جو DVD کی شکل میں تھی۔ اسکاٹ کون تھا؟ جو رقم جوتوں کے نیچے اور انشورنس DVD کی شکل میں رکھتا تھا۔ فیصلہ کرنے میں، میں نے ایک لمحہ لیا۔ DVD اپنے بیگ میں منتقل کردی اور واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

بروک کے ساتھ کچھ وقت گزار کے میں ایک گھنٹے سے پہلے وان کورٹ لینڈ پارک گالف کورس پہنچ گئی۔ گالف کورس امریکا کا قدیم ترین کورس تھا۔ میں [illegible] فیس [illegible] کے لیے وہاں پہنچی تھی۔ وہاں پارکنگ لاٹ میں پہنچ کے میں نے لیپ ٹاپ نکالا اور DVD لگا دی۔ میں اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ سہواً سرویلنس کی جگہ انشورنس لکھا گیا ہے۔ روشن اسکرین پر نیچے دائیں کونے پر جولائی بائیس اور صبح ساڑھے دس بجے کا وقت لکھا تھا۔ یہ نگرانی کی ٹیپ تھی۔ کوالٹی عمدہ تھی۔ فلم میں درمیانی عمر کا ہسپانوی نظر آ رہا تھا۔ وہ سڑک پر بے پروائی سے جا رہا تھا۔ وہ یونین اسکوائر پارک کے آؤٹ ڈور ریسٹورنٹ پر رکا۔ سین کٹتا ہے۔ دوسری مرتبہ وہ ٹیکسی سے نکلتا دکھائی دیا اور رالف لورین فلیگ شپ اسٹور میں داخل ہو گیا۔ کیا یہ آدمی ڈرگ ڈیلر ہو سکتا ہے؟ میرے ذہن میں سوال اٹھا۔ وہاں سے نکل کر وہ دوسری ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ کونے میں وقت تیس منٹ آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے دوسری ٹیکسی چھوڑی تو فور سیزن ہوٹل میں چلا گیا۔ اچانک کیمرے میں منظر کی نوعیت بدلی۔ وقت کافی آگے چلا گیا۔ شام کے چھ بج کے دس منٹ ہو رہے تھے۔ نگرانی کرنے والا یقیناً اکیلا تھا۔ فریم کی نوعیت بدل گئی تھی۔ لیکن کوالٹی برقرار تھی۔ منظر ہوٹل کی چھت، پھر بلندی پر بالکونی کو فوکس کیا گیا۔ منظر پھر بدلا اور نیچے پارک میں ایک عورت نظر

آئی۔ چند منٹ بعد فلم تاریک ہوگئی۔ میں نے نوٹ کیا کہ وقت نے چھلانگ لگائی تھی۔ جولائی تیئیس، رات ایک بج کے اٹھائیس منٹ۔ فلم تاریک نہیں ہوئی تھی، دن سے رات میں چلی گئی تھی۔

بالکونی کی ریلنگ تاریک تھی۔ اچانک جھماکا سا ہوا۔ بالکونی عجیب سبز روشنی میں نہا گئی۔ نگرانی کرنے والا یا کرنے والے بلاشبہ جدید ٹیکنالوجی سے مسلح تھے۔ فلم کے لیے انفراریڈ کا استعمال کیا جارہا تھا۔ کیا ہسپانوی ہوٹل میں ڈرگ ڈیل کررہا تھا؟ پندرہ منٹ تک کچھ بھی نہیں ہوا...... اچانک ایک شاندار آدمی ٹیکسیڈو سوٹ میں دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے سائڈ سے نظر آیا تھا۔ ساتھ حسینہ، فتنہ ساماں بھڑکیلے لباس میں ہمراہ تھی۔ میری دھڑکنوں میں اضطراب بڑھ گیا۔ معاً خاموش فلم میں آواز شامل ہوگئی۔ کیمرے نے منظر کلوز اَپ کیا۔ عورت بلا تکلف، بلا تامل مرد کے ساتھ لپٹ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عام فلم پورنا فلم میں تبدیل ہوگئی۔ دونوں کی زبان بھی بے لباس تھی...... میں مرد کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مرد کا پورا چہرہ سامنے آتے ہی میں نے کرسر کو پاز (Pause) پر اتنی شدت سے دبایا...... گویا ماؤس ہی ناکارہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ وہ برونکس کا ڈسٹرکٹ اٹارنی جان میڈ تھا۔ میں یہ جان چکی تھی کہ اسکاٹ وہ نہیں کرتا تھا جو اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا لیکن اس نے یہ کیسے کیا...... وہ اس حد تک...... اوہ، DVD پر انشورنس ٹھیک ہی لکھا تھا۔ یہ فلم اس کے لیے بونس تھی۔ یہ حادثاتی طور پر ہوا یا پلان تھا۔ پلان تھا تو وہ تنہا نہیں کرسکتا تھا۔ یقیناً وہ ڈرگ ڈیلرز کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ گندی رقم کے بعد بلیک میلنگ۔ جان میڈ وہ آدمی تھا جو اسکاٹ کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے بدبودار کپڑوں سے بھرے برتن کا ڈھکنا بند کردیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میری آزادی مشکوک ہے۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے وقتی طور پر استعفیٰ دینے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ بجائے اس کے میں نے پیر سے ایک ہفتے کی چھٹی لینے کا فیصلہ کیا...... اس میں کسی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ نئے شیڈول کے مطابق میں تفریح میں مشغول ہوگئی۔ واک، وڈیو، پال اور کھانا وغیرہ۔ نئے دن...... نئی سرگرمیاں بے فکری اور تازگی۔

دفعتاً جمعرات کے دن کلہاڑا پھر گرتا ہے۔ یہ پیغام کی شکل میں تھا جو گویا پاتال سے آیا تھا۔ دس بجے پیغام کا اشارہ پلکیں جھپکا رہا تھا۔ میں نے پیغام پڑھا...... ''ڈیئر مِنٹیو اسٹل ول، میں ڈسٹرکٹ اٹارنی جیفری فشر ہوں۔ میں باخبر ہوں کہ تم چھٹیوں پر ہو۔ لیکن ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ اسکاٹ کیس کی چند کڑیاں ملانا باقی ہے۔ کل دس بجے اچھا رہے گا۔ برونکس کاؤنٹی کورٹ ہاؤس، دوسری منزل۔''

میں نے کئی مرتبہ پیغام پڑھا۔ سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ ڈی اے ہوم سائڈ آفس میں میرے کافی دوست تھے...... لیکن فشر سے شناسائی سب سے کم تھی۔ بظاہر پیغام مختصر اور سرسری تھا۔ لیکن اتنا غیر اہم بھی نہیں تھا کہ میں پُرسکون رہتی۔ میں آنکھیں بند کرکے سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ کیس کی کون سی کڑیاں ملانی ہیں؟ میں نے کہاں غلطی کی ہے؟ میں ہر طرح سے ایک قدم آگے تھی۔ بالفرض پال پر مرڈر چارج آتا ہے...... تب بھی اسے کیسے ثابت کیا جائے گا۔ یہ کیسا جال، کیسا پھندا تھا کہ میں ہر مرتبہ نکل کے پھر الجھ جاتی تھی۔ جان کب اور کیسے چھوٹے گی۔ یہ جال نہیں دلدل تھی۔ اسکاٹ کے ساتھ ایک رات گزارنے کے یہ دلدل میں نے خود تخلیق کی تھی۔ خنجر کو بھی دیکھ لوں گی۔ معاً مجھے غصہ آگیا۔ وکٹر اور اسکاٹ خود کون سے معصوم تھے۔

☆☆☆

وہ رات تقریباً شب بیداری کی نذر ہوگئی۔ صبح گن اور بیج کے ساتھ میں نے اپنا پسندیدہ ارمانی ایکسچینج سیاہ سوٹ منتخب کیا۔ اسکرٹ میں ایک جانب گھاؤ تھا۔ کام پر جانے کے لیے لباس نامناسب تھا لیکن میں کون سی ڈیوٹی پر تھی۔ ڈیزائنر کھلے منہ والے سینڈل پاؤں میں ڈالے...... ڈی، اے آفس میں میٹنگ نہیں ٹکراؤ تھا۔ میں اس جھڑپ کے لیے ہر داؤ کھیلنے کے لیے تیار تھی...... نفسیات بھی شامل تھی۔ بساط پر دفاعی انداز کی گنجائش نہیں تھی۔

میں دس بجنے سے ٹھیک تیس منٹ قبل جادھمکی۔ فشر کی ڈیسک کے دوسری جانب تین اسسٹنٹ ڈی اے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک چنچل اداکارہ کے مانند بے نیازی سے اندر گئی۔ میٹھی چال کے ساتھ ارمانی کی جیکٹ کا پنکھ لہرایا اور ہولسٹر کے ساتھ گلوک کی نمائش ہوگئی...... گن بردار ڈانسر۔

''ہائے دوستو... کیا ہورہا ہے؟'' میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں...... ایک کے بعد دوسرے، تیسرے اور

pklibrary.com

فشر کی آنکھوں میں۔ یہ ایک ڈرامائی انٹری تھی۔ کوئی سنبھل نہ سکا۔ خاموشی تھی۔

''خاموش رہنا آپ کا حق ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن کیا یہ مضحکہ خیز نہیں ہے؟''

ایک ایک کر کے تینوں وکلا کھسک لیے۔ میں اور فشر تنہا تھے۔ میرے آخری وار نے فشر کو کرسی سے گرا ہی دیا۔ میں نے ایک ٹانگ کا سہارا لیا اور ایک سائڈ ڈیسک پر ٹکا کے بیٹھ گئی۔ گویا ٹینس کا مقابلہ تھا۔ گیند حریف کی توقع کے برخلاف پھینکو۔ میرے اسکرٹ کے گھاؤ والی ٹانگ نمایاں ہو گئی تھی۔ فشر کی عمر چالیس سے کم تھی...... سر پر بال بھی کم تھے۔

''فشر تم مجھے دیکھنا چاہتے تھے؟'' میں نے کہا اور دیکھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''اوہ، ہاں...... یس، ویل۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''میرا مطلب تھا...... مجھے یقین ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ فائل...... ایک سیکنڈ۔'' وہ فائل تلاش کرنے لگا۔ میں دیکھتی رہی۔ پہلا راؤنڈ میں جیت گئی تھی۔ سوال جواب اعصاب کی کشمکش ہوتی ہے۔ فشر پیغام بھیج کر اپنے تئیں انچارج بن گیا تھا۔ فی الحال اس کی خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ میری واپسی فاتحانہ انداز میں ہو گی۔

اچانک وہ زمین سے اگا یا آسمان سے ٹپکا...... فشر کا باس مارش۔ مارش، فشر سے خاصا مختلف تھا۔ بے حد پُرسکون، ٹھنڈا اور کمپوزڈ۔ میرے لباس اور اسٹائل نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کی پشت کو چوما۔ ''لورین، کیسی ہو؟'' اس نے کہا۔ ''دراصل میٹنگ کے پیچھے میرا ارادہ شامل تھا۔ کیوں نہ میرے آفس میں چلیں؟''

میں نے اپنے اندرونی بھونچال کو سطح پر نہیں آنے دیا۔

☆☆☆

''لورین، سنو...... میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ حقیقتاً تم ایک اچھی افسر ہو، باصلاحیت سراغ رساں اور......''

''مارش میں شادی شدہ ہوں۔'' میں مسکرائی۔

''میں آگاہ ہوں۔ او کے میں مطلب کی بات پر آتا ہوں۔ اسکاٹ کے قتل سے کیا تعلق ہے؟''

بوم پھٹا۔ جبکہ میں توقع کر رہی تھی کہ ایسا نہیں ہو گا۔

''یقیناً'' میں نے مسکراہٹ برقرار رکھی۔ ''میں اس کیس کی ہومی سائیڈ انسپکٹر تھی۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

میں نے پراسیکیوٹر کی آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے کیا کہنا چاہیے؟ کچھ کرو، اندر سے آواز آئی۔ لڑو یا مرو۔

''پھر کیا مطلب تھا؟ کیا مسئلہ ہے؟ کیس کلوز ہو چکا ہے۔''

''اورڈونز برادرز کے کلب سے اگاسی کا اٹارنی آیا تھا۔'' مارش نے انکشاف کیا۔ ''اس کا دعویٰ ہے کہ وکٹر کی باڈی کے قریب جو گن ملی، وہ تمہارے بیگ سے برآمد ہوئی تھی۔''

''اور یہ کہ اس گن سے ریل کار کے قریب میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں ان جرائم پیشہ افراد کا یقین فوراً نہیں کر سکتا...... میں واقف ہوں کہ اس گن سے وہ تم اور مائیک پر گولیاں برسا رہا تھا لیکن اس کا میں کیا کروں؟'' اس نے دراز میں سے ایک شیٹ نکال کر ڈیسک پر رکھی۔ وہ اسکاٹ کی فون کالز کا ریکارڈ تھا۔ مجھے لگا بازی الٹ رہی ہے۔ بوکھلاہٹ میں میرا دھیان مائیک کی طرف گیا۔ نہیں...... میں ہی ایک حقیقت بھول گئی تھی۔ [illegible] مارش نے اپنے حصے کی [illegible] الگ وصول کی تھی۔

میں نے پینترا بدلا۔ ''پھر کیا ہوا۔ میں اسے جانتی تھی۔ آپس میں بات کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔''

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک فوٹو کاپی نکالی۔ یہ موٹر بائیک کا پارکنگ ٹکٹ تھا۔ غیر قانونی پارکنگ۔ تاریخ اور جگہ کی نمایاں نشاندہی کی گئی تھی۔ مقام میرے گھر سے نصف بلاک دور تھا اور وقت بتا رہا تھا کہ پارکنگ کے چند گھنٹے بعد اسکاٹ کی موت ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری مزاحمت دم توڑ رہی ہے۔ یہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مزید کچھ کہنا بے معنی تھا۔ اگاسی کے اٹارنی کا دعویٰ، فون ریکارڈ، بائیک کی پارکنگ اور موت کا وقت...... یہ نکات مارش کے لیے ضرورت سے زیادہ تھے۔

''لورین، گرینڈ جیوری کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ گواہ اور شہادت بھی نکال لوں گا۔ میں نے اس سے کہیں زیادہ مشکل کیسز جیتے ہیں۔ میں تمہیں شک کا فائدہ دینا چاہتا ہوں۔ تم دوست ہو۔ سب جانتے ہیں کہ تم گن فائٹ میں زخمی ہوئی تھیں۔ میں ابھی پروسیڈنگ میں نہیں گیا ہوں۔ تمہارے لیے یہ آخری موقع ہے اور پہلا بھی۔ مجھے بتا دو کیا ہوا تھا۔ مجھے مدد کرنے میں آسانی ہو گی۔''

مارش کا بھاشن بڑا دل پذیر تھا۔ میں اتنی دور نکل آئی تھی کہ اس موقع پر سچ بول کر بوجھ ہلکا کرنا یا رعایت وصول کرنے سے بہت سے افراد متاثر ہو جانے تھے۔ اول تو رعایت ملتی نہیں، مارش مجھے لبھا کر گھیر رہا تھا اور اسے کامیابی کا یقین تھا۔

ایسے ہی کسی موقع کے لیے میں نے پلان B تیار رکھا تھا۔

میں نے ہولسٹر سے گلوک کھینچا۔ مارش کی آنکھوں کا تاثر پہلی مرتبہ بدلا۔ ''کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا۔

''کس بارے میں؟'' اس کی بے پروائی اور اعتماد لوٹ آیا۔

''ایسی ہی گن تھی اسکاٹ کی؟''

''تم وقت ضائع کر رہی ہو۔'' اس نے منہ بنایا۔

میں مسکرائی، گلوک واپس رکھا۔ میں اسے ہلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ''مارش تم نے اچھا کام کیا ہے۔ کاغذی کارروائی بھی اچھی ہے۔ لیکن وڈیو کی شہادت کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہاٹ؟'' پہلی بار اس کے تاثرات میں حیرت ہی حیرت تھی۔ ''لورین پلیز، خرافات بند کرو۔ مجھے اور بھی کام......''

''وڈیو، مارش...... سب سے بڑا اور خطرناک گواہ۔ تمہیں میرا کام پسند ہے۔ وڈیو تم خود دیکھو۔'' میں نے شولڈر بیگ سے لیپ ٹاپ نکالا۔ جسے میں بیگ میں کم ہی رکھتی تھی۔ زیادہ تر یہ کار میں ہوتا تھا۔ جیکٹ کی جیب سے DVD نکال کر لگائی اور پلے کرنے کے بعد لیپ ٹاپ کا رخ مارش کی طرف کر دیا۔

''DVD کی درجنوں کاپیاں تقسیم کے لیے تیار ہیں...... لیکن تم میرے دوست ہو۔'' میں اٹھ کر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو جائے گا...... یا مجھ پر فخر کرے گا کہ میں خود کو بچانے کے لیے رنگ میں ننگے ہاتھوں باکسنگ کے لیے تیار ہوں۔

DVD میں نظر آنے والا مارش کا باس جان میڈ تھا۔ نومبر میں الیکشن تھے۔ جان میڈ نے ڈی اے آفس سے اوپر جانا تھا۔ مارش اس کا رائٹ ہینڈ تھا۔ میڈ کی جگہ ڈی اے آفس مارش کو چلانا تھا۔ جان میڈ انسٹی ٹیوشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ مارش کی نظریں صرف برونکس ڈی اے آفس پر ہی نہیں تھیں۔ وہ مزید پیر پھیلانا چاہتا تھا۔ پریس میں وہ ابھی برونکس کا بارک اوباما بنا ہوا تھا۔ سیاسی حقیقت اور تقاضوں کے تحت اسے جان میڈ کی سرپرستی کی ضرورت تھی۔ الیکشن تک وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ میڈ کا جہاز کریش ہوتا تو مارش بھی ساتھ جھلس جاتا۔ اگر اس فلم کا مرکزی کردار مارش خود ہوتا تو کیا بات تھی۔

مارش نے زور سے لیپ ٹاپ بند کیا اور میں کھڑکی سے واپس نشست پر آ گئی۔ ''تو ڈو کے کیا؟'' میں نے کہا۔ کمرے میں بوجھل سناٹا۔ کھڑکی میں میری جگہ مارش کھڑا تھا...... لب بستہ۔ بالآخر اس نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔

''شہادت۔'' میں نے دہرایا۔ ''تمہارے پاس بھی اور میرے پاس بھی۔ کیا خیال ہے؟''

وہ کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ ''لورین، تم نے اسے ہلاک کیا تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نے اخبارات نہیں دیکھے۔ یہ کام وکٹر نے کیا تھا۔ خیر میں استعفیٰ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اپنے باس کا خیال رکھنا۔ میں نے DVD نکال کے جیب میں رکھی اور لیپ ٹاپ بیگ میں۔

''ہماری دوستانہ گفتگو یہاں ختم ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

مارش نے لائٹر نکالا اور اسکاٹ کا فون ریکارڈ سلگا کے باسکٹ میں ڈال دیا۔ پھر اس نے پارکنگ ٹکٹ کو آنچ دکھائی......

''لورین، میٹنگ ختم۔'' اس نے جھکی ہوئی آواز میں کہا۔ میرے جانے تک وہ پلٹا نہیں تھا۔

''واقعی میں نے اسے نہیں مارا۔'' میں نے بلڈنگ سے باہر آ کے سرگوشی کی۔

☆☆☆

دن رنگ چمن تھا۔ گل تھے، بہار اور گلستان۔ اور رات صنم پرست و بادہ پرست...... عالم بے خودی...... مدہوشی۔ اعصاب شکن مرحلوں کے بعد ٹکانی (ریزورٹ، اٹلی) کا ٹرپ لاجواب تھا۔ ''مستقبل کے نام پر۔''

''مستقبل کے نام پر۔'' میرے جام نے پال کے جام کو چھوا۔ ہم ساتھ تھے...... محفوظ تھے...... آزاد تھے۔

☆☆☆

ہم پلے گراؤنڈ ٹینس کورٹ، بیس بال فیلڈ کے ساتھ گزرتے چلے گئے اور ایک بنگلے کے سامنے رکے۔ جس کے قریب پارک اور ایک ندی تھی۔ سورج ڈوب گیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟ سیلز آفس؟'' میں نے استفسار کیا۔

pklibrary.com

پال نے گاڑی کی چابی نکالی۔ ''آؤ۔'' اس نے کہا۔
''تمہاری آمدنی بڑھ گئی ہے لیکن یہ پھر بھی بہت قیمتی ہیں۔''

''ایسا ہے لیکن یہ شہر سے دور ہیں۔ ہم بہ آسانی سنبھال لیں گے۔ محل وقوع شاندار ہے۔ مستقبل میں ان کی قیمتیں آسمان پر ہوں گی۔'' پال نے کہا۔ بعض مقام پر تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہاں تعمیراتی مشینیں اور سامان بکھرا ہوا تھا۔ ریت اور پتھروں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں موجود تھیں۔ ہم خراماں خراماں چل رہے تھے۔ پال ایک نیلگوں رنگت کے بنگلے کے سامنے رک گیا۔

''تم کو ماسٹر سوئٹ دکھاتا ہوں۔''

''کیا ہم اندر جا سکتے ہیں؟''

''اوہ کم آن لورین۔'' ہم گاڑی کی ہیڈ لائٹس کھلی چھوڑ آئے تھے۔ لہٰذا تاریکی پریشان کن نہیں تھی۔ پال نے بنگلے کے فرنٹ ڈور کا لاک کھولا...... کچن جہاز کے ہینگر کے مانند کشادہ تھا۔ پال نے اندرونی لائٹس آن کیں۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہماری بے بی یہاں پروان چڑھے گی۔

پال نے بوسہ دیا۔ ''رونے کی کیا بات ہے......؟''

ہم باہر [illegible] گاڑی کے قریب تھے۔ دفعتاً ہم نے کار کی روشنی بند ہوتے دیکھی۔

''یہ کیا...... کیا بیٹری ڈاؤن ہوئی ہے؟'' پال نے کہا۔ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ تاہم میرے اندر چھپے کوپ کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ ''تم یہاں رکو، میں جا کے دیکھتا ہوں۔''

''کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے؟'' میں نے کہا۔

''سراغ رساں پُرسکون رہو۔ یہ ساؤتھ برونکس نہیں ہے۔''

''میرا مشورہ ہے کہ ٹرپل A کو کال کرو یا پھر 911۔''

پال ہنس پڑا۔ ''تم ہمیشہ تفریح میں بھی پولیس وومین بن جاتی ہو۔ اس نے سیل فون کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو خالی تھا۔ ''میرا سیل فون تو کار میں چارجنگ پر لگا ہے۔ اپنا سیل فون دو۔''

''میرا کار کی عقبی نشست پر پڑا ہے۔''

''میں جاتا ہوں۔'' پال نے کہا۔

''محتاط رہنا۔'' میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

''فکر مت کرو۔ یہ کنکٹی کٹ ہے، سویٹی۔''

☆☆☆

وقت کی رفتار گویا سست پڑ گئی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ پال کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ میں سیڑھیوں کی طرف گئی۔ جب مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور اچانک تاریکی چھا گئی۔

''پال؟''

طاقتور فلیش لائٹ روشن ہوئی۔ پال نے گاڑی میں سے نکالی ہوگی۔ میں نے سوچا لیکن گھر کی روشنیاں......؟

معاً فلیش لائٹ کا رخ میرے چہرے کی طرف ہو گیا۔ وہ ہال میں کھڑا تھا۔ نظر چندھیا گئی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سیڑھیوں پر تھی۔ ''پال مذاق بند کرو۔'' میں نے کہا۔

''مذاق...... کتیا......!'' کوئی غرایا۔ وزنی ہاتھ میرے سینے سے ٹکرایا۔ میں نیچے گر گئی۔ تیس سیکنڈ تک میں مفلوج رہی پھر آنکھیں سکیڑ کر چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

''کون ہو تم؟''

''نہیں پہچانا۔'' آواز میں نفرت تھی۔ معاً فلیش لائٹ کا رخ آنے والے نے اپنے چہرے کی طرف کر دیا۔ اوہ گاڈ، میرا پورا بدن لرز اٹھا۔ وہ و[illegible] کا بھائی مارک تھا۔ اگلی ساعت میں مجھے اپنی گن کا خیال آیا۔ اس نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا۔

''گن گاڑی میں ہے۔''

''یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا بھروسا کرو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''اٹھو۔'' اس نے پھنکار ماری۔ میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے میرے ہاتھ پیچھے لے جا کر ہتھکڑی ڈال دی اور کالر پکڑ کے سیڑھیوں سے نیچے دھکیلا۔ پال کی کار کے قریب رک کر اس نے زمین کی طرف روشنی پھینکی۔ جہاں خون ہی خون تھا۔ لائٹ کا رخ تبدیل ہوا۔ پال کا تقریباً پورا جسم گاڑی کے اندر تھا۔ چہرہ چاک کے مانند سفید نظر آ رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔ میں گھٹنوں پر گر گئی۔ ''اوہ نو...... اوہ گاڈ...... پال!'' مارک نے مجھے گھسیٹا اور میری نظر وین پر پڑی۔

☆☆☆

بے بسی کا عالم تھا۔ میں وین کے فرش پر پڑی تھی۔ حواس بحال ہونے میں پورے دس منٹ صرف ہوئے۔ میری قوت گویائی لوٹ آئی۔

''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟''

pklibrary.com

"کہیں دور نہیں۔" وہ بولا۔ "شاید کنکٹی کٹ بارڈر سے رہوڈ آئی لینڈ......"

میرا دل ڈوب گیا۔ میں رونا چاہتی تھی لیکن ایسی مخدوش صورتِ حال میں رونا بے معنی تھا۔ اتنی بربادی اور اذیت جو میں دوسروں کو دے آئی تھی...... مثلاً بروک اور اس کے بچے...... اب کرنے کا کام صرف یہ تھا کہ میں اپنی فکر کروں۔ پال کا خیال آتے ہی میرا جسم سن ہونے لگتا۔ دل میں دعا تھی کہ خدا اسے بچا لے۔ میں خاموش پڑی رہی۔ "مارک اور ڈونز" ریڈیو پر کسی کو مغلظات سنا رہا تھا۔

"ہاں، بتاؤ تم اور تمہارے ساتھی نے میرے بھائی کو کیوں ہلاک کیا؟ اور بعد ازاں اسے قاتل کا روپ دے دیا۔ اس نے اسکاٹ کو نہیں مارا تھا۔ میں جانتا ہوں۔ تم بھی بے خبر نہیں۔ آخر کیوں؟"

مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ مارک کے خیال میں بتانے کے لیے میرے پاس کچھ تھا۔ میرے پاس ٹینس کھیلنے کا چانس تھا۔ مجھے خود کو بچانے کے لیے بال غلط رخ پر پھینکنا تھی۔

"ہمیں مخبر نے ٹپ دی تھی۔" بالآخر میں نے کہا۔

"مخبر؟" وہ بولا۔ "اس کا کوئی نام ہوگا؟"

"یقیناً، لیکن فی الوقت مجھے نہیں معلوم۔ ٹپ اسکاٹ کی ٹاسک فورس کے ذریعے آئی تھی۔ مخبر تمہارے اندر کا آدمی ہے۔ مجھے وقت دو تو میں مدد کر سکتی ہوں۔"

"واؤ، جھوٹ بولنے میں تم اسکاٹ سے پیچھے نہیں ہو۔"

"تم اور وہ دوست تھے؟" میں نے کہا۔

"اسکاٹ میرے گھر کا آدمی تھا۔ یہ پرانی بات ہے۔" اس نے میرے تاثرات دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ "جس رات اس کا قتل ہوا، ہم دونوں کی ملاقات طے تھی جو اس نے ملتوی کر دی تھی کیونکہ اسے رات گرماگرم سراغ رساں کے ساتھ گزارنی تھی۔ تم جانتی ہو وہ ہومی سائڈ ڈیٹیکٹو کون تھی؟"

میں سناٹے میں رہ گئی۔ مایوسی گہری سیاہ چادر کے مانند میرے گرد لپٹ رہی تھی۔

"کیا اب بھی تم جاننا چاہتی ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

مارک نے آنکھ ماری۔ "فلائی کریں گے۔ ایک گھنٹا خرچ ہوگا۔ ہم اٹلانٹک کے اوپر ہوں گے۔ غور سے سنو۔ تمہاری ہتھیلیوں میں اور تلووں میں چر کا لگایا جائے گا۔"

میرے رونگٹوں نے سر اٹھایا۔

"گھبراؤ مت لیڈی۔" وہ بولا۔ "میں جہاز کی بلندی کم کروں گا۔ پھر تم کو گہرے نیلے سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ تصور کرو کیا ہوگا؟"

میں نے چاہا کہ ہاتھ کانوں پر رکھ لوں لیکن میرے ہاتھ مقفل تھے۔ یوں لگا کہ وین میں آکسیجن کی مقدار کم ہو گئی ہو۔

"اب تمہارے پاس دو امکانات ہوں گے۔" اس نے پھر آنکھ ماری۔ آکسیجن کم نہیں ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ دمے کا حملہ ہوا تھا۔ سانس لینے کے لیے پھیپھڑوں کو زور لگانا پڑ رہا تھا۔

"تیرنے کی کوشش کرو۔ قسمت نے ساتھ دیا تو تم کسی گزرتے ہوئے جہاز یا کشتی کو متوجہ کر لوگی۔" اس کی آواز سرد ہو گئی۔ "تمہارے ہاتھ پیروں سے خون رس رہا ہوگا۔ ایک نہیں، دو نہیں...... سیکڑوں شارکس متوجہ ہو جائیں گی...... ہیمر ہیڈ، بلیو شارک، اسٹینڈ ٹائیگر اور ممکن ہے کہ ایک دو گریٹ وہائٹ بھی تمہارا سینڈوچ بنانے کے لیے وہاں آجائیں۔ لورین، یقین کرو ایک بدترین موت تمہاری منتظر ہے...... تصور کرنا محال ہے۔ تم زندہ مچھلیوں کے پیٹ میں جاؤ گی، بیچ سمندر میں۔ میں اپنے بھائی سے محبت کرتا تھا...... بھائی کی طرح۔"

☆☆☆

میں لاش کے مانند پڑی تھی۔ وحشت میری نس نس میں سما گئی تھی۔ مارک احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا...... معتدل رفتار۔ وہ خواہ مخواہ کسی کو متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب تک سب سے زیادہ میں نے کسے نقصان پہنچایا ہے۔ گھٹنے سکیڑ کر میں نے پیٹ سے لگا لیے۔

"تم کہاں ہو؟" میں نے بے بی کو مخاطب کیا۔ اس کی پیدائش میں سات آٹھ ماہ تھے۔ دیکھنے میں، میں حاملہ نظر نہیں آتی تھی۔ مایوسی کی جگہ رنج و غم نے لے لی تھی۔ "بے بی، آئی ایم سوری، سو سوری......" میں اشکبار ہو گئی۔ دفعتاً وین دائیں جانب لہرائی۔ مارک کسی پر چلایا۔

"اپنی لین میں رہو...... شرابی کی اولاد۔"

وین پھر لہرائی۔ میں ایک طرف لڑھکی۔ فوراً بعد وین کو دھکا لگا۔ ڈرائیونگ سائڈ پر وین کی دیوار اندر دب گئی۔ میں فرش پر لڑھک رہی تھی۔ سر بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ عجیب آوازیں تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وین کے دو پہیے سڑک پر

pklibrary.com

بال یا وبال

نہیں تھا۔

’’کتے کا بچہ۔‘‘ مارک چلّایا۔ تھرتھراہٹ ختم ہوئی اور وین پھر رواں ہوگئی۔ میں پسنجر سائڈ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

’’وہ شرابی نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا...... وہ تمہارا شوہر ہے۔‘‘

میرے گرد اَن دیکھی تاریکی کی چادر پھیلنے لگی۔ تاہم میری حیرانی عروج پر تھی۔ مجھے بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پال کی حالت دگرگوں ہوگی۔ مارک ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ اتنی رفتار وین کے لیے نامناسب تھی۔ وہ ڈگمگا رہی تھی۔ میں پسنجر سیٹ تک پہنچنے کی کوشش کررہی تھی۔ مارک کی وین چھ سلنڈر XLE کیمری کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ مارک سائڈ مرر میں دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہوگیا۔ اس نے مغلظات بکتے ہوئے اچانک بریک دبائے۔ ٹائروں کی چیخ سنائی دی۔ پھر خاموشی۔ میری کوشش جاری تھی۔ میں نے دیکھا کہ مارک نے شولڈر بیلٹ الگ کردی تھی۔

معاً وین کے عقب میں زوردار دھماکا ہوا۔ وین اچھل کے منہ کے بل آگے گئی۔ عقبی حصہ اٹھا پھر دھچکے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں شاک میں تھی۔ وین کا بھی ڈس ڈور کاغذ کے مانند کھل کے مڑ گیا تھا۔ کیمری کا فرنٹ دھواں دے رہا تھا۔ ونڈشیلڈ ٹوٹ گئی تھی اور حفاظتی ائربیگ کھل گیا تھا۔ پال کا خون آلود چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ کم ازکم وہ پلکیں جھپکا رہا تھا۔ میں رخ پھیر کر پسنجر سیٹ پر پہنچ گئی۔

مارک نے مجھے میرا ہی گلوک دکھایا اور وین کا دروازہ کھولا۔ ’’گھبراؤ مت، لورین۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ہنی، میں ابھی آیا۔ ہمارا شیڈول وہی ہے جو میں نے بتایا تھا۔‘‘ وہ وین سے اتر گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ میرے سینے پر ہنٹر بن کے برس رہی تھی۔ وہ پال کو ختم کرنے جارہا تھا۔ پال مرنے والا ہے۔ نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہم دونوں کے لیے آخری موقع تھا۔ پال نے جان کی بازی لگادی تھی۔ میں نے چلّانا شروع کردیا۔ ساتھ ہی میں نے خود کو ڈرائیونگ سیٹ پر گرایا۔ میں دائیں بازو کے بل کھلے دروازے سے گرنے والی تھی۔ میرے مقفل ہاتھوں نے ہینڈ بریک تھام لیا۔ سنبھل کر میں نے ایکسلریٹر دبایا اور پیشانی ہارن پر رکھ دی۔ گیئر نیوٹرل میں تھا۔ ہارن اور ریس کی آوازوں میں میری چیخیں شامل تھیں۔ نہ صرف پبلک

متوجہ ہوئی بلکہ سائڈ مرر میں، میں نے مارک کو ٹھٹکتے دیکھا۔ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر ہینڈ بریک سے ہاتھ ہٹا کر بمشکل گیئر پر مارا۔ میں نشست پر ترچھی حالت میں تھی۔ گاڑی آگے بڑھی اور متعدد ہارن چلا اٹھے۔ وین ٹریفک میں تھی۔ مارک بھنا کے دوڑا اور بروقت کھلا دروازہ تھام کر اندر ہاتھ ڈالا۔ انجن بند کر کے چابی جیب میں ڈالی۔ ''پاگل کتیا...... کہاں جا رہی ہے۔'' اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور پسنجر سیٹ کی طرف دھکیل دیا۔ ''وہیں پڑی رہنا ورنہ......'' وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ جو ہوا، جو میں نے دیکھا...... وہ ہمیشہ کے لیے میری یادداشت میں محفوظ ہو گیا، دل بہت زور سے دھڑکا۔ گویا کسی منتر کے زیرِ اثر وہ آناً فاناً دروازے سمیت غائب ہو گیا تھا۔ وہ لوڈ ڈ کار کیریئر تھا جس میں شیوی تاہو بھری ہوئی تھیں...... رفتار کم سے کم ستر اسّی کے درمیان تھی۔ ٹریلر نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ہائی وے پر اونچے ٹریلر کو شاید پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ ٹریلر زن سے میرے قریب سے گزرا تھا۔ اس کا عقبی حصہ میری نظر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

خدا نے میری سن لی تھی یا میرے حق میں دوسروں کی سن لی تھی۔ پال روڈ سائڈ پر ٹوٹی پھوٹی ٹویوٹا [illegible] کے قریب پڑا تھا۔ [illegible] لورین سے نکل گئی۔ میں تیز دھڑکنوں کے ساتھ دعا کر رہی تھی۔ ''پال میں یہاں ہوں۔

''لورین۔'' اس کے دانت بج رہے تھے۔

''خاموش رہو۔ کچھ مت بولو۔'' میں گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ پال کے سر کی پشت پر ضربیں لگائی گئی تھیں۔ میرے ذہن میں ''سب ڈیورل ہیماٹوما'' کی اصطلاح ابھری۔ یہ ایک کرشمہ تھا کہ وہ ہوش میں تھا۔ ہم دونوں زندہ تھے۔ ''حرکت مت کرو۔'' میں نے سرگوشی کی۔

دو اسٹیٹ کارز ٹریفک میں سے نمودار ہوئیں۔

☆☆☆

''ملک اور شوگر او کے؟'' ٹروپر ہیر نگٹن نے کہا۔ ہم ''یوکون'' ہیلتھ سینٹر کے ایمرجنسی روم میں تھے۔ ہیر نگٹن میرے قریب آئی۔ میرا ایج دیکھتے ہی ٹروپرواکر اور ہیر نگٹن، اٹینشن ہو گئے تھے۔ ایمبولینس کا انتظار کیے بغیر پال کو انہوں نے ہیر نگٹن کے کروزر میں منتقل کیا...... اور قریب ترین اسپتال جا پہنچے۔

''تمہاری بے بی اور شوہر...... او کے؟''

''الٹرا ساؤنڈ کے مطابق سب ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پال کے سر کی چوٹ شدید ہے۔ وہ نیم بے ہوش ہے۔ خدا کا شکر ہے، ڈاکٹروں کے مطابق وہ ٹھیک ہو جائے گا...... اور تم دونوں کا بہت شکریہ۔''

''کم آن ڈیئر۔'' ہیر نگٹن نے کہا۔

''مارک اور ڈونز......''

''وہ مر دود۔'' ٹروپرواکر نے کہا۔ ''وہ کئی سوفٹ دور جھاڑیوں میں پڑا تھا۔ اس کو محض دیکھ کر فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ اس کی حالت ایسی ہے جیسے کسی کو ریل ٹریک پر رکھا جائے اور ریل گاڑی اس پر سے گزری ہو......''

''تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گی۔'' ہیر نگٹن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اکیڈمی سے تازہ تازہ باہر آئی تھی۔

''اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔'' ایک چہکتی ہوئی مردانہ آواز آئی۔ میں نے گردن گھمائی۔ پارٹنر مائیک کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''یہ کنکٹی کٹ والے...... انہوں نے باس کو کال کی تھی اور باس نے مجھے روانہ کر دیا۔'' مائیک نے میرا ہاتھ دبایا۔ [illegible] فوراً نکل پڑا۔ حیرت ہے بھائی۔'' تمہارے پیچھے تھا۔ اپنا [illegible] چھوڑ کے یہاں [illegible] کی سیر کر رہا تھا۔ لورین نے شاندار کام کیا ہے۔ میرے لیے آج کی بہترین خبر ہے۔''

میں نے سر ہلایا اور بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ میں نے اس کے ساتھ حریفانہ سلوک کیا اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھے سہارا دینے کے لیے یہاں موجود تھا۔

''مائیک، مجھے معاف کر دو۔'' میں نے کہا۔ ''آئی ایم......''

''معاف کیا...... اگر آج کا ڈنر میرے لیے تمہاری طرف سے۔''

☆☆☆

ڈنر ہم نے اسپتال کے قریب ریسٹورنٹ میں کیا۔

''کوئی نئی بات لورین؟'' اس کی آواز میں پرانی شوخی تھی۔ میں نے کافی کی چسکی لی۔ یہی وقت تھا کہ میں ہر بات سچ سچ بتا دوں۔ مائیک نے آنکھ ماری۔

''کم آن، لورین۔ میں نے وکٹر کو مارا تھا۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم نے مارک کا خاتمہ کر دیا۔ اب دنیا میں تمہارے علاوہ کون ہے جو مجھے سچ بتائے گا۔''

میں نے کپ نیچے رکھ دیا۔ میں نے بولنا شروع کیا۔

نظریں کافی کپ پر تھیں۔ الف سے بے تک میں نے تمام کہانی سنا ڈالی۔ ہر گرہ کھول دی۔ ہر مرڈر پر اسرار کے بارے میں بتا دیا۔ صرف ایک بات نہیں بتائی کہ اسکاٹ کو مار کس نے تھا۔

مائیک نے سڑک کی طرف کار ہیڈ لائٹس کو دیکھا۔ ڈائٹ کوک کا آخری سپ لیا اور میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''لورین، ایک بات بتاؤں؟''

''کیا؟''

''احمق سمجھو یا پاگل...... جو ہوا، جو میں نے سنا۔ میں بہت خوش ہوں۔ ممکن ہے ان دونوں نے اسکاٹ کو قتل نہ کیا ہو۔ لیکن ٹھیک ہی ہوا۔ وہ دونوں ایک وبائی بیماری کی طرح تھے اور اسکاٹ کے بارے میں مارک نے خود ہی بتا دیا۔ جہنم میں جائیں...... تینوں کے ساتھ ٹھیک ہی ہوا۔''

''میری اطلاع کے مطابق تم جاب چھوڑ رہے ہو؟''

''ہاں، میں نے تمام چھٹیاں کیش کرا لی ہیں۔ کاغذی کارروائی کر چکا ہوں۔ آج میرا آخری دن ہے۔'' مائیک نے کہا۔ ''سان جوآن میں میرے چھوٹے بھائی کا اپنا بار ہے۔ وہ مجھے مہینوں سے وہاں آنے کے لیے کہہ رہا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''سارا قصور میرا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' اس نے میرے آنسو صاف کیے۔ ''گولی میں نے چلائی تھی۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے آزردگی سے کہا۔

''بھول جاؤ۔ بس ایک بات کا افسوس ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''تم نے جو کچھ مارش کے ساتھ کیا...... میں وہاں نہیں تھا۔ کاش میں اس وقت اس کے تاثرات دیکھ سکتا۔ تم کسی جنگلی بلی سے کم نہیں ہو۔ میں نے تمہاری غلطیوں کو بھلا دیا ہے۔ ہم پارٹنر ہیں۔ جو ہوا میں اسے کسی اور زاویے سے دیکھتا ہوں۔ میرے لیے تم آج بھی اچھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم آئندہ غلطی سے بچو گی۔ کہیں نہیں پھسلو گی۔ اب تمہاری فیملی سب سے مقدم ہے۔''

''مائیک میں بھرپور کوشش کروں گی۔''

اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ''کبھی سان جوآن آنے کا موقع ملے تو مجھ سے ضرور ملنا۔ اس وقت ہم ایکس پارٹنر ہوں گے۔''

☆☆☆

کام پر میرا پہلا دن تھا اور کیریئر کا آخری۔ میں مائیک کے نقش قدم پر تھی۔ میں نے باس کے کمرے میں قدم رکھا۔ ڈیرک کی نیلی آنکھیں میرے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں۔ اچانک اس نے پین کاغذ پر پٹخا۔

''پلیز۔'' اس نے کہا۔ ''نہیں، تم بھی؟ کچھ مت کہنا۔ لورین ایک کو ہم نے کھو دیا اور اب دو مزید جا رہے ہیں۔ پلیز نہیں۔ تمام مسئلے ختم ہو چکے۔ کوئی چھوٹی موٹی بات ہوئی بھی تو میں سنبھال لوں گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ہاں، میں پریگننٹ ہوں۔''

ڈیرک ہونقوں کے مانند مجھے گھورنے لگا۔ پھر چھت کی طرف دیکھا اور آنکھیں مسلنے لگا۔ بالآخر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ڈیسک کے گرد گھوم کے آیا اور باپ کے مانند مجھے گلے لگا لیا۔ اس نے یہ حرکت پہلی مرتبہ کی تھی اور شاید آخری......

''لیڈی، مجھے یاد نہیں...... کب میں نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی۔ لیکن تمہیں اور پال کو مبارک ہو۔ میری نیک خواہشات تم دونوں کے ساتھ ہیں۔ میں تمہیں مس کروں گا۔ جشن مناتے ہیں۔ چلو لنچ تمہارے ساتھ...... اور یہ کہ چھٹیاں ختم کر کے جاؤ۔''

''چھٹیاں...... او کے، میں بتا دوں گی۔''

لنچ کے دوران وہ باس کے بجائے پارٹنر کی طرح گپ شپ کر رہا تھا۔ لنچ ہم نے آفس میں ہی ارینج کیا تھا۔ لنچ کے بعد کافی کی طرف متوجہ ہوئے تو فون کی گھنٹی نے راگ چھیڑا۔

''یس؟''

''عجیب بات ہے۔ خیر اسے عمارت میں آنے دو۔''

''کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسکاٹ کیس کی گواہ، ریٹائرڈ اسکول ٹیچر۔ اس کا نام......''

''ایملی؟''

''ہاں، ایملی آئی ہے۔''

میرے اندرونی اعضا جگہ بدلنے لگے۔ ''اب کیا مسئلہ ہے؟''

''وہ انتظارگاہ میں ہے۔ معلوم کرو، کیا چاہتی ہے؟''

میں فی الفور اٹھ گئی۔

''کیا کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟'' میں نے ایملی سے سوال کیا۔

pklibrary.com

''میں توقع کر رہی تھی کہ میرے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ کوئی کال آئے گی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا تو میں خود چلی آئی...... کہ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔'' اس نے کہا اور میں نے سکون کی سانس لی۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد غیر اہم ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کتنے برس بعد اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا تھا......

''میں معذرت خواہ ہوں، ہم ضرور آپ کو کال کرتے لیکن کیس جلدی حل ہو گیا تھا۔ بہر حال میں آپ کی آمد کی قدر کرتی ہوں۔''

''اوہ اچھا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو گھر چھوڑ دوں؟'' میں گواہان کے لیے شوفر کی خدمات پیش نہیں کرتی تھی۔ لیکن یہ اسکول ٹیچر گزرے ہوئے خوفناک بحران کی آخری متعلقہ پرزہ تھی۔ جتنی جلدی ہو، مجھے اسے یہاں سے ہٹانا تھا۔

''او کے، ڈیٹیکٹیو۔'' وہ بولی۔ ''یہ اچھا رہے گا۔ میں کبھی پولیس کار میں سوار نہیں ہوئی۔ شکریہ۔''

''اوہ، شکریہ کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے باس کو [illegible] اور اسے [illegible] کر روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

آفس سے [illegible] کی خبر [illegible] ہی وقتاً فوقتاً اندر [illegible] چلے آرہے تھے۔ مبارک باد کا اور بہترین تمناؤں کا اظہار کر رہے تھے۔ الوداعی ڈرنک کے لیے زور دے رہے تھے۔ ان کی مسرت اور مبارک بادوں نے میرا دل چھو لیا تھا۔ کارڈز بھی چلے آرہے تھے۔

بعض نے افسردگی کا بھی اظہار کیا۔

''میں بھی تم سب کو بہت یاد کروں گی۔'' میں نے کہا۔ بالآخر شام سات بجے میں گھر کی طرف روانہ ہوئی...... گھر کے ڈرائیو وے میں پال کی کار نظر نہیں آرہی تھی۔ تاخیر کی صورت میں فون پر اطلاع دینا اس کی عادت تھی۔ میں نے اسے کال کرنے کے لیے سیل فون نکالا۔ معاً میری نگاہ گیراج کے اوپر کھلی ہوئی ونڈو بلائنڈز پر گئی۔ میری یادداشت کے مطابق ان کو بند ہونا چاہیے تھا۔ میں نے فون بند کر کے واپس رکھا۔ اطراف کا جائزہ لیا اور دھیرے سے حرکت پذیر ہوئی۔ میرا وہم ہے یا تخیل کی کرشمہ سازی۔ میرا ذہن دو رویہ امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کیا ''اور ڈونز برادرز'' کے دوست ہو سکتے ہیں...... میں نے گن ہاتھ میں لے لی۔ بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ وہم سمجھ کر ہی سہی...... محتاط رہا جائے۔ میں نے گھر کا چکر لگایا۔ کھڑکیوں کا جائزہ لیا۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ عقبی دروازے کے پردے کی جھری سے میں نے اندر جھانکا۔ کوئی حرکت، کوئی آواز نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد میری سوچ بدلنے لگی۔ وہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں گن واپس رکھنے والی تھی، میں نے ایک سایہ تیزی سے دائیں سے بائیں اوجھل ہوتے دیکھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ نبض کی رفتار یک لخت بڑھ گئی۔ کون ہے؟ کیوں ہے؟

میں نے جوتے اتارے...... نہایت احتیاط سے چابی کی مدد سے لاک کھول کر دھیرے سے ناب گھمائی۔ سانس روک کر اندر قدم رکھا۔ گن تیار حالت میں تھی۔

''شش...... ش......'' مدھم سرگوشی سنائی دی۔

اچانک روشنی ہوئی، جب میں فائر کرنے کے لیے تیار تھی۔

''سرپرائز۔'' متعدد آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

اوہ گاڈ! شکر ہے سیف ایکشن پسٹل تھا۔ ورنہ گولی چل گئی تھی۔ میری فیملی اور دوست تھے۔ تحائف سجے تھے۔ چھت رنگ برنگے غباروں سے بھری تھی۔ ایک کونے میں اسٹار رکھا تھا۔ سب میری بے بی کی وجہ سے تھا جس نے ابھی اس دنیا میں آنکھ نہیں کھولی تھی۔ [illegible] تھا۔ جو ٹریجڈی میں تبدیل ہونے سے بچ گیا۔ وہاں یک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے آنٹی لوسی کو دیکھا۔

''مام دیکھو۔'' میری بہن کی چار سالہ بیٹی نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ ''آنٹی لورین کے پاس گن ہے۔''

''سب ٹھیک ہے۔'' پال کی آواز آئی۔ وہ میری طرف لپکا اور گن واپس ہولسٹر میں رکھ دی۔

''ابھی گیارہ ہفتے ہوئے ہیں اور تم نے ''بے بی شاور'' کا پلان بنا لیا۔'' میں نے سرگوشی کی۔ پال نے میرے رخسار پر بوسہ دیا اور مڑا......

''ہیرو کوپ کا آخری دن...... پارٹی شروع کی جائے۔''

زندگی ایک بار پھر نئے معنی...... نئے رنگوں کے ساتھ طلوع ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''ہائے، اجنبی۔'' بونی نے اپنا بیگ ٹیبل پر پٹخا۔ گویا ٹیبل الٹنے کی کوشش کی۔ میں اس کی خواہش پر موٹ اسٹریٹ کے ریسٹورنٹ میں تھی۔ بے بی شاور کو گزرے کئی روز ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی سرجنٹ دوست کی طرف

دیکھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ میں تمہاری ریٹائرمنٹ اور بے بی شاور میں غیر حاضر تھی۔'' اس نے دیدے گھمائے۔

''بونی، میں یہاں ہوں نا تمہارے سامنے۔'' میں مسکرائی۔

''بحیثیت کوپ تم نے میرے علاوہ بہت سوں کو متاثر کیا۔ میں تمہارے اور پال کے لیے بہت خوش ہوں۔ تم کس طرح کام کرتی تھیں...... بے خوفی کے ساتھ۔ یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ تم یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر غائب ہو جاؤ گی۔ لورین مام۔''

''کچھ کھلاؤ گی یا بولتی رہو گی۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا تحفہ۔'' وہ بولی۔ ''اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں۔'' اس نے بیگ سے ایک بڑا لفافہ نکالا اور میرے حوالے کیا۔

میں نے لفافہ کھولا۔ اندر ایک کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ اور چند کاغذات تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی دوست کو دیکھا۔ ''کمپیوٹر پرنٹ؟''

میرے دل نے قلابازی کھائی۔ اب کیا ہونے جارہا ہے۔

''جمعہ کے روز یہ ایف بی آئی کی لیب سے موصول ہوا ہے۔'' بونی کے تاثرات میں کچھ سنجیدگی نظر آئی۔ ''یہ ڈی این اے کے نمونے کا رزلٹ ہے۔ نمونہ میں نے نیلے کمبل سے حاصل کیا تھا جس میں اسکاٹ کی باڈی لپٹی ہوئی تھی۔''

میری بینائی رخصت ہوگئی۔ نظروں کے سامنے برق کوندی تھی...... بے پناہ روشنی تھی۔ رعد کی چمک میرے بدن کو تراش کے نکل گئی۔

شادی کا پہلا سال۔ نیلا کمبل اور پکنک۔ اولاد کی خواہش پہلے ہی سال دلوں میں ہمک رہی تھی۔ میں جب بھی اپنے نسوانی نظام کی جانب سے مشکوک ہوتی۔ ڈاکٹر مارکس کے پاس چلی جاتی۔

میں نے پرنٹ آؤٹ پر نظر ڈالی پھر بونی کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے بتایا تھا...... کمبل پر سے ملنے والے خون کے دھبے اسکاٹ کے تھے؟''

''ہاں ایسا ہی......'' وہ بولی۔ ''لیکن بعد میں، میں نے کمبل پر سے مردانہ مادہ تولید دریافت کیا تھا۔ یہ نشانیاں خاصی پرانی تھیں۔ مادہ خشک اور ناقابلِ شناخت تھا۔ اتفاقاً میری نظر میں آگیا۔ میں اسے غیر اہم سمجھ رہی تھی۔ تاہم میں نے کھرچ کر ڈی این اے کے لیے روانہ کردیا۔'' میں خیالات میں غلطاں سوچ رہی تھی کہ کیس کلوز ہونے کے بعد نئے نئے انکشافات کیوں ہورہے ہیں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مادہ تولید کا ڈی این اے پال کا تھا لیکن یہ صرف میں جانتی تھی...... غالباً۔ بونی میرے بولنے کا انتظار کررہی تھی۔ بالآخر میں نے ہمت کی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''میں نے کوشش کی تھی لیکن اس دن صبح میں دونوں بھائیوں کے کلب پر چھاپا پڑا۔ پھر تمہاری، مائیک اور وکٹر کی شوٹنگ شروع ہوگئی۔ اگلے روز میں نے مائیک سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ کیس کلوز سمجھو۔ اسکاٹ کی گن، وکٹر کی تحویل میں تھی۔ بات ہی ختم ہوگئی۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

بونی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ڈیئر کیا کہوں؟ ڈی این اے کا مذکورہ رزلٹ وکٹر کا نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔''

میرے دماغ نے روشنی کی رفتار سے کام کیا۔ ان کے پاس پال کا ڈی این اے تھا۔ یہ حقیقت ہم دونوں کے لیے تباہ کن تھی...... دونوں میں تین...... بے بی بھی شامل تھی۔

''ڈی این اے رزلٹ کس کا ہے؟'' میں نے سرسری انداز اختیار کیا۔

''یہ نہیں معلوم۔'' بونی نے جواب دیا۔

او گاڈ شکر ہے۔ یہ اسی وقت معلوم ہوسکتا ہے جب وہ پال کا ڈی این اے حاصل کر کے میچ کریں اور پال کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا لیکن شومئی قسمت بونی کی بات جاری تھی۔

''ہمیں ماضی کے سرد خانے سے ایک اور ہی اشارہ ملا ہے۔''

''وہ کیا؟'' میرا دل کہہ رہا تھا کہ خود کو گولی مارلوں۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا۔

''ایف بی آئی کے کمبائنڈ ڈی این اے انڈیکس سسٹم (CODIS) کا ڈیٹا بیس مجرموں تک پہنچنے کے لیے مدد فراہم کرتا ہے۔ کمبل سے ملنے والا مادہ تولید کا ڈی این اے ایک اور ڈی این اے سے جاملا ہے۔'' بونی نے کہا۔

میری ریڑھ کی ہڈی کے مہروں نے جگہ چھوڑ دی۔ میرے اندر کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ کوئی رسی سے میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود میں کوئی سوال نہ کرسکی۔ بونی نے بات آگے بڑھائی۔ ''پانچ سال قبل واشنگٹن ڈی

pklibrary.com

سی میں مسلح ڈاکے کی واردات ہوئی تھی...... کیس ابھی تک ناقابلِ حل ثابت ہوا ہے۔ فائل کھلی ہے۔ وہاں خون کے نمونوں سے جو ڈی این اے حاصل ہوا تھا، وہ اور نیلے کمبل کا ڈی این اے ایک ہی فرد...... دونوں ایک ہی فرد کے ہیں۔''

نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ بونی کیا کہہ رہی ہے...... وہ یہ کہہ رہی ہے کہ پال مسلح ڈاکے میں بھی ملوث تھا۔ اگرچہ وہ یا کوئی دوسرا نہیں جانتا کہ قاتل اور ڈاکو کا نام پال ہے...... پال اسٹل ول۔ لورین اسٹل ول کا شوہر۔ پال کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں تھا۔ اس لیے خالی ڈی این اے کا رزلٹ مجرم تک نہیں پہنچ سکا۔ اسکاٹ کے قتل کے جرم میں وہ میری وجہ سے بچ گیا۔ اگر پکڑا جاتا تو پانچ سالہ پرانا کیس از خود حل ہو جاتا۔ ڈی این اے کا رزلٹ نام، مذہب، قومیت، پیشہ وغیرہ نہیں بتاتا۔ وہ کیا تھا؟ کون تھا؟ اور میں بے خبر تھی۔

☆☆☆

بونی نے میرا ہاتھ دبایا جو واضح طور پر لرز رہا تھا۔ ''مجھے بھی صدمہ ہوا ہے۔ بات بہت آگے چلی گئی ہے۔ میں تمہارے ا[illegible] نہیں آئی۔''

''ڈی سی میں مسلح ڈاکا...... پانچ برس پہلے؟ کیا تم کو یقین ہو؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''واشنگٹن ڈی سی کے ہوٹل میں ہونے والی روبری کا کیس کھلا ہوا ہے۔ دو مختلف کرائم سین سے ملنے والا یکساں نمونہ اور مجرم پردۂ اخفا میں ہے۔ کمبل واشنگٹن والے مجرم نے استعمال کیا ہے تو وکٹر تک کیسے پہنچا اور اگر کمبل وکٹر نے کہیں سے لیا تھا تو اس پر روبری کے ملزم کا ڈی این اے کیوں دریافت ہوا؟''

میں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں وارداتوں میں پال ملوث تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ اس کا نام کہیں نہیں آرہا تھا۔ ڈی این اے جھوٹ نہیں بولتا۔ بونی کچھ کہہ رہی تھی لیکن میرا دھیان کہیں اور تھا۔ میں پلکیں جھپکا رہی تھی...... سر ہلا رہی تھی۔

میں نے اسکاٹ کیس پر سوچنا بند کر دیا۔ ذہنی رو پانچ برس پیچھے چلی گئی تھی۔ بونی خاموش ہو کر میرے تبصرے کا انتظار کر رہی تھی۔ ''کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وکٹر نے اسکاٹ کا قتل نہیں کیا تھا؟'' میں نے کہا۔ وہ کھڑکی سے باہر موٹ اسٹریٹ کی آمد و رفت کو تک رہی تھی۔ نگاہ میں اذیت کا عنصر تھا۔

''لورین، میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ ہوسکتا ہے وکٹر نے کمبل کسی دوست سے لیا ہو لیکن ڈی این اے کے نتائج کیس کو مشکوک کرنے کے لیے کافی ہیں اور وکیل دونوں بھائیوں کے لیے اسے خوب استعمال کرسکتا ہے۔ پریس کے لوگ بھی دلچسپی لیں گے اور پولیس کو بھی آسرا نظر آئے گا کہ واشنگٹن کیس حل ہوسکتا ہے۔ سب سے بڑھ کے نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں اپنی خدمات پیش کرنی پڑیں گی۔''

میرے دل نے کہا، ریسٹورنٹ سے نکل بھاگو...... بھاگتی رہو...... بھاگتی رہو......

''میں نے فیصلہ کیا کہ شک کا فائدہ نارکوٹک ڈپارٹمنٹ، اسکاٹ کی بیوہ اور بالخصوص تم کو ملنا چاہیے۔'' اس نے لفافہ بند کر کے میرے بیگ میں ڈال دیا۔ ''تم اور مائیک نے اپنا کام پورا کیا۔ وہ دونوں کوئی سوشل ورکر نہیں تھے۔ ہنی اس کیس نے سب کو گھما کے رکھ دیا...... میری طرف سے اسے ریٹائرمنٹ کا تحفہ سمجھو۔ چاہو تو بروک لین برج سے نیچے پھینک دو۔ دل کچھ اور کہے تو لفافے میں تمہیں واشنگٹن کے سراغ رساں کا نام اور نمبر مل جائے گا، جس نے روبری کیس پر کام کیا تھا۔'' بونی نے جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ ''آئی لو یو...... ملیں گے کسی وقت...... کہیں پر۔''

☆☆☆

جب میں نے اسکاٹ کیس کے دشوار ترین مراحل طے کر لیے تھے، اس وقت ایک نیا...... عجیب تر موڑ سامنے آیا تھا۔ میں برج پر کھڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں لفافہ تھا۔ میں رہنمائی کے لیے مرحوم باپ کو یاد کر رہی تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپشن دو تھے۔ انگلیوں کی گرفت سے لفافہ آزاد کر دوں۔ یہ مستقل اسٹاپ ہوگا یا پھر اپنے پُراسرار شوہر کا اسرار جاننے کی کوشش کروں۔ میرے ہاتھ ریلنگ پر تھے۔ پہلا آپشن آسان تھا اور نتیجہ بھی یقینی۔

''اسے بہا دو...... اسے بہا دو......'' میرا ذہن اکسا رہا تھا۔ میں نے نیچے پانی کی طرف دیکھا۔ دل نے ذہن کی پکار کو مسترد کر دیا۔ میں نے لفافہ واپس بیگ میں رکھ لیا۔ شاید میرے اندر کا سراغ رساں پوری طرح نہیں مرا تھا۔

میں وہاں سے نکل گئی۔ راستے میں پال کو فون کر کے بتایا کہ بونی کی خواہش ہے کہ میں چند روز مزید ٹھہر جاؤں...... پھر میں نے باس کو فون کیا کہ میں چھٹیاں پوری کروں گی۔'' ڈیرک نے اظہارِ مسرت کیا۔

آدھی رات تک میں بے خانماں فرد کے مانند دوڑتی رہی پھر ایک ہوٹل میں چلی گئی۔ صبح سات بجے میں نے

ہوٹل چھوڑ دیا۔ ٹیکسی پکڑی اور مالیاتی ڈسٹرکٹ کا رخ کیا۔ میرا پلان سیدھا تھا۔ پال سے براہِ راست تفتیش، خواہ نتائج کچھ بھی ہوں..... میں اس کے آفس کے سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئی۔ ناشتے کا آرڈر دے کر میں نے ایف بی آئی کی رپورٹ نکالی۔ بغور کئی بار میں نے تفصیلات کا مطالعہ کیا۔ میری نظر دھندلا گئی۔ سب کچھ درست تھا۔ کوئی غلطی نہیں تھی۔ رپورٹ واپس رکھ کے میں نے اس عمارت کی طرف دیکھا جہاں پال کا آفس تھا۔ ویٹر کی آمد پر شکم خوری میں مشغول ہوگئی۔ تاہم میری ایک آنکھ نگرانی پر تھی۔ اِدھر میں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اُدھر پال عمارت کے اندر جاتا دکھائی دیا۔ ادائیگی کر کے میں اٹھ گئی۔

''ہاتھ اٹھا کے باہر آجاؤ، پال۔'' فقرہ ذہن میں کلبلایا۔ میں اسٹریٹ کراس کر کے عمارت میں داخل ہوئی۔ میں ڈیسک کے ساتھ قطار میں تھی۔ میرے آگے فیڈ ایکس کا آدمی کھڑا تھا۔ جب تک میرا نمبر آتا، میں نے ایک ایلیویٹر میں سے پال کو واپس نکلتے دیکھا۔ عجیب بات ہے..... میں نے ایک آدمی کی آڑ لی اور اوپر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ضرورت نہیں تھی۔ وہ باہر جا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھی اور قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے شانے پر فیتوں کی مدد سے شاپنگ بیگ بندھا تھا۔ میرے اٹھتے قدم یک لخت تھم گئے۔ نیلے رنگ کا قفلی شاپنگ بیگ؟ پال کہاں جا رہا ہے؟ اب کون سی مصیبت ظاہر ہونے والی ہے؟

میں نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے نظر دوڑائی اور ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے ٹیکسی میں سوار ہوئے اور تعاقب شروع ہوگیا۔

مڈٹاؤن مین ہٹن، مڈٹاؤن ٹنل پھر لانگ آئی لینڈ ایکسپریس وے..... جب دونوں گاڑیاں بروک لین کوئنز ایکسپریس وے پر آئیں تو میں نے سیل فون نکالا۔

''ہائے پال، کیا ہو رہا ہے؟''

''لورین۔'' اس نے کہا۔ ''کہاں ہو؟''

''بونی کے ساتھ..... لیکن سوچ رہی ہوں کہ لنچ تمہارے ساتھ کروں۔ مزہ آئے گا..... میں پہنچوں گی۔''

''اوہ بے بی، آج نہیں۔'' پال نے کہا۔ ''چھ رپورٹس میں نے نمٹائی ہیں۔ میں شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں..... باس بھی اپنی ڈیسک پر موجود ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ رات آٹھ بجے تک یہاں سے ہل بھی سکوں گا۔ مجھے افسوس ہے۔ لیکن وعدہ ہے..... جلد ہی کوئی اچھا پروگرام بنائیں گے۔''

مجھے اس کے سفید جھوٹ پر دکھ نہیں ہوا۔ میں پہلے ہی جو کچھ جان چکی تھی، اس کے مقابلے میں یہ جھوٹ کچھ بھی نہیں تھا۔

''اوکے، کوئی مسئلہ نہیں ہے..... اپنا خیال رکھنا۔''

''لو یو بے بی.....'' پال نے کہا۔ میں نے آگے والی ٹیکسی میں اسے فون کان سے ہٹاتے دیکھا۔ ہم سبز رنگ کے نشان کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ نشان ''لاگارڈیا ائرپورٹ'' کی علامت تھا۔ ائرپورٹ پر NYPD کی شناخت دکھائی اور ٹکٹ کے بغیر سیکیورٹی چیک پوائنٹس سے گزر گئی۔ میں نے خود کو مناسب فاصلے پر رکھا اور خود کو مسافروں کے درمیان رکھا۔ وہ اچانک ڈپارچر کے لیے گیٹ نمبر 32 کے قریب بیٹھ گیا..... میں پے فون کے قریب تھی۔ پال کی منزل دیکھ کر میرے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ وہ واشنگٹن ڈی سی کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔

☆☆☆

میرے ایک سو پچھتر ڈالرز خرچ ہوئے۔ میں آخری منٹ میں پال کی فلائٹ پر سوار ہوگئی۔ پال بزنس کلاس میں تھا۔ میں فاصلے پر رکھی کے ساتھ ایسی نشست پر تھی جہاں سے ہم دونوں کی مڈبھیڑ کا امکان نہیں تھا۔ تاہم میں محتاط تھی۔ سوار ہونے سے پہلے میں نے نیوز اسٹینڈ سے اخبار اٹھالیا تھا۔

ہوشیاری کی ضرورت لینڈنگ کے وقت سامنے آئی۔ جب وہ بزنس کلاس کے ایگزیکٹوز کے ہمراہ پہلے نکل گیا۔ میں نے پھرتی دکھائی لیکن جب ٹیکسی لائن کے ساتھ اسٹریٹ پر پہنچی تو پال کہیں نظر نہیں آیا۔ لعنت ہے..... کیا یہاں تک کا سفر رائگاں جائے گا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوئی۔ رخ ایلیویٹر کی طرف تھا۔ جب میں نے اسے مردانہ واش روم سے نکلتے دیکھا۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ چہرے پر چشمہ بھی نہیں تھا۔ جین اور شرٹ پر نیلا سویٹر نظر آ رہا تھا۔ میں اسے پکارتے پکارتے رہ گئی۔ مجھے اسرار کی گہرائی میں جانا تھا۔

وہ ٹیکسی لائن کو نظرانداز کر کے اسٹریٹ پر آگے گیا۔ میرا دورانِ خون رکنے لگا جب میں نے اسے چمکتی ہوئی رینج روور میں بیٹھتے دیکھا۔ رینج روور پہلے سے اسٹارٹ تھی۔ میں دس پندرہ فٹ دور تھی جب شاندار گاڑی ٹریفک میں شامل ہوگئی۔ میں نے لائسنس پلیٹ دیکھنے کی کوشش کی۔ پلیٹ ڈی سی کی تھی اور نمبر کے ابتدائی دو ہندسے 99 تھے۔ نمبر سے توجہ ہٹا کے میں نے ڈرائیور کو دیکھنے کی سعی کی۔ خصوصاً

میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ڈرائیور مرد ہے یا عورت۔ تاہم رنگین شیشوں نے میری کوشش ناکام بنادی۔

میں اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایف بی آئی کی رپورٹ میں راجرز مپالا کا نام اور نمبر تھا۔ میں نے راجر سے ملنے کا فیصلہ کرنے کے بعد ائرپورٹ سے نمبر ملایا۔ بالمشافہ اس کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کا اسکواڈ روم، اڈاہوایونیو پر میٹروڈی سی سیکنڈ ڈسٹرکٹ اسٹیشن میں تھا۔ راجر نے بلاتر دو ملاقات کا وقت طے کیا۔

☆☆☆

''تم نے فون پر پانچ سال پرانی روبری کا ذکر کیا تھا۔'' راجر نے کہا۔ ''پہلے میں بتا دوں کہ اب میں ہومی سائڈ میں ہوں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کیس کا نمبر تین۔ سات۔ تین۔ چار۔ پانچ ہے۔ مسلح واردات شیرٹن کرسٹل سٹی ہوٹل میں ہوئی تھی۔ شیرٹن دریا کے پار آرلنگٹن، ورجینیا میں ہے۔ مجرم نے......''

''خون کی شکل میں کلیو چھوڑا تھا۔'' راجر نے میرا جملہ مکمل کیا۔ ''مجھے یاد ہے۔ ٹکٹ بروکر کا معاملہ تھا۔''

''تمہاری یادداشت اچھی ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

''بدقسمتی سے غیر حل شدہ کیس بھلانا مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم نے ٹکٹ بروکر کے الفاظ استعمال کیے؟''

''شیرٹن، ریگن نیشنل ائرپورٹ سے قریب ہے۔ وہاں نیشنل کالجیٹ ایتھلیٹک ایسوسی ایشن کے تحت اسپورٹس کوچز کے سالانہ کنونشن کی میزبانی کی تقریب ہوتی ہے۔ اسسٹنٹ کوچز بھی شامل ہوتے ہیں۔'' راجر نے وضاحت کی۔ ''چھوٹے بڑے اداروں کے کوچ اور نائب کوچز کو ہر سال چار ٹکٹ فری دیے جاتے ہیں۔ ٹکٹ بروکرز فری ٹکٹ کے متلاشیوں کو کھینچنے کے لیے متعدد ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں......''

''راجر، ہم کتنی رقم کی بات کررہے ہیں؟''

''خاص...... ایک ٹکٹ کے ہزاروں ڈالرز۔ بروکرز سیکڑوں ہزاروں ٹکٹ بیچ دیتے ہیں لیکن فری ٹکٹ چار ہی نکلتے ہیں۔ پانچ سال قبل ان میں سے ایک بروکر کنونشن کے لیے چند روز قبل ہی وارد ہوگیا تھا۔ کسی کو بھنک پڑ گئی اور مجرم اس کا کیش سے بھرا بریف کیس چھین کرلے گیا۔''

''حلیہ یا کوئی اور نشانی؟'' میں نے سوال کیا۔

''نامعلوم مجرم نے اسکائی ماسک چڑھایا ہوا تھا۔''

''خون کے دھبے کیوں سامنے آئے؟''

''بروکر نے بریف کیس دیتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پر دے مارا تھا۔''

''پھر ڈاکو نے کیا کیا؟''

''اس نے گن نکال کر دھمکی دی اور بروکر نے مزاحمت ترک کردی۔''

''کتنی رقم تھی؟'' میرا اگلا سوال تھا۔

''نصف ملین...... لگ بھگ، لیکن انٹرنل ریونیو سروس اور گینگسٹر کے ڈر سے بروکر نے سات ہزار ڈالرز بتائے تھے۔ اندازہ ہے کہ وہ کوئی میجر بروکر تھا۔''

''شک کس پر تھا؟''

''خون کی مدد سے کوئی سراغ نہیں ملا۔'' راجر نے کہا۔ ''بروکر فلور پر ہم نے بہت سے افراد سے تفتیش کی۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس رات وہاں دو ہزار افراد تھے۔ ہم انتشار پھیلا کے جرائم پیشہ افراد کو متوجہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں قانون کے تحت چلنا تھا...... وقت گزرتا گیا۔ کیس غیر حل شدہ رہا۔ غیر حل شدہ اسرار۔ اور اب تم اچانک......؟''

''دراصل یہ ذاتی معاملہ ہے۔'' میرا جواب پہلے سے تیار تھا۔ ''میری دوست کے زیورات پستول دکھا کے چھین لیے گئے۔ یہ گزشتہ مہینے کی بات ہے۔ ہوٹل، مڈٹاؤن...... مین ہٹن میں تھا۔ میں نے چھان بین کی تو تمہارے پرانے کیس پر نظر پڑی۔ کیا تمہارے پاس ٹکٹ بروکرز والے ہوٹل کے رجسٹر کی نقل ہوگی؟''

راجر نے گھڑی دیکھی۔ ''میں نے نقل فائل میں لگائی تھی لیکن پانچ برس گزر گئے ہیں......'' وہ ہچکچایا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ میں تمہیں پریشان کررہی ہوں لیکن اگر تم کچھ تعاون کرو تو شاید کوئی نکتہ ہاتھ آجائے۔'' میں نے کہا۔

راجر نے ٹھوڑی کھجائی۔ ''اوکے...... ہم ہوٹل سے ہی شروع کرتے ہیں۔''

☆☆☆

میں توقع کررہی تھی کہ راجر اپنے ریکارڈ میں تلاش کرے گا لیکن اس نے ہوٹل کا رخ کیا۔ یقیناً اس نے اپنی جانب سے کیس کلوز کرکے بھلا دیا تھا۔ میں تذبذب کے عالم میں اس کے ہمراہ ہوٹل پہنچی۔ ظاہر ہے وہ اب ہومی سائڈ میں تھا اور پرانے روبری کیس کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

ہوٹل انتظامیہ راجر سے زیادہ منظم نکلی۔ میں اب بھی سوچ رہی تھی کہ میں خواہ مخواہ پال پر شک کررہی ہوں۔ تاہم میں اس وقت ہل کے رہ گئی جب پرانے رجسٹر میں پال اسٹل ویل نام پر نظر پڑی۔ میں رکی نہیں بلکہ اور ق پلٹتی رہی۔ راجر اکتانے لگا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور واپسی کا اشارہ کیا۔

پال نے اسپورٹس ٹکٹ بروکر سے نصف ملین ڈالرز لوٹ لیے تھے۔ ناقابلِ یقین...... اسکاٹ والا حادثہ میں کسی اور خانے میں فٹ کرتی رہی تھی لیکن یہ روبری وہ کون تھا؟ کتنے جرائم کیے تھے؟ مردوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ مرد پاگل ہوتے ہیں کیا؟ نہیں سب نہیں ہوتے...... میں نے خود ہی جواب دیا۔ مجھے رینج روور اور نفنی بیگ کا خیال آیا۔ کیا وہ یہاں ڈی سی میں چشمہ نہیں لگاتا؟

میں نے راجر کو متوجہ کیا۔ ”راجر، ایک آخری درخواست۔ اس کے بعد میں چلی جاؤں گی۔“

”بولو۔“

”مجھے 2007ء کی رینج روور کے مالک کا نام درکار ہے۔ لائسنس پلیٹ، ڈی سی کی ہے...... نمبر 99 سے شروع ہوتا ہے۔“

”وہ، مزید غیر حل شدہ معمے...... یہ آخری ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

راجر کے آفس میں تیس منٹ انتظار کے بعد اس نے مجھے ایک شیٹ پکڑائی۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

میں نے شیٹ دیکھی...... فہرست میں اکیس گاڑیاں تھیں۔ میں نے اسٹل ویل کا نام تلاش کیا۔ ناکامی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ یہ اکیس مختلف نمبرز اور اکیس مختلف مالکان تھے۔ میں نے دوبارہ آہستگی کے ساتھ نام چیک کیے...... نتیجہ صفر تھا۔ میں راجر کا شکریہ ادا کرکے باہر نکلی اور ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئی۔ کیا کرنا چاہیے؟ اگلا قدم واضح تھا۔ اگر ناکامی ہوئی پھر کیا کروں گی...... ناکامی کے خیال کو ایک طرف ہٹا کے میں اٹھی۔ شیرٹن ہوٹل کے رجسٹر میں، میں نے اسٹل ویل کا نام دیکھا تھا۔ میں شیرٹن کی طرف جارہی تھی۔

میں نے ہوٹل کی گیسٹ بک میں کنونشن والی رات، جب روبری ہوئی تھی، کے مہمانوں کی فہرست اور راجر کی دی ہوئی فہرست نکالی۔ جس میں اکیس گاڑیوں کے نمبرز تھے۔ رینج روور کے مالکان کے نام احتیاط سے ملانے شروع کیے۔ گاڑی کا نمبر موجود تھا۔ ڈی سی کی نمبر پلیٹ...... نمبر 99 سے شروع ہوتا تھا۔ تاہم یہ اسٹل ویل کے نام کے ساتھ میچ نہیں کررہا تھا۔ اکیس میں سے صرف ایک گاڑی کا مہمان وہاں موجود تھا۔ تھا نہیں تھی...... نام ویرونیکا بوائیڈ۔ میں الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ ویرونیکا بوائیڈ کے نام کو گھور رہی تھی۔ معاً الجھن یک لخت معدوم ہوگئی۔ میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ائرپورٹ پر میں رینج روور کے ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکی تھی۔ وہ ویرونیکا تھی۔ جواب غالباً ویرونیکا اسٹل ویل تھی۔ ایڈریس آسان تھا۔ میں نے ذہن نشین کرلیا۔ میرے خون میں اُبال آگیا تھا۔

☆☆☆

میں کرائے کی فورڈ ٹورس میں 221 رگ پلیس کی نگرانی کررہی تھی۔ اسٹریٹ کے دونوں طرف درخت لگے تھے۔ میں نے بلاک کا سرسری جائزہ لیا تھا لیکن سیاہ رینج روور کہیں دکھائی نہیں دی۔ اگرچہ وہاں دیگر رہائشیوں کی پارکنگ میں مختلف لگژری گاڑیاں موجود تھیں...... میں نے توجہ نمبر 221 پر مرکوز کردی۔ نگاہ کھڑکیوں پر جمی تھی۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک گھنٹے بعد اُکتا کے میں نے آرام کرنے کی ٹھانی۔ کسی کار میں گاڑی اسٹارٹ کرنے والی تھی...... جب پال کی جھلک نظر آئی۔ نیلے رنگ کا نفنی بیگ اس کے ساتھ تھا۔ وہ سبز رنگ کی کنورٹیبل جیگوار میں بیٹھ رہا تھا۔ پہلے رینج روور اب لگژری جیگوار۔ دل کررہا تھا کہ فورڈ اسٹارٹ کرکے جیگوار میں ٹھونک دوں۔ میں نے ضبط کیا۔ اس کی خفیہ زندگی کے پرت کھل رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے تعاقب کا آغاز کا۔ اگرچہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے گمان میں نہیں ہوگا کہ میں ڈی سی میں اس کے پیچھے ہوں۔ اسٹریٹ نمبر 14 سے موڑ لیا...... S اور R اسٹریٹ...... Q اسٹریٹ کے بعد اسٹریٹ نمبر 13 اور پھر O اسٹریٹ۔

وہ ایک عمارت کی پارکنگ میں جارہا تھا۔ دیوار پر پیتل کے حروف کہہ رہے تھے ’وچیمبلس اسکول‘ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔ عیاں تھا کہ میں ایک ناخوشگوار اختتام کی سمت محوِ سفر تھی۔ وہ گھر اور یہ اسکول...... میرے دل سے آہ نکلی۔ میں نے ہائیڈرنٹ کی طرف فورڈ پارک کی۔ ویرونیکا بوائیڈ کیا اسکول ٹیچر ہے؟ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ نوجوان نہیں تو خوب صورت ضرور ہے۔ میرا انتظار جلد ہی ختم ہوگیا۔ پال واپس آرہا تھا، دنیا ڈانواں ڈول ہوگئی آسمان ٹوٹ پڑا...... وہ جوان نہیں، نوجوان تھی...... نہ

نہ...... وہ نو عمر تھی...... کمسن تھی۔ پارکنگ میں پال جھکا۔ تین یا چار سالہ بچی نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پال نے پیار کیا اور ننھی بیگ کھولا۔ بچی نے ٹیڈی بیئر کے ساتھ نیکلس نکال کر گلے میں ڈالا...... دیگر بچے اپنے اپنے والدین کے ساتھ نکل رہے تھے۔ میں سکتے کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بچی کو لے کر جیگوار کے عقب سے گھوم کر پسنجر سیٹ کی طرف گیا...... مجھے بچی کا پورا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ میرے پھیپھڑوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ سانس اندر نہ سانس باہر۔ وہی ناک، وہی پال جیسی نیلگوں آنکھیں...... ویسے ہی بال۔ خوب صورت بچی تھی۔ پال کی شبیہ...... کرب و اذیت کا اینا کونڈا مجھے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ ایسی تکلیف تھی گویا بے ہوش کیے بغیر اوپن ہارٹ سرجری کی جا رہی ہو۔

صورتِ حال میرے تصور سے ہزار گنا زیادہ بدتر تھی۔ پال نے انتہائی ظالمانہ چال چلی تھی۔ بے رحمی کا نیا مفہوم...... پال کی بیٹی...... میرے بغیر......

☆☆☆

میں پال سے پہلے واپس رگ پلیس آ گئی...... وہ آیا گاڑی کے ٹرنک سے ڈورا بائیسکل نکالی اور بچی کو بٹھا کر جنوب کی سمت سائڈ واک پر چلنے لگا۔ یقیناً وہ کھیل کے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ شاندار...... بہت اچھا باپ تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو میں فورڈ سے باہر نکلی۔ میرا رخ نمبر 221 کی جانب تھا۔ ایک کام کرنا ضروری تھا۔ بال برابر۔

میں نے ڈور بیل پر انگلی رکھی۔

''یس؟'' دروازہ کھولنے والی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی عمر تیس سال سے کم تھی۔ بلاشبہ وہ پُرکشش تھی۔

''ویرونیکا؟'' بالآخر میں نے جائزہ مکمل کر کے سوال کیا۔

''یس۔'' اس نے ہامی بھری۔

میں نے اپنا بیج نکالا۔ ''کیا میں تھوڑا وقت لے سکتی ہوں؟''

''کیا معاملہ ہے؟'' وہ کچھ کشیدہ دکھائی دی لیکن دروازہ مزید کھول دیا۔ میں لاعلم تھی کہ وہ میری حقیقت سے آگاہ ہے یا نہیں۔ میں نے راجر زمپالا سے حاصل کردہ پرنٹ آؤٹ نکالا۔

''کیا سیاہ رینج روور ماڈل 2007ء آپ کی ملکیت ہے؟'' میں اپنے قیاس کے مطابق پال کی دوسری بیوی سے بات کر رہی تھی۔

''ہاں، کیا ہوا؟'' ویرونیکا نے اعتراف کیا۔

میرے پاس جواب تیار تھا۔ ''میں ایک حادثے کی تفتیش کر رہی ہوں۔ ہٹ۔ اینڈ۔ رن کا کیس ہے۔ مجھے چند منٹ درکار ہیں۔''

''لیکن نیویارک کی سراغ رساں واشنگٹن ڈی سی میں ایکسیڈنٹ کے لیے کیسے......؟'' اس نے جائز اعتراض اٹھایا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دراصل تین دن قبل میری ماں اپنے گروپ کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ حادثے کا تعلق ان سے ہے۔ میں گاڑی ایک نظر دیکھنا چاہوں گی۔''

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے راستہ دیا۔ ''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ مجھے کچن تک لے گئی۔ جہاں کا منظر اس کی مصروفیت کی نشاندہی کر رہا تھا۔ وہ اچھی بیوی کی طرح ایک گندے شوہر کے لیے کھانا بنا رہی تھی۔

''میری بیٹی کیرولین کی آج چوتھی برتھ ڈے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کافی چلے گی؟''

''ہاں۔'' میں نے فٹ جواب دیا۔ ''مہمان نوازی کا شکریہ۔'' میں نے بمشکل خود کو وہاں روکا ہوا تھا...... کیا کرنا چاہیے...... کیا کرنا چاہیے......

''کیا میں باتھ روم استعمال کر سکتی ہوں؟''

''ہاں، ہال کے سرے پر دائیں جانب۔''

ہال میں دیوار کے فوٹو دیکھ کر یوں لگا جیسے دیواریں میرے اوپر گر رہی ہیں۔ ایک فوٹو میں وہ ویرونیکا اور بیٹی کے ہمراہ روشن ساحل پر نظر آ رہا تھا۔ دوسری تصویر میں مام اور ڈیڈ رخسار سے رخسار ملائے ہنس رہے تھے۔ تیسری تصویر...... گویا کسی نے میری آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بلیڈ چلا دیا۔ ویرونیکا سوئمنگ سوٹ میں تھی اور گریٹ ڈیڈی کی ٹھوڑی اس کے کاندھے پر ٹکی تھی۔ چوتھا اور آخری فوٹو...... میری کھوپڑی میں ہزار میگاٹن بلاسٹ ہوا۔ وہ شادی کی مخصوص تصویر تھی۔

میری گردن پر ویرونیکا کی سانس تھی۔ ''تم یہاں کار ایکسیڈنٹ کے لیے آئی تھیں؟'' اسے پھرتی سے ایک طرف ہونا پڑا۔ میں تند جھونکے کے مانند دروازے کی طرف گئی تھی۔

☆☆☆

یہ گزشتہ مہینے کے واقعات و حادثات و سانحات کا سوال نہیں تھا..... میری پوری ازدواجی زندگی ایک دھوکا تھی۔ یہ تصور ہائی وولٹیج کرنٹ کے مانند میرے دماغ سے گزر رہا تھا۔ میں جرم کے نشانات مٹانے میں لگی رہی۔ دوستیاں خطرے میں ڈالیں۔ کیریئر داؤ پر لگا دیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی کو بلیک میل کیا۔ اپنے سے زیادہ پال کے لیے اور میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا...... اندھیرا ہی اندھیرا اور چند روز کی چھٹی۔

جس سمت پال گیا تھا، میں اسی طرف جا رہی تھی۔ پارک میں تین آدمی میوزک بجا رہے تھے۔ بوڑھے آدمیوں کا ایک گروپ درختوں کے نیچے شطرنج کھیل رہا تھا۔ کچھ لوگ فوارے کے آس پاس تھے۔ چند بچوں کے ساتھ ٹریک پر اسٹرالر کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں فوارے کے قریب سے گزری تو پال نظر آیا۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ مگن تھا۔ میں چکر کاٹ کے ان کی بینچ کے پیچھے آ گئی۔

''ڈیڈی، ڈیڈی۔''

''یس، مائی لو۔'' پال نے کہا۔

''میں جوس پیوں گی۔'' بیٹی نے فرمائش کی۔ پال نے بائیسکل کی باسکٹ میں سے جوس پیک نکالا...... دونوں کے چہرے مسرت و شادمانی سے کھلے ہوئے تھے۔

''کیا یہ جگہ خالی ہے۔'' میں نے بینچ کے سرے کی طرف اشارہ کیا۔ پال نے گردن گھمائی اور یک لخت ٹھوس مجسمے میں تبدیل ہو گیا۔ شاک تھا، فکر، خوف، پریشانی اور شاید قلق۔ لمحہ بھر کے لیے یوں لگا کہ وہ اٹھ کے پارک کے بیرونی گیٹ کی طرف دوڑ لگانے والا ہے۔ بجائے اس کے وہ بینچ پر ڈھیر ہو گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے گھٹنوں کے درمیان رکھ لیے اور بالآخر زبان کھولی۔ ''بولو، میں کہاں سے شروع کروں؟''

''دیکھنا پڑے گا۔'' میں نے انگلی سے کنپٹی پر دستک دی۔ ''انتخاب کرنا مشکل ہے۔ کہاں سے شروع کیا جائے...... تم نے پہلی مرتبہ کب مجھ سے بے وفائی کی تھی؟ نہیں، شیرٹن میں ڈاکے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ بھی ٹھیک نہیں رہے گا، کیا اُس دن سے شروع کریں جب تم نے خفیہ شادی کی؟ رکو ایک اور آئیڈیا...... میرے بغیر بیٹی؟'' آنسو میرے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ ''میں بانجھ تھی اور تمہیں اولاد کی ضرورت تھی۔ تمہیں دوسری عورت کی ضرورت تھی......''

''ایسی بات نہیں تھی۔'' پال نے کہا اور بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''وہ ایک حادثہ تھا۔''

''گن پوائنٹ پر کسی نے شادی کرا دی تھی؟'' میں مشتعل ہو گئی۔

پال نے آنکھیں مسل کے مجھے دیکھا۔ ''مجھے چند سیکنڈ دو۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں سب تفصیل سے بتاتا ہوں۔'' وہ بائیسکل لے کر اس طرف گیا جہاں چند بے بی سسٹرز کا اجتماع تھا۔ ایک عورت سے بات کر کے وہ واپس آیا۔ ''اسیلڈا اڑوس میں بھی کام کرتی ہے۔ وہ کیرولین کو واپس لے جائے گی۔''

☆☆☆

''یہ تقریباً پانچ برس پہلے کی بات ہے۔'' اس نے کہانی شروع کی۔ ہم دونوں ٹریک پر چل رہے تھے۔ ''میں اس منحوس کونشن میں شریک تھا۔ سچ ہے کہ میرے ذہن میں بسااوقات اولاد کی خواہش شدت سے سر اٹھاتی۔ ہم دونوں کا رشتہ مثالی تھا...... اور...... وہ...... خیر چھوڑو۔ میں پی رہا تھا اور آگے میٹنگ کے بارے میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''میں تمہاری خفیہ فیملی کے بارے میں سننا چاہتی ہوں، پال۔ احمقانہ ہوٹل بار اسٹوری میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''میں وہیں آ رہا ہوں۔'' پال نے کہا۔ ''اس جگہ پر ویرونیکا سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں جام تھا۔ کافی مہمان تھے۔ نادانستگی میں اس کا مشروب چھلکا اور کچھ میرے لباس پر گرا...... وہ معذرت کر رہی تھی۔''

''واؤ...... سوئٹ فلمی سین۔'' میں اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ''اور اسی رات تم دونوں نے شب بسری کی...... تم نے اس کی معذرت شاندار انداز میں قبول کی۔''

''میں بحث کروں یا وضاحت...... یا خاموش رہوں؟''

''یا ناف کے نیچے گولی کھاؤں؟'' میں نے دانت پیسے۔

''لورین مجھے بات مکمل کرنے دو۔''

''خرافات ہے...... خیر بکو۔''

''اس نے مجھے ڈرنک کے لیے مدعو کیا۔ یقین کرو یہ ایک رسمی دعوت تھی۔ تم بھروسا نہیں کرو گی لیکن سچ یہی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی زندگی کی کہانیاں شیئر کر رہے

تھے۔ جب وہ بروکر وہاں نظر آیا...... ویرونیکا اسے تکتی رہی
پھر مجھ سے کہا کہ وہ اسے جانتی ہے...... مزید یہ کہ وہ ٹمپا بے
کی چیئر لیڈر رہ چکی ہے۔ ویرونیکا کا ٹمپا بے کی ایک
اسسٹنٹ کوچ سے ملنا جلنا تھا۔ ویرونیکا کو یاد تھا کہ مذکورہ
آدمی جس شخص سے سپر باؤل کے ٹکٹ خرید رہا تھا، وہ شخص
ویرونیکا کا سابقہ بوائے فرینڈ تھا۔ خریدنے والا عام بروکر
نہیں تھا...... جیسا کہ وہ نظر آرہا تھا۔ ویرونیکا نے مجھے یہ بھی
بتایا کہ اس کے ہاتھ میں جو بریف کیس ہے...... وہ ڈالرز
سے لبالب بھرا ہے۔ ہم نے کچھ دیر مزید بات کی۔ وہ گفتگو
کو گھما کر بار بار ڈالرز کی طرف لا رہی تھی۔'' پال نے تھم کر
مجھ سے نظریں ملائیں۔ ''تم مزید سننا چاہتی ہو؟''

''تم میرے احساسات کو تحفظ دینا چاہتے ہو۔'' میں
نے کہا۔ ''یقیناً میں اختتام سننا پسند کروں گی۔''

''تم کر سکتے ہو۔'' اس نے میرے کان میں سرگوشی
کی۔ ''میں نمبر 206 میں ہوں اور وہ چلی گئی۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پال پھر گویا ہوا۔
''میں وہیں بیٹھا رہا۔ تین اسکاچ ڈکار کے بریف کیس والا
چل دیا۔ میں دیکھتا رہا۔ معاً میں بھی کھڑا ہوگیا اور اس کے
پیچھے چل دیا۔ شاید یہ مذاق تھا۔ میں خود کو بہلا رہا تھا کہ
مذاق ہے۔ میں کیونکر کسی کو لوٹ سکتا ہوں۔ تاہم میں اس
کے کمرے تک چلا گیا۔ پھر مجھے نہیں پتا چلا کہ میرے ساتھ
کیا ہوا۔ میری کیفیات، میرا ذہن الٹ گیا۔ چند منٹ بعد
میں اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھلتے
ہی میں نے اس کے چہرے پر پنچ رسید کیا۔''

معاً ہم دونوں چلتے چلتے ایک دوسرے سے دور ہو
گئے۔ سامنے سے آنے والی سائیکل زن سے ہمارے
درمیان سے گزری۔ اس کے پیچھے ایک اور تھا۔ دونوں
ریس لگا رہے تھے۔ میں پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ پہلا تو گزر
گیا۔ دوسرے کے کولہے پر میں نے اطمینان سے کک
جمائی۔ لڑکا سائیکل سمیت ٹریک سے اتر کے گھاس میں
جا گرا...... سائیکل بھی ساتھ گئی۔ میں اس کے پیچھے گئی۔ لیکن
پال نے میرا بازو تھام لیا۔ دیکھنے والے مطمئن تھے۔ دونوں
کام ہی غلط کر رہے تھے۔

''میں کہہ رہا تھا......''

''ایک سیکنڈ۔'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''رپورٹ کے
مطابق تمہارے پاس گن تھی؟''

پال نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، ہم ہاتھا پائی کر رہے
تھے۔ اس میں خاصی جان تھی۔ اس کی ایک ضرب کے
باعث میری ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میں شکست سے
خوف زدہ تھا۔ لہٰذا میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور بریف
کیس جھپٹ کے دوڑ لگا دی۔''

''نمبر 206 کی طرف۔'' میں نے اسے گھورا۔

''نمبر 206۔'' پال نے آہستہ سے سر کو جنبش دی۔

☆☆☆

میری چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا
کہ دہشت گردوں کی بمباری میں بچنے والی میں تنہا
ہوں...... دفعتاً میں رکی اور ایک بھرپور تھپڑ پال کے رخسار پر
جڑا۔

''اور مارو۔'' اس نے جبڑا سہلایا۔ ''میں صبح بیدار
ہوا تو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں...... اور رات کیا
ہوا تھا۔ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میز پر پہلو بہ پہلو ڈالرز کی دو
ڈھیریاں نظر آرہی تھیں۔ اور ویرونیکا کافی بنا رہی تھی......
پندرہ منٹ بعد میں، جمنازیم بیگ کے ساتھ نکل رہا تھا۔ بیگ
میں چار لاکھ ڈالرز تھے۔''

''تم نے رقم کا کیا کیا؟''

''کیمین آئی لینڈ۔'' پال نے بتایا۔ ''میرا ایک
دوست وہاں مرچنٹ بینکنگ کرتا ہے۔ اس نے رقم انویسٹ کر
دی۔ چار سال بعد اب وہ بڑھ کر 1.2 ملین ڈالرز کے
قریب ہے۔ تین ماہ بعد اچانک ویرونیکا کی کال آئی اور میرا
خون برف ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ حاملہ ہے۔ پہلے مجھے
یہ بکواس لگی۔ میں نے ٹیسٹ کی کاپی طلب کی اور کہا کہ میں
وکیل کروں گا۔ اس نے مجھے پُرسکون رہنے کے لیے کہا اور
بتایا کہ وہ کوئی الجھن تخلیق نہیں کرنا چاہتی۔ وہ صرف یہ بتا
رہی تھی کہ ایک بچہ دنیا میں آنے والا ہے اور سب کچھ
میرے اوپر ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں...... میں نے کچھ بحث
کی اور دو مہینے تک کوئی ردِعمل نہیں پیش کیا...... بالآخر میں
اس کے پاس گیا۔ ایک بات سے دوسری بات نکلتی رہی اور
ایک روز میں باپ بن گیا۔''

''چار سال میں تمہارے آفس میں یا کسی اور کو خبر نہیں
ہوئی؟''

''نہیں۔ میں بہت کم وزٹ کرتا تھا۔ رابطہ فون یا
کمپیوٹر کے ذریعے ہوتا تھا یا آفس کے کام سے جانا پڑتا تو
ملاقات ہوتی تھی۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں یقین کر لوں...... تم اُسے، مجھے
یا دونوں کو بے وقوف نہیں بنا رہے ہو؟''

''میں نے سچائی بیان کی ہے۔'' پال نے کہا۔

در سیکنڈ بعد میرے ہاتھ اس کے حلقوم پر تھے۔

''سب بکواس! تم نے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کی تھی۔''

پال نے میرے ہاتھ ایک طرف کیے۔ ''نہیں، نہیں......'' وہ بولا۔ دفاعی انداز میں پیچھے گیا۔ ''وہ کیرولین کی خاطر کرنا پڑا۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ یہی سمجھے کہ دوسروں کے مانند اس کے ڈیڈی بھی حقیقی ہیں۔ فوٹوگرافر نے چند تصاویر اتاری تھیں اور بس۔ کیرولین مجھے پائلٹ خیال کرتی ہے۔''

میری آنکھوں میں جیسے کسی نے تیزاب ڈال دیا۔ جھوٹ پر جھوٹ، مہارت اور برجستگی کے ساتھ۔ ''اور ویرونیکا تمہیں کیا سمجھتی ہے؟''

پال نے شانے اچکائے۔ ''وہ جانتی ہے۔ میں کون ہوں۔''

''وہ میرے اور تمہارے رشتے سے آگاہ ہے؟''

''ہاں، شروع سے۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میری زبان سے بے اختیار گالی نکلی۔ ''وہ آگاہ ہے، میں بے خبر؟ تم اپنے بارے میں جانتے ہو تم کون ہو۔ کیونکہ میں نہیں جانتی اور یہ تمہاری نئی جاب...... بچوں کا کہانیاں لکھنا۔''

''نہیں، یہ سچ ہے۔'' وہ اچانک ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔ ''لورین، تسلیم کرلو۔ ہم دونوں بھی ماں باپ بننے والے ہیں۔ شروع میں اولاد نہ ہونے کے باعث ہماری شادی ناکام ہوگئی تھی لیکن میں نے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہم دونوں ہی گھائل تھے۔ پھر برونکس ہوم سائڈ میں تمہاری ترقی ہوگئی۔ زندگی نئے موڑ کاٹ رہی تھی۔ تم شفٹوں میں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ڈبل، ٹرپل شفٹ۔ میری بات کا غلط مطلب نہیں نکالنا۔ میں تمہیں موردِالزام نہیں ٹھہراتا...... تاہم لورین اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ زندگی ہمیں نیا موقع دے رہی ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔'' پال نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ ''نئی پرانی...... جھوٹی سچی سب باتیں ختم۔''

''بہت پُرکشش پال۔ بہت دلکش۔'' میں نے ہاتھ کھینچا۔ ''ونڈرفل۔ لیکن ایک چھوٹی سی بات رہ گئی۔''

اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھا۔ اب اسے زخمی کرنے کی باری میری تھی...... ''تم ایک چیز بھول گئے...... بہت اہم بات۔ جس پولیس مین کو تم نے قتل کیا تھا، اس کی عینی شاہد میں ہوں۔''

☆☆☆

پال کے تاثرات پتھرا گئے۔ ''وہ کیسے؟ کیا کہہ رہی ہو؟''

''اس وقت، میں اس کے مسکن پر تھی۔ تم نے سیل فون کی کالز کے ذریعے پتا لگایا ہوگا۔ میں اس کے بستر میں تھی۔ یہ بھی ایک موڑ تھا۔ کیسا لگ رہا ہے؟''

پال کا منہ کھلتا چلا گیا۔ ''تم وہاں...... لیکن...... کیسے، کس لیے......'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''سرپرائز، پال سرپرائز۔'' میں نے پوری طاقت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''تم خود کو ہوشیار سمجھتے ہو۔ احمق انسان تم اب تک جیل سے باہر ہو تو صرف میری وجہ سے۔ تمہیں بچانے کے لیے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ تم تصور نہیں کرسکتے۔'' پال کا ہاتھ میرے چہرے کی طرف آیا۔ جسے میں نے ایک طرف جھٹک دیا۔ مجھے احساس تھا کہ چند خواتین و حضرات ہماری طرف متوجہ تھے۔

''ذرا سوچو۔'' میں غرائی۔ ''تمہیں اسکاٹ کی جان لینے کی جرأت کیسے ہوئی جبکہ تم خود ایک دغاباز شخص ہو۔ چور، ڈاکو، قاتل...... دو عورتوں کے ساتھ بیک وقت شادی رچائی تم نے۔ اور کتنے جرائم کیے ہیں تم نے۔ جو میرے علم میں نہیں ہیں۔'' میں نے [illegible]۔

''اسکاٹ کی بیوی اور تین بچے ہیں!''

پال اٹھا اور چند قدم چل کے ٹریک کے دوسری جانب کھڑا ہوگیا۔ شاید تھپڑوں سے بچنے کے لیے۔ چند ساعت بعد اس نے غیر یقینی حرکت کی...... وہ ہنس رہا تھا۔

''کیا میں لطیفہ سنا رہی ہوں۔'' میں سرخ چہرے کے ساتھ اس کی طرف بڑھی۔ ''تمہاری ناک توڑنی پڑے گی۔''

''کیوں نہیں۔'' وہ بولا۔ ''بات یہ ہے کہ میں نے اسے اس لیے نہیں مارا کہ وہ تمہارے ساتھ سو رہا تھا۔ لورین یہ میرے گمان میں نہ تھا۔'' اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور مسکرایا۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھ پائی۔

''میں نے اسے اس لیے مارا کہ وہ مجھے بلیک میل کررہا تھا۔'' پال نے انکشاف کیا۔

☆☆☆

میرا سر ڈھلک گیا۔ ''بلیک میلنگ؟''

پال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایک سال پہلے کی بات ہے۔ ویرونیکا نیویارک آئی تھی۔ اس کی دوست ماڈل

تھی۔ صبح گیارہ بجے اس نے گھبراہٹ میں مجھے کال کی۔ وہ اپنی دوست کی وجہ سے ڈرگ ریڈ کی زد میں آگئی تھی۔ میں مدد کے خیال سے سوہو میں واقع اس کی دوست کے اپارٹمنٹ پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سیکڑوں پولیس اہلکار موجود ہوں گے لیکن وہاں صرف ایک آدمی تھا...... اسکاٹ۔ مجھے پہنچنے میں تاخیر ہوئی تھی اور غالباً ویرونیکا نے خوف زدہ ہوکر اسے رقم کے بارے میں بتادیا تھا۔ اسکاٹ مجھے کچن میں لے گیا اور قائل کیا کہ وہ ایک معقول آدمی ہے اور کسی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ دس ہزار ڈالرز کے عوض معاملہ ختم کرنا چاہتا تھا۔''

میری گردن میں سوئیاں چبھنے لگیں۔

''میں نے اسے دس ہزار دے دیے۔'' پال نے کہا۔ ''ایک مہینے بعد میں آفس گیا تو وہ وہاں موجود تھا۔ ایک نئی کہانی سنا کے اس نے بیس ہزار ڈالرز کا مطالبہ کیا...... تیسری مرتبہ وہ آیا تو مطالبہ بڑھ کے پچاس ہزار ڈالرز تک چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں نے اسے دوسرے طریقے سے نمٹانے کا فیصلہ کیا۔''

پارک میں میوزک کی لہریں...... مجھے لگا یہ المیہ دھن ہے جو میری تدفین کے موقع پر بجائی جا رہی ہے۔ وہ حادثہ بلیک میلنگ کی وجہ سے ہوا تھا جس میں مجھے اور [illegible] رہی۔ تاہم میرا غصہ پوری طرح سرد نہیں ہوا تھا۔ نہ میں مطمئن تھی۔

''لہٰذا تم نے اسے قتل کردیا۔ پولیس کا قتل۔ ڈاکے اور قتل......''

پال نے زمین کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔

میرے اندر ہمدردی کا عنصر جنم پذیر ہوا۔ تیزی سے میں نے اسے ایک طرف ہٹادیا۔ پال کے لیے آخری چیز جو میں سوچ رہی تھی، وہ اس کا انجام تھا۔

☆☆☆

میں نڈھال بیٹھی تھی۔ کرۂ ارض کی گردش ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔ اطراف کی ہر حرکت دھیمی دھیمی سی تھی۔ میں نے پال کو محبت دی۔ اس کو بچانے کے لیے جو کچھ کیا۔ اس کے بعد میں صفر ہو چکی تھی...... کچھ نہیں بچا تھا۔

معاً پال کی بیٹی پھر نمودار ہوئی۔ بے بی سسٹر ہمراہ تھی۔

''ڈیڈی۔'' بیٹی نے کہا۔ ''تصویریں! میں امیلڈا کو تصاویر دکھانا چاہتی ہوں۔''

''ابھی نہیں، سویٹ ہارٹ۔'' پال نے کہا۔

''نہیں ڈیڈی...... ابھی۔ وہ میرے بھائی ہیں۔'' کیرولین نے کہا اور پال کو موقع دیے بغیر اس کی جیکٹ میں ہاتھ ڈال دیا۔ پال پیچھے ہٹا۔ کیرولین کا ہاتھ باہر آیا اور فوٹو نیچے گر گیا۔

''ڈیڈی آپ نے اچھا نہیں کیا...... میں امیلڈا کو اپنے جڑواں بھائیوں کی تصویر دکھانا چاہتی تھی۔''

میری آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ پال کا چہرہ فق تھا۔ وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔ ''بعد میں دکھا لینا۔'' پال کی آواز میں نرمی مفقود تھی۔ امیلڈا نامی بے بی سسٹر نے بعجلت کیرولین کا ہاتھ پکڑ کے اسے ایک طرف کھینچا۔

میں نے جھک کر قیمتی فوٹو اٹھایا۔ دو مرتبہ سر ہلایا۔ میری حیرت عروج پر تھی۔ پال کتنی صفائی اور روانی سے کہانی پر کہانی سناتا آ رہا تھا لیکن کیرولین کے جڑواں بھائیوں کی تصویر نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔ مزید کوئی جھوٹ...... کوئی کہانی...... نہیں۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ کوئی انتہائی غلط معاملہ ہے۔ اس کے ساتھ۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کوئی منجھا ہوا اداکار بھی اتنی برجستگی کے ساتھ یکے بعد دیگرے جھوٹ نہیں بول سکتا اور کوئی عام آدمی ایسے جرائم اور دوہری زندگی کامیابی سے نہیں گزار سکتا...... وہ کتنی محبت کرتا نظر آ رہا تھا، اپنی بیٹی سے اور اب دفعتاً اسے جھڑک دیا تھا...... میں ایک عفریت کو بچاتی آ رہی تھی۔

میں نے فوٹو نیچے گرا دیا اور پال کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے منہ کھولا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ میری آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ ''یہ فوٹو مجھے رکھنا چاہیے، ننھے منے پیارے بچے ہیں۔'' میں دوبارہ جھکی۔ یہ دکھاوا تھا۔ میں نے بیگ کھولا اور سیدھی ہو گئی۔ پال سمجھ نہیں سکا اور میں نے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

''میں نے ٹھیک فیصلہ کرنے میں بہت دیر کردی۔'' میں نے کہا۔ ''مسٹر تم زیرِ حراست ہو۔''

☆☆☆

عرصۂ رستخیز کے بعد انجام عذاب جاں نکلا۔ انسان فرشتہ نکلا...... مداری نکلا...... رنگ گیا، ساغر گیا۔ بادہ و سبو بھی گیا۔ آرزو نہ امید...... نہ وہم۔ منزل ہے گم...... صرف غبار رہ گیا۔ چاک گریباں، تہی دست و تہی داماں...... غمِ ہجراں...... اسرار نہاں تھا۔ اسرار نہ رہا۔ کوئی تمنا نہ کوئی ملال......

پارک میں موجود بیشتر افراد دیدۂ حیراں کے ساتھ متوجہ تھے۔ شطرنج کے کھلاڑی، موسیقار، جوگرز...... پال مجھ سے دگنی جسامت کا حامل تھا۔ میں کشاں کشاں اسے گھسیٹ کے لے گئی۔ میرا رخ کرائے کی فورڈ ٹورس کی طرف تھا۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم ٹھیک کررہی ہو؟'' بالآخر وہ بولا۔ ''ایک ملین ڈالر ہمارے پاس ہیں...... تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ سوچو تم نے مجھے بچایا ہے۔ تم بھی زد میں آجاؤ گی۔ ہمارا بچہ سلاخوں کے پیچھے پیدا ہوگا۔ تم نے کچھ سوچا ہے؟''

''پال تمہاری بدقسمتی ہے کہ مجھے سوچنے سے چڑ ہوگئی ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔ یہ نہ ختم ہونے والا کھیل تماشا ''سوچ'' کی پیداوار ہے۔ اب جو ٹھیک ہے، میں وہ کروں گی...... برق گرے یا بھونچال آئے۔'' جیگوار کے قریب سے گزرتے وقت میں اچانک تھم گئی۔ ''چابیاں دو۔ انجام اسٹائلش ہونا چاہیے۔ ملین ڈالرز کی خوشبو شاید میرا ذہن بدل دے اور ہم ائرپورٹ روانہ ہوجائیں۔'' ہتھکڑیاں سامنے کی جانب لگی تھیں۔ اس نے ردِعمل پیش نہیں کیا۔ میں نے فوراً جیکٹ کی جیب سے چابیاں نکالیں۔ اسے سیٹ پر اس کے اوپر سے گھوم کے آئی۔

میں اپنا ہی خیال بھول گئی تھی کہ میں ایک عفریت کو بچاتی آئی تھی۔ دوسری جانب سیٹ سنبھال کے میں نے اگنیشن میں چابی لگائی، اُدھر اس نے گلوو کمپارٹمنٹ کھول کے گن نکالی۔ ایک سیکنڈ میں گن کی نال میری بغل میں چبھ رہی تھی۔

ایڈیٹ، مجھے اپنی حماقت کا ادراک ہوا۔ نکٹ بروکر نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ گن کے بارے میں جھوٹ پال نے بولا تھا۔ ''تم نے کہا تھا کہ بروکر کو لوٹتے وقت تمہارے پاس گن نہیں تھی؟'' میں نے کہا۔

''لورین، تم موجودہ صورتِ حال پر توجہ دو۔'' وہ بولا۔ ''تم جو سننا چاہتی تھیں، میں نے وہی کہا۔ اب یہ ہتھکڑیاں فوراً کھول دو۔''

''نہیں تو کیا کروگے؟ گولی ماردوگے مجھے؟'' میں نے سوال کرکے ہتھکڑی کھول دی۔

''کھیل کا آغاز تم نے کیا تھا۔'' اس نے ہتھکڑیاں باہر پھینک دیں۔

''تم اسی قابل تھے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔ ''تم نے ایک انسان کا ہی نہیں، رشتوں کا بھی خون کیا ہے...... جذبات اور احساسات کا خون کیا ہے۔ تم سراپا جھوٹ ہو۔ تمہارے اندر ایک حیوان چھپا ہے۔''

پال نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا۔ ''کیا یہ کافی نہیں تھا کہ میں ایک بانجھ عورت سے نبھا کرتا رہا۔''

''ڈھونگ تھا۔ تم دوسری عورتوں کے ساتھ کھیلتے رہے۔''

پال نے گن میری کھوپڑی سے لگادی۔ ''سنو...... جب مجھے شیرٹن میں ویرونیکا نے پیشکش کی تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں تمہارے ساتھ زندگی برباد کرتا رہا...... اور وہ فضول معمولی جاب......'' وہ ہنسا۔ ''کیسا لگا؟''

''اچھا لگا لیکن تم مجھے مار نہیں سکتے۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

''کیوں نہیں؟''

''مارنا ہوتا تو تم مجھے مارک سے نہ بچاتے؟'' دراصل میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اصل بات کیا تھی کیونکہ اس کی حقیقت کھل گئی تھی۔ اس وقت اسے اسپتال جانا چاہیے تھا۔ مارک کے ذریعے وہ بہ آسانی مجھ سے جان چھڑا سکتا تھا...... کوئی شک بھی نہ کرتا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''مجھے تمہاری پروا نہیں تھی، مارک کی فکر تھی۔''

''میں نہیں سمجھی؟''

''سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت گزر گیا۔''

''تم بچ گے نہیں۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیں گے۔'' اس نے دروازہ کھول کے مجھے باہر دھکیلا۔ اسی وقت دور سے پولیس کارز کے سائرن کی آواز ابھری۔ ظاہر ہے پارک میں تماشا دیکھنے والوں میں سے کسی نے فون کردیا تھا۔ ''سن رہے ہو؟'' میں چلائی۔

اس نے جواب دینے کے بجائے رفتار کے ساتھ گاڑی اٹھائی۔ ٹائروں سے دھواں اٹھا۔ جیگوار اچھل کے آگے گئی۔ میں منتشر ذہن کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ گزشتہ چند گھنٹوں کی حقیقت ہضم کرنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے ڈی سی پولیس کی دو گاڑیاں دیکھیں۔ جو طوفانی رفتار سے جیگوار کے پیچھے گئی تھیں۔ یہ ہونا تھا...... یہ تھا انجام۔ میں نے سوچا۔ نصف بلاک کے فاصلے پر میری فورڈ کھڑی تھی۔ میں چابیاں نکال کے کار کی طرف دوڑی۔

☆☆☆

فورڈ، ڈی سی پولیس کے عقب میں تھی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ میں حتی الامکان تیز رفتاری کا مظاہرہ کررہی تھی۔ یہ خطرناک ڈرائیونگ تھی۔ میرا رُواں رُواں جل رہا تھا۔ پال میرا مجرم تھا۔ اسے بھاگنے دوں گی نہ قانون سے بچنے دوں گی۔ ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ قاتل کو سلاخوں کے پیچھے ڈالنا ہے۔ اپنے بارے میں سوچنا میں نے بند کردیا تھا۔

وہ کہاں جاسکتا ہے؟ کہاں بھاگ رہا ہے؟ ائرپورٹ کے بلند ٹاور کی جھلک دور سے نظر آئی۔ مجھے سوال کا جواب مل گیا۔ میں نے آنے والے کونے سے بایاں موڑ کاٹا اور سرخ اشارہ نظرانداز کردیا۔ گاڑیوں کے ٹائرز اور ہارن چلّا اٹھے۔ فورڈ، اسٹریٹ M پر پھسلی۔ میں برج کی جانب اس کا راستہ کاٹنے جارہی تھی...... کار ایک بار پھسلی اور ترچھی حالت میں فرانسس اسکاٹ کی برج میں جانے والے راستے پر رکی۔ میں دروازہ کھول کے باہر کودی۔ دروازہ کھلا رہا۔ ایک ہاتھ مستقل ہارن پر جما تھا۔ ایک بس ڈرائیور کی غصیلی آواز آئی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔ سنی اَن سنی کر کے میں نے شمال کی طرف دیکھا۔ جہاں سے پال کی جیگوار نمودار ہوئی۔ عقب میں پولیس کارز تھیں۔ ہڑبونگ مچی تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پال نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انٹرسیکشن پر جانے کے لیے اس نے بلاتردد سائڈ واک کی طرف جگہ بنائی۔ میں نے بائیں جانب جست لگائی۔ بس ڈرائیور چلا رہا تھا۔ برج اور پال کے درمیان تنگ راستے پر میں کھڑی تھی۔ میں ستون کے مانند جمی رہی۔

وہ رکا نہیں۔ میں ہٹی نہیں۔

جیگوار گولی کے مانند آرہی تھی۔

وہ میرے اوپر سے نہیں جاسکتا تھا۔

وہ مجھے پولیس اور عوام کی موجودگی میں قتل نہیں کرسکتا تھا۔ اگرچہ جیگوار کی رفتار میں فرق نہیں پڑا......

آخری لمحے میں، مجھے دائیں جانب چھلانگ لگانی پڑی۔ جیگوار میزائل کے مانند بہت قریب سے گزری۔ میں بل کھا کے گھومی۔ وہ برج پر تھا۔ للکار رہا تھا۔ وحشی نے مجھے روند ہی ڈالا تھا۔ گویا میں غیر اہم جانور تھی۔

دفعتاً برق رفتار کار کے [illegible] جیسے [illegible] نے پل کی [illegible] رکاوٹ کو چھو لیا۔ کار سیدھی ہوا میں گئی۔ گویا اسٹنٹ تھا۔ فلمی منظر تھا۔ جیگوار رکاوٹ توڑ کر نیچے گئی...... شیشے ٹوٹ گئے۔ مضروب کار نے قلابازی کھائی اور دریا کے سبز پانی پر رکی...... پھر زیرآب چلی گئی۔

☆☆☆

میں برج کے کنارے کی طرف دوڑی...... اور ہاتھ آگے پھیلا کر سر کے بل نیچے دریا میں گئی۔ ٹانگیں چلاتی ہوئی میں نیچے کی طرف جارہی تھی۔

کیوں اور کیسے؟ بہادری تھی یا حماقت کچھ پتا نہیں۔ شاید میں اسے پانی میں نہیں جیل میں دیکھنا چاہتی تھی۔ پانی شفاف نہیں تھا۔ میں واپس اوپر گئی۔ گہری سانس لے کر غوطہ لگایا۔ میرا ہاتھ دھات سے ٹکرایا۔ وہ جیگوار کے اندر ائربیگ کے پیچھے سیٹ میں پھنسا ہوا تھا۔ شولڈر بیلٹ بھی اپنی جگہ پر تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر کئی جگہ زخم تھے۔ آکسیجن کی قلت کے باعث غالباً دماغ جواب دے رہا تھا۔ دروازہ ڈینٹ کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔

میں پسنجر سائڈ سے آئی اور شولڈر بیلٹ کھولنے کی کوشش کی۔ وقت کم تھا۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ میری گردن پر ہیں۔ وہ کیا کررہا ہے؟ کیا چاہتا

ہے؟ مجھے یقین نہیں آیا۔ میرا دماغ ساتھ چھوڑنے جا رہا تھا۔ دریا کی تہ میں وہ حیوان میرا گلا گھونٹ رہا تھا...... نئی کشمکش کا آغاز ہوا، دریا کا پانی میری ناک میں جانے والا تھا۔ سادہ انجام سامنے تھا۔ توانائی کے ساتھ آکسیجن بھی کم ہو رہی تھی۔ پال کا جسم اور طاقت کئی گنا زیادہ تھی۔ مجھے تیزی سے کوئی حل تلاش کرنا تھا۔ آکسیجن کے بغیر اس کی طاقت بھی جلد ہی موت کے پیام میں تبدیل ہو جاتی۔

میں نے ونڈ شیلڈ پر پاؤں جما کے پال کے حلقوم پر کہنی ماری۔ بچی ہوئی تمام توانائی کے ساتھ دوسرا وار کیا۔ میرے پھیپھڑوں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ میری گردن پر دباؤ کم ہوا۔ پال کے منہ سے ٹینس بال جیسا بلبلہ خارج ہوا۔ میں نے گردن آزاد کرائی اور کار سے باہر نکلی۔ سانس روکنا محال تھا...... یوں لگا کہ بے ہوش ہو جاؤں گی۔ پال نے میرا ٹخنا تھام لیا۔ غالباً اس کے لیے آخری کام یہ رہ گیا تھا کہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے۔ میں نے دیوانہ وار دوسری لات اس کی ناک پر ماری۔ اگلے لمحے میں آزاد تھی۔ اوپر پانی میں روشنی جھلک رہی تھی۔ میں لاتیں چلاتی روشنی کی طرف جا رہی تھی۔ پھیپھڑے پھٹنے کے قریب تھے۔ جب میرا سر آب سے باہر آیا۔ میں ہانپتے ہوئے لمبی گہری سانسیں لے رہی تھی۔ برج پر پولیس کارز کی روشنیاں گھوم رہی تھیں۔ فضا میں ہیلی کاپٹر بھی چکرا رہا تھا۔ اوپر کوئی چلایا اور رسی میری طرف پھینکی جس کے سرے پر ہوا سے بھرا ٹیوب نما دائرہ تھا۔ یہ میری لائف لائن تھی۔ پیرا کی کا دم نہیں تھا۔ میں بے جان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ڈی سی کی پولیس نے میرا خاص خیال رکھا...... فلائٹ لسٹ چیک کرنے کے بعد انہوں نے فرض کیا کہ ہم دونوں چھٹی پر تھے۔ باڈی میں نے شناخت کر لی تھی۔ میری ترجیح تھی کہ کم سے کم بولوں۔

''پارک میں ہمارے درمیان تلخی ہو گئی تھی۔ ذاتی معاملہ تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''کبھی کبھی اچانک ایسا ہوتا رہا تھا۔ تاہم بعد میں صلح ہو جاتی...... اس مرتبہ وہ خفا ہو کے گیا تو حادثہ پیش آیا۔ وہ جھگڑیوں کے باعث مشتعل تھا اگرچہ میں نے ہتھکڑیاں کھول دی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح صلح ہو جاتی تھی...... میں اسے بچانے کے لیے دریا میں کودی تھی۔ ائیر بیلون اور بیلٹ کا تحفظ اس کے لیے مصیبت بن گیا...... مزید یہ کہ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب دروازہ مڑ گیا تھا۔'' میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

راجر زمپالا بھی پہنچ گیا۔ لوکل میڈیا کو اس نے مختصر کہانی سنائی جس میں روبری کا ذکر نہیں تھا۔ اس نے مجھے وہاں سے نکال لیا۔

رہ گئی ویرونیکا، مجھے یقین تھا کہ وہ اپنا منہ بند رکھنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ وہ خود روبری میں ملوث تھی۔ پال میرا شوہر تھا۔ ویرونیکا کے لیے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے۔ سب سے بڑا سوال تھا کہ پال اور مارک کا کیا معاملہ تھا۔

تدفین کے لیے میں نے بالٹی مور کا انتخاب کیا جہاں ہماری شادی ہوئی تھی۔ میرے قیاس کے مطابق ویرونیکا منظرِ عام پر نہیں آئی۔ میں نے شیرٹن انر ہاربر ہوٹل میں قیام کیا۔ شاور لے کر بستر پر گری۔ بے حس و حرکت...... چھت کو گھور رہی تھی۔ غم، غصہ، اضطراب، شرمندگی اور تنہائی، یادیں، خیالات...... پتا نہیں کب نیند نے مجھے دبوچ لیا۔

آنکھ کھلی تو نیم تاریکی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ خیالات پھر سے ذہن میں در آئے۔ کیا ہوا تھا...... شروع سے آخر تک۔ کیسا آغاز تھا اور کیسا انجام۔ پال درحقیقت کون تھا۔ اچانک میری پلکیں بھیگیں۔ پتا نہیں کتنی دیر میں روتی رہی۔

بالآخر میں اندر سے بھی دہل گئی۔ ایک نئی زندگی میرے پیٹ میں پل رہی تھی۔ میں نے فون پر طعام کا آرڈر دیا پھر ٹی وی آن کیا۔ چینل بدلتے ہوئے میں وہاں رک گئی جہاں واشنگٹن ڈی سی والے برج کے حادثے کی خبر چل رہی تھی۔ پال کی کار دریا سے نکالی جا رہی تھی۔ میں اشکبار ہو چلی تھی پھر خود کو روک لیا۔ نیوز اینکر حادثے کو المناک واقعہ قرار دے رہا تھا...... ٹریجڈی۔

''یہ آدھا سچ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مسٹر تمہیں کوئی آئیڈیا نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

☆☆☆

تین ماہ بعد...... فیڈ ایکس پیکیج میں ''کے مین آئی لینڈ ٹرسٹ بینک'' کے اٹارنی کا لیٹر ہیڈ تھا۔ رقعے کے مطابق پال نے لوٹی رقم مع سود کے میرے نام چھوڑی تھی۔

میں متاثر نہیں ہوئی۔ میں اسے معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اگرچہ یہ پیکیج غیر متوقع تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ رقم کسی خیراتی ادارے کے حوالے کر دوں گی۔ پیٹ میں بے بی کی کک نے میری سوچ بدل دی۔ میں نے ڈھائی لاکھ ڈالرز اسکاٹ فیملی کے لیے روانہ کر دیے۔

☆☆☆

مصروف اسٹریٹ تھی اور بار بھی مصروف۔ میرا اپنا آفس بار سے محض دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ آفس کے سائن بورڈ پر ''پیرڈائز انویسٹی گیشن'' کے الفاظ تھے۔ فیڈ ایکس پیکیج وصول کیے ہوئے مزید پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ وصولیابی سے قبل مجھے چند روز کے لیے واپس بروکلین، مین ہٹن جانا پڑا تھا۔ بچی ہوئی چھٹیاں منسوخ کیں۔ استعفیٰ پر دستخط کیے۔ دوستوں، ساتھیوں سے تعزیت اور ہمدردی وصول کرکے چند ضروری کام نمٹائے اور نکل گئی۔

میں سیڑھیاں اتر کے بار میں آئی۔ بارٹینڈر نے سنڈے نیویارک ڈیلی نیوز ایک طرف ہٹا کے مجھے دیکھا۔ اس نے دیدے گھمائے اور مسکرایا۔ اس طرح صرف مائیک مسکرا سکتا تھا۔ میرا پرانا ساتھی مائیک، ننھا تھامس، مائیک کی آنٹی کے پاس تھا۔ میں اس وقت سات ماہ جوآن میں تھی۔

''آؤ باہر چلتے ہیں۔'' مائیک کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ہم ساحل پر ٹہل رہے تھے...... ساتھ ساتھ...... ہاتھ میں ہاتھ۔ میں اسے ہر بات جزئیات کے ساتھ بتا چکی تھی۔ گزشتہ مرتبہ میں نے ایک بات چھپائی تھی...... وہ بھی [illegible] کے قاتل کے بارے میں۔ اس بار میں نے ہر بات بھول کے [illegible] نئے رشتے کی بنیاد [illegible] سچ پر استوار کرنا چاہی تھی۔

''لورین بعض فیصلے تقدیر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہم قطعی بے بس...... بھول جاؤ۔ تھامس اور میرا خیال رکھو۔''

''تمہارا خیال؟ تمہیں کیا ہوا؟''

''گھبرایا سا رہتا ہوں۔ جب سے تم سے شادی کی ہے۔''

''شادی نہیں کرنی تھی۔'' میں نے کہا۔

''مطلب خیال نہیں رکھوں گی۔'' مائیک نے مجھے کھینچا۔

میں ہاتھ چھڑا کے بھاگی۔

ہم دونوں ساحل پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

''سنو...... ایک سوال ہے۔'' مائیک نے بلند آواز میں کہا۔

''بولو۔'' میں رک گئی۔

''تم ویرونیکا سے پہلی بار ملیں...... تم نے بیج دکھایا۔ اُس نے تمہیں پہچانا نہیں؟''

''پال نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بے خبر تھی۔''

''اور پال کی گن؟''

''اس کا لائسنس ہوگا یا پھر وہ گاڑی سے دریا میں گری ہوگی۔''

''ویرونیکا سامنے کیوں نہیں آئی؟'' مائیک نے سوال کیا۔

''تم استفسار کررہے ہو؟ تم خود پولیس میں رہ چکے ہو...... ویرونیکا پر میری اور پال کی حقیقت اس وقت کھلی جب حادثے کی خبر گردش میں آئی۔ اس کے لیے شاک تھا۔ تہ در تہ شاک...... میں پال کی بیوی تھی...... پولیس میں تھی...... پال نے ویرونیکا کو بے خبر رکھا۔ بڑا سوال یہ تھا کہ میں کس لیے اور کیونکر اس تک پہنچی۔ اس کا ماضی داغ دار تھا، کتنا تھا...... یہ نہیں معلوم۔ لیکن تھا، کیونکہ اس نے پانچ سال قبل پال کو جرم کے راستے پر ڈالا۔ اسے بروکر کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ وہ یہی سمجھی کہ میں اس کے بارے میں بہت زیادہ جانتی ہوں۔ اسے مجھ سے خطرہ تھا۔ پال کے خاتمے کے بعد خطرہ بڑھ گیا تھا۔ وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کے پاس لوٹ کی رقم کا حصہ موجود ہوگا...... آخری اندازہ ہے کہ وہ [illegible] فرصت [illegible] خاموشی سے [illegible] چھوڑ [illegible] سوال نہیں۔'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

''لورین، حیرت ہے جتنے افراد مارے گئے...... سب گنہگار تھے۔ یہ اور بات کہ غیر قانونی طور پر ہلاک ہوئے۔ یعنی چہرے کے پیچھے چہرہ تھا۔ صرف پال اپنی موت آپ مرا۔ یہاں تمہاری قسمت پھر کام کر گئی۔'' مائیک نے تبصرہ کیا۔ ''ورنہ پال نے تو پھنسنا ہی تھا...... تم بھی بچ نہ پاتیں۔ اتنی بہادری، ایسا انتہائی فیصلہ تم نے کیسے کیا؟''

''پھر سوال؟''

''نہیں پارٹنر۔''

''مائیک، میں نڈھال تھی۔ تھک چکی تھی۔ بہت زیادہ...... میں نے اپنے بارے میں سوچنا بند کردیا تھا۔ ایک ہی آرزو تھی کہ کہانی کو منطقی انجام تک پہنچا دیا جائے۔''

''کس قیمت پر؟''

''ہر قیمت پر۔ پارٹنر۔''

''پارٹنر؟''

''ایکس، پارٹنر۔''

''نہیں، لائف پارٹنر۔'' مائیک.... اس کی طرف ہاتھ بڑھا۔

❖❖❖

دہری چال

سیرینا راض

pklibrary.com

سفر پر نکلتے ہی احساسیات و جذبات میں تروتازگی آجاتی ہے... سفر انسان کی آنکھوں پر سے پردے ہٹادیتا ہے... ہر قسم کی اشیا... مختلف مزاج کے لوگوں سے گفت و شنید کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے... مظلوم و مجبور سے لے کر امیروں کی فیاضی و عیاشی تک تمام برائی اور نیکی رفتہ رفتہ عیاں ہوتی چلی جاتی ہے... ایک ایسے ہی سفر کا آغاز... گزرتے گزرتے نئے مسافروں کی آمد نے اسے دلچسپ کے ساتھ پراسرار و متحیر بنادیا اور اختتام تک...

ایک ہی میان میں چھپی دو تلواروں کی تیزی طراری

معروف اداکارہ جون فیرن چائلڈ کے بارے میں جب یہ خبر شائع ہوئی کہ وہ اس سال گولڈن گلوب ایوارڈز کی تقریب میں شرکت کرے گی تو لوگوں کی دلچسپی اور حیرت بڑھ گئی کیونکہ اپنی آخری کامیاب فلم کورٹ کے بعد وہ گوشہ نشین ہوگئی تھی اور گزشتہ دس سالوں کے دوران وہ منظر عام پر نہیں آئی۔ اس نے کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لیا اور نہ ہی اسے کسی تقریب یا عوامی اجتماع میں دیکھا گیا۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ اس تقریب میں غالباً اپنا مشہورِ زمانہ ہیروں کا نیکلس

پہن کر شرکت کرے گی۔

ٹرین کے اٹینڈنٹ نے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر سے نظریں ہٹا کر ان دو مسافروں کو دیکھا جو بوگی کی طرف آرہے تھے۔ ان میں ایک عمر رسیدہ اور دوسرا بہت بوڑھا تھا۔ تاہم اس کی صحت قابل رشک تھی اور وہ سیدھا چل رہا تھا۔

اٹینڈنٹ نے دل میں سوچا کہ ان پر نظر رکھنی پڑے گی کیونکہ بوڑھا آدمی کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے جب وہ قریب آئے تو اس نے مسکراتے ہوئے ان کا نام پوچھا۔

''کوئن۔'' چھوٹی عمر والے نے جواب دیا۔ ''ہیلیری اور رچرڈ۔''

اٹینڈنٹ نے اپنی فہرست دیکھی اور ان کے ناموں پر نشان لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تم دونوں کا بوگی نمبر 0331 اور بیڈ روم B، ہے۔ یہ ٹرین کی آخری بوگی ہے۔ لہٰذا تم اپنے بائیں جانب راہداری میں سیدھے چلے جاؤ۔ تمہارا کمرا بوگی کے دوسری طرف ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے؟'' اس نے بوڑھے آدمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ہیلیری مسکرایا اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ریٹائرڈ بینکر رچرڈ کوئن حسب عادت بڑبڑا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے بوگی میں سوار ہوا۔ ہیلیری نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو خواتین پلیٹ فارم پر چلتی ہوئی ان کی طرف آرہی تھیں۔ دونوں طویل قامت اور تقریباً 65 برس کی لگ رہی تھیں۔ ان کی شکل وصورت اور جسامت میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ لگتا تھا کہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ ہیلیری اپنے آپ کو قیاس آرائی سے باز نہ رکھ سکا۔ تاہم اس مماثلت کے باوجود دونوں کے لباس میں نمایاں فرق تھا۔ ان میں سے ایک نے بزنس سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ دوسری کشادہ گلے کے سلک گاؤن میں ملبوس تھی اور اس نے اپنے کندھوں پر جالی دار دوپٹا ڈالا ہوا تھا۔

''ان کے بارے میں مت سوچو۔'' ہیلیری نے اپنے آپ کو ملامت کی اور واپس مڑ کر اپنے باپ کو دیکھنے لگا جو بیڈ روم کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک اور مسافر ڈائننگ کار میں داخل ہوا اور اس نے ہیڈ ویٹر کو اپنا ٹکٹ دکھایا۔ ''جی جناب، تمہارا بیڈ روم C اور بوگی نمبر 0330 ہے۔''

وہ بوڑھا شخص ویٹر کے ہمراہ میزوں کے درمیان راستے پر چل دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے دونوں طرف کی میزوں پر ہاتھ رکھ کر چل رہا تھا۔

ویٹر اسے اس میز پر لے گیا جہاں دو مسافر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مڑا اور ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں بیٹھ جائیں۔''

بوڑھا شخص کھڑکی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے سکون کا سانس لیا پھر اس نے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں مسافروں کی جانب دیکھا۔ ان میں ایک اس سے عمر میں چھوٹا اور دوسرا کافی بوڑھا تھا۔ اس کی عمر اسی یا نوے برس ہوگی پھر اچانک ہی وہ چونک پڑا۔ ''اوہ میرے خدا۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''ہیلیری! رچرڈ! مجھے یقین نہیں آرہا۔''

سامنے بیٹھے ہوئے دونوں افراد بھی حیران رہ گئے پھر ہیلیری نے بوڑھے کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ''جے جے! تم یہاں کیا کررہے ہو؟ کیا تم بھی ہماری طرح چھٹیاں منانے جارہے ہو؟''

''نہیں یہ کوئی تفریحی دورہ نہیں ہے۔ میں اپنی بہن کی میموریل سروس میں شرکت کے لیے لاس اینجلس جا رہا ہوں۔''

''کیتھرائن؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ سُن کر بہت افسوس ہوا؟'' ہیلیری نے کہا۔

جے جے کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''پیاری کیتھرائن، کیتھی۔ ریٹائرڈ آرٹسٹ۔ اس کے بہت نام تھے۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا انتقال پچھلے ہفتے ہوا۔ بالکل اچانک۔ میں وہاں موجود نہیں تھا لیکن اب میں اس کی سروس میں شرکت کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔''

وہ ایک لمحے کے لیے اپنے خیالوں میں کھو گیا پھر ان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور تم دونوں بھی لاس اینجلس جا رہے ہو؟''

''ہاں۔'' ہیلیری نے جواب دیا۔ ''میں اور ڈیڈی وہاں دو ہفتے قیام کریں گے۔ ہمیں وہاں این بی سی سیریز کی ایک ایپی سوڈ کی شوٹنگ دیکھنی ہے۔ میں وہاں ستمبر میں بھی گیا تھا تب ڈیڈی بہت ناراض ہوئے تھے اور انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ انہیں یہ پسند نہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر چلا جاؤں چنانچہ میں اس کی تلافی کرنے کے لیے ڈیڈی کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

انسپکٹر نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ سمجھتا ہے کہ میں اس عمر میں سفر نہیں کر سکتا۔''

جے جے نے اپنی بھویں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس سفر کے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا۔''

لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ایک عورت ان کی میز پر آگئی تھی۔ ہیلیری کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک

pklibrary.com

ابھری۔ وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ انہی دو عورتوں میں سے ایک تھی جو ان کے پیچھے پیچھے ٹرین میں سوار ہوئی تھیں۔ اس نے وہی سلک کا لباس اور جالی دار دوپٹا پہن رکھا تھا۔ اس عورت نے گلا صاف کیا اور پوچھا کہ کیا چوتھی کرسی خالی ہے۔ تینوں مردوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلایا تو وہ جے جے کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایلیری بولا۔ ''نئے دوست بنانے کے لیے ڈائننگ کار بہترین جگہ ہے۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ایلیری کوئن۔''

''تمہارا مطلب ہے رائٹر ایلیری کوئن جس کا شو ٹیلی وژن پر چل رہا ہے۔''

''ہاں، مجھ سے ہی یہ قصور سرزد ہوا ہے اور یہ میرے ڈیڈی رچرڈ ہیں، ہم دونوں ایک ایپی سوڈ کی شوٹنگ دیکھنے لاس اینجلس جا رہے ہیں اور تمہارے برابر میں ہمارا پیارا اور پرانا دوست جے جے میک کیو بیٹھا ہوا ہے جس نے میرے ابتدائی ناولوں کا پیش لفظ لکھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ سفر کر رہا ہے۔''

اس عورت نے باری باری بقیہ دونوں مردوں سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ ''میں سینڈی ہوں۔ سینڈی منٹ۔''

ایلیری نے ڈائننگ کار کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''معاف کرنا میں نے تمہارے ساتھ ایک اور عورت کو بھی ٹرین میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ کیا وہ ڈنر نہیں کرے گی؟''

''وہ نہیں، مسز فرینی تنہا ڈنر کرنا پسند کرتی ہے۔ وہ میری دوست نہیں بلکہ پرسنل سیکریٹری ہے۔''

ایلیری نے لمحہ بھر کے لیے اپنی پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ''مجھے حیرت ہے......'' لیکن انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ویٹر ہماری طرف آرہا ہے۔ اس لیے ہمیں مینیو دیکھ کر اپنی پسند کی چیزوں کا انتخاب کر لینا چاہیے۔''

☆☆☆

جے جے میک کیو، پہلا شخص تھا جس نے کھانا ختم کیا۔ جب بقیہ تینوں افراد کافی پینے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے تو وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سینڈی منٹ کو دیکھ کر احتراماً جھکا پھر اس نے انسپکٹر اور ایلیری کی طرف دیکھ کر کہا۔

''امید ہے کہ تم سے بعد میں ملاقات ہوگی تب تک کے لیے......'' وہ مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ ٹٹولنے لگا پھر وہ میزوں کے درمیانی راستے پر لڑکھڑاتے ہوئے چل دیا۔

سینڈی منٹ نے کافی ختم کی اور بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے بھی اب جانا چاہیے۔'' وہ مسکرائی اور میز سے اٹھ کر مخالف سمت میں چل دی۔

انسپکٹر نے ایلیری سے کہا۔ ''کیا تم نے ان دونوں عورتوں کو دیکھا تھا جب وہ ٹرین میں سوار ہوئی تھیں؟''

''ہاں۔'' ایلیری نے جواب دیا۔

''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ ہم نے اداکارہ جون ٹرین چائلڈ کے ساتھ ڈنر کیا ہے۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ کسی ایوارڈ تقریب میں شرکت کے لیے ہالی ووڈ جا رہی ہے اور اسے ہوائی جہاز میں سفر کرنا پسند نہیں اور وہ دوسری عورت...... کیا نام تھا اس کا؟ فرینی! وہ یقیناً اس کی اسسٹنٹ یا سیکریٹری ہوگی۔''

''ہو سکتا ہے۔'' ایلیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسی خبریں غور سے پڑھتے ہو۔''

انسپکٹر نے کافی ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے کمرے میں واپس جا رہا ہوں۔''

''ایک منٹ رک جاؤ۔ میں بل ادا کر دوں پھر ہم ساتھ چلیں گے۔''

انسپکٹر نے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بچہ مت سمجھو۔ میں اپنے پیروں پر چل کر جانے کے قابل ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میزوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ڈائننگ کار سے باہر چلا گیا۔ ایلیری نے ویٹر کو اشارہ کیا جو تنہا ڈنر کرنے والی ایک عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ ایلیری نے سوچا کہ یہی فرینی ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

ایلیری، سلیپر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس نے فائر کی آواز سنی۔ اس نے اپنی رفتار بڑھائی اور بوگی کے عقبی حصے میں ڈبل بیڈروم کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹرین کو ایک جھٹکا لگا تو اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ راہداری کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ابھی اسے اپنے آگے شور کی آواز سنائی دی۔ وہ جیسے ہی وہاں پہنچا تو اس کے قدم فرش پر جم گئے۔ اس کے سامنے انسپکٹر کسی پر گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ وہ شخص آدھا بیڈروم میں اور آدھا گیلری میں چت پڑا ہوا تھا۔ ایلیری کو وہاں خون بھی نظر آیا۔

وہ اپنے باپ کے پاس پہنچا اور نیچے دیکھا۔ انسپکٹر کے بازوؤں میں جے جے میک کیو جھول رہا تھا۔ ''اسے گولی لگی ہے۔'' انسپکٹر چلایا۔ ایلیری جھکا اور اس نے بایاں ہاتھ باپ کے کندھے پر رکھ دیا۔

''میں راہداری سے گزر رہا تھا جب فائر کی آواز سنی۔''

pklibrary.com

انسپکٹر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ آواز اندر سے آئی تھی۔“ اس نے بیڈ روم C کی طرف اشارہ کیا۔ ”دروازہ مقفل تھا اور میں اس پر زور آزمائی کرنے والا تھا لیکن پھر وہ اچانک کھل گیا اور جے جے، باہر راہداری میں گر پڑا۔ جیسے ہی وہ گرنے لگا میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی پھر خاموش ہو گیا۔“

ایلیری نے پوچھا۔ ”ڈیڈی، اس نے کیا کہا؟“

”اسے چھوڑو۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ وہ مر چکا ہے۔“ انسپکٹر نے بیٹے کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

رچرڈ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی بہن کو بہت یاد کر رہا ہے۔ وہ کتنی پیاری تھی بس اتنا ہی کہا۔“ پھر اس نے اپنی پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

ایلیری نے ایک گہری سانس لی اور سوچنے لگا کہ اس گتھی کو سلجھانا ہوگا۔ اس نے پہلے جے جے اور پھر بیڈ روم C کے اندر دیکھا۔ اس کا سوٹ کیس کھلا ہوا تھا اور اس کا سامان پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور راہداری میں دیکھنے لگا جو ڈائننگ کار کی طرف جا رہی تھی۔ ان کے پیچھے اٹینڈنٹ اور اس کے پیچھے ایک بھاری بھرکم جسامت والا شخص کھڑا ہوا تھا۔ ایلیری اسے نہیں پہچانتا تھا۔ وہ تیزی سے ان کی طرف آیا اور والٹ سے اپنا بیج نکال کر دکھایا۔

”سراغ رساں ڈین فوشین۔ میرا تعلق ریلوے پولیس سے ہے۔ یہاں کیا ہوا ہے؟“

اٹینڈنٹ پیچھے ہٹ گیا اور سراغ رساں بیڈ روم C کی جانب بڑھا۔ ایلیری نے سہارا دے کر انسپکٹر کو کھڑا کیا اور وہ دونوں ایک طرف ہو گئے تاکہ سراغ رساں فرش پر پڑے ہوئے جے جے کو بہتر طور پر دیکھ سکے۔

”ہمارا دوست۔“ انسپکٹر نے سرگوشی میں کہا۔ ”اسے گولی لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مر چکا ہے۔“

فوشین اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس کی نظریں جے جے پر تھیں جو راہداری میں چت لیٹا ہوا تھا پھر اسے کھانسی آئی اور اس کے منہ سے خون کے قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ ایلیری اور انسپکٹر نے بیک وقت گہرا سانس لیا۔ فوشین نے پیچھے کھڑے ہوئے اٹینڈنٹ سے کہا۔ ”مسافروں کی فہرست میں دیکھو کہ کوئی ڈاکٹر اس ٹرین میں سفر کر رہا ہے اور اس بوگی پر پہرا لگا دو، کسی کو بھی میری اجازت کے بغیر اندر نہیں آنے دینا۔“

چند منٹوں بعد جے جے کو احتیاط کے ساتھ ڈائننگ کار میں منتقل کر دیا گیا۔ فاؤنٹین نے واپس آ کر کہا۔ ”تمہارے دوست کی حالت بہت خراب ہے اور وہ ابھی تک بے ہوش ہے اس ٹرین میں ایک ڈاکٹر موجود ہے جو اس کی ہر ممکن طریقے سے دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ہم اگلے اسٹیشن پر اسے اسپتال بھیج دیں گے۔“

یہ کہہ کر فاؤنٹین خاموش ہو گیا اور سوالیہ انداز میں ان دونوں کو دیکھنے لگا جیسے واقعے کی تفصیل جاننا چاہ رہا ہو۔ ایلیری اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا اور بولا۔ ”ہمیں نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہوا۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے دوست جے جے میک کیو، کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ میرے والد نے اسے گولی لگنے کے بعد یہاں پڑا ہوا دیکھا۔ میں تمہاری تفتیش میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا لیکن یہاں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے فائر کیا اور غالباً اس کے پاس اب بھی گن موجود ہو گی۔“

”ایک منٹ۔“ فوشین نے کہا۔ ”پہلے تم دونوں اپنا تعارف کرواؤ۔“

”میرا نام ایلیری کوئن ہے۔ میں ایک رائٹر ہوں اور یہ میرے والد رچرڈ کوئن ہیں۔ نیویارک پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر۔“

فوشین کی آنکھیں سکڑ گئیں اور اس نے بے دلی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ پھر اس نے اٹینڈنٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو دوبارہ ان کے پیچھے آ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ”کیا تم پیچھے جا کر بوگی کے دروازے کی نگرانی کر سکتے ہو۔ تمہیں یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ سیل ہے اور وہاں ڈائننگ کار سے کوئی واپس نہیں آیا۔“

اٹینڈنٹ کے جانے کے بعد سراغ رساں نے کہا۔ ”میں فی الحال یہ فرض کر لیتا ہوں کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی اس واقعے میں ملوث نہیں۔“

لیکن ایلیری اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”میرے والد مجھ سے پہلے یہاں آ گئے تھے۔ ہمیں بیڈ روم B ملا ہے۔ میں ڈائننگ کار کا بل دینے کے بعد ان کے پیچھے آیا۔ جب میں بوگی کے عقب میں پہنچا تو ایک فائر کی آواز سنی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ میرے والد پہلے یہاں پہنچے اور ہمارے دوست کو گولی لگ چکی تھی۔ وہ اس بیڈ روم سے نکل کر باہر راہداری میں آن گرا۔ یہ اس ٹرین کی آخری بوگی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پچھلے حصے میں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں

pklibrary.com

ہے۔‘‘

’’نہیں، بوگی کے پچھلے حصے کا دروازہ ہمیشہ باہر سے مقفل ہوتا ہے۔‘‘

’’ڈیڈی، کیا تم نے کسی کو اپنے عقب میں آتے جاتے دیکھا؟‘‘

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں۔‘‘

’’اور نہ ہی کوئی بیڈ روم میں تھا جب جے جے باہر راہداری میں گرا؟‘‘

انسپکٹر نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا۔ ’’اور نہ ہی کوئی میرے پاس سے گزرا جب میں یہاں آرہا تھا۔‘‘ ایلیری نے کہا۔ ’’کیونکہ میرا یا ڈیڈی کا کسی سے بھی سامنا نہیں ہوا جب ہم بوگی میں آئے تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جس کسی نے گولی چلائی وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ میرا مطلب ہے ہمارے اور بوگی کے آخری حصے کے درمیان۔‘‘

تینوں آدمی راہداری کے بقیہ حصے کی طرف دیکھنے لگے۔ ’’ڈیڈی، ہمارا بیڈ روم B ہے۔‘‘ ایلیری نے کہا۔ ’’اس بوگی میں دس چھوٹے کمرے بھی ہیں لیکن وہ سب ہمارے عقب میں ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ بیڈ روم بھی ہیں لیکن ہمارے اور بوگی کے آخری سرے کے درمیان صرف بیڈ روم B اور A ہیں۔ اگر بوگی کے آخری سرے کا دروازہ مقفل ہو تو وہ شخص انہی دو کمروں میں سے کسی ایک میں ہوگا۔‘‘

تینوں آدمیوں کی نظریں بوگی کے آخری سرے کی جانب اٹھ گئیں۔ ’’یہاں ٹھہرو۔‘‘ فونٹین نے اپنی گن نکالی اور آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ ’’دونوں کمرے خالی ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ڈیڈی، جب تم نے فائر کی آواز سنی تو بیڈ روم C کا دروازہ مقفل تھا؟‘‘

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر اندر سے کلک کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور جے جے لڑکھڑاتا ہوا باہر فرش پر آن گرا۔‘‘

’’اور دروازہ صرف اندر سے مقفل ہوسکتا ہے۔‘‘ فونٹین نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

ایلیری نے سوچتے ہوئے کہا۔ ’’یعنی جب جے جے کو گولی لگی تو وہ کمرے میں بند تھا۔ بہرحال اس نے کسی طرح دروازہ کھول لیا اور باہر راہداری میں آن گرا۔ جب میرے والد نے اسے دیکھا تو اس نے کچھ کہا اور بے ہوش ہوگیا۔‘‘

’’لیکن جس شخص نے اسے گولی ماری وہ کہاں گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے دوست نے خودکشی کی ہو؟‘‘ فونٹین نے پوچھا۔

’’ناممکن ہے۔‘‘ ایلیری نے کہا۔ ’’اور اگر یہ معاملہ ہوتا تو پھر گن کہاں ہے؟‘‘

تینوں آدمیوں نے کمرے کی طرف دیکھا۔ فاؤنٹین اٹھا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ ایلیری اور رچرڈ اسے کمرے اور ملحقہ باتھ روم کی تلاشی لیتے ہوئے دیکھتے رہے۔

’’وہاں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔‘‘ اس نے واپس آکر کہا۔

ایلیری نے راہداری پر نظر ڈالی اور فونٹین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’کیا یہ بیڈ روم جے جے، کو دیا گیا تھا؟‘‘

’’غالباً نہیں۔‘‘ فونٹین نے جواب دیا۔ ’’کیونکہ کمرے میں بکھرے ہوئے سارے کپڑے عورتوں کے ہیں لیکن مجھے فہرست چیک کرنے دو۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ڈائننگ کار کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی کئی منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذ تھے۔

’’انہیں لوگوں کو اس بوگی سے دور رکھنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔‘‘ فونٹین نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ’’خاص طور پر دو عورتیں بضد ہیں کہ وہ اپنے کمرے چیک کرنا چاہتی ہوں۔‘‘ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فہرست دیکھی اور بولا۔ ’’بیڈ روم C خاتون مسافر منٹ کو دیا گیا ہے۔‘‘

’’منٹ۔‘‘ انسپکٹر نے ایلیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’یہ وہی عورت ہے جس کے ساتھ ہم نے ڈنر کیا تھا لیکن جے جے، اس کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟‘‘

ایلیری نے اپنی بھویں اچکائیں پھر فونٹین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ’’بیڈ روم ڈی، میں کون ہے؟‘‘

فونٹین نے دوبارہ فہرست چیک کی اور بولا۔ ’’ٹرینی ڈولیاج۔‘‘

’’وہ منٹ کی اسسٹنٹ ہوگی۔‘‘ انسپکٹر بڑبڑایا۔ ’’اس نے ڈنر کے دوران اس کا تذکرہ کیا تھا۔‘‘

’’کیا ہم مزید کچھ دیر کے لیے بوگی کو سیل رکھ سکتے ہیں؟‘‘ ایلیری نے سراغ رساں سے پوچھا۔ ’’میں اس معاملے پر اپنے والد سے چند منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ہاں، اس میں کوئی حرج نہیں۔‘‘ فونٹین نے جواب دیا۔

ایلیری نے رچرڈ کو اپنے بیڈ روم میں چلنے کا اشارہ کیا۔ رچرڈ ایک کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ایلیری نے بیڈ روم کا دروازہ بند کیا اور باپ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

’’مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ جے جے نے تم سے کیا کہا

pklibrary.com

تھا؟"

رچرڈ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ یہ کتنا اہم ہے۔ اس نے صرف یہ کہا کہ وہ اپنی بہن کو بہت یاد کررہا ہے اور یہ کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم تھی۔"

"ڈیڈی، مجھے اس کے اصل الفاظ بتاؤ۔"

"اس نے کہا کہ وہ اپنی بہن کو یاد کررہا ہے اور اس کی بہن بہت پیاری تھی پھر اس نے پیچھے مڑ کر بیڈروم کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہوگیا۔ میں سمجھا کہ وہ مرگیا ہے۔"

"ڈیڈی پلیز، اپنے ذہن پر زور دو۔ اس کے اصل الفاظ کیا تھے؟ کیا اس نے یہ کہا کہ وہ کیتھرائن کو یاد کررہا ہے؟"

رچرڈ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں، اس نے ریڈ کہا تھا۔ اس کے الفاظ تھے Missed Red۔"

"لیکن ڈیڈی، یہ تو ماضی کا صیغہ ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے Missed Red کہا تھا؟"

"نہیں، اس نے کہا تھا، 'i miss Red' اور یہ کہ وہ پیاری تھی۔"

"اس نے یہ کہا کہ ریڈ پیاری تھی؟"

"اس نے یہ الفاظ کہے تھے i miss Red اور پھر چھت کی طرف دیکھ کر کہا Sweet kay۔"

ایلیری دروازے پر گیا اور اس نے سراغ رساں کو پکارا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسٹر میک کیو کا کمرا کون سی بوگی میں تھا؟"

فونٹین نے فہرست میں دیکھ کر بتایا۔ "بوگی نمبر زیرو تھری زیرو۔ ڈائننگ کار کے دوسری جانب......"

ایلیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور اس بوگی میں اس کا بیڈروم C تھا؟"

فونٹین حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "ہاں لیکن تم کیسے جانتے ہو؟"

لیکن ایلیری جواب دینے کے بجائے واپس بیڈروم میں چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے باپ کو دیکھنے لگا۔ رچرڈ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور بولا۔ "تم ساری بات سمجھ گئے ہو، مجھے بھی بتاؤ۔"

ایلیری نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "اب تک ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ جے جے کو اس کمرے میں گولی لگی جو اس کا نہیں تھا۔ جب اس نے اندر سے دروازہ کھولا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا تمہارے بازوؤں میں آگیا۔ لگتا تھا کہ اس کمرے کی تلاشی لی گئی تھی کیونکہ ہر جگہ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ویسے وہ کمرا خالی تھا۔ جب ہم دونوں ایک ایک کرکے اس کمرے تک پہنچے تو راستے میں ہمارا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ لہٰذا بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حملہ آور بوگی کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا لیکن جب دوسرے کمرے کی تلاشی لی گئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب تک کا نچوڑ یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک مقفل کمرا، ایک لاپتا حملہ آور اور زخمی شخص کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

انسپکٹر نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔ "جے جے نے جو کچھ کہا اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے۔"

ایلیری نے کہا۔ "بہتر ہے کہ ہم اس سراغ رساں کی موجودگی میں مزید گفتگو کریں۔"

رچرڈ نے اس سے اتفاق کیا اور دونوں کمرے سے نکل کر ڈائننگ کار کی طرف چل دیے جہاں سراغ رساں فونٹین ایک اٹینڈنٹ کی مدد سے سلیپرز میں جانے کا راستہ بند کررہا تھا اور ان کے پیچھے کئی مسافر کھڑے ہوئے احتجاج کررہے تھے۔

"ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" ایلیری نے سراغ رساں سے کہا اور راہداری کی طرف دیکھنے لگا۔ سراغ رساں تھوڑا سا حیران ہوا لیکن وہ ایلیری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایلیری نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے اٹینڈنٹ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم ان لوگوں کو کمروں میں جانے دیں۔ تمہاری مدد کا شکریہ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا جسے اٹینڈنٹ نے فوراً ہی تھام لیا۔ عین اسی وقت رچرڈ نے اپنا ہاتھ اس کے کوٹ میں ڈالا اور بائیں کندھے پر لٹکے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

"گن رکھنے کا احمقانہ طریقہ ہے۔" انسپکٹر نے شکایتاً کہا۔ یہ کہہ کر اس نے پستول کی نال کا رخ اٹینڈنٹ کی طرف کردیا۔ ایلیری نے ابھی تک اس کا دایاں ہاتھ پکڑا ہوا تھا پھر اس نے فونٹین کی طرف دیکھا جس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

"یہ...... یہ کیا ہے؟" وہ زور سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ اسی پستول سے میک کیو پر گولی چلائی گئی تھی اور اب تم اگلے اسٹیشن کو اطلاع دے سکتے ہو کہ ہم صرف متاثرہ شخص ہی نہیں بلکہ حملہ آور بھی ان کے حوالے کریں گے۔"

کئی گھنٹوں بعد ایلیری اور رچرڈ اپنے بیڈروم میں بیٹھے

pklibrary.com

کھڑکی سے باہر کا نظارہ کررہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور سراغ رساں فونٹین اندر داخل ہوا۔ وہ سیٹی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں یہ بتانے آیا تھا کہ تمہارے دوست کو گزشتہ اسٹیشن پر اسپتال منتقل کردیا گیا ہے۔ اس کی حالت کافی خراب ہے اور وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ تاہم ڈاکٹر پُرامید ہیں کہ وہ جلد ہی ہوش میں آجائے گا۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

یہ سن کر ہیلری کے چہرے پر رونق آگئی اور رچرڈ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ سراغ رساں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہم نے اٹینڈنٹ کو بھی پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ اسے حال ہی میں ملازم رکھا گیا ہے۔ وہ اس سے پہلے ڈکیتی اور مسلح حملوں میں ملوث رہا ہے تاہم اس نے ابھی تک اس واردات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اسے کس چیز کی تلاش تھی جس کے لیے اس نے پورا بیڈروم چھان مارا اور تمہارے دوست کو قتل کرنے کی کوشش کی۔"

"میں بتاتا ہوں۔" ہیلری نے جواب دیا۔ "وہ دراصل اس ہیروں کے ہار کی تلاش میں گیا تھا جس کی مالیت کئی لاکھ ڈالر بتائی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ معمولی چیکنگ کے بعد یہ پتا چل جائے گا کہ بیڈروم سی اور ڈی میں سفر کرنے والی خواتین دراصل اداکارہ فیرن چائلڈز اور اس کی اسسٹنٹ ہیں۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق یہ اداکارہ، لاس اینجلس میں ہونے والے ایک ایوارڈ شو میں شرکت کے لیے جارہی ہے۔ اسی خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ممکنہ طور پر اس تقریب میں اپنا مشہورِ زمانہ ہیروں کا ہار بھی پہنے گی۔ اٹینڈنٹ کا خیال تھا کہ یہ ہار یقیناً اداکارہ کے بیڈروم میں ہوگا، اگر وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ اگلے اسٹیشن پر ٹرین سے اتر کر بھیڑ میں غائب ہوجائے گا اور بقیہ زندگی عیش سے گزارے گا لیکن بدقسمتی سے اس کی تلاش کے دوران ہی ہمارا دوست جے جے بیڈروم میں داخل ہوگیا۔"

"لیکن......" سراغ رساں ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اب بھی بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ اٹینڈنٹ کے پاس سے ہمیں صرف ریوالور ملا اور بیڈروم سی میں سفر کرنے والی لیڈی منٹ کا کہنا ہے کہ اس کے یا اسسٹنٹ کے کمرے سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی جبکہ اس کے کمرے کی اچھی طرح تلاشی بھی لی گئی پھر وہ نیکلس کہاں ہے؟ اور وہ اٹینڈنٹ کمرے سے کس طرح باہر نکلا جبکہ تم میں سے کوئی ایک دروازے پر موجود تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ تمہارا دوست میک کیو اس کمرے میں کیا کررہا تھا؟"

رچرڈ اور ہیلری نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر رچرڈ نے کہا۔ "کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو ہیلری؟"

"یقیناً ڈیڈی۔" ہیلری نے کہا پھر وہ فونٹین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "جب جج میک کیو کو گولی لگی اور وہ بیڈروم C کا دروازہ کھول کر میرے والد کے بازوؤں میں گرا تو اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے دو باتیں کہیں۔ ڈیڈی نے اسے یہ کہتے سنا۔ "آئی مس ریڈ اور 'سوئٹ کے'۔ جے جے کی بہن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور وہ کئی ناموں سے پہچانی جاتی تھی۔ جے جے نے بھی ڈنر کے دوران اس کا تذکرہ کیا تھا۔ ان ناموں میں ریڈ اور کے، بھی شامل تھے کیونکہ کچھ دیر پہلے ہی ڈیڈی نے جج کی زبان سے اس کی بہن کی موت کا ذکر سنا تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ یہی سمجھا کہ جج اپنی بہن کو یاد کررہا ہے حالانکہ وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ ان چار لفظوں میں اس نے ہمیں سب کچھ بتادیا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ ریڈ کو یاد کررہا ہے بلکہ وہ miss read کہہ رہا تھا۔ وہ ڈائننگ کار سے نکل کر غلط سمت میں چل دیا اور اس سے بوگی کا نمبر پڑھنے میں غلطی ہوئی اور وہ بوگی نمبر 0330 کے بجائے 033 میں چلا گیا جس میں سینڈی منٹ کا بیڈروم C تھا اور اتفاق سے جج کا بیڈروم بھی C ہی تھا۔ وہ ہمیں یہی بتارہا تھا کہ اس سے بوگی نمبر پڑھنے میں غلطی ہوئی اور وہ سینڈی منٹ کے بیڈروم میں چلا گیا۔"

رچرڈ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جے جے مجھے حملہ آور کے بارے میں بتانے کی کوشش کررہا تھا اور یہ کہ وہ کس طرح کمرے سے باہر گیا۔ بیڈروم C دراصل دو کمروں پر مشتمل ایک سوئٹ ہے جن کے درمیان ایک دیوار ہے جسے بوقتِ ضرورت ہٹایا اور بند کیا جاسکتا ہے اور اسے کھولنے کے لیے ایک چابی استعمال کی جاتی ہے۔ کمرے کی تلاشی کے دوران اٹینڈنٹ، جے جے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دونوں کا ٹاکرا ہوا اور اٹینڈنٹ نے جے جے کو گولی ماردی پھر اسے یہ خوف ہوا کہ فائر کی آواز سن کر لوگ اس جانب متوجہ ہو سکتے ہیں تو اس نے بیڈروم C کا دروازہ اندر سے بند کردیا اور دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ کھول کر بیڈروم D میں چلا گیا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جے جے زندہ ہے اور یہ کہ اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہے بلکہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ بیڈروم C کا دروازہ کھول کر باہر جاسکے۔ اٹینڈنٹ نے درمیانی دیوار کا دروازہ کھولنے کے لیے چابی استعمال کی اور جے جے

نے جب سوئٹ کی، کہا تو اس کا اشارہ اسی جانب تھا جسے میں غلطی سے سوئٹ کے، سمجھا۔"

"جے جے نے ان چار لفظوں میں سب کچھ بتا دیا۔ اول تو یہ کہ وہ منٹ کے کمرے میں اس لیے گیا کہ اس سے بوگی کا نمبر پڑھنے میں غلطی ہوئی اور دوم یہ کہ حملہ آور نے بھاگنے کے لیے سوئٹ کی، استعمال کی۔ یہ چابی ریلوے کے اس ملازم کے پاس ہوتی ہے جو سوئٹ کے دونوں کمروں کی درمیانی دیوار کو کھولنے اور بند کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے اور وہ یہی کار اٹینڈنٹ ہے۔"

"اب ہم اس نیکلس کی طرف آتے ہیں جس کی وجہ سے یہ پریشانی ہوئی۔" ایلیری نے کہا۔ "بیڈ روم C، سینڈی منٹ کے نام پر بُک ہے جس نے ہمارے ساتھ ڈنر کیا۔ اس ٹرین کے مسافروں کی فہرست میں کسی جون فیرن چائلڈ کا نام نہیں ہے لہٰذا اگر اس ہار کی مالکن اس ٹرین میں سفر کر رہی ہے تو اس نے کوئی فرضی نام اختیار کیا ہوگا اور وہ سینڈی منٹ ہی ہو سکتی ہے۔ ڈیڈی نے مجھے ڈنر کے بعد بتایا کہ انہیں اس عورت پر جون فیرن چائلڈ کا شبہ ہے۔ اٹینڈنٹ بھی یقیناً اسی نتیجے پر پہنچا ہوگا۔ لہٰذا اس نے اس کے بیڈروم C کی تلاشی لی لیکن جیسا کہ اٹینڈنٹ یا تمہیں وہاں کوئی نیکلس نہیں ملا اور اس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔"

سراغ رساں فونٹین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایلیری نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف اٹھایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہار بیڈ روم C میں نہیں تھا۔ یہاں تک کہ یہ ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ جس عورت نے ہمارے ساتھ ڈنر کیا وہ جون فیرن چائلڈ تھی۔ وہ ہجوم سے دور رہتی ہے اور کئی برسوں سے گوشہ نشین ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی عورت تھی جس کے ساتھ ہم نے ڈنر کیا؟ کیا ایسی عورت تین اجنبیوں کے ساتھ ڈنر کر سکتی ہے؟"

"یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔" فونٹین نے کہا۔ "ریل میں تقریباً سبھی لوگ اجنبیوں کے ساتھ ڈنر کرتے ہیں۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے تقریباً کا لفظ استعمال کیا۔" ایلیری نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے برعکس سینڈی منٹ کی ساتھی عورت جو معمولی کپڑوں میں ملبوس تھی اور جسے سینڈی منٹ نے اپنی سیکریٹری ظاہر کیا تھا، اس نے الگ تھلگ میز پر تنہا ڈنر کیا۔ تم نے ڈائننگ کار میں اجنبی لوگوں کے بارے میں بالکل صحیح کہا۔ تم نے کتنی بار کسی مسافر کو ڈائننگ کار میں اکیلے کھانا کھاتے دیکھا ہے؟ تمہارا جواب نفی میں ہوگا۔ میں نے اس عورت کو ہیڈ ویٹر سے باتیں کرتے دیکھا، وہ اس سے یہی کہہ رہی ہوگی کہ اس کے لیے ایک علیحدہ میز کا انتظام کیا جائے جس پر دوسرے مسافر نہ بیٹھیں، وہ یہاں بھی اپنی پرائیویسی برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ یہ تضاد میری سمجھ سے باہر تھا کہ اداکارہ کو تو اجنبیوں کے ساتھ ڈنر کرنے میں کوئی تکلف نہیں تھا اور اس کی سیکریٹری لوگوں سے دور رہنا چاہ رہی تھی۔ یہیں سے میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ہم نے جس عورت کے ساتھ ڈنر کیا وہ جون فیرن چائلڈ نہیں بلکہ اس کی سیکریٹری تھی۔"

"اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارے ساتھ ڈنر کرنے والی عورت اس نیکلس کی مالک نہیں بلکہ اس کی سیکریٹری تھی۔" انسپکٹر رچرڈ نے کہا۔ وہ پہلے ہی معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا لیکن فاؤنٹین کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی تک اندھیرے میں ہے۔ اس نے پوچھا۔

"وہ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

ایلیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں عورتوں نے یہ انتظام غلط راستے پر ڈالنے کے لیے کیا۔ اس کا مقصد اصلی جون فیرن چائلڈ کی شناخت کو لوگوں سے چھپانا تھا یہاں تک کہ ہم بھی دھوکا کھا گئے اور یہی سمجھے کہ ہم نے قیمتی کپڑوں میں ملبوس جون فیرن چائلڈ کے ساتھ ڈنر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان دونوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ دوسرے یہ کہ گزشتہ دس برسوں میں کسی نے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی کوئی تصویر شائع ہوئی پھر ان کے لباس کا فرق، انہی سب باتوں کی وجہ سے ہم دھوکا کھا گئے اور ہم نے اس کی سیکریٹری کو ہی جون فیرن چائلڈ سمجھ لیا لیکن ان کی چال کئی اعتبار سے ادھوری رہی۔ پہلی بات تو یہ کہ فیرن چائلڈ نے فرضی نام فرینی (Frannie) استعمال کیا، اگر اس کے اصل نام کے حروف آگے پیچھے کیے جائیں تو یہی نام بنتا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ جس عورت نے ہمارے ساتھ ڈنر کیا اور جسے بیڈروم سی ملا وہ فیرن چائلڈ نہیں بلکہ اس کی سیکریٹری تھی جس نے سینڈی منٹ کا فرضی نام اختیار کیا تھا۔ اسی لیے اٹینڈنٹ کو تلاشی کے دوران وہ نیکلس نہیں ملا۔"

سراغ رساں فونٹین یہ تفصیل سن کر حیران رہ گیا۔ واقعی ان دونوں نے ہار کی حفاظت کے لیے دوہری چال چلی تھی۔ یعنی انہوں نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے فرضی نام اختیار کیے اور پھر لباس تبدیل کر کے اپنی اصلیت بھی تبدیل کر لی لیکن وہ ایلیری کی تیز نگاہوں سے نہ بچ سکیں اور وہ ان کی حقیقت جان گیا۔

❖❖❖

pklibrary.com

pklibrary.com

طاہر جاوید مغل

شائقین اپنی پسند کے کرداروں کو اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں... انہیں اپنی دھڑکنوں میں بسا لیتے ہیں... کیونکہ ان میں انہیں اپنی خواہشات اور خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے... کرداروں کی یہ پرچھائیاں سانس لینے لگتی ہیں... ایسے ہی دلوں میں زندہ رہنے والے کرداروں کی بھرپور جھلک جو آپ کو ماضی کے خوب صورت در و دیوار میں قید کر دیتی ہے...

عمران جرنیرا اور اس کی ذات میں بسی پُراسراریت...

میں گھر میں اپنے کمرے میں تھا اور صرف ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا۔ ائرکنڈیشنر 16 کے ہندسے پر تھا اور پورے کمرے میں بھرپور ٹھنڈک تھی۔ اب جو بات میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں، وہ یقیناً کافی حیران کن ہوگی۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور پورے لاہور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، جی ہاں، یہ میرا وہی رہن سہن تھا جو میں نے پچھلے اٹھارہ بیس برس سے اپنایا ہوا تھا۔ سخت گرمی، سردی کو جھیلنا، اپنے جسم کو غیر معمولی مشقت سے توڑنا اور

اپنی قوتِ برداشت کو بڑھانے کی کوشش جاری رکھنا۔ اب یہ سب کچھ میرے جسم کی ضرورت بن چکا تھا۔ یہ تکلیفیں مجھے راحت دیتی تھیں اگر یہ نہیں ہوتی تھیں تو ایک مہیب خلا محسوس ہوتا تھا۔

ٹی وی آن تھا۔ پنجاب کے ایک علاقے میں غیر متوقع بارش نے تباہی مچادی تھی۔ اس کی فوٹیج وغیرہ چل رہی تھی۔ ایک تنومند صوبائی وزیر صاحب بڑے طنطنے سے موقع پر موجود تھے اور مصیبت زدگان کی امداد فرما رہے تھے۔ آٹے کی بوریاں اور گھی کے ڈبے تقسیم ہو رہے تھے۔ وزیر موصوف کو امدادی کارروائی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ ان کی تصویر صحیح زاویے اور صحیح ایکسپریشن کے ساتھ آئے۔ ایک بزرگ نے ان کے ''دستِ مبارک'' سے آٹے کا ''توڑا'' لے کر اپنے سر پر رکھا۔ وزیر صاحب نے بہتر پوز کے لیے تین چار تصویریں اتروائیں۔ تب تک بزرگ کی دبلی پتلی گردن آٹے کے توڑے کے نیچے کانپتی رہی۔ پتا نہیں کہ خودنمائی کا یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں امداد و خیرات کے نام پر غربت کو تماشا بنایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دین میں [illegible]...... مستحق کی مدد اس طرح کرو کہ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے کو پتا نہ چلے۔

دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے کندھوں پر تولیا ڈالا اور دروازہ کھولا۔ سامنے ہماری پرانی ملازمہ کرن کھڑی تھی۔ اپنے نام کے برعکس وہ خاصی موٹی تازی تھی۔ عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی اور ایک دھان پان شوہر کی ''مالکہ'' بھی تھی۔ اس نے کہا۔ ''صاحب جی! ایک لڑکی ملنے آئی ہے۔ اپنا نام ماہین بتا رہی ہے۔''

میں ٹھٹک گیا۔ گھڑی دیکھی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ سہ پہر کے چار بج گئے تھے۔ کل فون پر ماہین سے بات ہوئی تھی۔ اس نے آنے کا کہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ حسبِ توقع جین اور جرسی میں دکھائی دے رہی تھی۔ بال ٹائٹ جوڑے کی شکل میں بندھے تھے۔

''گڈ آفٹرنون انکل۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔

''ویلکم ماہین! سوری...... تمہیں چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔''

وہ عجیب انداز میں مسکرائی۔ ''آج یہ سوری والا لفظ آپ میرے کہنے کے لیے رہنے دیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے صوفے پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اُڑس کر بولی۔ ''انکل! میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ اس واقعے کو دو ہفتے گزر گئے ہیں مگر سب کچھ اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

وہ اس واقعے کا ذکر کر رہی تھی جب میں اور عمران جونیئر، شاہین سے ملنے کے لیے اس کی کوٹھی پہنچے تھے اور ماہین نے بالکل غیر متوقع طور پر ہمارے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ بعدازاں اس نے عمران کو مارا تھا۔ بلکہ شاید یوں کہنا چاہیے کہ عمران نے اس سے مار کھائی تھی پھر گھر میں گھس بیٹھیے آگئے تھے اور ماہین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ سب کچھ بڑا ڈرامائی تھا۔

میں نے کہا۔ ''ماہین! وہ جو کچھ ہوا، اس کو دہرانے سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سب کچھ غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ میرا دل تمہارے لیے بالکل صاف ہے۔''

''تھینک یو انکل۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔ پھر ذرا توقف کر کے مسکرائی۔ ''اور انکل! آپ کا وہ بھتیجا؟''

''اسے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

''ویسے وہ کچھ عجیب سا ہے۔ لگتا ہے کہ اوپر سے کچھ، اندر سے کچھ اور ہے۔ میری طرف سے اسے بھی سوری کہہ دیجیے گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر اپنی انگلیوں سے کھیلتی رہی پھر ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ویسے انکل تابش! آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ دراصل میں یہی درخواست کرنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

میں نے دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ''تمہاری درخواست سے پہلے ہی میں جان گیا ہوں کہ کیا کہنا چاہتی ہو۔'' اس نے چونک کر مجھ پر نگاہ ڈالی۔ میں نے کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ ہم فی الحال تمہاری آپی شاہین سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ یہی بات ہے نا؟''

وہ حیران نظر آئی۔ ''آپ تو واقعی پولیس والوں کی طرح ہیں۔ بڑی گہری نظر ہے آپ کی۔''

''شکریہ، کچھ اور؟''

''بس انکل! آپ نے میری ایک بڑی پریشانی دور کر دی ہے۔ آپ کا بھتیجا آپ کے دوست عمران دانش سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ مجھے خوف آنے لگا ہے۔ اسے دیکھ کر آپی کے سارے پرانے زخم ہرے ہو جائیں گے۔''

بات کرتے ہوئے ماہین کی پیشانی چمکنے لگتی تھی اور

pklibrary.com

خوب صورت آنکھوں میں ایک روشنی سی نمودار ہو جاتی تھی۔ عمران کا خیال تھا کہ اس کی آنکھوں میں مقناطیس چھپے ہوئے ہیں جو اردگرد کی ہر شے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ آج کل رات دن اس کی غائبانہ تعریفوں میں مصروف تھا۔

اتنے میں ماہین کے فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ چہرے پر رنگ سا گزرا اور اس نے کال ریجیکٹ کر دی۔

''کون تھا؟'' میں نے بے تکلف انداز میں پوچھا۔

''کک...... کوئی نہیں۔''

''جو کوئی نہیں ہوتا...... وہ کبھی کبھی کافی کچھ ہوتا ہے۔'' میں زیرِلب مسکرایا۔

وہ چند سیکنڈ کے لیے سنجیدہ نظر آئی پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے نوخیز چہرے پر حیا کا ہلکا سا رنگ بکھر گیا۔ پھر اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ''آپ تو بہت دور، دور کی کوڑی لے آتے ہیں۔''

''بوائے فرینڈ ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس نے پلکیں جھکا لیں تاہم لہجے میں بے باکی برقرار رہی۔ ''آپ ففٹی پرسنٹ کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

مجھے فوراً عمران جونیئر کا خیال آیا۔ ''وہ تو مارا گیا مفت میں۔'' میں بڑبڑایا۔

''جی کیا کہا آپ نے؟''

''کچھ نہیں...... سوچ رہا ہوں، وقت کتنا بدل گیا ہے۔ اب لڑکیاں بیکار میں شرماتی نہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے جھٹ سے کہہ دیتی ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں شوخی ابھری۔ ''ملنا چاہیں گے اس سے؟ میرا مطلب ہے یہاں سے اس کا آفس زیادہ دور نہیں ہے۔ ابھی دس منٹ میں پہنچ جائے گا۔''

''کیا کرتا ہے؟''

''فرم ہے امپورٹ ایکسپورٹ کی۔ والد سرکاری افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔''

''چلو بلا لو بھئی، دیکھیں کہ تمہاری پسند کیسی ہے؟''

اس نے بلاتردّد فون پر نمبر پریس کیا پھر بات کرتے ہوئے کوریڈور کی طرف چلی گئی۔ واقعی آٹھ دس منٹ بعد میری کوٹھی کے گیٹ پر اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔ میں نے سی سی ٹی وی کی اسکرین پر دیکھا۔ دو تین سال پہلے والے ماڈل کی اسپورٹس کار تھی۔ اس میں سے درمیانے قد اور چوکور چہرے والا ایک نوجوان باہر نکلا۔ دو منٹ بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اس کا لباس قیمتی تھا۔ بال اسپائکس کے اسٹائل میں بنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں مہنگا موبائل تھا۔ سلام کر کے وہ بے تکلفی سے ماہین والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ قبول صورت نوجوان تھا۔ گفتگو بھی اچھی کر لیتا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میرا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے تو تھوڑا سا ''ریزرو'' نظر آیا، تاہم میرے رویّے نے اسے جلد ہی نارمل کر دیا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ اس درمیانی عمر میں بھی میں اس قدر فٹ ہوں اور بھرپور طریقے سے مارشل آرٹ کے ساتھ جڑا ہوا ہوں۔ کہنے لگا۔ ''انکل! آپ عام پولیس والوں سے بہت مختلف لگتے ہیں۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ میرے کان کھڑے ہوئے۔ مجھے عمران کی پنکچر موٹر بائیک کی مدھم پھٹ پھٹ سنائی دی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ چوکیدار یا گارڈ اسے نہیں روکے گا اور ایسا ہی ہوا۔ دو تین منٹ بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آدھمکا۔ لباس ہمیشہ کی طرح بے ڈھنگا ہی تھا۔ وہاں میرے پاس ماہین کو بیٹھے دیکھ کر وہ پہلے تو ٹھٹکا پھر حسبِ عادت بتیسی نکال دی اور چہکا۔ ''واہ جی واہ، یہاں تو بڑی اہم شخصیات آئی بیٹھی ہیں۔ السلام علیکم جی سب کو۔''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے اور حشام نے کہا۔

(حشام، ماہین کے بوائے فرینڈ کا نام تھا)

میرے اشارے پر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں حشام کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''یہ...... آپ کے بھائی ہیں؟'' اس نے ماہین سے پوچھا۔

''نہیں، بھائی جان!'' وہ فوراً چہک کر بولی۔

میں زیرِلب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ عمران نے کہا۔ ''اوہ سوری، آپ دونوں کی شکلیں کچھ کچھ ملتی ہیں اس لیے مجھے شک ہوا۔''

حشام نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''جو لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، آہستہ آہستہ ان کی شکلیں بھی آپس میں ملنے لگتی ہیں۔''

عمران نے ہونٹ سکیڑے۔ مجھے لگا، اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا ہے۔ میں نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''عمران! یہ حشام ہے، ماہین کا سابقہ کلاس فیلو اور دوست...... اور حشام یہ عمران ہے۔ میرے بہت گہرے دوست کا بیٹا۔ میرے لیے بیٹوں کی طرح ہی ہے۔''

''یہ کیا کرتے ہیں؟'' حشام نے پوچھا۔

ماہین بولی۔ ”جو کچھ نہیں کرتے، وہ بھی کمال کرتے ہیں۔ ویسے آج کل یہ جاب ڈھونڈ رہے ہیں۔“

حشام مسکرایا اور اس کی ناک تھوڑی سی پھیلی ہوئی نظر آنے لگی۔ ”جاب ڈھونڈنا بھی تو ایک کام ہی ہوتا ہے نا جی...... میرا خیال ہے ابھی جس موٹر بائیک کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ عمران صاحب ہی کی تھی۔“

عمران نے فخریہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں...... لگتا ہے کہ آپ کے کان کافی تیز ہیں۔“

ماہین طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ”اور لگتا ہے کہ آپ کی نظر زیادہ تیز نہیں ہے...... آپ کے جوگر کا تسمہ کھلا ہوا ہے، باندھ لیجیے۔“

”اوہ۔“ عمران نے چونکنے کی اداکاری کی اور جھک کر تسمہ باندھنے لگا اور اسی طرح جھکے جھکے بولا۔ ”ویسے یہ تسمہ بھی آزار بند کی طرح ہی ہوتا ہے۔ کھل جائے تو سب انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں۔ میں جب پریشان ہوتا ہوں تو عموماً یہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے تسمہ۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

”خیریت ہے؟ تمہیں کیا پریشانی لاحق ہوگئی؟“ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں چاچو جی، اب تو خیریت ہی ہے۔ دراصل دو تین دن کافی پریشانی رہی شادی کے سلسلے میں۔ اللہ کا شکر ہے، اب انتظام ہوگیا ہے۔“

وہ اپنے محلے کی اس لڑکی کی شادی کی بات کر رہا تھا جسے اس نے بہن بنایا تھا۔ وہ لوگ بہت تہی دست تھے۔ عمران شادی کے سلسلے میں ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ قریباً پانچ چھ لاکھ کا خرچ تھا۔ محلے کے دو تین خوش حال افراد نے بھی کچھ مدد دی تھی۔ میں نے بھی حصہ ڈالا تھا۔

”باقی پیسوں کا کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”شکر ہے اللہ کا۔ حاجی فراز صاحب عمرے سے واپس آگئے۔ کل شام انہوں نے پورے پانچ لاکھ روپے کیش بھجوا دیا۔ اللہ ان کو صحت اور لمبی عمر عطا کرے، بڑے دل والے ہیں۔“

”یہ شادی کا کیا معاملہ ہے جی؟“ ماہین نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ عمران جس محلے میں رہتا ہے وہاں ایک بہت ضرورت مند گھرانا ہے۔ وہ لوگ بچی کو عزت سے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔

”اب تو کوئی مسئلہ نہیں؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”چھوٹا سا مسئلہ ہے اسی لیے آیا ہوں۔“

”فرماؤ۔“

”تھوڑے سے جہیز کی ڈیمانڈ بھی تھی، اس کے علاوہ سونا اتنا مہنگا ہے کہ کافی ساری رقم دو انگوٹھیوں اور دو جھمکوں پر نکل گئی ہے۔ لڑکی کے گھر والے چاہ رہے ہیں کہ شادی ہال ڈھونڈنے کے بجائے محلے کے گراؤنڈ میں ہی ٹینٹ وغیرہ لگ لیے جائیں۔ مگر مقامی نائب ناظم روڑا اٹکا رہا ہے۔ میرے خیال میں آپ اسے ایک فون کر دیں تو بات بن جائے گی۔“

میں نے اسی وقت اس سے نمبر لے کر فون کیا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ بندہ مان گیا اور عمران خوش نظر آنے لگا۔

”یہ لیجیے عمران صاحب، اس سلسلے میں یہ چھوٹا سا نذرانہ میری جانب سے بھی رکھیے۔“ ماہین کے پہلو میں بیٹھے حشام نے دو نوٹ نکال کر عمران کی طرف بڑھائے۔ یہ پانچ پانچ ہزار کے تھے۔

عمران نے پہلے تو انکار کیا پھر میرے کہنے پر رکھ لیے۔ تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ حشام یہ جو حصہ ڈال رہا ہے اس میں خدا ترسی سے زیادہ تفاخر اور امارت کا اظہار ہے۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنا اسٹیٹس بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب امکان تھا کہ وہ ماہین کو بھی امپریس کرنا چاہتا ہے۔

عمران چلا گیا۔ اس کی بائیک کی پھٹ پھٹ معدوم ہوگئی تو ماہین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مائنڈ نہ کیجیے گا انکل! یہ واقعی شادی ہو رہی ہے یا......“

”نہیں ماہین......“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”وہ ایسا نہیں ہے۔ بہت مختلف ہے عام لوگوں سے۔ بے شک کچی پکی آبادی میں رہتا ہے۔ فی الحال ذرائع آمدن بھی نہیں ہیں، لیکن دل بڑا ہے، علاقے والے اسے ہیرو بھائی کے نام سے پکارتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے اس کے والد بھی......“

”ہاں پتا ہے انکل...... خیر چھوڑیں اس بات کو، پھر گفتگو لمبی ہو جائے گی...... آپ یہ بتائیں کہ ہمارے گھر کب آ رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”اگر جوڈو کراٹے نہیں کرو گی تو ’ویک اینڈ‘ پر چکر لگاؤں گا۔“

”سوری انکل...... ایک بار پھر ویری ویری سوری۔“

pklibrary.com

وہ خجل ہو کر بولی۔ پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ’’اور انکل، ان غنڈوں کا کیا بنا جو اس روز گھر میں گھسے تھے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہیں۔ ان کی طرف سے بے فکر رہو۔ اب وہ تمہارے پاس سے بھی نہیں گزریں گے، انشاءاللہ۔‘‘

☆☆☆

حاجی فراز ایک ثروت مند شخص تھے۔ بقول عمران خداترس اور مخیر بھی تھے۔ میں نے کئی بار اس سے کہا کہ ان سے ملواؤ مگر وہ آئیں بائیں شائیں کر گیا۔ ایک دن میں نے اپنے خاص مخبر نوشا سے کہا کہ وہ حاجی فراز کا پتا چلائے۔

دو روز بعد شام کے وقت نوشا کا فون آ گیا۔ ’’جی سر! تھوڑا بہت پتا چلا ہے حاجی صاحب کے بارے میں۔‘‘

’’ہاں کہو۔‘‘

’’نیک آدمی ہیں۔ علاقے کے ضرورت مند لوگوں کی خبر رکھتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ میں دو تین یتیم لڑکیوں کی شادیاں کرا چکے ہیں۔ کئی مستحق بچوں کی تعلیم کا خرچہ ادا کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک فری ڈسپنسری بھی علاقے میں بنائی ہے۔ پچھلے سال دسمبر میں علاقے کے بزرگ پوسٹ مین کی بائی پاس سرجری انہوں نے اپنے خرچے پر کروائی ہے۔ اس کے علاوہ......‘‘

’’یار، یہ سب کچھ مجھے پتا ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ’’میں نے تمہیں یہ ہسٹری نکالنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ حاجی صاحب پائے کہاں جاتے ہیں؟‘‘

’’وہ اس سلسلے میں بہت محتاط ہیں جی۔ شاید ہی دو چار بار لوگوں کے سامنے آئے ہوں۔ وہ یہ سب کچھ درپردہ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ آپ کے کہنے پر میں بہشت کالونی بھی گیا تھا مگر ابھی تک تو اس کالونی میں مجھے ان کا کھوج نہیں ملا۔‘‘

’’تو پھر اب تک تم نے جھک ہی ماری ہے۔ تم سے ’’گزارش‘‘ کی تھی کہ وہ اس کالونی میں ہی کہیں رہتے ہیں۔ ان کا اتا پتا معلوم کرو۔‘‘ میں نے جھلّائے ہوئے انداز میں فون بند کر دیا۔

نوشا میری جھنجلاہٹ کا خاصا اثر لیتا تھا، میں جانتا تھا کہ اب وہ کوئی نہ کوئی سراغ ڈھونڈ کر ہی مجھے فون کرے گا۔ پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے بھی عمران پر کچھ شک سا ہونے لگتا تھا۔ اس شک کو بُرا تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ پریشان کن

میڈیکل غزل

چلو آؤ اب موسم کا مزہ چکھیں
تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں
تم سے ملنے کی اب کیا جستجو کریں
طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کریں
ہماری چاہت کا کچھ تو خیال کریں
سیرپ کو اچھی طرح ہلا کر استعمال کریں
دل میرا ٹوٹ گیا ابھی جب اس کی ڈولی
صبح دوپہر شام، ایک ایک گولی
دل میرا عشق کرنے پر رضامند رہے گا
جمعہ کے دن کلینک بند رہے گا

کوٹلی سے حمیرا اقبال کی حکیمانہ شاعری

ضرور تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا کوئی روزگار نہیں۔ جو پیسے وہ انڈیا سے لے کر آیا تھا، وہ ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ کہاں سے پیسے لے رہا تھا؟ اس نے حاجی فراز کا نام لیا تھا لیکن فی الحال حاجی فراز سے بھی ’’ملاقات‘‘ نہیں ہو پا رہی تھی۔ انڈیا میں اپنی فیملی کے بارے میں بھی عمران نے ابھی تک تفصیلی معلومات نہیں دی تھیں۔ ایک بات اور تھی، کسی وقت وہ بہت کنجوسی کا مظاہرہ بھی کر جاتا تھا۔ کسی کی کہی ہوئی بات بار بار ذہن میں آ رہی تھی۔ اچھوں سے بُرے اور بُروں سے اچھے پیدا ہوتے ہیں۔ باپ اچھا ہو تو ضروری نہیں کہ بیٹا بھی نقشِ قدم پر چل رہا ہو۔ ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ کسی کا فون آیا تھا اور عمران نے میرے سامنے فوراً ہی ’’ڈس کنکیٹ‘‘ کر دیا تھا یا بات کرنے کے لیے علیحدہ کمرے میں چلا گیا تھا۔ ایک ایسی ہی گفتگو میں، میں نے اسے ہندی کے الفاظ استعمال کرتے بھی سنا تھا۔

یہ چوتھے، پانچویں روز کی بات ہے، میں حسبِ معمول صبح سویرے اپنے جم میں مصروف تھا جب میرے انفارمر نوشا کی کال آ گئی۔ ’’ایک بڑی اہم نیوز ہے جی آپ

pklibrary.com

کے لیے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ لہجے میں دبا، دبا جوش تھا۔

''آگے بولو۔''

''جناب، میں پچھلے دو روز سے آپ کے عمران صاحب کو واچ کر رہا ہوں۔ یہ بہت کائیاں شخص ہے جی۔ اس کا پیچھا کرنے میں مجھے واقعی دانتوں پسینا آ گیا ہے۔ ایک بار تو ایسے ہی لگا کہ پکڑا جاؤں گا۔''

''تمہید باندھ چکے ہو، اب اصل بات بتاؤ۔''

''ہوسکتا ہے کہ میرا کہا غلط ہو...... لیکن یہ بندہ کچھ مشکوک ہے جی۔ کل رات قریباً گیارہ بجے یہ گھر سے نکلا۔ پہلے گلی میں اپنی موٹر سائیکل کو کِکیں لگاتا رہا۔ وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی تو پیدل چل کر بس اسٹاپ تک پہنچا۔ ایک بس میں سوار ہوا اور گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں اتر گیا۔ بہشت کالونی بھی پاس ہی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حاجی فراز سے ملنے آیا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔''

دو لمحے توقف کرنے کے بعد نوشا نے بات جاری رکھی۔ ''آپ کو یہ سن کر تھوڑی سی حیرانی ہوگی کہ عمران عرف ہیرو بھائی جس شخص سے ملا ہے، وہ ایک سکھ ہے۔ کاروباری شخص ہے۔ لیدر کی فیکٹری چلاتا ہے اور اس کا بنایا ہوا مال انگلینڈ اور آئرلینڈ وغیرہ میں بھی سپلائی ہوتا ہے۔ گارڈن ٹاؤن میں ڈیڑھ دو کینال کی کوٹھی میں ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اس کی فرم کا نام جگو اینڈ کمپنی ہے۔''

جگو اینڈ کمپنی ذرا مختلف نام تھا اور یہ نام میں نے بھی کہیں سنا ہوا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مالک کوئی سکھ ہے۔ ویسے بھی لاہور، پاکستان کے ان شہروں میں سے ہے جہاں سکھ کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ البتہ حسن ابدال اور ننکانہ صاحب وغیرہ میں سردار صاحبان عام دیکھے جاتے ہیں۔

چند ہفتے پہلے عمران مجھے اسپیشل سموسے کھلانے اور تندوری چائے پلانے کے لیے گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں لے گیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ذکر نہیں کیا تھا کہ یہاں اس کا کوئی سکھ دوست رہتا ہے۔

میں نے نوشا سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے؟ عمران کا اس بندے سے کیا ناتا ہوسکتا ہے؟''

''اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور جناب! سچ بات تو یہ ہے کہ مزید کھوج لگانے سے مجھے ڈر بھی آ رہا ہے۔ یہ عمران عرف ہیرو ضرورت سے زیادہ چوکنا شخص ہے۔''

''یہ تو شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' پھر میں نے ذرا توقف سے پوچھا۔ ''جگو اینڈ کمپنی کے بارے میں کچھ اور معلوم ہوا؟''

''کمپنی کے مالک کو جگو سیٹھ کہتے ہیں۔ یہ داڑھی مونچھوں والا ہے، یعنی مونا سکھ نہیں ہے مگر پگڑی نہیں باندھتا۔ علاقے میں اس کا کچھ زیادہ میل جول بھی نہیں۔ ہر پانچ چھ ماہ بعد گاڑی کا ماڈل بدلتا ہے۔ گارڈز شارڈ بھی رکھے ہوئے ہیں...... اس کے علاوہ ایک اور عجیب بات بھی معلوم ہوئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ درست ہے یا نہیں لیکن جگو اینڈ کمپنی کے ایک پرانے ملازم نے رازداری کی شرط پر بتائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جگو سیٹھ ذرا ٹھرکی ٹائپ کے کام کرتا رہتا ہے...... کوئی تین ماہ پہلے وہ ترکی سے دو عورتیں باقاعدہ خرید کر لایا ہے۔ عورتیں کیا، وہ لڑکیاں ہی ہوں گی۔ اس نے انہیں گھر میں رکھا ہوا ہے۔

''شادی شدہ نہیں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''شادی شدہ تو ہے جی، لیکن ایسے لوگوں کو ایسی باتوں کی کیا فکر ہوتی ہے۔ عورتوں کو بھی نئے ماڈل کی گاڑیوں کی طرح ہی سمجھتے ہیں۔'' نوشا کی معلومات قابلِ غور تھیں اور اس سلسلے میں میری دلچسپی اور فکرمندی دونوں بڑھ گئی تھیں۔

اگلے روز سہ پہر کو میں عمران جونیئر سے ملنے اس کے گھر جا پہنچا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔ اس کے دو بے فکرے دوست کچن میں گھسے نہاری بنا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پارک میں گیا ہے۔ ایسی گنجان آبادیوں میں چھوٹے موٹے پارک کا ہونا بھی ایک نعمت ہی ہوتا ہے۔ یہ چلڈرن پارک بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں دو تین پُرپیچ گلیوں سے گزر کر وہاں جا پہنچا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران وہاں بچوں کی ایک سلائیڈ کے ایک ٹوٹے ہوئے حصے کو پلاستر کر رہا تھا۔ کئی بچے اس کے اردگرد جمع تھے۔ دو چار بڑے بھی اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے آستین سے پسینا پونچھا اور بقایا کام اپنے ایک ساتھی کو سونپ کر میرے پاس لکڑی کی ایک بینچ پر آ بیٹھا۔ ''یہ کیا کر رہے تھے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بس ٹائم پاس کر رہا تھا۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''آج کل دل بہت اداس ہے چاچو۔ سوچتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ کرتا رہوں۔ کل لڑکوں کے ساتھ مل کر وہ سامنے کرکٹ کی پچ مرمت کی تھی۔ آج اس سلائیڈ کو ٹھیک کر رہا

تھا۔''

''خیر سے یہ ادا سی کس سلسلے میں ہے؟''

''ایسے بے خبر نہیں ہو تم۔ سب جانتے ہو، میری دنیا کیسے اندھیر ہوئی ہے آہ...... ماہین، مجھے کیا پتا تھا کہ تم میرے دل پر اتنا بڑا گھاؤ لگاؤ گی۔ کاش میرے سینے میں دل نہ ہوتا اور اگر دل تھا تو پھر غربت نہ ہوتی۔'' اس نے گردن لٹکا لی اور آنکھوں میں نمی لے آیا۔ باپ ہی کی طرح زبردست ایکٹر تھا مگر کسی وقت پُراسرار بھی لگتا تھا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''تو اس میں واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مہوش حیات کے ہوتے ہوئے تمہیں بھلا کون سی کمی ہے؟''

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''تم نہیں سمجھو گے چاچو جانی! میرے سینے میں ایک نہیں کئی دل دھڑکتے ہیں اور ہر ایک دل کے علیحدہ مسئلے مسائل ہیں۔ مہوش حیات والا دل مطمئن ہے۔ مہوش تو گھڑے کی مچھلی ہے، جب چاہو بھون کر کھا سکتا ہوں۔ یہ ماہین دریائی مچھلی تھی۔ اس کا کانٹا سیدھا دل نمبر دو میں لگا ہے۔''

اسی دوران میں اس کے فون پر کوئی کال آئی۔ اس نے اسکرین دیکھی اور جلدی سے کال ریجیکٹ کر دی۔

''کون تھا؟''

''وہی مہوش...... ایک فلم کی شوٹنگ چھوڑے بیٹھی ہے۔ کہتی ہے گوجرانوالا جا کر تمہارے ساتھ چڑے کھاؤں گی۔ وہ بے چارہ پروڈیوسر علیحدہ میرے ترلے ڈال رہا ہے کہ مہوی سے کہو شوٹنگ نہ چھوڑے...... ہائے ری قسمت...... اب تم خود ہی بتاؤ چاچو، خوب صورت ہونا کوئی جرم ہے...... پتا نہیں کس بات کی سزا مل رہی ہے مجھے۔ انڈسٹری کی آدھی ہیروئنز کو پتا چل گیا ہے کہ میں پاکستان میں ہوں اور جس کو پتا چلنا چاہیے تھا، اس کی آنکھوں میں موتیا آ گیا ہے۔''

''وہ کون؟''

''یہی ماہین...... چاچو! تم نے دیکھا نہیں تھا کتنی بیدردی سے اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا تعارف کرایا مجھ سے۔''

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم اصل بات گول کر رہے ہو۔ یہ فون کس کا تھا؟'' اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا...... پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''چاچو! میرا خیال ہے کہ تم شک کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ مہوش نہیں کوئی انڈین ہیروئن ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جس دیس کا کھاتا ہوں، اسی کا گاتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رہوں تو پاکستان میں اور محبت کی پینگیں بڑھاؤں کترینہ کیف اور ودیا بالن وغیرہ سے۔ ناٹ ایٹ آل۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے ایک بات صاف صاف بتاؤ...... اگر تم نے......''

میری بات ادھوری رہ گئی۔ عمران ایک دم سامنے کھیلتے ہوئے ایک بچے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اس نو عمر بچے کو دیکھا۔ اس کے ساتھ دو خواتین تھیں۔ ایک ذرا بڑی عمر کی، دوسری نوجوان۔ دونوں لمبی چادروں میں تھیں۔ چہرے آدھے نقاب میں تھے۔ نوجوان عورت کو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی صوفیہ تھی جس کے لیے کراچی کے کمانڈو باکسر اور لاہور کے امیر زادے واجد کے درمیان چکر چلا تھا۔ واجد احمد اتفاقیہ فائرنگ کے نتیجے میں جاں بحق ہو چکا تھا۔ (اس کے وارث تلملائے پھرتے تھے) کمانڈو باکسر کہیں علاقہ غیر میں تھا۔ یہ محبت کی ایک عجیب...... اور ادھوری کہانی تھی۔ ایک شریف زادی اور ایک بدنام غنڈے کے درمیان ایک بے نام تعلق۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس کہانی کا انجام ہونا باقی ہے۔

عمران نے کہا۔ ''دیکھا چاچو! وہی چھلاوہ اپنی سوہنی جھلک دکھا رہا ہے۔ یہ صوفیہ ہی ہے۔ حالانکہ اسے اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اس میں خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''تو یہ تمہارے محلے دار ہیں۔ صوفیہ یا اس کے والد کو سمجھاؤ۔ واجد کے وارث ان کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے چاچو! نیک کام میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ مجھے وہیں بیٹھا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور نپے تلے قدموں سے چلتا دونوں خواتین کے پاس پہنچ گیا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ اہم موضوعات پر بات کرتے ہوئے مجھے چکما دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اب بڑے جوش و خروش کے ساتھ دونوں خواتین سے گفتگو کر رہا تھا اور وہ بھی ایسا رسپانس دے رہی تھیں جیسے عمران ان کا محلے دار نہیں، ان کے گھر کا فرد ہے۔

کچھ دیر بعد وہ میرے پاس واپس آ گیا۔ سلائڈ کی مرمت مکمل ہو چکی تھی، وہ میرے ساتھ گھر چلا آیا۔ میں نے اس لڑکی کی شادی کے بارے میں پوچھا جس کے لیے وہ رقم کا انتظام کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ بروز ہفتہ آٹھ تاریخ طے ہو گئی ہے۔ تقریب پارک میں ہی ہوگی۔

عمران جونیئر کے ساتھ اپنی اس ملاقات میں، میں نے اسے ٹٹولنے کی کافی کوشش کی۔ وہ حاجی فراز کے بارے میں کوئی ٹھوس بات بتا سکا اور نہ اس نے اپنے مالدار سکھ دوست کا ذکر کیا۔ نجانے کیوں مجھے شک ہونے لگا تھا کہ شاید یہی وہ جگجو نامی سکھ ہے جو اسے مالی مدد فراہم کرتا ہے۔ اس مالی مدد کے لیے عمران نے کسی حاجی فراز کا نام لے لیا تھا۔ سوال یہ بھی تھا کہ وہ شخص اس کی مدد کیوں کرتا ہے۔ کہیں اس کے پیچھے کوئی مقصد تو نہیں تھا؟

☆☆☆

گھر میں ایک نجی ٹی وی چینل کے نمائندے آئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری بیتی زندگی کے بارے میں ایک تفصیلی انٹرویو کیا تھا۔ خوبرو اینکر اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ادا سے بولی۔ ''ایک آخری سوال سر! آپ کی عمر 42 سال سے اوپر ہے۔ اس عمر میں آپ کی اس زبردست فٹنس کا راز کیا ہے؟''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دیوار پر آویزاں ثروت کی تصویر کو دیکھا اور کہا۔ ''میرے خیال میں میری اس کامیابی میں تین افراد کا ہاتھ ہے۔ ایک تو وہی عمران دانش جس نے ایک نہایت بُرے وقت میں مجھے سہارا دیا...... بلکہ موت کے منہ سے کھینچا۔ دوسرے میری مرحومہ شریکِ حیات جس نے مجھے گھریلو پریشانیوں سے آزاد زندگی دی اور مجھے میرے ''پیشن'' کے ساتھ جینے کے وافر مواقع فراہم کیے اور تیسرا وہ شخص جس نے مجھے زندگی کا فلسفہ سمجھایا۔''

''شاید آپ اپنے استاد باروندا جیکی کی بات کر رہے ہیں؟'' ایک نمائندے نے کہا۔

''آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ باروندا جیکی ہی تھا جس نے مجھے بتایا کہ جب ہم جسمانی تکلیف سہنا سیکھ جاتے ہیں اور اپنی قوتِ برداشت کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور اٹل یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں اس مشقت کا صلہ مل کر رہے گا تو مارشل آرٹ سے متعلق حیران کن کامیابیاں ہماری جھولی میں آن گرتی ہیں۔''

''اور سر...... بالفرض...... اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر؟'' خوبرو اینکر پرسن نے پوچھا۔

''تو بھی وہ محنت اور مشقت رائگاں نہیں جاتی۔ اس کا صلہ ہمیں اپنی زندگی میں کسی نہ کسی صورت مل کر رہتا ہے اور یہی اٹل یقین تھا جس نے مجھے بدترین حالات میں بھی مارشل آرٹس سے جوڑے رکھا۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ انٹرویو والے بھی سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے مقررہ وقت سے کہیں زیادہ لے لیا ہے۔ وہ اٹھنے کے لیے تیار نظر آئے۔ اینکر پرسن چہکتی لہجے میں بولی۔ ''آپ ہمارے لیے جیتے جاگتے لیجنڈ ہیں سر۔ آخر میں بس ایک درخواست کرنی تھی آپ سے۔''

میں سمجھ گیا کہ اچھا بھلا انٹرویو کرنے کے بعد، وہ آخر میں کوئی احمقانہ فرمائش کرنے والی ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے اکثر میرا پالا پڑتا رہتا تھا۔ اینکر پرسن نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے بیگ میں سے قریباً پانچ مربع انچ کی دو ڈھائی فٹ لمبی لکڑی نکال لی۔ یہ نیم خشک شیشم کی تھی، وہ بولی۔ ''سر آپ کا منفرد ریکارڈ ہے کہ آپ اس سائز کی لکڑی کو کہنی کی ایک ضرب سے توڑ لیتے ہیں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......''

غصے کی ایک لہر میرے اندر اٹھی لیکن میں آخر میں ان لوگوں کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''ویری سوری...... فی الحال یہ ممکن نہیں۔ میرے کندھے میں کچھ کھچاؤ ہے، پھر کبھی سہی......''

میرا موڈ دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ابھی وہ رخصت ہوئے ہی تھے کہ میرے فون پر ماہین کی کال آگئی۔ ''ہیلو انکلو، کہاں ہیں آپ؟''

''میں گھر میں ہی ہوں اور تم؟''

''میں ذرا باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک خاص چیز نظر آئی ہے جس کی وجہ سے آپ کو فون کیا ہے۔'' وہ چہکی۔ اداؤں کی طرح اس کی آواز میں بھی شوخی تھی۔

''کیا چیز؟'' میں نے پوچھا۔

'ایک شیطانی چرخہ۔ جسے بعض لوگ موٹر بائیک کا نام دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ پھٹ پھٹی جسے آپ کے بھتیجے صاحب چلاتے ہیں۔ وہ گارڈن ٹاؤن کی ایک سڑک پر خراب کھڑی ہے...... بلکہ شاید مردہ کھڑی ہے اور آپ کے بھتیجے عمران اسے زندہ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔''

''تم نے کب دیکھا؟''

''ابھی دومنٹ پہلے......'' وہ بے باکی سے بولی۔ ''دراصل میں حشام کے ساتھ گاڑی پر وہاں سے گزری ہوں۔ اتفاقاً نظر پڑ گئی اس عجوبے پر۔ غلط مطلب نہ لیجیے گا۔ عجوبے سے میری مراد موٹر بائیک ہی ہے۔'' اس کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔

''پچھلی ملاقات میں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے

سوری بولنا چاہتی ہو۔ یہ سوری بولے بغیر ازالہ کرنے کا اچھا موقع تھا۔ تم لوگ اس کی ہیلپ کر سکتے تھے۔''

''میں نے دو سیکنڈ کے لیے سوچا تھا لیکن انکل کافی دیر ہوگئی ہے مجھے۔ گھر میں خالہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ اُسے فون کر لیں۔'' اس نے ذرا توقف کیا پھر اسی شوخ آہنگ لہجے میں بولی۔ ''ویسے میرا مشورہ ہے انکل تابش! اپنے بھتیجے سے کہیے کہ اس برگزیدہ موٹر سائیکل کی خطائیں اب معاف کر دے۔ اسے بیچ کر اس میں تھوڑے اور پیسے ڈالے اور اچھی حالت کی بائیسکل لے لے۔''

ماہین نے تو یہ اطلاع دے کر اور گڈ نائٹ کہہ کر کال ختم کر دی لیکن میرے اندر ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ عمران اس وقت گارڈن ٹاؤن کے دوسرے چوراہے سے آگے ایک ذیلی سڑک پر تھا اور یہ وہی سڑک تھی جو سیدھی جگو سیٹھ کی کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ ماہین نے جو پچویشن بتائی تھی، اس کے مطابق موٹر بائیک کا رخ چوراہے کی مخالف سمت میں تھا۔ اس سے بہ آسانی یہ مطلب لیا جا سکتا تھا کہ عمران، جگو سیٹھ سے ملنے جا رہا ہے۔ عمران اور جگو سیٹھ کے حوالے سے میرے ذہن میں کئی سوالات ابھر رہے تھے۔ اچانک ہی ذہن میں ایک خیال آیا اور میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

رات سرد تھی۔ کچھ دھند بھی تھی۔ ٹریفک کم تھا۔ میں اپنی گرے کلٹس پر بیس پچیس منٹ میں گارڈن ٹاؤن پہنچ گیا۔ جگو سیٹھ کی کوٹھی ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اچھی عمارت بنی ہوئی تھی۔ میں سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ گیٹ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ پورچ کی روشنی میں مجھے کالے رنگ کی ہیوی بائیک کی جھلک نظر آگئی۔ کنفرم ہو گیا کہ عمران اندر ہی موجود ہے۔ میں واپس آیا اور ایک بار پھر کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ گارڈ کی موجودگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں کوٹھی کی عقبی سڑک پر گیا تو ایک موافق صورتِ حال نظر آئی۔ کوٹھی کے عقب میں پلاٹ خالی تھا۔ غالباً تعمیر شروع ہونے والی تھی۔ دو جگہ اینٹوں کا اسٹاک دکھائی دے رہا تھا۔ میں بڑے اچھے اور ''ایڈونچرس'' موڈ میں تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ڈائریکٹ ایکشن لے کر کچھ کھوج لگایا جائے۔ ایسے موقعوں پر عموماً میرا جگری، میرا ہمدم عمران دانش میرے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہمارے جسموں میں جوش کی ایک ہی جیسی لہر دوڑا کرتی تھی...... اب وہ نہیں تھا، اور تغیرِ زمانہ یہ تھا کہ یہاں اسی عمران دانش کا بیٹا تھا، میں جس کا کھوج لگانا چاہ رہا تھا، جاننا چاہ رہا تھا کہ کہیں اس کے حوالے سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔

میں نے گاڑی خالی پلاٹ کے قریب کھڑی کی پھر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی متنفس نہیں تھا، اردگرد کوئی سی سی ٹی وی کیمرا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پلاٹ میں تاریکی تھی۔ میں ٹہلنے والے انداز میں پلاٹ کے اندر چلا گیا پھر ترتیب سے رکھی ہوئی اینٹوں کے اوپر چڑھا...... چار دیواری اینٹوں سے بس چار پانچ فٹ ہی اونچی تھی۔ میں نے اندر جھانکا۔ وسیع کوٹھی میں بس کہیں کہیں روشنی تھی۔ کوئی آہٹ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے تیزی سے دیوار پھاندی اور اندر کود گیا۔ ربر سول والے جوتوں کی وجہ سے آواز پیدا نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر تک سن گن لینے کے بعد میں نے دو عقبی دروازوں کو چیک کیا۔ وہ اندر سے بند تھے۔ ایک جالی دار دروازے میں سے جھانکا۔ قالین پوش راہداری تھی۔ ایک دیوار پر گروتا نک دیو کی دو پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سامنے والے کسی کمرے سے ٹی وی چلنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دبے پاؤں چل کر کوٹھی کے بغلی کوریڈور کی طرف آ گیا۔ یہ کوریڈور ۔۔۔ یعنی بغلی گلی کوٹھی کے اوپن ایریا کا حصہ تھی۔ گلی کے دو تہائی حصے کو فائبر کے ایک نیم گول شیڈ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ اچانک کچھ مدھم آوازوں نے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ آوازیں گلی کے گول شیڈ والے حصے کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔ میں جھک کر چلتا ہوا ایک کھڑکی کے قریب پہنچا۔ آوازیں کچھ اور واضح ہو گئیں۔ تھوڑی سی کوشش کے ساتھ میں اس کھڑکی میں ایک درز ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر ویلوٹ کا سرخ پردہ سرکا ہوا تھا۔ مجھے ایک تندرست و تنومند شخص کی پشت نظر آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا تھا، اس کا لباس قیمتی تھا، مجھے صرف نیلی شرٹ نظر آ رہی تھی۔ ایک نہایت قیمتی موبائل فون اس کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھا تھا۔ اس کے سامنے جو شخص سنگل صوفے پر براجمان تھا، وہ کوئی اور نہیں عمران تھا۔ مجھے اس کا سائیڈ پوز دکھائی دیا۔ وہ اپنے بے ڈھنگے لباس میں تھا۔ ''شکریہ گاڈ فادری۔'' عمران کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

فربہ اندام شخص نے گلاس سے ایک چسکی لی۔ یقیناً یہ وہسکی وغیرہ ہی تھی۔ وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''شکریہ کس بات کا پتر جی، یہ آپ ہی کا پیسا ہے۔ آپاں تو نوکر ہیں تمہارے۔'' پھر اس نے قمیص کی بغلی جیب سے اپنا پرس نکالا اور کوئی کاغذ نکال کر عمران کی طرف بڑھایا۔ ''یہ Remittance کل آئی ہے آپ کی ماتا کی طرف

ہے۔ میرا خیال ہے قریباً چھ ہزار پاؤنڈز ہیں۔''
عمران نے کاغذ دیکھ کر بے پروائی سے ایک طرف رکھ دیا۔ ''یہ ذرا مشکل کام ہے گاڈ فادر جی! پہلے رقم انڈیا سے لندن جاتی ہے، تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے، پھر یہاں پہنچتی ہے۔''
''بادشاہ زادے، تمہیں کیا پریشانی ہے۔ آپاں نے کون سا کسی خچر پر نوٹ لاد کر یہاں لانے ہوتے ہیں۔ تم پن (ثواب) کا کام کر رہے ہو، اس میں تھوڑا بہت حصہ آپاں کا بھی پڑ جاندا ہے۔''
عمران نے موبائل فون کے کیلکولیٹر پر کچھ حساب جوڑتے ہوئے کہا۔ ''گاڈ فادر جی، بدھ کے روز جو پچاس ہزار تم نے بھیجے تھے وہ...... اور پرسوں جو پانچ لاکھ تم سے لیے تھے وہ بھی اس میں سے کاٹ لینا......''
''چلو کاٹ لیں گے پتر جی، پر یہ پنج لاکھ دیا کس کو ہے؟''
''وہی رفیق صاحب جس کا ذکر کیا تھا میں نے تم سے۔ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ سخت ضرورت مند لوگ ہیں۔''
''اچھی بات ہے۔ واہگرو تمہاری ان کوششوں کو قبول کرے۔ جب میں تمہارے یہ کام دیکھتا ہوں، مجھے وشواس ہو جاندا ہے کہ تمہارا کاروبار اور ترقی کرے گا۔''
میں سناٹے کی کیفیت میں یہ باتیں سن رہا تھا...... مجھ پر انکشاف ہو رہا تھا کہ عمران دانش کا یہ بے روزگار بیٹا، جو چند ماہ پہلے پاکستان میں وارد ہوا ہے اور جو ''تنگ دستی'' کے عالم میں لاہور کی ایک متوسط آبادی میں رہ رہا ہے...... (اور پھٹیچر موٹر سائیکل پر گھوم رہا ہے) حقیقت میں ایک امیر کبیر نوجوان ہے۔
جس فربہ اندام شخص کی مجھے صرف پشت نظر آ رہی تھی، یقیناً یہی جگو سیٹھ تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر الکحل کا ایک اور گھونٹ لیا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''پتر جی! اور آلے دوالے کا کیا حال چال ہے؟ وہاں جھانسی میں تمہاری غیر موجودگی میں کاروبار کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہو رہا؟''
''نہیں گاڈ فادر۔'' عمران نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''تم کو بتایا تھا نا کہ اللہ پاک نے مجھے جو منیجر دیا ہے، سمجھو کہ فرشتہ ہی بھیجا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ماں جی بھی وقت نکال کر چکر لگا لیتی ہیں۔''
عمران نے آگے کچھ اور بھی کہا تھا لیکن میں سن نہیں سکا، اچانک ہی میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

میرے سر کے عقبی حصے پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ میں سر پکڑ کر رکوع کے بل جھک گیا۔ یہ میری اضافی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے اتنا نیل ہونے سے بچا لیا تھا۔ ضرب کے ساتھ ہی کسی نے مجھے عقب سے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں ایک ساعت ضائع کیے بغیر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور حملہ آور کو پوری شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرا دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ حملہ آور میرے جسم پر اپنی گرفت برقرار نہیں رکھ سکے گا لیکن یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ اس نے شدید چوٹ کے باوجود اپنی گرفت نرم نہیں ہونے دی۔ مجھے عجیب سا شک ہوا۔ یوں لگا جیسے عقب سے میرے ساتھ لپٹا ہوا حملہ آور مرد نہیں، کوئی عورت ہے۔ اس کے جسم کی ساری ساخت مجھ پر واضح ہو رہی تھی مگر کیا ایک عورت اتنی سخت جان ہو سکتی تھی؟
اگلے ہی لمحے صورتِ حال مزید واضح ہو گئی۔ دوسرے حملہ آور نے مجھ پر سامنے سے یلغار کی۔ یہ بھی ایک عورت ہی تھی لیکن کوئی عام عورت نہیں تھی۔ چوڑے چکلے جسم کی جوان اور نہایت مضبوط عورت۔ وہ یونیفارم طرز کے لباس میں تھی۔ شلوار قمیص اور چوڑی بیلٹ جو کمر کے گرد کسی ہوئی تھی۔ چوڑے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور جبڑا نہایت مضبوط۔ مجھے اس کی بیلٹ کے ساتھ پستول لٹکا ہوا نظر آیا، وہ اپنا ہاتھ اس پستول کی جانب ہی بڑھا رہی تھی۔
یہ سارا منظر میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں دیکھا۔ غضب ناک عورت نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور پستول نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی میری دونوں ٹانگوں کی بھرپور ٹھوکر اس کے سینے پر لگی اور وہ کراہتی ہوئی دور جا گری۔ وہ گرتے ہوئے کسی ڈیوائس سے ٹکرائی تھی، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ یو پی ایس کا یونٹ تھا۔ دھماکے کے ساتھ شارٹ سرکٹ کی آواز آئی اور پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب گئی۔
عقب سے لپٹی ہوئی جنگجو عورت نے مجھے جکڑ تو رکھا تھا لیکن میرے بازو آزاد تھے۔ میں نے اپنی کہنی کی یادگار ضرب اس کی پسلیوں میں لگائی۔ پسلی چٹخنے کی آواز واضح سنائی دی۔ عورت کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ میں تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ تب تک سامنے والی حملہ آور پھر مجھ پر جھپٹ چکی تھی، وہ مجھ پر آتشیں گالیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ اس نے میرے سینے پر اپنے فولادی سر کی ضرب لگائی پھر کوئی تیز دھار چیز میری کلائی کو چیر گئی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر یقیناً یہ کوئی خنجر وغیرہ تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ فرش بوس ہونے کے بعد

pklibrary.com

پستول اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

تیز دھار آلے کا دوسرا وار میرے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے اس کا دایاں بازو دبوچ لیا اور طاقت سے مروڑ کر تیز دھار آلہ اس کی گرفت سے چھڑا دیا۔ دوسری حملہ آور اپنی پسلی پر نہایت سنگین ضرب کھانے کے باوجود پسپا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ وہ غضب ناک انداز میں چنگھاڑتی ہوئی جھپٹی۔ میں نے اس کی ساتھی کو گھما کر اس پر دے مارا۔

ایسی خطرناک، کڑک عورتوں سے میرا واسطہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ جو زبان بول رہی تھیں وہ میرے اندازے کے مطابق ترکی تھی۔ ان کے خدوخال بھی ترک تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جن ترک عورتوں کے بارے میں میرا اور میرے مخبر نوشا کا خیال تھا کہ وہ شاید موج میلے کے لیے یہاں لائی گئی ہیں، وہ موج میلے کے لیے نہیں لائی گئی تھیں، وہ یہی آفت زادیاں تھیں۔ وہ میرے ساتھ یوں برسرِ پیکار تھیں جیسے پرانی دشمن ہوں اور اسی جگہ مجھے لاش میں تبدیل کر دینا چاہتی ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ان کے اس مہلک حملے سے جانبر نہ ہوسکتا۔ میں پانچ دس سیکنڈ کے اندر اندر سنبھل گیا اور پھر ان دونوں پر کاری وار کیے۔ "مضروب پسلی والی" ایک دروازے کا شیشہ چکنا چور کرتی ہوئی ایک برآمدہ نما جگہ پر جا گری اور دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ دوسری کا پیش قبض نما خنجر اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور میں نے اس کے ہیولے کو اپنے گھٹنے کے نیچے دبا لیا تھا۔ یہ سارے کا سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر ہی وقوع پذیر ہوگیا تھا۔ یکایک مجھے لگا کہ تاریکی میں کسی نے عقب سے آکر میری گردن میں لوہے کا شکنجہ ڈال دیا ہے۔ بہت سخت گرفت تھی۔ میرے دل نے پکار کر کہا...... یہ میرے یار عمران دانش کے بیٹے کی گرفت ہے۔ میں اس گرفت کو اور اس کی لڑائی کے سارے داؤ پیچ کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ (وہ جوش و خروش کی انتہا کا دور تھا، وہ دیوانگی کا زمانہ تھا۔ کبھی کبھی میں اور عمران دانش بے وجہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔ مار مار کر ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے تھے۔ چوٹیں راحت پہنچاتی تھیں، تکلیفیں جسم میں مزید امنگ ترنگ جگاتی تھیں، خطرے لہو کی گردش تیز کرتے تھے اور موت ہمیں دیکھ کر دائیں بائیں سرک جاتی تھی) ہاں، یہ اسی عمران دانش کا بیٹا تھا۔ میں اسے کوئی جوابی چوٹ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ گہری تاریکی تھی اور یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس پر عقاب کی طرح جھپٹا ہے، وہ کوئی اور نہیں اس کا "چاچو یار" ہے۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا لیکن میری گردن پر اس کے بازو کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں نے بولنا چاہا تو گلے سے آواز نہیں نکل پائی۔ کاش لائٹ آجائے...... میں نے سوچا۔

کمک پہنچنے کے بعد ترک گارڈ پھر شیر ہوگئی۔ وہ چلاتی ہوئی مجھ پر جھپٹی لیکن پھر ٹانگ کھا کر لڑکھڑا گئی۔ اسی دوران میں عمران جونیئر نے مجھے پوری طاقت سے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ میرا سر دیوار سے ٹکراتا تو چیخ کر رہ جاتا۔ میں نے اس کا توڑ اپنے ہاتھ کو چہرے کے سامنے لا کر کیا اور سر کی شدید چوٹ سے بچ گیا۔ "عمران یہ میں ہوں۔" میں نے اسے تاریکی میں پھر پکارنا چاہا لیکن ظالم نے گردن کو یوں جکڑ رکھا تھا کہ آواز ناقابلِ شناخت ہوکر رہ گئی تھی۔ اب مزید بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ بھی گارڈز وغیرہ ہی تھے۔ مجبوراً میں نے اپنے دائیں آزاد ہاتھ سے عمران کی پسلیوں پر کہنی کی جچی تلی ضرب لگائی جسے اس نے کافی حد تک بچا لیا۔ تاہم اس دوران میں اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے میرے سر کی جانب سے ہٹ گئی۔ میں نے تڑپتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر سر سے جھٹکے سے چوٹ لگائی۔ میرے گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو میں نے "پہلی فرصت" میں وہ کام کیا جو کرنا چاہتا تھا۔ "عمران، یہ میں ہوں۔" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

ایک دو سیکنڈ کے لیے عمران جیسے سن ہوگیا۔ میں اس کی گرفت سے نکل آیا۔ یہی وقت تھا جب دو تین موبائل فون ٹارچز کی روشنی نے تاریکی کو دور کر دیا۔ عمران ہکا بکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر پھر سے جھپٹنے والی "ترک فائٹر" بھی ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کا تھوبڑا خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ہانپتے کانپتے جگو سیٹھ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ رائفل بدست موقع پر آن موجود ہوا تھا۔

عمران نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روکا۔ پھر ترک جنگجو اور دوسرے گارڈز کو بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ تب جھپٹ کر اس نے ترک جنگجو عورت کے ہاتھ سے خنجر بھی نکال لے، (جو اس نے روشنی ہونے کے بعد دوبارہ اٹھا لیا تھا)

"چاچو جی! تم یہاں؟" وہ ششدر تھا۔

پھر اس کی نگاہ میری زخمی کلائی پر پڑی، جہاں گہرا کٹ تھا اور خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ''اوہ گاڈ، چاچو جی، تم تو زخمی ہو۔'' اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ وہ مجھے لیتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔

''کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''لیکن خون تو بند کرنا ہے نا۔'' وہ بولا۔

چکنا چور شیشے کے قریب دوسرے ترک جنگجو نیم بے ہوش پڑی تھی۔ ''قادری! پلیز، تم اس کو دیکھو۔'' عمران نے جگو سیٹھ سے مخاطب ہو کر بے سدھ عورت کی طرف اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد میں اور عمران اسی کمرے میں تھے جہاں میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اور جگو سیٹھ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اسی دوران میں کوٹھی کی برقی رو بحال ہو گئی۔ روشنی ہوئی تو میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کو دھیان سے دیکھا جہاں میرے سر کی ضرب لگی تھی وہاں عمران کے رخسار پر نیلگوں ابھار نمودار ہو چکا تھا۔

وہ میری کلائی پر ایک رومال باندھتے ہوئے ششدر لہجے میں بولا ''یہ سب کیا ہے چاچو؟''

''میں بھی یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟''

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ''تو اس کا مطلب ہے میرا چاچو میری جاسوسی کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے......''

''جب بھتیجا کچھ زیادہ ہی ''غریب'' اور لاچار ہو تو اس کی خبر تو رکھنی پڑتی ہے نا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

عمران نے ہونٹ سکیڑے اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''اس کا مطلب ہے چاچو! کہ تم نے میری اور چاچا جگت سنگھ کی باتیں بھی سنی ہیں۔''

''کون جگت سنگھ؟''

یہی وقت تھا جب جگو سیٹھ اندر داخل ہوا۔ اس کے لمبے کرتے کے نیچے درمیانے سائز کی توند بھی ابھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے سامنے سے جگو سیٹھ کو دیکھا تھا۔ دماغ میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ یہ شکل کچھ جانی پہچانی تھی پھر لگا ہوں کے سامنے جھماکا سا ہوا۔ برسوں پہلے کا وہ نڈر جگت سنگھ یاد آ گیا جو میرے اور عمران دانش کے ساتھ ہی انڈیا کی بارڈر فورس کو پچھاڑ کر پاکستان پہنچا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی محبوبہ اور اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا...... جگت سنگھ نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں لاہور میں میری موجودگی سے پہلے ہی باخبر تھا۔ شاید اس نے مجھ سے جان بوجھ کر رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ ''بھرا جی'' کہتا ہوا مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اس کوٹھی میں میری موجودگی عمران کی طرح جگت سنگھ کو بھی حیرت زدہ کر رہی تھی۔ جگت سنگھ بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا اور کبھی عمران کی طرف۔ ''یہ سب کیا ہے بادشاہ زادو۔ آپاں کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا؟''

عمران نے کہا۔ ''قادری، یہ سب لمبی کہانی ہے۔ ڈھیروں سوال ہیں اور ڈھیروں جواب بھی ہیں۔ میرے خیال میں زیادہ سوال تو چاچو تابش کے ذہن میں ہوں گے۔ آرام سے بیٹھ کر یہ سوال جواب کریں گے۔ فی الحال تو تمہاری دونوں گارڈز زخمی ہیں ان کو دیکھو اور باقی ملازموں کو بھی مطمئن کرو۔ میں چاچو کی چوٹ کی ڈریسنگ کرواتا ہوں۔''

جگت سنگھ جذباتی نگاہوں سے میری جانب دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ عمران نے کلائی کے کٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑی [illegible] چلا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پیٹ میں گھس کر ریڑھ کی ہڈی تک بھی جا سکتا تھا...... مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ خوفناک عورتیں کیوں پال رکھی ہیں تم لوگوں نے...... اور انہوں نے اتنی بے رحمی سے مجھ پر حملہ کیوں کیا؟''

''چاچو جی! تم نے بھی تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دونوں زخمی ہیں، ایک تو بے ہوش ہے اور اسپتال روانہ ہو گئی ہے...... دراصل ہوا یوں ہے کہ یہ کسی اور کے لیے ''بے رحم'' ہو رہی تھیں۔ اتفاقاً ان کے ریڈار پر تم آ گئے۔''

''کیا مطلب؟ کس پر بے رحم ہو رہی تھیں؟''

جواب میں عمران نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ کوٹھی میں پچھلے دو مہینوں کے دوران میں دو بار چوری اور ایک بار ڈکیتی ہو چکی ہے۔ جگت سنگھ نے (جسے عمران پیار سے گاڈ فادری کہتا تھا) دو گارڈز کا انتظام تو کر رکھا تھا لیکن زنانے حصے میں سیکیورٹی کے لیے اس نے ترکی سے یہ دو اسپیشل زنانہ گارڈز منگوائی تھیں۔ انہیں پیش آمدہ خطرے کے حوالے سے پوری طرح ہوشیار اور چارج کیا گیا تھا۔ یہی ''چارج شدہ'' گارڈز مجھے ''گھس بیٹھیا'' جان کر مجھ پر پل پڑی تھیں اور دمادم مست قلندر کر دیا تھا۔

☆☆☆

رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ میں اور عمران جگت

سنگھ والی کوٹھی میں ہی موجود تھے۔ میں جگت سنگھ کے بارے میں کافی کچھ جاننا چاہتا تھا مگر عمران کا خیال تھا کہ جگت سنگھ یہ سب کچھ اپنی زبانی ہی بتائے گا تو زیادہ اچھا ہوگا۔ جگت سنگھ فی الوقت اپنی ترک گارڈ کی دیکھ بھال کے لیے اسپتال میں ہی تھا۔ ترک گارڈ کا ایک ایمرجنسی آپریشن ہوا تھا...... ابھی اس کی حالت کے بارے میں کوئی تسلی بخش خبر نہیں تھی۔ اس کی پسلی دو ٹکڑے ہو گئی تھی۔

عمران کے استفسار پر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ کسی طرح ماہین نے سرِراہ گزرتے ہوئے اس کی خراب موٹر بائیک کو دیکھا اور کس طرح مجھے شک ہوا کہ وہ یہاں جگو سیٹھ کی کوٹھی میں موجود ہے۔ میں اسے صاف لفظوں میں یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں نے اپنے ایک انفارمر سے اس کی تھوڑی سی نگرانی بھی کرائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی (عمران کی) بھلائی کے لیے ہی میں اس کے ذرائع آمدنی جاننا چاہ رہا تھا۔

اسی دوران میں پرائیویٹ اسپتال سے وہ خبر آگئی جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ جگت سنگھ نے فون پر بتایا کہ ترک گارڈ اب ہوش میں آگئی ہے، اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

اس اطمینان بخش اطلاع کے بعد عمران نے گرین ٹی اور کچھ لوازمات منگوائے۔ جگت سنگھ کی بیوی اپنے مقامی عزیزوں کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ چائے وغیرہ ملازمین نے ہی پیش کی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں دھیان سے عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اب اداس بکرے کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس سے تیکھے سوال کرنے والا ہوں۔ آخر خود ہی بول اٹھا۔ ''چاچو، جو پوچھنا ہے، پوچھ لو۔ خواہ مخواہ میرا پیشاب خشک مت کرو۔''

''پیشاب نہیں ''خون'' خشک ہوتا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''جب ڈر زیادہ ہو تو محاورے آگے پیچھے ہو ہی جاتے ہیں۔'' اس نے رونی صورت بنائی۔

میں نے کہا۔ ''زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ اس طرح کے پاکھنڈ تم کیوں کرتے ہو؟''

''کس طرح کے پاکھنڈ؟'' اس نے دائیں بائیں دیکھا۔

''عمران میں سیریس ہوں۔'' میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تم مجھ سے بھی جھوٹ بولتے رہے ہو۔ ایک طرف مجھے ''چاچو، چاچو'' کہتے تمہاری زبان

مجبوری

ایک شرابی ریلوے بکنگ آفس پر ایک شخص کو اپنے کندھے پر سوار کیے پہنچا اور ٹکٹ بیچنے والے سے کہا۔ ''مجھے روہڑی کا ایک ٹکٹ دے دو۔''

ٹکٹ بیچنے والے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ اور بولا۔ ''اس شخص کا ٹکٹ نہیں لوگے جو تمہارے کندھوں پر سوار ہے؟''

''یہ شخص۔'' شرابی نے جواب دیا۔ ''یہ تو میرا بچہ ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں ہوئی ہے۔''

''چھ سال سے کم عمر کا بچہ ہے؟'' ٹکٹ بیچنے والے نے کہا۔ ''کیوں بے وقوف بناتے ہو یہ شخص چھ فٹ لمبا ہے، اس کا وزن کم سے کم ستر کلو ہوگا اور اس کی داڑھی کسی حال میں بھی تین انچ سے کم نہیں ہے پھر بھی تم اسے بچہ کہہ رہے ہو؟''

شرابی نے کندھے پر سوار شخص کو زمین پر دے پٹکا اور [illegible] نکال کر بولا۔ ''کمبخت میں نے پہلے ہی کہا تھا اپنی داڑھی منڈوا دو۔ اب مجبوراً مجھے تمہارا بھی ٹکٹ لینا پڑے گا۔''

مرسلہ: عبدالغفار کوثر، اورنگی کراچی

سوکھتی ہے اور دوسری طرف مجھے بے وقوف بھی بناتے رہے ہو۔ تم...... ایک...... مال دار شخص ہو۔''

وہ بھی سنجیدہ نظر آنے لگا، بولا۔ ''چاچو جی! غلط نہیں کہہ رہا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد میں تمہیں بھی سب کچھ سچ سچ بتا دیتا لیکن فی الحال حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اپنے اردگرد جو خول سا میں نے بنایا ہوا ہے، اس میں کوئی تریڑ (دراڑ) نہ پڑ جائے۔''

''خول چڑھانے کو اور بہروپ بھرنے کو ہی تو ڈراما بازی کہتے ہیں۔''

وہ چند لمحے تک عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''چاچو جانی! چلیں، یہ ڈرامے بازی ہی سہی...... لیکن پلیز...... مجھے اس ڈرامے بازی کے ساتھ رہنے دو۔ اس حوالے سے مجھ پر کسی طرح کا زور نہ ڈالنا۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اپنے خوب

صورت بالوں میں انگلیاں چلا کر اسی کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''چاچو! میں ان لوگوں جیسا بن کر ان لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا ہوں، ان کے دکھ سکھ کو ان کی غمی خوشی کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دور رہ کر ان مسائل کو جان ہی نہیں سکتا جو ان تنگ گلی کوچوں میں پھلتے پھولتے ہیں، نہ ان بیماریوں اور تکلیفوں کو جان سکتا ہوں جو ان تاریک بوسیدہ کمروں میں جنم لیتی ہیں...... اور نہ ان سسکیوں سے باخبر ہوسکتا ہوں جو صرف کان لگا کر ہی سنی جاسکتی ہیں...... مجھے یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے دو چاچو جی! مجھے وہ ذمے داری نبھانی ہے جو آپ کے دوست اور میرے پاپا نے مجھ پر ڈالی ہے۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ بات تو وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ اور یہ بات بہت ظرف مندی والی بھی تھی۔ وہ بغیر سامنے آئے، بغیر کسی نمود و نمائش کے اپنی ہمت طاقت کے مطابق اپنے اردگرد کے دکھی لوگوں کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کے لیے اس نے کسی حاجی فراز کا نام گھڑ لیا تھا اور اپنی ساری کوششوں کو بڑی خاموشی کے ساتھ اس کے کھاتے میں ڈال رہا تھا...... ان لمحوں میں جانے کیوں میری نگاہوں کے سامنے چند دن پہلے کی وہ ٹی وی اسکرین پر دیکھے ہوئے کچھ منظر آگئے۔ وہی مخیرانہ انداز سیاست داں جو آٹے کا تھیلا، مفلوک الحال لوگوں کے سروں پر رکھتا تھا اور مسکرا مسکرا کر تصویریں اتروا تا تھا۔ آفت اور مصیبت کے دنوں میں ایسے مناظر اس وطنِ عزیز میں جانے کتنی جگہ بکھر جاتے ہیں، کتنی جگہ غربت کو تماشا بنایا جاتا ہے۔

ماحول بہت بوجھل ہوگیا تھا۔ اچانک ایک فون کال نے صورتِ حال تبدیل کردی۔ رات کے ڈیڑھ بجے آنے والی یہ کال ماہین کی طرف سے تھی۔ ''ہیلو انکل...... ماہی بول رہی ہوں۔ کہیں آپ سو تو نہیں گئے تھے؟''

''بس سمجھو، سونے ہی والا تھا۔''

''سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کردیا۔ وہ دراصل آپ کے بھتیجے کے بارے میں پوچھنا تھا۔ کیا بنا اس کا؟''

''ہاں ٹھیک ہوگئی تھی اس کی بائیک، واپس گھر آگیا تھا۔''

''چلیں...... میں نے سوچا اتنی سردی میں، کہیں وہیں اٹکا نہ پڑا ہو۔ ترس آرہا تھا اس پر...... او کے گڈ بائے، گڈ نائٹ۔'' اس نے کھنکتی آواز میں کہا۔

''گڈ نائٹ۔'' میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

عمران سمجھ گیا کہ ماہین کا فون تھا۔ ''اس کو کیا فکر لاحق ہوگئی؟'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں...... یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

ایک دم عمران کا سنجیدہ موڈ ہوا ہوگیا۔ وہ اپنی اسی چلبلی ڈگر پر واپس آگیا جو ہر گام پر کئی کئی بل کھاتی تھی، بولا۔ ''چاچو جانی! اب دیکھو تم خود مجھے راہ دکھا رہے ہو، وہ کیا کہتے ہیں پنجابی میں، اشکل دے رہے ہو۔ تم نے میری امید کے بجھے چراغوں میں پھر تیل ڈال دیا ہے۔''

''میں نے کیا، کیا ہے؟''

''تم مسکرائے ہو چاچو، حالانکہ تم ماہین کے ذکر پر نیم کے پتے چبانے لگتے ہو جو ہر وقت کڑوے۔ پتے چبائے، وہ ذرا سا مسکرا بھی دے تو یہ بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔''

''کوئی خبر شبر نہیں ہے۔ اس کو بس ترس آیا ہے تم پر۔''

''اب تم جو مرضی کہہ لو چاچو جی، لیکن یہ جو تم مسکرائے ہو نا، یہ مسکراہٹ اب تم واپس نہیں لے سکتے۔ تم نے جو آس میرے اندر جگائی ہے چاچو، اب وہ بڑھتی جائے گی، بڑھتی ہی جائے گی...... اور پھر ایک دن''

''تم اس سے باقاعدہ جوتے کھاؤ گے۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

''چاچو مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو تم۔ مجھے آج تک کوئی جوتا نہیں مار سکا۔ اگر کسی نے مارا ہے تو میں نے لگنے نہیں دیا۔ اگر لگا بھی ہے تو بس اچٹتا سا۔ جیسے بوسہ دے کر گزر گیا ہو۔'' وہ فخریہ انداز میں مسکرایا۔

''اچھے ایکٹر ہو۔ کامیڈی فلموں میں چانس بن سکتا ہے تمہارا۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

یہی وقت تھا جب قریبی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کی کھڑکھڑاہٹ گونجی اور پھر اعلان ہونے لگا۔ ''حضرات، ضروری اعلان سماعت فرمائیں۔ حاجی فراز صاحب کی فری ڈسپنسری میں بچوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر تشریف فرما ہیں۔ وہ آج اور کل رات آٹھ بجے تک بچوں کا مفت معائنہ کریں گے۔ ادویات بھی دی جائیں گی۔ اہالیانِ علاقہ سے گزارش ہے کہ......''

اعلان جاری رہا۔ میں عمران کی طرف دیکھتا رہا جو اب اپنے خستہ حال موبائل فون کے اندر ماچس کی تیلی پھنسا کر اسے چارج کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

❖❖❖

احساسِ فراموشی

تنویر ریاض

خواہشوں اور آرزوؤں کا بھی عجیب انداز ہوتا ہے... جس کے بارے میں کبھی سوچا نہ ہو... وہ انجام پذیر ہو جائے تو انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ انسانی ذہن کی گرہوں کو کس طرح کھول کے سلجھایا جائے... ایک ایسے ہی کردار کے مختلف روپ... زیرِ نقاب بہت کچھ پوشیدہ تھا...

اس مجرم کی کا ماجرا جو اپنی منفرد شناخت چاہتا تھا

میں نے اپنے دوست موری شوناسا سے 'دی مرڈرز ان دی اسکار لیٹ ڈ۔تھ مینشن' کے بارے میں سنا تو اس سے ملنے چلا گیا۔ سراغ رسانی پر مبنی کہانیاں لکھنے والوں کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ کہی جاتی ہے کہ وہ راتوں رات [illegible] کے پیچھے ہونے والے قتل اور مجرم کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کی کہانی تخلیق کر لیتے ہیں۔ اس میں مجرم کی چال کے علاوہ قتل کا محرک اور اس میں حائل پیچیدگیاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

pklibrary.com

اگر میں اصل قاتل ہوتا تو اپنے مقصد کو ذہن میں رکھ کر قتل کی منصوبہ بندی کرتا پھر ایسی چال چلتا جس سے میرے جرم کی پردہ پوشی ہو جاتی۔ بعد میں وہ لوگ جو اپنے آپ کو سراغ رساں کہتے ہیں، وہ اس جرم کا سراغ لگاتے۔ بہرحال ہم رائٹرز کے لیے یہ اتنا آسان نہیں۔

ایک بار پھر مجھے مختصر جرم کہانی لکھنے کے لیے کہا گیا تھا اور کام نہ ہونے کی وجہ سے میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ انکار کر سکوں چنانچہ میں نے فوراً ہی اسے قبول کر لیا اور اس کے بارے میں تفصیلات جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اب میں ایک بند دروازے کے پیچھے ہونے والے قتل کی کہانی لکھنے کا پابند تھا۔ بند دروازے کی اصطلاح اس جرم کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس میں بظاہر یہ معلوم نہ ہو کہ مجرم کس طرح کمرے میں داخل ہوا اور باہر نکلا۔

کہانی دینے کی تاریخ قریب آرہی تھی اور میرے پاس ایسا کوئی کیس نہیں تھا جس پر کچھ لکھ سکوں اور نہ ہی پبلشر سے مدد مانگ سکتا تھا کیونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسی لیے میں اپنے دوست سراغ رساں موری سے ملنے چلا گیا اور اس سے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''میرے دوست، تمہارے پاس کوئی بند دروازے والا کیس ہے؟''

''اتنے مختصر نوٹس پر یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی میں تمہیں اپنے بہت سے کیسز کے بارے میں بتا چکا ہوں، ان کا کیا بنا؟''

میں نے اسے وضاحت سے بتایا کہ ان میں سے زیادہ تر کو میں کہانی کے قالب میں ڈھال چکا ہوں البتہ چند ایک کیسز ایسے ہیں جن پر ابھی تک نہیں لکھا جا سکا۔ ایسے کئی حقائق ہیں جو لکھنے والے کے لیے پریشانی کا سبب بنتے ہیں اور اسے پبلشر کی ترجیحات کو دیکھنا پڑتا ہے۔

''اس کے علاوہ بھی قتل کے کئی کیسز ہیں جن میں ناممکن چالوں کو استعمال کیا گیا اور ان پر ہم بات بھی کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کئی ایک کو ابھی تک نہیں لکھا گیا۔'' وہ بولتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات تھے لیکن ساتھ ہی وہ میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میں نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔ ''میں انہیں کیسے لکھ سکتا تھا۔ ان میں بعض بہت بڑی اور بعض بہت چھوٹی کہانیاں تھیں۔ اس کے علاوہ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں ایسے وقت لکھا جائے جب یہ کلک کر سکیں۔''

''میں نہیں جانتا کہ کلک سے تمہاری کیا مراد ہے۔ دوسرے لفظوں میں تم یہ کہہ رہے ہو کہ ایسی کہانیاں نہیں لکھ سکتے جن میں پیچیدہ چالیں اور بہت زیادہ وضاحت کی ضرورت ہو؟''

''درست۔''

''یعنی تمہیں کوئی ایسی چیز چاہیے جو سادہ اور مختصر ہو اور اس کی پہلے کوئی نظیر نہ ہو؟''

''ہاں۔'' میں اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''سراغ رساں موری! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی کہانی ہے؟''

''ہاں لیکن اس میں ایک نقشہ بھی شامل ہے۔ تمہیں اس سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟''

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' میں نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مجھے اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہو گی؟''

''نہیں، یہ محض اس مکان کا نقشہ ہے جس میں جرم واقع ہوا۔ کیا تم اس پر بات کرنے کے لیے تیار ہو؟ ٹھیک ہے پھر ہم شروع کرتے ہیں۔''

☆☆☆

[illegible] میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی [illegible] اس لیے یہاں پر [illegible] اور کاٹیج میں شاذ و نادر ہی کوئی نظر آتا تھا۔ سوائے کنارے پر واقع اس ولا کے جس میں کرائے دار رہتے تھے لیکن اس وقت تمام مکین گہری نیند سو رہے تھے اور عمارت میں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ یہ روشنی ہال کے وسط سے آرہی تھی جہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا البتہ ایک گھومنے والی کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر ایک جوان شخص بیٹھا آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اچانک ہی وہ سامنے کی جانب گر گیا اور کرسی تقریباً اس کے اوپر آگئی۔

''اوو پس!'' نیتو میاریوتا چلایا۔ اس نے جلدی سے اپنا توازن درست کیا اور چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔

''مجھے اس طرح کا کام قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے اپنی جماہی روکتے ہوئے سوچا۔ اسے توقع تھی کہ نائٹ واچ مین کی جاب بہت آسان ہوگی لیکن اب اسے احساس ہوا کہ یہ انتہائی تکلیف دہ کام تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو رسالے لے کر آیا تھا سب اس نے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالے۔ اس کے علاوہ ساتھ لائے ہوئے اسنیکس بھی تقریباً ختم ہو چکے تھے اور اب اسے بیئر کی طلب ہو رہی تھی۔ اسے

pklibrary.com

یہ تاکید بھی کی گئی تھی کہ وہ ریسٹ روم استعمال کرنے سے ممکن حد تک پرہیز کرے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کام کے اوقات اور معاوضے کو دیکھتے ہوئے یہ ایک معقول جاب تھی۔ اسی لیے اس نے یہ پیشکش قبول کرلی۔

ریوتا نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ اس کی ڈیوٹی سورج نکلنے پر ختم ہوتی۔ برآمدے میں تاریکی نہیں تھی لیکن بہت زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور مسلسل جماہیاں لینے کے بعد اسے ہر چیز دھندلی نظر آنے لگی۔ جب بھی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ انہیں زبردستی کھول لیتا۔ اس کے سامنے دس فٹ کے فاصلے پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ شاید یہ ہنگامی صورت میں باہر نکلنے کے لیے وہاں رکھا گیا تھا۔

جب بھی وہ آنکھیں کھولتا تو وہ نقشہ اس کی نظروں کے سامنے آجاتا۔ اس طرح وہ اسے یاد ہو چکا تھا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ بیرونی دروازے سے داخل ہونے کے بعد مرکزی ہال سے گزر کر ولا کے عقبی دروازے یا آٹھ کمروں تک رسائی ممکن تھی جن میں چھ گیسٹ روم، ڈائننگ روم اور اسٹور روم شامل تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چھ میں سے چار گیسٹ روم بھرے ہوئے ہیں۔

یہ ولا شمالاً جنوباً واقع تھا اور اس کا بیرونی دروازہ جنوب کی طرف تھا۔ مغرب کی جانب واقع فلیٹ میں ایک وکیل سومورا ایگو رہائش پذیر تھا اور اس کی شہرت انسانی حقوق کے حوالے سے تھی۔ یہاں تک کہ ریوتا، جسے خبریں دیکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی وہ بھی کئی بار ٹی وی پر دیکھ کر اس کا چہرہ پہچان چکا تھا۔

اس کے بالکل سامنے والے کمرے میں ایک بڑے مقامی اخبار کی رپورٹر ساوا کی شی زورو رہتی تھی۔ اس کے بالکل برابر میں جنوب کی جانب والے کمرے میں نومی تاواشی اور اس کی بیوی اکوکو، رہتے تھے۔ نومی ایک بڑی کمپنی میں منیجر اور اس کی بیوی ٹیچر تھی۔ یہ ہر لحاظ سے ایک مثالی جوڑا تھا۔ وہ دونوں اپنی اصل عمر سے بڑے نظر آتے تھے اور لگتا تھا کہ انہیں کوئی دکھ ہے۔

یہ سب لوگ اس ولا میں کیوں اکٹھے ہوئے اور انہیں کیوں ایک چوکیدار رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ بننے والا شخص نومی اری ماسا، عمارت کے جنوب مشرقی کونے میں واقع کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا جو داخلی دروازے کے بالکل برابر میں تھا۔

ریوتا کے لیے یہ نام جانا پہچانا تھا۔ نومی نے مبینہ طور پر جو جرائم کیے تھے اس کی وجہ سے تقریباً سب لوگ اسے جان گئے تھے۔ اس پر یکے بعد دیگرے کئی قتل کرنے کا الزام تھا۔ وہ مقتولین کو بے ہوش کر کے تشدد کے ذریعے ہلاک کرتا۔ یہ ایک دیوانگی تھی جس میں بے ہوش کرنے والی دوا کو دروازے کے کی ہول سے اندر داخل کیا جاتا، اس کے بعد مجرم کمرے میں جا کر مکینوں کو ہلاک کر دیتا۔ اس کا شکار کوئی بھی مرد، عورت، جوان یا بوڑھا ہو سکتا تھا۔ وہ انہیں ہلاک کر کے ان کی ذاتی اشیا چوری کر لیتا یا انہیں جلا دیتا۔

یہ کیس اس لحاظ سے بھی سنسنی خیز ثابت ہوا کہ مشتبہ شخص سولہ سالہ نومی اری ماسا، تھا۔ یہ ایک انتہائی حیرت انگیز انکشاف تھا جس نے لوگوں پر سکتہ طاری کر دیا لیکن پھر اس کیس نے ایک غیر متوقع رخ اختیار کیا۔ پہلے سومورا ایگو نے اپنی مہارت اور قابلیت کو استعمال کرتے ہوئے نومی کو سزا سے بچالیا۔ وہ رضاکارانہ طور پر اس کا مقدمہ لڑ رہا تھا پھر ساوا کی شی زورو نے اپنے اخبار میں ایک مہم شروع کی جس میں اس نے اس برائی کو دبانے کی کوشش کی جس کا چرچا پورے ملک میں ہو رہا تھا۔

غنتو میاریوتا کو تفصیلات کا علم نہیں تھا لیکن وہ جان گیا تھا کہ کیس حتمی طور پر حل نہیں ہوا۔ اس لیے جب اس لڑکے کو رہا کیا گیا جس نے مبینہ طور پر یہ جرائم کیے تھے تو بہت سے لوگ حیران رہ گئے اور اس کا شدید ردِعمل سامنے آیا۔ ریوتا کو ذاتی طور پر اس معاملے میں شامل ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی حالانکہ وہ ولا کی انتظامیہ کی مدد کر رہا تھا۔

وکیل سومورا، اور ساوا کی، کا اصرار تھا کہ نومی پر غلط الزام عائد کیا گیا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ میڈیا کے جنون اور لوگوں کے غصے کے نتیجے میں لڑکے کو ان جرائم میں غلط طور پر ملوث کیا گیا ہے۔ پہلے تو ریوتا کو ان دعوؤں پر یقین نہیں آیا لیکن جب سومورا نے نومی کا دفاع کیا اور ساوا کی نے اس کی عزت بحال کرنے کے لیے خود ایک بیان جاری کیا تو اسے یقین آنے لگا کہ شاید وہ ٹھیک، کہہ رہے ہیں۔

اس کے علاوہ نومی سے بات کرنے کے بعد جو دیکھنے میں ایک عام لڑکا لگ رہا تھا، وہ سوچنے لگا کہ اگر اس لڑکے کو سزا ہو جاتی تو کتنا برا ہوتا۔

''ہمارے بیٹے کو قاتل کہہ کر بدنام کیا جا رہا ہے۔'' نومی کے باپ نے کہا۔ ''یہاں تک کہ وہ گھر سے باہر بھی نہیں جا سکتا۔ میری بیوی بہت خوف زدہ ہے جب بھی ہمیں مسٹر سومورا یا ساوا کی سے بات کرنی ہوتی ہے تو اس کے لیے ہم کوئی الگ جگہ دیکھتے ہیں۔''

pklibrary.com

''میرا شوہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں نامعلوم اجنبیوں کی جانب سے دھمکیاں مل رہی ہیں۔ وہ لوگ جو اخبارات پڑھتے اور ٹی وی دیکھتے ہیں انہیں یقین ہو گیا ہے کہ ہمارے بیٹے نے ہی یہ جرائم کیے ہیں۔ وہ انتقام لینا چاہ رہے ہیں۔ ہمارا سکون غارت ہو گیا ہے اور اس لیے......''

اس لیے انہیں رات کے لیے ایک چوکیدار کی ضرورت تھی۔ نیتو میا ریوتا، کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا کیونکہ وہ مضبوط جسم کا مالک اور دیکھنے میں ایتھلیٹ لگتا تھا۔ اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ اسے یقین تھا کہ کوئی بھی پاگل شخص اس خاموش اور الگ تھلگ علاقے میں آوارہ گردی کرنے نہیں آئے گا۔ بہر حال اس کام میں تھوڑا سا ہیجان بھی تھا۔

ریوتا نے ساوا کی، کے دروازے پر نظریں جماتے ہوئے سوچا کہ صبح جب دروازہ کھلے گا تو شاید وہ کمرے سے باہر آئے۔ ممکن ہے کہ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا ہو، اس طرح وہ اس کے خوب صورت جسم کا نظارہ کر سکے گا۔ وہ اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ دن کا اجالا پھیلنے کے باوجود بھی بیدار رہے گا جب تک ساوا کی بیدار نہ ہو جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی وہ باتھ روم جانے کے لیے اٹھے۔ اس لیے اسے ہر حال میں جاگتے رہنا چاہیے۔ اس کے چند لمحوں بعد ایک دروازہ کھلا اور اسے یوں لگا جیسے اس کی دعا قبول ہو گئی ہو لیکن وہ ساوا کی، کا دروازہ نہیں بلکہ اس کے سامنے والے کمرے کا تھا۔ کیا یہ بوڑھا وکیل ہے۔ اس نے سوچا لیکن یہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟

دروازہ باہر کی جانب برآمدے میں کھلا۔ اس لیے وہ دروازہ کھولنے والے کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سومورا کو پاجامے میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی نظریں دروازے پر ہی تھیں۔ دروازہ تھوڑا سا اور کھلا تب معلوم ہوا کہ اندر کون تھا۔

''کیا؟'' ریوتا اپنی چیخ نہ روک سکا اور اس نے کرسی سے چھلانگ لگا دی۔ جو کچھ اس نے دیکھا وہ اتنا ناقابلِ یقین تھا کہ اس کی غنودگی فوراً ہی غائب ہو گئی۔

اس کے باوجود وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر ایک جوکر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر فل میک اپ اور جسم پر عجیب و غریب لباس تھا۔ ایسا حلیہ جوکروں کا ہی ہو سکتا ہے۔ ریوتا نے حیران ہو کر اپنی آنکھیں ملیں لیکن منظر تبدیل نہیں ہوا۔ وہ مسخرہ اب بھی اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا جیسے وہ ابھی تاش کی گڈی سے نکل کر آیا ہو اور اس کی وہاں موجودگی بھی ایک مذاق تھی۔ البتہ ایک بات مذاق نہیں تھی، اس جوکر نے اپنے ہاتھ میں ایک خون آلود چاقو پکڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چند سیکنڈ تک دیکھتے رہے۔

''اے تم......'' ریوتا نے بمشکل تمام سرگوشی میں کہا۔ وہ صرف خوف زدہ ہی نہیں بلکہ اس صورت حال سے پریشان بھی تھا۔ کوئی شخص کیسے ولا میں چھپا رہا اور آدھی رات کے وقت وکیل کے کمرے سے برآمد ہوا؟

اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کیا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ جوکر نے بھی دھمکی آمیز انداز میں اس کی جانب چاقو گھمایا اور جیسے ہی ریوتا پیچھے ہٹا۔ وہ ہال کی دوسری طرف چلا گیا۔ تب ریوتا کو احساس ہوا کہ وہ ساوا کی، کے کمرے کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس سے پہلے ہی وہ کمرے میں جا چکا تھا۔

دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا اور ہال میں پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ریوتا [illegible] کھڑا رہا۔ [illegible] پہلے جو واقعہ پیش آیا وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھا پھر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ ساوا کی خطرے میں ہے اور وہ اس کے دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے ناب کو گھمایا لیکن اس نے حرکت نہیں کی۔ وہ اس طرح کی ناب تھی جو خود بخود مقفل ہو جاتی ہے پھر جوکر نے اسے اتنی آسانی سے کیسے کھول لیا؟

وہ دروازہ توڑنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اس کے بالکل پیچھے کوئی چمک دار شے حرکت کر رہی تھی۔

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا......'' وہ پیچھے کی جانب مڑا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے سامنے جوکر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

کیا...... کب...... کیسے ہوا؟ یہ سوال بے معنی تھا۔ جوکر نے اپنا بازو گھمایا اور اس نے ہاتھ میں جو چیز پکڑی ہوئی تھی وہ اس کے سر پر لے آیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے روشنی کا جھماکا ہوا لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے جوکر کو اسٹور روم میں جاتے ہوئے دیکھ لیا جو ساوا کی، کے کمرے کے شمال کی جانب تھا۔

☆☆☆

جب ریوتا کو ہوش آیا تو باہر اُجالا پھیل چکا تھا اور اس کے اردگرد افراتفری اور شور شرابا ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد اس نے سب سے پہلے دیوار پر بنے ہوئے نقشے اور اس کے سامنے لوگوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ ان میں سے کچھ وردی میں تھے۔

کیا ہو رہا ہے؟ اس نے صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے بیٹھنے کی کوشش کی۔ ''آہ......!'' وہ جسم میں ہونے والے درد کی شدت سے جھک گیا۔ تبھی اسے اپنا ناقابلِ یقین خواب یاد آیا، اس وقت میں کیا کر رہا تھا؟

صبح تین بجنے کے کچھ دیر بعد سومورا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص جوکروں والا لباس پہنے باہر آیا۔ جب ریوتا اسے دیکھ رہا تھا تو وہ جوکر، ساوا کی، کے کمرے میں چلا گیا اور پھر......

اس نے سر پر ایک گومڑ محسوس کیا جو ہاتھ لگانے سے دکھتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جوکر نے اس پر چاقو سے وار کیا ہے لیکن درحقیقت اس کے سر پر کسی کند شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔

''اٹھ جاؤ۔'' ایک اجنبی نے اس کے پاس آکر کہا۔ ''ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہیں معمولی سر کی چوٹ لگی ہے اور تم کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ زیادہ دیر فرش پر پڑے رہنے سے کہیں تمہیں سردی نہ لگ جائے۔''

''اچھا......'' ریوتا نے جواب دیا۔ اسے ابھی تک صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح واقعے کی تفصیل بیان کرے۔ اس نے کئی لوگوں کو سومورا کے کمرے سے باہر آتے دیکھا۔ انہوں نے سفید کوٹ پہن رکھے تھے اور وہ ایک اسٹریچر لے کر آرہے تھے جس پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی اور اس کا درمیانی حصہ ابھرا ہوا تھا۔ جب وہ اسٹریچر ریوتا کے پاس سے گزرا تو اسے خون کی مہک محسوس ہوئی اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

مونچھوں والے اجنبی شخص نے کہا۔ ''یہ لاش سومورا کی ہے۔ اسے انتہائی سفاکی سے چاقو کے کئی وار کر کے ہلاک کیا گیا ہے۔'' اس نے جیب سے پولیس نوٹ بک نکالی۔ ''ہمیں امید ہے کہ تم اس بارے میں مزید کچھ بتا سکو گے۔ فرش سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھو اور شروع ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریوتا نے کہا اور اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر وہ گزشتہ شب براجمان تھا۔ اس نے بڑی وضاحت سے وہ کہانی بیان کی جو ابھی تک اس کی یادداشت میں محفوظ تھی۔ اس کے بے ہوش ہو جانے کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ کچھ یوں تھے۔

ریوتا کے سر میں چوٹ لگنے کے کچھ دیر بعد ہی نومی اور اس کی بیوی، ساوا کی اور نومی اری ماسا، شور کی آواز سن کر بیدار ہو گئے۔ وہ سب اپنے کمروں کے دروازے سے سر باہر نکالے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ریوتا کو آواز دے کر جگانے کی کوشش کی لیکن رک گئے کیونکہ چند لمحوں بعد ہی ساوا کی، نے نوٹ کیا کہ اس کے سامنے والا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے اور انہوں نے اندر جھانکا۔ ایک لمحے بعد ہی ایک زوردار چیخ پورے ولا میں سنائی دی۔

مونچھوں والے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر سومورا پر چاقو کے تین وار کیے گئے اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس کی موت تقریباً تین بجے واقع ہوئی۔ یہ وہی وقت تھا جب تمہارے سر پر ضرب لگائی گئی۔ تمہارے بیان کے مطابق ایک آدمی جوکروں کا لباس پہنے نمودار ہوا، اور اس کے چند لمحوں بعد تمہارے سر پر کسی بھاری چیز کی ضرب پڑی۔''

''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' ریوتا نے اپنے سر کے گومڑ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گیا۔'' سراغ رساں نے سپاٹ لہجے میں کہا پھر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ایک منٹ کے لیے اس طرف آؤ گے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نے جو کہا، کیا وہ واقعی ممکن ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' ریوتا نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

''مس ساوا کی تمہیں زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' سراغ رساں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ عورت اس وقت بستر پر بیٹھی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ چونک گئی۔ ریوتا کو اس کا رویہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ واضح طور پر صدمے میں نظر آرہی تھی اور سراغ رساں کو اچانک کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اس کا حیران ہونا سمجھ میں آتا تھا لیکن جب اس نے ریوتا کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت اور خوف اُتر آیا۔

''بیٹھی رہو۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ گزشتہ شب تم نے کیا دیکھا۔ میرا مطلب ہے چند گھنٹے پہلے؟''

pklibrary.com

''بہت اچھا...... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ اس سے مختلف نہ ہوگا جو تمہیں پہلے بتا چکی ہوں۔'' ساواکی نے کہا۔

''ریوتا ہوش میں آچکا ہے۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''لہٰذا میں اس کے بیان کا موازنہ تمہارے تجزیے سے کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ہال میں آنے سے پہلے کوئی کمرے میں داخل ہوا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا تو میں فوراً جاگ جاتی اور اسے دیکھ لیتی۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ کیا کمرا مقفل تھا؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''بالکل۔'' ساواکی نے جواب دیا۔ ''کیونکہ......'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

سراغ رساں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ تم اور سیریل کلر ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے ہو؟''

''نہیں۔'' ساواکی نے جواب دیا۔ ''اریماسا بے قصور ہے۔ اس پر غلط الزام لگایا گیا ہے۔ اگر تم اخبارات پڑھتے ہوتو تمہیں معلوم ہونا چاہیے، سب سے پہلے تو کہ تمہیں یہاں......''

اس نے ایک بار پھر ریوتا کی طرف دیکھا۔ اس کا کیا مطلب تھا، وہ کیوں اسے مسلسل دیکھے جارہی تھی۔ جیسے وہ اسے سوموراکی موت کا ذمے دار سمجھ رہی ہو۔

سراغ رساں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال یہ شاید تمہارے علم میں ہو کہ اس ولا میں کمروں سے باہر آنا اور اندر جانا ممکن ہے۔ یہاں ہر کمرے کا دروازہ برابر والے کمرے میں کھلتا ہے۔ مثال کے طور پر تمہارے کمرے کا دروازہ نومی کے کمرے میں کھلتا ہے۔''

اس نے بغلی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک سادہ دروازہ تھا اور اس میں ڈورناب کے بالکل نیچے بولٹ لگا ہوا تھا جو دیکھنے میں بالکل نیا لگ رہا تھا۔

''ایسا ہی ایک بولٹ دروازے کے دوسری طرف بھی لگا ہوا ہے۔ اس لیے یہ دروازہ دونوں طرف سے مقفل ہوسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی ایک کمرے کا مکین دروازہ مقفل کردے تو اس سے آنا جانا ممکن نہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ گزشتہ شب یہ دروازہ مقفل تھا؟''

''بالکل۔'' میں نے دروازہ لاک کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ نومی نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔''

''کیا تم نے اس کی تصدیق کی تھی؟''

''نہیں، جب میں نے اپنا دروازہ بند کیا تو اسے چیک کرلیا تھا لیکن میں نہیں جانتی کہ نومی نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ میرے خیال میں یہ مناسب نہیں تھا کہ میں شور مچاتی اور اچانک دروازہ کھول دیتی اگر انہوں نے اسے مقفل نہ کیا ہوگا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' سراغ رساں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تو تم جنوب والے کمرے میں جانے کے قابل نہیں تھیں۔ ٹھیک ہے ریوتا، اب ہم چلتے ہیں۔''

ہال میں واپس آنے کے بعد وہ جنوب میں واقع کمرے میں گئے جس میں نومی، اس کی بیوی اور بیٹا اریماسا رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے کھلے دل کے ساتھ دونوں کا استقبال کیا لیکن نومی کی آنکھوں میں شک اور اس کی بیوی خوف زدہ نظر آئی۔

''ہاں، ہمارے اور ساواکی، کے کمرے کے درمیان دروازہ شروع سے ہی مقفل ہے اور ہم نے کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ بے شک وہاں یا ہال سے کوئی ہمارے کمرے میں نہیں آیا، اگر ایسا ہوتا تو ہمیں معلوم ہوجاتا۔'' نومی نے کہا۔

''ہاں، میرے شوہر نے بالکل ٹھیک کہا۔'' نومی کی بیوی اکو نے تائید کی۔ ''مسٹر سراغ رساں میں تمہیں بتارہی ہوں کہ یہ جرم کسی ایسے شخص نے کیا ہے جو ہمارے بیٹے کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ کیا یہ بلا جواز غصہ نہیں ہے۔ کیا انہی جذبات کے زیر اثر کسی شخص نے مسٹر سوموراکو قتل نہیں کیا؟''

''فی الحال ہم صرف قیاس آرائی ہی کرسکتے ہیں کیونکہ ابھی تک باہر کے کسی آدمی کا ولا میں داخل ہونے کا سراغ نہیں ملا۔'' سراغ رساں نے جواب دیا۔

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ان کی نظریں ریوتا پر جم گئیں۔

''کیا اس کا مطلب ہے......؟'' ریوتا مزید پریشان ہوگیا۔ ان کی شہادتوں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کی بنا پر اسے اس قتل میں ملوث کیا جائے۔ گوکہ وہ اس واقعے کی وجہ سے دہشت زدہ نظر آرہے تھے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کے خوف کا رخ اس کی جانب کیوں ہوگیا۔

تبھی ان کے بیٹے نومی اریمانے بلند آواز میں کہا۔ ''مسٹر ریوتا، کیا تم نے مسٹر سوموراکو قتل کیا ہے؟ کیا تم سے کسی نے کہا تھا؟''

ریوتا خاموش رہا۔ دونوں میاں بیوی فرش کی جانب

pklibrary.com

دیکھنے لگے اور سراغ رساں نے بناوٹی شکل بنالی۔ لڑکے نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کیونکہ جب ہم نے تمہیں دیکھا تو تم ایک خون آلود چاقو پکڑے ہوئے تھے یا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ کسی نے وہ چاقو تمہارے ہاتھ پر رکھ دیا؟''

''کیا تم سنجیدہ ہو؟ میں مسٹر سوموراکو کیوں قتل کرتا جبکہ میں اس سے کل ہی ملا تھا؟ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ تم نے کہا کہ میرے ہاتھ میں ایک چاقو تھا لیکن مجھے یہ یاد نہیں۔ جب میرے سر پر ضرب لگی تو قاتل نے وہ چاقو میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم لوگ اس جوکر کو تلاش کیوں نہیں کرتے؟ اس نے بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے آسانی سے ڈھونڈ لوگے۔''

نیتو میاریوتا شدت سے اپنے بے گناہ ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔ بالآخر وہ سمجھ گیا کہ دوسرے لوگ اسے اتنی عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شک اور خوف بھرا ہوا تھا۔ وہ اس غلط فہمی کو جلد از جلد دور کرنا چاہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اتنا کافی ہے۔'' سراغ رساں نے ریتا کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ ''تو تم یہ [illegible]

کررہے ہو کہ جوکر کا لباس پہنے ہوئے ایک شخص سوموراپر چاقو سے وار کرنے کے بعد اس کے کمرے سے باہر آیا اور تمہارے سر پر ضرب لگانے کے بعد کہیں غائب ہوگیا۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟''

''نہیں، وہ وہاں سے اسٹور روم میں گیا۔'' ریوتا نے اس کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ساوا کی، کے کمرے کے شمال میں تھا۔

سراغ رساں نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا پھر کیوں نہ ہم اس کمرے پر ایک نظر ڈال لیں۔''

وہ دونوں اسٹور روم کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کا دروازہ کچھ مختلف نہیں تھا لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ کافی پرانا لگا۔ شاید اسے دوسرے کمروں کی طرح زیادہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور اس کی مناسب دیکھ بھال بھی نہیں ہورہی تھی۔

''جب ہم یہاں پہنچے تو یہ دروازہ لاک نہیں تھا۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''عمارت کی انتظامیہ کے مطابق یہ دروازہ عام طور پر بند رہتا ہے۔ لہٰذا کسی نے اسے زبردستی [illegible] کوشش کی ہو۔ چاہے وہ جوکر ہو یا کوئی اور؟ [illegible]

pklibrary.com

قارئینِ بیرونِ ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ **بیرون ملک ڈاک خرچ** پر تقریباً 200 سے 250 **فیصد** اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کررہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کردی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

اس کمرے میں جاسکتا ہے لیکن......"

وہ کمرے میں داخل ہوئے جس میں ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی گوکہ اسے اسٹور روم کا نام دیا گیا تھا لیکن وہاں دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھوڑے سے فرنیچر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کھڑکی پر ایک پرانا پردہ پڑا ہوا تھا۔ سراغ رساں نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کھڑکی کو اندر سے چٹخنیاں لگا کر بند کیا گیا تھا جن میں سے کچھ پر مٹی لگی ہوئی ہے۔ تم اگر چاہو تو آگے بڑھ کر چیک کر سکتے ہو۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ کھڑکی کی چوکھٹ پر لگی مٹی کی تہ کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس راستے سے کوئی کمرے میں داخل ہوا اور نہ ہی باہر گیا۔ مجھے یقین نہیں کہ اس سے تمہارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں، بہر حال......"

اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ کھڑکی کے قریب گیا اور اچانک ہی پردہ ہٹا لیا۔ "ہمیں یہ ملا ہے۔"

پردے کے پیچھے ایک پرانی کرسی رکھی ہوئی تھی اور اس پر ایک جوکر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ریوتا چونک گیا۔ وہی بھڑکیلا لباس، عجیب و غریب پینٹ اور بھونڈا میک اپ۔ یہ ہوبہو وہی جوکر تھا جو اس نے کئی گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔ البتہ دونوں کی جسامت میں فرق تھا۔ رات اس نے جس جوکر کو دیکھا اس کا قد ایک انسان کے برابر تھا لیکن یہ جوکر بمشکل ایک فٹ لمبا تھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟

کیا وہ اس کمرے میں آیا اور اچانک ہی اس کی جسامت سکڑ گئی یا ممکن ہے کہ اس نے درحقیقت کوئی گڑیا دیکھی ہو اور کسی جادو کے ذریعے اس کی جسامت سکڑ گئی ہو۔ کیا یہ گڑیا کسی کو قتل کر سکتی ہے؟

بے شک یہ ناممکن تھا۔ بہر حال اپنے ہی دعوے کی تردید کرنا ایک احمقانہ بات لگ رہی تھی کہ ایک جوکر دیواروں سے گزر کر لوگوں کو قتل کرنے چلا آیا۔ اسے اپنی یادداشت پر شبہ ہونے لگا۔

بہت سے لوگوں کی یہی رائے تھی کہ ریوتا نے جس جوکر کو دیکھنے کا دعویٰ کیا وہ حقیقی نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ریوتا نے کبھی جوکر نما گڑیا دیکھی ہوگی جو رات کو غنودگی کے عالم میں اسے دوبارہ نظر آگئی جو محض نظر کا دھوکا تھا۔

لیکن اس سے کیس کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ پولیس اتنی احمق نہیں تھی کہ وہ ایک لڑکے کو موردِ الزام ٹھہرائے جس کے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا۔ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ قتل کا محرک تھا۔ ایک کالج کا طالب علم کسی وکیل کو کیوں قتل کرنا چاہے گا۔ اگر اس نے جوکر کا روپ اختیار کیا تب بھی یہ وضاحت کرنا مشکل ہے کہ اسے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

سب سے پہلی بات یہ کہ قتل کا محرک کیا تھا؟ یہ سچ ہے کہ سومورا جیسے زیرک اور کامیاب وکیل کے کئی دشمن بھی ہوں گے لیکن اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو قاتل ولا میں کیسے داخل ہوا، اس کی دخل اندازی کا سراغ نہیں ملا۔ بیرونی دروازہ اندر کی جانب سے مقفل تھا اور اس کی چابی سومورا کے کمرے سے ملی۔ ایک اضافی چابی انتظامیہ کے دفتر میں ہوتی ہے لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا کہ اسے استعمال کیا گیا ہو۔

ایک ممکنہ محرک اس مظلوم سے تعلق ہو سکتا ہے جو مبینہ طور پر نومی کے کسی جرم کا نشانہ بنا یا کوئی ایسا آدمی جس کی خدمات مذکورہ متاثرہ شخص نے وکیل کو قتل کرنے کے لیے حاصل کی ہوں۔ بہر حال ایسا کوئی تعلق دریافت نہیں ہوا۔

جہاں تک نومی اور اس کی بیوی کا تعلق ہے تو وہ وکیل کے شکر گزار تھے کہ اس کی کوششوں سے ان کے بیٹے کو رہائی نصیب ہوئی۔ اس سے قطع نظر کہ اس نے وہ جرائم کیے یا نہیں جن کا اس پر الزام عائد کیا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے پاس وکیل سے نفرت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ایسی صورت میں ساوا کی اور وہی باقی رہ جاتی تھی جس پر شک کیا جائے۔

سومورا، اور ساوا کی، کو نومی کے کیس کے حوالے سے کئی بار ساتھ کام کرنے کا موقع ملا لہٰذا اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی کہ ان دونوں کے درمیان کسی رومانی تعلق کا شبہ کیا جائے۔ ساوا کی، سنگل جبکہ سومورا، شادی شدہ تھا۔ ایسی صورت میں اس کی بیوی اس تعلق کو کیسے برداشت کرتی، اس طرح یہ ایک مثلث بن گئی جس کی ایک فریق ساوا کی بھی تھی۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سومورا کی بیوی کا اس معاملے سے کوئی تعلق تھا کیونکہ حملہ آور کے عمارت میں داخل ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

جوکر نے سومورا پر سوتے میں چاقو سے وار کیا، اگر اسے حقیقت مان لیا جائے تو پھر وہ خود کہاں گیا۔ ریوتا کے بیان کے مطابق وہ اسٹور روم میں غائب ہونے سے پہلے ہال میں آیا اور ساوا کی، کے کمرے میں داخل ہو گیا جبکہ اس عورت نے دعویٰ کیا کہ اس رات اس کے کمرے میں ایسی کوئی مخلوق نہیں آئی۔

اس کا مطلب ہے کہ جوکر پُراسرار انداز میں دروازے سے نکل گیا اور اگر یہ ممکن نہیں تو کیا کوئی ایسا طریقہ تھا کہ وہ اس کمرے سے گزرے بغیر دروازے سے

pklibrary.com

نکل جاتا۔ یہ اس سے بھی زیادہ ناممکن تھا۔

اس مرحلے پر ایک امکان یہ نظر آتا ہے کہ جوکر اور ساوا کی کے درمیان کسی قسم کا تعاون ہو۔ ایسی صورت میں وہ جوکر کو اپنے کمرے میں داخل ہونے دیتی اور اس کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا جاتا۔ ایک منٹ، کیا ساوا کی خود جوکر نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

اس نظریے کے مطابق ساوا کی شاید اپنے کمرے کی کھڑکی کے ذریعے ولا سے باہر گئی اور چپکے چپکے سوموراکے کمرے میں چلی گئی، اگر ایسا ہے تو سومورا نے اپنے کمرے میں خوش دلی سے جوکر یا ساوا کی کا استقبال کیا ہوگا۔ یہ تھیوری قرین قیاس لگتی ہے۔

تاہم اگر یہ سچ ہے تب بھی اس سے بعد میں پیش آنے والے واقعات کی وضاحت نہیں ہوتی، اگر جوکر یا ساوا کی اپنے کمرے میں واپس آئی تو وہ کس طرح ریوتا کے عقب میں آکر اس کے سر پر ضرب لگانے کے قابل ہوئی۔ ایسا کرنے کے لیے اسے اپنے کمرے سے نومی کے کمرے اور پھر واپس ہال میں آنا پڑتا لیکن نومی اور اس کی بیوی کے بیان سے امکان کی نفی ہوتی ہے۔ کیا وہ اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر جا کر واپس عقبی دروازے سے ہال میں واپس آسکتی تھی؟ یہ امکان زیادہ قرین قیاس لگتا ہے۔

مزید براں اس جوکر پر کیا گزری جو اسٹور روم میں چلا گیا تھا؟ کیا وہ کوئی نشان چھوڑے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ کھڑکی کی چٹخنیاں بند تھیں اور ان پر گرد جمی ہوئی تھی؟ اتنے کم وقت میں اس نے کس طرح ثبوت ضائع کیے ہوں گے؟

یہ کیس پیچیدہ ہوتا جارہا تھا اور اس نے ایک سنگین مذاق کی شکل اختیار کرلی تھی۔ یہ کہانی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور شہر کے کنارے اس پرانی عمارت میں بھی پہنچ گئی جس میں موری کا دفتر تھا۔ اس کے لیے یہ ایک دلچسپ کیس تھا۔

☆☆☆

''میں سمجھ گیا......'' موری نے ولا میں داخل ہوتے ہوئے کہا جہاں اس وقت پُراسرار خاموشی تھی۔ وہ عمارت کے جنوب سے داخل ہوا اور داخلی دروازے سے گزر کر ہال میں آگیا۔ اس نے رہائشی کمروں پر ایک نظر ڈالی اور ہال کے آخر میں واقع اسٹور روم تک آیا اور پھر واپس آکر دیوار پر لگے ہوئے فلور پلان کو دیکھا۔ اس کا بغور معائنہ کرنے کے بعد وہ مڑا۔

''تو یہ ہے وہ نقشہ جو تم دیکھ رہے تھے؟'' اس نے ریوتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' ریوتا نے جواب دیا جو کافی کمزور لگ رہا تھا حالانکہ اس واقعے کو ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔

''میں سمجھ گیا۔'' موری نے کہا۔

''تو تم نے دیکھا مسٹر موری۔ اس احمق نے میرے سر پر ضرب لگائی اور میرے ہاتھ پر چاقو رکھ دیا۔ میں نہیں جانتا کہ مزید کیا ہونے والا ہے۔''

''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔'' موری نے کہا۔ ریوتا یہ چند الفاظ سن کر قدرے پُرسکون ہوگیا۔

''تو تم اس رات ہال کے وسط میں اس جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ جوکر اس کمرے سے نکلا اور سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔ تم اس دروازے تک گئے اور وہ اچانک ہی آہستہ سے تمہارے پیچھے آگیا۔ وقت اور جگہ کا اندازہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوکر اس طرف والے کمرے سے باہر آیا۔ میں سمجھ گیا۔''

وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے تمام کمروں کو بغور دیکھا اور ان کے تالے چیک کیے اور پھر دوبارہ نقشے کو دیکھنے لگا۔

''ریوتا، تم مسلسل اسی نقشے کو دیکھتے رہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

وہ نقشے کی طرف واپس آیا اور اس نے وہی سوال دہرایا جو وہ پہلے بھی پوچھ چکا تھا۔ ''ہاں۔'' ریوتا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ وہ حیران تھا کہ موری ایک ہی سوال بار بار کیوں پوچھ رہا ہے۔

''واقعی۔'' موری نے دوبارہ کہا پھر اس نے دونوں ہاتھ نقشے پر رکھے اور اسے دیوار سے اتار لیا۔

''ڈپارٹمنٹل اسٹور، سپر مارکیٹ اور میوزیم وغیرہ میں گاہکوں کی رہنمائی کے لیے ایسے نقشے لگائے جاتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر وہ اپنی مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکیں۔ اس لیے اگر نقشہ حقیقت سے مختلف ہو تو وہ پریشان ہوجاتے ہیں۔''

''بالکل صحیح۔'' ریوتا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس نقشے میں کوئی غلطی ہے؟''

''ہاں یہی بات ہے۔'' موری نے سرد مہری سے جواب دیا۔

ریوتا اچانک ہی بھڑک اٹھا۔ ''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں نے اس رات جو نقشہ دیکھا وہ بلاشبہ یہی تھا اور اس

کے بعد سے اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ یہاں تک اگر اس میں تبدیلی کی گئی تب بھی یہ مجھے یاد ہے۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا۔'' موری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے جو نقشہ دیکھا وہ یہی تھا جس میں دکھایا گیا ہے کہ کمروں کی ترتیب کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ درست نہیں ہے۔''

''کیسے...... اس کا کیا مطلب ہے؟'' ریوتا نے اپنی سانس روک لی۔

موری نے پُرسکون انداز میں اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں نے ڈپارٹمنٹل اسٹور کی مثال دی تھی۔ بے شک ان نقشوں کو درست ہونا چاہیے لیکن اس کے علاوہ دو شرائط اور بھی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس میں کوئی ایسا نشان ہو جو دیکھنے والے کو اس کی سمت بتائے۔ دوسرے لفظوں میں 'تم یہاں ہو' کا نشان جبکہ اس نقشے میں صرف ایک سیاہ نقطہ دیا گیا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کے ذریعے دیکھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ اس کا رخ کس جانب ہے۔''

''لہٰذا جب وہ دیوار تبدیل ہو گئی جس پر نقشہ لگایا جاتا ہے تو 'تم یہاں ہو' کے نشان اور خود نقشے کی پوزیشن بھی تبدیل ہو گئی۔ مثال کے طور پر اگر تم نقشے کو ہال کی شمال [illegible] دیوار سے [illegible] جنوب مغربی دیوار پر لگا دو [illegible] دروازے کے بائیں جانب [illegible] کمرے کے قریب [illegible] نقشے کو [illegible] ایک سو اسی زاویے پر گھماتا ہوگا۔''

''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

''ایسی صورت میں نقشے کی نئی پوزیشن کے مطابق اس کا فرنٹ شمال کے بجائے جنوب بن جائے گا اور اسی لحاظ سے کمروں کی پوزیشن بھی مختلف ہو جائے گی۔''

''تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ......''

''ہاں جب تم رات تین بجے کے بعد ڈیوٹی دے رہے تھے تو تم نے اپنی کرسی کا رخ تبدیل کر لیا اور اس طرح تمہاری سمت شمال کے بجائے جنوب کی طرف ہو گئی۔ تمہیں اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ غنودگی کی وجہ سے تمہاری آنکھیں پوری طرح نہیں کھل رہی تھیں جس کی وجہ سے تمہیں نقشے پر بنا ہوا تیر صاف نظر نہیں آیا۔''

''اس لیے تم اپنے سامنے بائیں جانب جو کمرا دیکھ رہے تھے وہ سومورا کا نہیں بلکہ اس کے سامنے والا تھا۔ تم نے دراصل یہ دیکھا کہ جوکر، نومی کے کمرے سے نکل کر ہال کے دوسری طرف خالی کمرے میں گیا پھر وہاں سے بغلی دروازے کے ذریعے سومورا کے کمرے میں داخل ہوا اور

اس پر چاقو سے وار کیے۔ جب تم نے پہلے جوکر کو دیکھا اس وقت تک جرم سرزد نہیں ہوا تھا اور چاقو پر خون نہیں بلکہ رنگ تھا جسے سومورا کو ہلاک کرنے سے پہلے صاف کر دیا گیا۔ وکیل کو قتل کرنے کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر آیا اور آہستہ سے چلتے ہوئے تمہارے پیچھے آ کر سر پر ضرب لگائی اور پھر خالی کمرے میں چلا گیا جسے تم اسٹور روم سمجھ رہے تھے جبکہ تمہاری بے ہوشی کے دوران اس نے اصل اسٹور روم میں گڑیا رکھ دی اور نقشے کو دوبارہ شمال مشرقی دیوار پر لگا دیا۔''

''واؤ......'' ریوتا نے بے ساختہ کہا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''تم نے جو کچھ کہا وہ سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کہانی میں ایک جھول ہے اگر میرا رخ شمال کے بجائے جنوب کی طرف تھا اور میں نے غلطی سے مشرق کو مغرب سمجھ لیا پھر بھی جوکر کو نقشہ پلٹنے کا وقت کب ملا؟ کیا اس نے میرے اونگھنے کا انتظار کیا؟ یا وہ سامنے والے دروازے کے بجائے عقبی دروازے سے داخل ہوا تاکہ میں اس پر توجہ نہ دے سکوں؟ بہرحال یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے اور کوئی ایسا کیوں کرے گا؟''

موری نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''تم پر تین بجے [illegible] اور [illegible] جا کر توجہ کو ایک [illegible]''

[illegible]

موری دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس نے کی ہول کے ذریعے بے ہوشی کی دوا اندر داخل کی اور تمہیں وقتی طور پر نیند آ گئی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اری ماسا؟''

اس غیر متوقع نام کی گونج پورے ہال میں گونج گئی۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس میں سے ایک دبلا پتلا لڑکا برآمد ہوا۔

''تو تم یہاں تھے نومی بیٹا، اس رات کی طرح جب تم نے بچوں کی طرح چھپن چھپائی کھیلا اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے رہے؟'' موری نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

لڑکا کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر اب بھی نارمل تاثرات تھے۔ موری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''نومی تم نے مسٹر سومورا کو قتل کیا کیونکہ شاید تم یہ برداشت نہ کر سکے کہ تمہیں سومورا، اور دوسرے لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں بے گناہ سمجھا جائے۔ تم نے سیریل کلر کے طور پر جو جرائم کیے ان میں اپنی روح ڈال دی تھی لیکن سومورا اور اس کے ساتھی یہی سمجھتے رہے کہ تم پر غلط الزام لگایا گیا ہے جس سے

تمہارے والدین اور دیگر متعلقین کو سکون ملا۔''

''جہاں تک متاثرہ لوگوں کے دکھ کا تعلق ہے تو بدقسمتی سے تمہارے وکیلوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ اس کے برعکس سومورا اور ساوا کی یہ سمجھتے رہے کہ اگر انہوں نے متاثرین کی آوازوں کو آگے بڑھایا تو یہ کسی نہ کسی انداز میں مثالی معاشرے کی راہ میں رکاوٹ بنیں گی۔ لہٰذا انہوں نے ان آوازوں کو مکمل طور پر نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے تمہارے جرائم کو منانے کی کوشش کی جو تم نے دل اور روح کی گہرائی سے کیے تھے اور اسے تم نے اپنی بےعزتی سمجھا جس سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی۔''

''میں حیران ہوں۔'' لڑکے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے باوجود کہ میں نے انہیں بہت کہا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ تم بےقصور ہو۔ تم پر غلط الزام لگایا گیا ہے لہٰذا مجھے انتقام لینا پڑا۔''

''کیا تم ساوا کی کے ساتھ بھی یہی کرنا چاہتے تھے؟''

''میں اس قتل کا الزام اس پر ڈالنا چاہ رہا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔''

''جوکر کے لباس کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''میں نے اپنی ماں سے اس کے لیے کہا تھا۔ دراصل میں اس ولا میں پہلے بھی رہ چکا ہوں اور وہ گڑیا مجھے یاد تھی۔ ہمارے گھر میں اس کی ایک تصویر بھی ہے۔ جب میں نے اپنی ماں سے اس لباس کی فرمائش کی تو اس نے ہوبہو اس تصویر کے مطابق بنا دیا۔ تاہم وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اسے کس مقصد کے لیے استعمال کروں گا۔''

لڑکے نے فاتحانہ انداز میں اپنی بات ختم کی اور داخلی دروازے کی طرف جانے لگا پھر وہ مڑا۔ ''کیا ہوا؟ کیا تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن نہیں جاؤ گے؟ جلدی کرو، تم مجھے اپنی تحویل میں لے لو۔ ورنہ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد میرا اگلا قدم کیا ہوگا؟''

پولیس اسٹیشن کے قریب پہنچ کر نومی اری ماسا نے کہا۔ ''تم بھی تو وکیل ہو، اس بار تم میرا کیس کیوں نہیں لڑتے؟ مجھے یقین ہے کہ اس سے تمہیں بہت شہرت ملے گی؟''

''یہ میرے لیے ایک اعزاز ہوگا۔'' موری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بہرحال میرا جواب نفی میں ہے۔''

☆☆☆

میں اپنے دوست کی زبانی یہ کہانی سُن کر حیران رہ گیا۔ میں اس سے پوچھنے والا تھا کہ اس کے بعد لڑکے کے ساتھ کیا ہوا لیکن خاموش رہا کیونکہ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس بارے میں مزید بات کرنا نہیں چاہتا۔

''یقیناً ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن......'' میں نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اچانک ہی ایک سوال میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ میں نے تفتیش کی کاپی اٹھائی اور کہا۔ ''تمہاری کہانی کے مطابق جب ریوتا اونگھ رہا تھا تو نومی اری ماسا، سومورا کے سامنے والے کمرے سے باہر آیا جو اس کے والدین کا کمرا تھا۔ اس کا مطلب کہ وہ بھی اس سے باخبر تھے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔''

''یعنی وہ بھی اس کے شریک تھے یا کم از کم اس کے جرم میں ساتھ دے رہے تھے گو کہ یہ ممکن نہیں ہے کیا؟''

''لیکن ایسا ہی ہے۔'' موری نے کہا۔ ''اس کے والدین نے یہی ظاہر کیا کہ انہیں جرم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جبکہ وہ مبہم طور پر جانتے تھے کہ ان کا بیٹا کیا کرنے والا ہے۔''

''ایک منٹ رکو...... پھر تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کے گزشتہ جرائم سے بھی باخبر تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے سومورا، اور ساوا کی سے کہا کہ وہ ان کی مدد کریں جبکہ ساتھ ساتھ وہ انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بھی بنا رہے تھے۔''

''انہیں پورا یقین تھا کہ اگر وہ ان سے مدد مانگیں تو ان کا بیٹا بری ہو جائے گا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ نومی نے کوئی جرم نہیں کیا۔''

''بالکل نہیں......''

میرا دوست بولتا رہا۔ ''ممکن ہے کہ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو لیکن نومی اری ماسا نے ریوتا کے ہاتھ پر خون آلود چاقو نہیں رکھا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اسے ساوا کی کے ہاتھ پر رکھے تاکہ اس پر قتل کا الزام آ جائے۔ اس طرح وہ ساوا کی سے بھی بدلہ لینا چاہ رہا تھا لیکن اس کے والدین نے وہ چاقو ریوتا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ چاہتے تھے سومورا کے قتل کا الزام ان کے بیٹے کے بجائے کسی ایسے شخص پر آئے جس سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔''

میں یہ کہانی سُن کر حیران رہ گیا۔ میری نظر میں نومی اری ماسا ایک عجیب و غریب کردار تھا جس نے احسان فراموشی کی انتہا کر دی۔ جن لوگوں نے اس کی مدد کی اس نے انہی سے بدلہ لیا۔ اس نے اسے اپنی توہین سمجھا کیونکہ وہ سیریل کلر کے طور پر اپنی پہچان بنانا چاہ رہا تھا۔

❖❖❖

ریت اناگیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو اناگیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو ادھر ادھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کرسکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہورہے تھے۔

pklibrary.com

قسط 10:

"ساوری یہ کیا کر رہی ہو؟" مجھ سے پہلے ہی بختاور چیخ اٹھا۔ ساوری نے بختاور کے چیخنے کی پروا نہیں کی بلکہ بڑے ہی سرد لہجے میں کہا۔

"اسے تم نہیں مار سکتے، اسے میں ماروں گی، یہ میری ماں کی قاتل ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھو اس ڈائن سے..... میری ماں کو اس نے سسکا سسکا کر مارا تھا۔ میری ماں کا قصور صرف اتنا تھا، اس نے انجانے میں میرن شاہ کو بتا دیا تھا کہ یہ کس یار کے ساتھ رات گزار کر آئی ہے۔" اس نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ میں نے پہلی بار ساوری کو وحشت ناک انداز میں دیکھا تھا۔ تبھی میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم نے کبھی کوئی قتل کیا ہے؟"

"نہیں، لیکن آج کروں گی۔" اس نے ہذیانی انداز میں کہا اور پستول میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"نہ ساوری نہ..... مجھے مت مار..... مجھے جانے دے۔" پیروزاں اپنے سامنے کھڑی موت دیکھ کر لرزنے لگی تھی۔ تبھی ساوری نفرت سے بولی۔

"ایسا ہی میری ماں نے کہا تھا، یاد ہے نا تجھے؟"

"رُک جا ساوری....." اچانک بختاور نے کہا۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"اسے بستی والوں کے سامنے لے جا کر مارنا چاہیے، پتا تو چلے کہ یہ ڈائن مرگئی ہے۔ یہاں ویرانے میں مار دینے کا فائدہ؟" بختاور نے نفرت سے کہا۔ میں جانتا تھا اس کے اندر انتقام کی آگ کس قدر بھڑک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، جیسے تم چاہو۔" میں نے ایک دم سے کہا تو ساوری نے آگے بڑھ کر اسے چوٹی سے پکڑ لیا۔ پیروزاں کی آنکھوں میں حیرت زدہ وحشت تھی۔

"ابھی رحماں کو تو نے مارا ہے نا، چل رحماں، مار اسے۔" ساوری نے ہذیانی انداز میں کہا تو رحماں مائی نے نفرت سے کہا۔

"میرے ہاتھ گندے ہو جائیں گے۔"

"چل بختاور اب دیر نہ کر۔" شعیب نے کہا تو میں بڑھا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ ساوری نے پیروزاں کو چوٹی سے پکڑا ہوا تھا، وہ اسے اسی طرح گاڑی تک لے آئی۔ ہمارے بیٹھتے ہی بختاور نے گاڑی بڑھا دی۔

ہم بستی چراغ شاہ پہنچے تو ڈیرے کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ ساوری گاڑی سے اتری پھر اس نے رحماں مائی کو اتارا جو رو رہی تھی۔ ہر کوئی حیرت سے ساوری کو دیکھ رہا تھا۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ جسے پیروزاں نے اغوا کر لیا ہو، وہ بچ کیسے گئی۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا، اب بستی کے لوگوں کو یہ احساس ہو گیا کہ میں ساوری کو کتنا چاہتا ہوں۔ پیروزاں جیسی دشمن کو چھوڑ کر میں نے ساوری کو بچا لیا تھا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں گاڑی سے اُتر کر چند قدم بڑھا تو سانول نے ساوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں علی زین..... ہم پیروزاں کو پھر دیکھ لیں گے۔ ساوری بچ گئی، یہی بڑی بات ہے۔"

"نہیں سانول، تم غلط سمجھے ہو، ہم پیروزاں کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔"

سانول نے حیرت سے گاڑی کی طرف دیکھا، بختاور گاڑی سے اُتر چکا تھا۔ اس نے پیروزاں کا ہاتھ پکڑا اور نیچے اتار لیا۔ سب بستی والے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پیروزاں اسی ڈیرے میں ایک مجرم کی طرح کھڑی تھی جہاں وہ کبھی حکم دیا کرتی تھی، اس نے کئی قتل کیے تھے، جہاں اس کی حکومت چلتی تھی اور وہ راج کرتی تھی۔

پھر جیسے سب پر سکوت طاری ہو گیا۔ ساوری نے پستول سیدھا کیا اور غضب ناک انداز میں بولی۔

"یہی جگہ ہے نا پیروزاں، جہاں تو نے میری ماں کو مارا تھا؟"

پیروزاں کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ وہ موت کو دیکھ کر ساکت ہو چکی تھی۔ ساوری نے سامنے کھڑی پیروزاں پر کئی فائر کر دیے۔ فائر کی آواز میں کئی حیرت زدہ آوازیں ابھری تھیں۔ وہ چیخ کر نیچے گری اور تڑپتی رہی۔ میں نے چند لمحے اسے دیکھا تو..... یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے جلنے والے شعلے مدھم پڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پیروزاں کی روح اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے اس کا؟" بختاور نے..... بازو سے پکڑ کر پوچھا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور دھیمے سے کہا۔

"جو تیرا دل چاہے کر۔"

"اب یہ مرگئی ہے، اب دشمنی ختم، اس کا کفن دفن کر دو۔" ایک بزرگ شخص نے مشورہ دیا تو بختاور نے تیزی سے کہا۔

"چل بابا تو ہی کر دے۔"

ساوری اب تک ساکت کھڑی زمین پر بے حس و حرکت پڑی پیروزاں کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا، رحماں مائی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔

روہی پر رات اُتر آئی تھی۔ رحماں مائی نے آتے ہی گھر سنبھال لیا تھا۔ ساوری نے اس کے ساتھ مل کر سب کو کھانا کھلایا، ساتول کے ذریعے سب کو دودھ پہنچایا۔ رہائشی حصے میں یہی دو عورتیں تھیں۔ رحماں مائی سب کچھ سمیٹ کر چارپائی پر جا کر لیٹ چکی تھی۔ میں رہائشی حصے میں تھا۔ ساوری میرے پاس آکر سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تبھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بستی سے کسی کو بلوا لیتیں جو یہاں تمہارے ساتھ رہتیں۔''

''مجھے کون سا ڈر لگ رہا ہے، تم سب تو ہو یہاں۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا تو میں دھیمے سے بولا۔

''میں ڈیرے پر جا رہا ہوں، وہیں پر سب ہیں اور......''

''نہیں تم نہیں رہو گے...... مجھے تم سے بات [illegible] ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''کیسی بات؟ خیریت تو ہے۔'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ رحماں مائی، اب اس دنیا میں اکیلی ہے۔ کوئی نہیں ہے اس کا۔ اب ہم ہی سب کچھ ہیں اس کے لیے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ایسا کیا ہو گیا جو تم یوں کہہ رہی ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں اس کی شادی کر دوں، اپنے گھر بار کی ہو جائے۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا، پھر سکون سے بولا۔

''ٹھیک ہے کر دو، اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے، کوئی لڑکا ہے تمہاری نگاہ میں؟''

''ساتول ہے نا، اس کا بھی کوئی نہیں۔ سارا مال ڈنگر انہیں دے دیں گے، ہمیں کیا کرنا۔'' اس نے پورا پلان ہی میرے سامنے رکھ دیا۔

''ساتول مان جائے گا، اس کی بھی مرضی جاننا......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''اسی لیے تو میں نے تم سے کہا ہے۔ اس سے بات کرو، اسے مناؤ۔ کل ہی ان کی شادی کر دیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، کل بات کروں گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا پھر ایک دم میرے ذہن میں سوچ لہرائی، میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''رحماں اور ساتول کی شادی کی بڑی فکر ہے، اپنے بارے میں کیا خیال ہے، کب کرو گی شادی؟''

''جب مجھے کوئی محبت کرنے والا ملا تا تب کر لوں گی۔'' اس نے نخرے سے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھا میں تم سے محبت ہی نہیں کرتا؟ میری محبت کا تمہیں احساس ہی نہیں ہے، میں تو بچپن سے......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تنک کر بولی۔

''اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی نا تو اپنے بارے میں مجھے ضرور بتاتے، کئی بار میں نے تم سے پوچھا، مگر آج تک تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''کیا کرو گی میرے بارے میں جان کر...... بس جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں، تمہیں تھوڑا بہت تو پتا چل ہی گیا ہے لاہور سے۔'' میں نے جواب کی تفصیلات سے بچنے کے لیے کہا۔

''نہیں علی زین ایسے نہیں...... تمھے لاہور سے [illegible] بچپن کا پتا ہے، وہ ایک بات ہے [illegible] مجھے [illegible] اپنے بارے میں نہیں بتاتے [illegible] مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔ جس طرح عقیدت محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی، اس طرح بھروسے بنا محبت نہیں ہو سکتی۔'' اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے اکتائے لہجے میں کہا۔

''یہ تم کیسی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو؟''

''یہی تو باتیں ہیں کرنے والی، تم جس دن آئے تھے نا میں نے اسی دن تمہیں پہچان لیا تھا۔ کیونکہ بچپن سے لے کر اس دن تک، تم مجھے ایک دن بھی نہیں بھولے ہو۔ میں نے اسی امید پر وقت بتا دیا کہ ایک دن تم آؤ گے۔ تم آ گئے، میری محبت جیت گئی علی زین مگر تم...... تم نے خود کو چھپا کر رکھا۔ میں اور بابا اکثر یہی بات کرتے تھے۔ میرا یہی سوال ہوتا کہ تم خود کو کیوں چھپا رہے ہو، بابا یہی کہتا کوئی راز ہو گا، تم خاموش رہو، انجان بنی رہو۔ میں انجان بنی رہی۔ اُس دن تو حد ہو گئی جب تم نے مجھ سے تھپڑ کھایا تھا۔ میں چاہتی تھی تم مجھ پر کھل جاؤ، میں تمہیں بہت سے راز بتا دیتی۔ مگر تم......'' وہ کہتے ہوئے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

''ساوری، میں کوئی انوکھا شخص نہیں ہوں، ایک عام

سا انسان ہوں، میری قسمت اچھی تھی جو میں آج زندہ ہوں، پتا نہیں کس لیے زندہ ہوں، ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں تھا اور آج بھی میرے دامن میں کچھ نہیں ہے سوائے بچپن کی چند یادوں کے جو میرا سرمایہ ہیں۔ تم میری محبت ہو ساوری۔'' میں نے کہا تو میرا لہجہ جذبات سے بھیگ گیا....

وہ اٹھی اور میری چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میری محبت کوئی عام لڑکیوں جیسی نہیں ہے، جس کا انجام صرف شادی ہوتا ہے۔ میں خون دینے والی لڑکی ہوں، جب چاہو، جہاں چاہو، مجھے قربان کر سکتے ہو۔ ہاں مجھے یہ یقین ہو کہ میں تم پر قربان ہوئی ہوں، اگر تم کچھ نہ بتانا چاہو تو مجھے کوئی شکوہ نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے گیسو میرے سینے پر پھیل چکے تھے۔ میں کچھ دیر یونہی اسے محسوس کرتا رہا، پھر پُرسکون لہجے میں بولا۔

''اچھا پھر سنو...... میں بتاتا ہوں۔''

میں نے کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

وہ رات میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ ایک طرف میری بہن اور دوسری جانب میری ماں کی لاش پڑی تھی.... میرا گھر جل رہا تھا، جس کے شعلوں کی بلندی دیکھتے ہوئے میری گردن پیچھے لگ گئی تھی۔ میرا باپ چیخ چیخ کر مجھے کہہ رہا تھا کہ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ میرے باپ کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جب اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ، چلے جاؤ، تو پھر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں بستی چراغ شاہ سے نکلا اور بھاگتا چلا گیا۔ میرے گھر والوں کی چیخیں، میرے باپ کا دہشت بھرا لہجہ، میرا جلتے ہوئے گھر کی سرسراہٹ میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ مجھے نہ سمت کا اندازہ تھا اور نہ ہی مجھے کسی منزل کا پتا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے ریت تھی اور میں اندھیرے میں بھاگتا چلا جارہا تھا۔ پتا نہیں کتنا بھاگا ہوں گا۔ یہاں تک کہ میں دربار کے پاس جا پہنچا، میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ میری سانس پھول چکی تھی اور میں چکرا رہا تھا۔ میں دربار کی سیڑھیاں تو چڑھ گیا لیکن صحن کے پاس ہی گر گیا۔ میں ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا، شاید میرے چوٹ لگی تھی یا میں چکرا کر گرا تھا، مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔

میری آنکھ کھلی یا جب مجھے ہوش آیا تو مجھ پر ایک

بزرگ شخص جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیالہ تھا جس سے اس نے میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ میں اٹھ بیٹھا تو اس نے پیالہ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں پانی پی گیا۔

''اور پانی پینا ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔ وہ قریب پڑے گھڑے سے پانی لے آیا تو میں وہ پیالہ بھی پی گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے سب کچھ سچ بتا دیا۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر مجھے ایک کوٹھری میں سو جانے کے لیے کہا۔ میں صحن سے اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں جا کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ رات کا واقعہ مجھے یاد آیا تو میری بھوک مٹ گئی۔ میرا دل چاہا کہ میں ابھی واپس جا کر اپنے باپ کی خیر خیریت دریافت کروں۔ میں اٹھا اور کوٹھری سے باہر آگیا۔ باہر وہی بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں واپس کوٹھری میں آبیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں کھانا تھا۔ میرے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کھالو، میں پانی دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر کوٹھری میں پڑی صراحی سے پیالے میں پانی بھر کر میرے قریب رکھ دیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ میں کھا چکا تو وہ بولا۔ ''بیٹا، اب تمہاری بستی میں تمہارے لیے کچھ نہیں رہا، مجھے سب پتا چل گیا ہے، انہوں نے تمہارے باپ کو بھی مار دیا ہے۔ تم جاؤ گے وہاں تو تمہیں بھی مار دیں گے۔''

ایک دم سے میرے اندر دھواں بھر گیا۔ میں اس دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار ہو گیا تھا۔ دشمنوں نے میرے سب خون کے رشتے مار دیے تھے۔

''میں اب کہاں جاؤں گا؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تم ابھی یہیں رہو، میں کرتا ہوں تمہارے لیے کچھ۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور میں پھر وہیں پڑی خس کی بنی ہوئی چٹائی پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر گزری ہو گی، وہ بزرگ ایک شخص کے ساتھ آیا، اس نے مجھے دربار کے پچھواڑے ایک گھر میں بھیج دیا۔ وہ ایسے ہی اجڑا اجڑا سا تھا، وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ وہاں میں شام تک رہا۔ شام کے وقت اس بزرگ کے ساتھ صاف ستھرے کپڑے پہنے ایک شخص آیا، اس نے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ میں

بہاول پور پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں سیٹلائٹ ٹاؤن پوری طرح آباد ہو چکا تھا۔ وہیں ایک بڑا سا گھر تھا۔ اس گھر کا مالک ایک بیوروکریٹ تھا۔ اس کے دو ہی بچے تھے گڈو اور بیتا۔ مجھے ان کے کاموں پر مامور کر دیا گیا۔ میں وہاں رہنے لگا۔

وہاں میرا کام یہی تھا کہ میں صبح سویرے اٹھتا، بچوں کو تیاری میں مدد دیتا، انہیں ناشتا کرواتا، پھر جب وہ اسکول چلے جاتے تو ان کے کمرے صاف کرتا، ان کے اسکول سے آنے پر، ان کے جو کام ہوتے' وہ کرتا رہتا۔ رات گئے سو جاتا، بس یہی زندگی تھی۔ ہاں ایک خواہش جاگ اٹھی تھی کہ جیسے یہ بچے پڑھتے ہیں، میں بھی پڑھوں، میں بھی اسکول جاؤں۔

اس گھر کے سامنے ایک ویسا ہی بڑا سا گھر تھا۔ اس میں ایک بوڑھی خاتون اپنی بہو کے ساتھ رہتی تھی۔ میں اکثر اس کے بھی کام کر دیا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا رینجر میں آفیسر تھا۔ ایک بار جب وہ آیا تو اس نے میرے بارے میں پوچھا، میرے متعلق جاننے کے بعد اس نے بیوروکریٹ کو کہا کہ مجھے بھی اسکول بھیجا جائے۔ کم از کم ایک ملازم کی تنخواہ جو آپ نہیں دے رہے، اس میں اسے پڑھا ہی دیں۔ بیوروکریٹ نے اس بات پر ناک بھوں تو بہت چڑھائی لیکن اس آفیسر کی بات مان گیا۔ یوں مجھے ایک سرکاری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں ماحول ہی نیا تھا۔ میں نے دل لگا کر پڑھا۔ کچھ عرصے بعد بیوروکریٹ کا لاہور شہر میں تبادلہ ہو گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ وہیں چلا گیا۔

جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، میرے ساتھ دو سوچیں بھی پروان چڑھتی گئیں۔ ایک تو یہ کہ آخر میرے والدین کا کیا قصور تھا جو دشمنوں نے بے دردی سے انہیں مار دیا۔ وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ میں اتنا طاقتور ہو جاؤں کہ میں اپنے والدین کا بدلہ لے سکوں۔ ہر آنے والا دن میری ان سوچوں کو مضبوط کرتا تھا۔

گڈو کو ہاکی کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ میدان میں جاتا تو مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جاتا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہاکی کھیلنے لگا۔ میں گڈو سے کہیں زیادہ اچھی ہاکی کھیلتا تھا۔ کوئی میچ میرے بغیر نہیں کھیلا جاتا تھا۔ یوں میں زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور اونچ نیچ کے ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ میرے لیے گھر، اسکول اور کھیل کا میدان ہی ساری دنیا تھی۔ گڈو کے کئی راز میں چھپا جاتا، جس کی وجہ سے میں کئی 'مراعات' حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن میں تھا اس گھر میں نوکر ہی، ایک ایسا نوکر جسے پناہ دینے کے عوض کام پر رکھا ہوا تھا اور میں اسی میں خوش تھا۔

آج ہمارے ملک میں ہی نہیں پورے جنوبی ایشیا میں یہی حالت ہے۔ ہم عوام یہ سمجھتے ہیں کہ ہم غلام نہیں ہیں، حالانکہ ہم سر تا پا غلام ہیں، اس لیے کہ ہم ذہنی غلام ہیں۔ ہمیں کہا یہ جاتا ہے کہ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں لیکن ایسا ہے نہیں، ہمیں آئین اور قانون بھی تھما دیا گیا لیکن پورے خطے میں بے انصافی عروج پر ہے۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو خود کو قانون سے بھی بالاتر سمجھتا ہے۔ روٹی کے ایک نوالے سے لے کر کپڑے پہننے والے پارچے تک ہم ان دیکھے آقا کے غلام بن چکے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ ہی نہیں رہے کہ ہم غلام ہیں؟

ان دنوں میں اور گڈو دسویں کا امتحان دے چکے تھے۔ ہماری آوارگی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنی سائیکل لیتا اور مجھے ساتھ لے کر شہر بھر میں آوارگی کرتا۔ میں چونکہ اس کے ساتھ ہوتا، اس لیے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں ہوتی تھی۔ شام کے وقت ہاکی کھیلنے ضرور جاتے تھے۔ کبھی کبھی چوری چھپے سینما دیکھنے چلے جاتے، یہ ان دنوں سب سے بڑی عیاشی کے ساتھ سب سے بڑا ایڈونچر ہوا کرتا تھا۔ دنیا ہم پر کھلنے لگی تھی۔ جوں جوں ہم لاہور شہر سے واقف ہوتے جا رہے تھے، اسی طرح ہمارے اندر کسی نہ کسی ایڈونچر کا حوصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انہی دنوں وہیں میں کے میدان میں ایک لمبے تڑنگے شخص کی آمد ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت جسم کے مالک تھے۔ ہاکی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ اس اسٹیڈیم میں اس کی تعیناتی حکومت کی طرف سے ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک بہترین ٹیم چنی اور اسے تربیت دینے لگے۔ انہیں میرے بارے میں بڑا تجسس تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ میرے بارے میں سب کچھ جان گئے۔ انہوں نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ میں اس وقت انہیں صرف ہاکی کا ایک کوچ ہی سمجھتا تھا۔ گڈو اس ٹیم کا حصہ نہ بن سکا لیکن میں منتخب ہو گیا۔ ان کا نام عبدالمجید تھا لیکن وہ چاچا مجید کے نام سے مشہور تھے۔

ایسے ہی ایک بار بڑے اہم ٹورنامنٹ میں ہماری ٹیم کا میچ ہوا۔ مخالف ٹیم ایک معتبر ادارے کی طرف سے تھی۔ شاید انہیں اپنے کھیل پر ناز تھا، وہ بڑے پُرغرور انداز میں کھیل رہے تھے۔ ان میں دو کھلاڑی ایسے تھے جو کھیل کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور ہماری ٹیم کے دو لوگوں کو زخمی بھی کر چکے تھے۔ یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ ہاف ہونے پر چاچا مجید نے ہمیں اجازت دے دی

pklibrary.com

کہ سامنے سے اب اگر ایسا ہو تو معاف نہیں کرتا۔ پھر یوں ہوا کہ کمیل ختم ہونے تک میں نے ان کے تین کھلاڑی زخمی کر دیے اور میچ بھی جیت گئے۔ میرے خیال میں بات وہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن بات یہیں سے شروع ہوئی۔

ٹورنامنٹ ختم ہوئے چند دن ہوئے تھے۔ میں اور گڈو سائیکل پر اسٹیڈیم جا رہے تھے کہ ہمیں چند لڑکوں نے اسٹیڈیم کے باہر روک لیا۔ میں پہچان گیا کہ یہ مخالف ٹیم کے کھلاڑی ہیں۔ جب تک ہم نے سائیکل روکی، تب تک کئی ہاکی کے وار میری پیٹھ پر پڑ چکے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اگر میں نے جگرا نہ دکھایا تو یہ مجھے بہت ماریں گے، ممکن ہے کوئی ہڈی وغیرہ توڑ دیں۔ گڈو لڑنے میں بالکل کورا تھا۔ وہ ڈر کر بھاگ نکلا، وہ تین چار تھے جبکہ میں اکیلا۔ ہاکی میرے ہاتھ میں بھی تھی۔ میں ان کے ساتھ لڑتا رہا۔ مجھے کافی چوٹیں آئیں، جہاں تک میں انہیں مار سکا مارا لیکن اس وقت میری ہمت ختم ہو گئی جب ایک ہاکی میرے سر پر پڑی اور میں چکرا کر سڑک پر گر گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا، جو ٹانکے لگے تھے۔ خون بہت بہہ گیا تھا۔ اس وقت میرے پاس گڈو کے ساتھ چاچا عبدالمجید تھے۔ تین دن اسپتال رہنے کے بعد میں گھر واپس آیا تو مجھے سوائے حقارت کے کچھ بھی نہ ملا۔ ظاہر ہے میں کوئی ان کا خونی رشتے دار تو نہیں تھا، ایک نوکر ہی تھا۔ اس دن میں نے خود کو اس دنیا کا کمزور ترین اور گھٹیا شخص تصور کیا، جس کے پاس اپنے دفاع کا بھی اختیار نہیں تھا۔ حالانکہ گڈو نے سب کچھ بتا دیا تھا، پھر بھی قصور میرا ہی تھا۔ شاید وہ پہلے ہی کچھ سوچ چکے تھے، بہانہ یہی بنا اور مجھے اپنا بندوبست کر لینے کا کہہ دیا گیا۔ اس بیوروکریٹ نے مجھے بڑے سکون سے کہا تھا۔

''دیکھو علی، تم بڑے ہو گئے ہو، جب تک ہم تمہیں پال سکتے ہیں، ہم نے پالا، تمہیں پڑھایا، تم پر خرچ کیا۔ تم اب اپنا کھا کما سکتے ہو۔ اب گڈو نے بھی پڑھنے کے لیے چلے جانا ہے۔ پھر تم خودسر بھی ہوتے جا رہے ہو، میں تھانے کچہری کے چکر نہیں لگا سکتا اور ہم مزید تمہیں نہیں رکھ سکتے۔ تم ایک آدھ ہفتے میں اپنا بندوبست کہیں اور کر لو۔''

اس وقت اُس گھر کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ وہ پہلی شام تھی جب میں بہت رویا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ میں اس دنیا میں اکیلا و بے یار و مددگار ہوں۔ جن کی میں نے اتنا عرصہ خدمت کی، انہوں نے چند لفظ کہے اور اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا۔ کیا یہی ہے دنیاداری؟ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں دو دن تک اپنے سرونٹ کوارٹر سے نہ نکل سکا۔ گڈو میرے پاس آجایا کرتا تھا۔ وہی مجھے کھانا دے جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ کر جاتا تھا۔

وہ تیسرے دن کی شام تھی جب میں سرونٹ کوارٹر میں پڑا یہی سوچ رہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں گا، تب چاچا عبدالمجید مجھے ملنے آ گئے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے اپنی پریشانی انہیں بتائی تو وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

''کوئی بات نہیں، تم اپنا سامان باندھ رکھنا، تمہیں رہنے کے لیے بہت اچھا ٹھکانا مل جائے گا۔''

مجھے ان کی باتوں سے بہت حوصلہ ملا۔ مجھے اس وقت ضرورت بھی تھی۔ سو اگلے دن میں چاچا عبدالمجید کے ساتھ چل دیا۔ انہوں نے مجھے رہنے کے لیے جو گھر دیا، وہ کافی بڑا تھا۔ ایک بڑا گیٹ، پھر پورچ جس میں دو تین گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ پورچ کے سامنے ایک بڑا سا لان تھا، جس میں رنگ برنگ کے پودے اور پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کی چار دیواری پر لوہے کی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ داخلی دروازے کے بعد ایک بڑا سا لاؤنج تھا، لیکن گھر میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس میں تین کمرے تھے، لیکن سب کو تالے لگے ہوئے تھے۔ دو کمرے اور ایک لاؤنج کھلا ہوا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یوں گھر کے اندر رہوں گا۔ میں یہی سوچ رہا تھا مجھے کوئی سرونٹ کوارٹر میں رہنے کو کمرا مل جائے گا۔ مجھے داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک بہترین کمرا دے دیا گیا، جہاں میں نے اپنا سامان رکھ لیا۔

پہلی رات ہی مجھے اس گھر میں بہت خوف محسوس ہوا۔ میں اکیلا اور اتنا بڑا گھر؟ خیر جیسے تیسے کر کے میں نے وہ رات گزاری۔ چاچا عبدالمجید نے مجھے یہی کہا تھا کہ میں چند دن یہاں رہ لوں پھر جیسے ہی کالج کھلے وہ مجھے ایک مقامی کالج میں داخل کروا دیں گے اور میں وہیں ہاسٹل میں رہوں گا۔ میرے پاس ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کوئی تیسرا یا شاید چوتھا دن تھا، جب آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں ایک دم سے سہم کر رہ گیا۔ میرے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے باہر دو جوان کھڑے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ کچھ لمحوں بعد احساس ہوا کہ دو بندے ابھی اندر ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ بھی باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں بھی ایک ایک گن تھی۔ انہوں نے بڑے

سکون سے دروازہ بند کر کے اس میں چابی گھمائی اور باہر کی سمت چل دیے۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں اٹھ کر دیکھ لوں۔ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے باہر پورچ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ سب ایک وین میں بیٹھ گئے تھے۔ ایک شخص نے باہر والا گیٹ کھولا، جب گاڑی گیٹ پار کر گئی تو اس نے گیٹ بند کیا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ جیسے یہ لوگ یہیں کے رہنے والے تھے۔ وہ آئے، انہوں نے اسلحہ نکالا اور چلے گئے۔

میں نے ایسا منظر پہلی بار... دیکھا تھا۔ کئی خیال اور وسوسے آنے لگے۔ میں اس کمرے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ نجانے اس کمرے میں کیا کچھ پڑا ہے۔ میں اس رات نہیں سو سکا۔

اگلے دن جب میں ہاکی گراؤنڈ میں چاچا عبدالمجید سے ملا تو رات والی ساری بات بتا دی۔ وہ پُرسکون انداز میں سنتے رہے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

''تمہیں تو کسی نے کچھ نہیں کہا نا؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں، مجھے تو لگا جیسے انہیں میرے بارے میں پتا ہی نہیں تھا؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے، انہیں تمہارے بارے میں پوری طرح خبر تھی۔ خیر میں نہیں بتا دوں وہ گھر ہے ہی اس مقصد کے لیے، وہاں اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ کبھی کبھی کسی کو لاکر بھی رکھا جاتا ہے۔ سمجھ لو کہ یہ ایک سیف ہاؤس ہے۔'' تب مجھے پہلی بار انہوں نے بتایا کہ ''سیف ہاؤس'' کیا ہوتا ہے۔ میں وہاں رہنے پر راضی نہیں تھا۔ میں دبے دبے لفظوں میں وہاں سے جانے کی بات کرنے لگا تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''اچھا بات سنو، دو چار دن میں وہاں رہنے کے لیے کوئی آجائے گا۔ تم وہیں رہو۔ کہاں جاؤ گے؟''

''میں کہیں بھی رہ لوں گا لیکن......'' میں نے کہنا چاہا لیکن لفظوں کا کھوکھلا پن مجھے خود بھی محسوس ہوا تھا۔ میں پندرہ برس، سولہ برس کا لڑکا، جسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا، لیکن زمانے کے رویے نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس دن پہلی بار چاچا نے بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنے ڈرپورک اور بزدل ہو گے۔ ذرا سا اسلحہ دیکھ کر تمہارے اوسان خطا ہو گئے۔ تم اپنے ماں باپ اور بہن کا بدلہ کیسے لو گے، یوں جا کر معافی مانگو گے ان سے، منت کرو گے ..... ان کی، بھیک مانگو گے ان سے کہ مجھے بدلہ دے دو؟''

چاچا عبدالمجید کا لہجہ پہلی بار سخت ہوا تھا۔ اس لہجے میں حقارت ایسی تھی جس کا ذائقہ ہی نیا تھا۔ اس حقارت میں توہین نہیں تھی۔

''میں بڑا ہو جاؤں گا تو......'' میں نے کہنا چاہا تو چاچا بولے۔

''اور کتنا بڑا ہونا ہے تم کو...؟ تمہاری عمر کے لڑکے، سامنے والے کو ننگی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ اور تم...... آؤ آج میں تمہیں دکھاؤں۔''

میں کچھ نہیں بولا، چپ چاپ ان کے ساتھ چل دیا۔ ان کے پاس ایک موٹر سائیکل ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے پیچھے بٹھایا اور مجھے لے کر ایک سینما کے پاس آ گئے۔ اس دن ہم ہاکی نہیں کھیل سکے تھے۔ میں سینما ہال کے باہر چاچا کے ساتھ کھڑا تھا۔ تبھی انہوں نے مجھے دکھایا۔

''وہ سامنے دیکھو، وہ تین لڑکے کھڑے ہیں، تمہاری عمر کے ہیں نا؟''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے بہ مشکل کہا۔

''اب چپ چاپ تماشا دیکھنا۔'' انہوں نے کہا اور ایک طرف دکان پر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے دو سوڈے کی بوتلیں لیں، ایک مجھے دے کر ان لڑکوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ اس وقت ہم سوڈا پی کر خالی بوتلیں واپس رکھ چکے تھے۔ اچانک ایک طرف سے تین چار افراد آئے اور انہوں نے آ کر ان لڑکوں کو دھکے دینا شروع کر دیے۔

''سمجھ رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے؟'' چاچا نے دھیرے سے پوچھا پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''یہ لڑکے یہاں پر ٹکٹ بلیک کر رہے ہیں، وہ دوسرے بھی یہاں ٹکٹ بیچتے ہیں، اب دیکھنا۔''

میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں لڑکے انہیں سمجھاتے رہے۔ پھر ایک دم سے وہ تھپڑوں اور گھونسوں پر اتر آئے۔ سامنے والے بھی انہیں مارنے لگے۔ مگر وہ چار ہونے کے باوجود انہیں زیر نہیں کر پائے۔ ان کی یہ لڑائی محض چند منٹ کی تھی، مگر وہ تینوں لڑکے اس بے جگری سے لڑے کہ چاروں حملہ آوروں کو وہاں سے بھاگنا پڑا، اس لڑائی کے دو تین منٹ بعد وہ کپڑے جھاڑ کر پھر سے ٹکٹیں بیچنے لگے۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

''دیکھا، یہ ان لڑکوں کے لیے روزانہ کا معمول ہے، کیا تم ایسے لڑ سکتے ہو؟'' چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

''نہیں، میں ایسے نہیں لڑ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ تم بزدل اور ڈرپوک ہو؟'' انہوں نے طنز سے پوچھا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تھوڑے سے پیسوں کے لیے لڑ رہے ہیں، میں اگر لڑا تو کسی مقصد کے لیے لڑوں گا۔'' میں نے چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''کیسا مقصد، یہی اپنے دشمنوں سے بدلہ؟''

''ہاں، اسی لیے تو کہتا ہوں میں بڑا ہو جاؤں، اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں، تب......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''تب بھی بیٹا تمہیں بے خوف ہونا پڑے گا، یہ بزدلی اپنے اندر سے نکالنا پڑے گی، تمہیں خود پر بھروسا کرنا سیکھنا ہوگا؟''

''کیسے چاچا، میں وقت کے ساتھ سیکھ جاؤں گا نا۔'' میں نے کہا۔

''میں سکھاؤں گا تمہیں، بتاؤں گا تمہیں کہ وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں کیسے لی جاتی ہیں۔'' نجانے کس جذبے کے تحت چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ پھر چند لمحے سوچتے ہوئے بولے۔ ''کل تم ہاکی کھیلنے نہیں جاؤ گے، کہاں جانا ہے یہ میں تمہیں بتاتا ہوں، آؤ۔''

اس شام میں اور چاچا بندر روڈ کے پاس ایک علاقے میں چلے گئے۔ ایک بڑے سے گھر کے ساتھ کافی بڑی چار دیواری تھی۔ اس میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف اکھاڑا تھا۔ وہاں اکھاڑے میں اس وقت کوئی نہیں تھا لیکن کمروں کے سامنے ایک موڑھے پر ایک ادھیڑ عمر، سرخ چہرے، صحت مند اور رعب دار شخصیت والا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کئی موڑھے، کرسیاں اور چارپائیاں دھری ہوئی تھیں۔ جو سب کی سب خالی تھیں۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ چاچا کو دیکھتے ہی جیسے وہ کھل اٹھا۔ خوشی سے اٹھا اور چاچا کو گلے لگا لیا۔

''آؤ بھئی مجید باؤ، کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں لالہ، تم سناؤ۔'' چاچا نے گلے ملنے کے بعد کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالہ نے خود بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں، سنا کیسے درشن ہو گئے تیرے؟''

''اس لڑکے کو چھوڑنے آیا ہوں۔'' چاچا نے کہا تو لالہ نے پہلی بار مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر چاچا سے پوچھا۔

''خیر تو ہے نا؟''

''ہاں خیر ہی ہے۔ بس اسے تھوڑا مضبوط بنا دے۔'' چاچا نے کہا تو لالہ نے پھر میری طرف دیکھا، چند لمحے دیکھنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہڈی تو ٹھیک لگتی ہے۔''

''بس یہ اب کچھ عرصہ آپ کے پاس ہے۔'' چاچا نے کہا تو لالہ فخر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جانی، فکر نہ کر۔'' پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تیرا؟''

''جی علی زین۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا پھر بولا۔

''چل بیٹھ جا اُدھر۔''

انہوں نے دور پڑی ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا، میں وہاں جا کر بیٹھ گیا تو وہ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چاچا میرے بارے میں بتا رہے ہوں گے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اچانک کمرے میں سات آٹھ نوجوان اندر آ گئے۔ وہ سب مختلف عمر کے تھے۔ ان سب نے باری باری مجھے دیکھا، پھر کوئی کرسی پر بیٹھ گیا، کوئی موڑھے پر۔ تھوڑی دیر بعد چار بندے تین پتیلے اور ایک گٹھڑی اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی سب اٹھے اور اندر کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد چاچا نے مجھے کہا۔

''علی آ بھئی۔''

میں اٹھا اور ان کے پیچھے چل دیا۔ اندر دسترخوان لگا ہوا تھا۔ ہم گنتی کے پندرہ لوگ تھے۔ گٹھڑی میں کوئی سو کے قریب نان تھے۔ ایک پتیلے میں پالک گوشت، دوسرے میں دال گوشت اور تیسرے میں بھنا ہوا گوشت۔ وہ رکابی یا پلیٹ کے جھنجٹ سے آزاد تھے۔ سب پتیلوں میں شروع ہو گئے۔ اس وقت پیچھے ہٹے جب سب صفایا کر دیا۔ میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ دسترخوان اٹھایا جانے لگا تو چاچا نے کہا۔

''ہاں بھئی علی، اب تمہیں یہاں رہنا ہے۔''

''کب تک؟'' میں نے پوچھا تو لالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھ رہا تھا پتر، تم نے صرف ایک نان کھایا

ہے، تم کو... اُس وقت یہاں سے جانا ہے جب کم از کم پانچ سے دس نان ایک وقت میں کھاؤ۔''

اس پر چاچا ایک دم ہنس پڑے اور میں سوچنے لگا، ایسا بھی ہوسکتا ہے؟

میں لالہ پر حیران تھا، وہ کیسا بندہ ہے، کیسے لوگ پالے ہوئے ہیں۔ چاچا اور لالہ آپس میں باتیں کرتے رہے، کئی لڑکے اٹھ کر جانے لگے۔ تبھی چاچا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''لے بھئی لالہ یہ اب تیرے حوالے، اسے سنوار دے۔''

''تو فکر ہی نہ کر۔'' لالہ نے کہا تو چاچا مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ میں سوچنے لگا، لالہ نے مجھے کیا سنوارنا ہے۔ میں اسی خیال میں تھا کہ لالہ نے ایک لڑکے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسے اوپر والے کمرے میں لے جاؤ، وہیں رہنے کا بندوبست کردو، یہ اب یہیں رہے گا۔''

اس لڑکے نے مجھے ساتھ لیا اور اوپری منزل میں موجود ایک کمرے میں لے آیا۔ وہ بڑا صاف ستھرا کمرا تھا، وہاں تین بیڈ لگے ہوئے تھے۔ بہت اچھا ماحول تھا۔ اس نے ایک بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرا نام دلبر ہے، اور وہ میرا بیڈ ہے، تم جو چاہو لے لو۔ جو کچھ بھی چاہیے مجھے بتادینا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرا ہم عمر ہی تھا۔ اس کی نگاہیں کافی شوخ تھیں۔

☆☆☆

میرا کندھا زور سے ہلا تو میری آنکھ کھل گئی۔ دلبر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے نیند میں ہی پوچھا۔

''او کیا ہوگیا ہے؟''

''ہونا کیا ہے، چل اٹھ، نیچے چل، صبح ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھادیا۔ میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صبح ہونے کے آثار تھے۔ میں کسلمندی سے نیچے گیا تو وہاں کا ماحول ہی عجیب تھا۔ وہاں کے سب لڑکے لنگوٹ باندھے جسم پر تیل ملے ورزش میں مصروف تھے۔ ان کے بدن چمک رہے تھے۔ کوئی ڈنڈ تو کوئی بیٹھکیں لگا رہا تھا۔ مجھے بھی ایک لنگوٹ دے دیا گیا۔ دلبر نے میرے بدن پر تیل لگا دیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ لالہ وہاں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہاں پر موجود لڑکوں نے دیوار کے ساتھ لگی لاٹھیاں اٹھائیں اور سیدھے ہوگئے۔ چھ سات لڑکے لالہ فخر کے سامنے آگئے۔ لالہ ان کے درمیان.... گھر گیا۔ ایک لڑکے نے پوری قوت سے لاٹھی لہرائی اور لالہ کے دے ماری، لیکن یہ کیا؟ لالہ نے کمال مہارت سے نہ صرف وہ لاٹھی اپنی لاٹھی سے روک لی، بلکہ گھما کر لڑکے کی پنڈلی پر لاٹھی دے ماری۔ اچانک وہ سبھی لالہ پر پل پڑے۔ صرف لاٹھیوں کی ٹھک ٹھک کی آوازیں آرہی تھیں۔ لالہ بجلی کے جیسی سرعت کے ساتھ نہ صرف لاٹھیوں کے وار بچاتا بلکہ کسی نہ کسی پر وار بھی کردیتا۔ حیرت یہ تھی کہ کسی ایک کی بھی لاٹھی لالہ کو چھو نہیں سکی۔ تقریباً پانچ سے سات منٹ تک یہ تماشا چلتا رہا۔ پھر اچانک سب رک گئے۔ لالہ باقی کے لڑکوں کو دھیرے دھیرے سکھانے لگا، میں بھی ان میں شامل تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد لالہ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا۔ وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تولنے لگا۔ میرے ہاتھ میں بھی لاٹھی تھی۔ اچانک لالہ نے اپنی لاٹھی گھمائی اور میری پنڈلی پر دے ماری، میں تکلیف سے دہرا ہوا تو میری پشت پر لاٹھی یوں پڑی جیسے کوڑا پڑتا ہے۔ میں سیدھا ہوا تو تیسری لاٹھی میرے کولھے پر پڑی۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ لالہ ہنس دیا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنے بدن پر تکلیف برداشت کررہے ہو؟ کیسا ہے یہ درد؟''

''بہت زیادہ ہورہا ہے۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی درد سامنے والے کو ہوتا ہے، جب تم اسے مارتے ہو۔ لیکن اگر سامنے والے کو موقع مل جائے تو ایسا ہی درد برداشت کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ جب مار پڑے تو ایسا درد اور تکلیف سہنا پڑتی ہے۔''

''میں ایسا ماہر تو نہیں .....'' میں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر ماہر نہیں بنو گے تو ایسی لاٹھیاں پڑتی ہی رہیں گی۔ بچو اِن لاٹھیوں سے۔'' لالہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''جی بالکل ٹھیک۔'' میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا پہلا اور آخری سبق یہی ہے، صرف حوصلہ..... حوصلہ ہے تو تم ہو، نہیں ہے تو تم نہیں۔'' لالہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

pklibrary.com

''جی سمجھ گیا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ لالہ نے لاٹھی لہرائی، میں تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ اگرچہ لاٹھی مجھے چھو گئی تھی لیکن میں بچ گیا۔ لالہ ہنس دیا۔ پھر بولا۔

''پتر، لاٹھیوں سے لڑنے اور اپنے بچاؤ کے اس فن کو بنوٹ کہتے ہیں۔ یہ ہمارے آبا کا فن ہے۔ اس فن کو سیکھنے کے بعد ہی آگے بڑھا جائے گا۔''

وہ پہلا دن تھا اور پھر کئی ہفتے گزر گئے۔ پہلے پہل میں خوف زدہ تھا، پھر مجھے بھی مزہ آنے لگا۔ وہاں یہی معمول تھا۔ منہ اندھیرے ورزش اور بنوٹ کا فن۔ پھر ناشتا اور اپنے کمرے میں، دوپہر کے بعد اکھاڑا، اور شام تک یہی سلسلہ چلتا۔ وہاں رہتے ہوئے بس ورزش تھی اور کھانا پینا۔ میں اس چار دیواری سے باہر نہیں نکلا، مگر کئی لڑکے دن کے وقت نکلتے اور دوپہر کے بعد آتے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ علاقے میں ان کی بدمعاشی چلتی ہے۔ پورے علاقے پر ان کا راج ہے۔

ایک دن ناشتے کے بعد جب سب باہر جانے لگے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چل دیے۔ دلبر بھی ساتھ تھا۔ راستے میں مجھے اس نے بتایا۔

''پتا ہے ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''نہیں پتا۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''ایک فیکٹری والا بہت اچھا آدمی ہے، اپنا بندہ ہے، غریبوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اچھا بندہ ہے۔ اس لیے ایک سیاست داں نے اس کی فیکٹری پر قبضہ کرلیا ہے۔ پولیس بھی بیٹھی ہے، ہم وہ قبضہ لینے جارہے ہیں۔'' دلبر نے بتایا تو مجھے اپنے ہی معاشرے کا ایک نیا رخ پتا چلا۔

ہم وہاں پہنچے تو چند پولیس والوں کے علاوہ کچھ لوگ وہاں تھے۔ ان کے پاس اچھا خاصا اسلحہ بھی تھا۔ ہم میں جو سب سے بڑا لڑکا تھا، اس نے جا کر بڑے پیار سے ایک بندے کو سمجھایا۔

''لالہ فخر کا حکم ہے، یہ جگہ چھوڑ کر چلے جاؤ، اسی میں سب کی بھلائی ہے۔''

''اور اگر ہم نہ جائیں تو......'' سامنے والے گرانڈیل بندے نے طنزیہ انداز میں کہا تو اس نے زبانی جواب نہیں دیا بلکہ پوری قوت سے اس کے چہرے پر گھونسا مارا، جیسے ہی اس گرانڈیل شخص کا چہرہ سیدھا ہوا اس کے منہ سے خون نکل پڑا۔ تبھی ایک ریلا فیکٹری کے کونوں کھدروں سے نکلتا چلا آیا اور ہم پر حملہ آور ہوگیا۔ ہمیں اس وقت پتا چلا تھا کہ وہ لوگ کتنے ہیں۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم کون کس کے ساتھ کیسے لڑا، میرے سامنے ایک بندہ آیا تھا۔ ظاہر ہے، اس وقت میں خود کو نہ بچاتا تو وہ مجھے مارتا۔ وہ ایک لوہے کا پائپ لے کر میری جانب بڑھا تھا۔ اس نے پائپ میرے مارنا چاہا، میں طرح دے گیا۔ پائپ زمین پر لگا تو میں نے پاؤں کی ٹھوکر اس کے سینے پر ماری۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں بچنے کے بجائے جوابی وار کروں گا۔ زندگی میں یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ وہ الٹ کر پرے جاگرا، اس کے ہاتھ سے پائپ چھوٹ گیا۔ میں نے وہ پائپ اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون نکلنے لگا، وہ وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میرے سامنے دلبر لڑ رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا وہاں تک گیا اور مخالف کے سر پر پائپ دے مارا۔ اس کا سر بھی پھٹ گیا۔ اسی لمحے ایک فائر ہوا، جو ہمارے ہی ایک ساتھی کے لگا۔ فائر کی آواز ابھرنے کی دیر تھی، ہمارے کئی ساتھیوں نے اسلحہ نکال لیا۔ ایک دم سے فضا فائرنگ سے گونج اٹھی تھی۔

دلبر مجھے لیے ایک اوٹ میں ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ وہ تاک تاک کر نشانے لگانے لگا۔ دونوں طرف کے لوگ آڑ میں ہوکر فائرنگ کرنے لگے۔ پولیس جو پہلے خاموش تماشائی تھی، وہ وہاں سے غائب ہوگئی۔ اگلے دس منٹ میں سامنے کے لوگ وہاں سے بھاگنے لگے۔ دونوں طرف کے لوگ زخمی ہوچکے تھے۔ مخالفین کا ایک بندہ مرچکا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم نے اس فیکٹری کا قبضہ لے لیا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت تک ہم وہاں سے غائب ہوچکے تھے۔ وہ معاملہ جو بھی تھا، لیکن میرا خوف ختم ہوچکا تھا۔

دلبر میرا بہت اچھا دوست بن گیا تھا۔ مجھے وہاں کی ہر بات بتاتا، میرے ساتھ رہتا، میری ہر طرح سے رہنمائی کرتا تھا۔ اب میں باقاعدہ ان کے ساتھ کسی نہ کسی لڑائی میں شامل ہوتا تھا۔ ایک بڑے لڑکے نے مجھے پسٹل چلانا سکھایا تھا لیکن میرا نشانہ بہت کچا تھا۔ میں نشانہ پکا کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ میرے دن وہاں پر بہت اچھے گزرنے لگے تھے، اچانک ایک شام چاچا عبدالمجید آگئے۔ ان کے ہاتھ میں مٹھائی کی دو بڑی بڑی ٹوکریاں تھیں۔ سب کے ساتھ مجھے بھی بلایا گیا۔ میرے سمیت سب کو تجسس تھا۔ تب چاچا نے بتایا۔

''لو جی ہمارا علی زین میٹرک کے امتحان میں بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہوگیا ہے، یہ مٹھائی اس خوشی میں

ہے۔“

لالہ نے مجھے قریب بلایا اور گلے لگا کر کہا۔ ”مبارک ہو پتر، پڑھائی نہ چھوڑنا۔“

”میں نے پڑھائی کر کے کرنا کیا ہے، بس یہ......“ میں نے کہنا چاہا تو لالہ نے سختی سے کہا۔

”او نہیں اوئے...... ابھی تجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کے لیے تیرا پڑھنا بہت ضروری ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

اس دن رات کا کھانا کھا چکے تو لالہ نے چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”گنتی کی ہے، پورے پانچ نان کھائے ہیں اس علی زین نے۔“

اس پر چاچا بے اختیار ہنس دیا۔ باقی سب بھی ہنسنے لگے۔ اس رات میں چاچا کے ساتھ واپس اسی گھر میں آ گیا جہاں میں نے اسلحہ دیکھا تھا۔ اب میرے لیے کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن ایک سوال ذہن میں اٹک گیا کہ اس سیف ہاؤس میں اتنا اسلحہ کس کا ہے؟ میں یہ سوال تو نہ پوچھ سکا، ہاں مگر چند دن بعد میرا کالج میں داخلہ کروا دیا گیا۔ اسی دوپہر مجھے بتایا کہ اب میں کالج کے ہاسٹل میں رہا کروں گا۔ شام کے وقت چاچا نے مجھے ہاسٹل میں پہنچا دیا۔ سامان وغیرہ رکھنے کے بعد چاچا مجھے لے کر کینٹین کے پاس ایک لان میں جا بیٹھے۔ ویٹر کھانے پینے کی چیزیں رکھ گیا تو چاچا بولے۔

”علی زین...... یہاں تمہارے دو کام ہیں، پڑھنا ہے، اور دل لگا کر پڑھنا ہے۔ دوسرا کام جو بھی تمہارے سامنے سر اٹھائے اسے دبا دینا ہے۔ ذرا بھی خوف نہیں کرنا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

”ابھی کچھ دیر بعد تم سے ایک لڑکا ملنے آئے گا ظفر نام کا، ظفر مونڈی کے نام سے مشہور ہے یہاں۔ میں اسے ابھی بلوا لیتا مگر وہ اس وقت ہاسٹل میں نہیں ہے۔ کچھ پوچھنا ہو تو اس سے پوچھ لینا، ورنہ اپنی مرضی کرنا۔ ذرا بھی نہیں گھبرانا، تم ہر وقت ہماری نگاہوں میں رہو گے۔“

”ٹھیک ہے چاچا۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔

”کل تمہارا پہلا دن ہوگا، خوب سنبھال کے۔“ یہ کہہ کر چاچا مجھے کالج کے بارے میں سمجھانے لگے کہ کون لوگ ہیں جو یہاں پر چھائے ہوئے ہیں اور انہیں یہاں سے نکال باہر کرنا کتنا ضروری ہے۔

اسی رات ایک لمبا تڑنگا لڑکا کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی اس نے پسٹل نکال کر میز پر رکھ دیا، پھر کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں میز پر رکھ لیں۔ نجانے کیوں مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لیے میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”یہ پسٹل واپس جیب میں ڈال لے اور سیدھا ہو کر بیٹھ۔“

میرے یوں کہنے پر اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرا اس کا جوڑ ہی نہیں بنتا تھا۔ میں جسم میں اس سے آدھا تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بڑے واہیات انداز میں بولا۔

”اور پُتر یہی اسٹائل ہے اپنا۔“

”تو پھر سن یہ کن ٹٹوں والا اسٹائل مجھے نہیں پسند، چل سیدھا ہو کر بیٹھ۔“ میں نے کہا تو اس نے پھر غور سے میری طرف دیکھ کر ٹانگیں سیدھی کر لیں، پھر پسٹل اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”دیکھ علی، ہم نے یہیں اس ہاسٹل سے اور اسی کالج سے اپنا خرچہ نکالنا ہے، ان پر اگر ہمارا خوف نہ ہوا تو یہ......“

”وہی کن ٹٹا ہے نا تو۔“ میں نے کہا اور قہقہہ لگا دیا۔ میں اسے یہ جتا دینا چاہتا تھا کہ میں اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا ہوں۔ نہ میں نے اس کی مرضی سے چلنا ہے۔ وہ سینئر ہونے کے ناتے مجھے اپنے تابع رکھنا چاہتا تھا۔

”تم نئے ہو نا، تمہیں نہیں پتا یہاں پر تمہیں میری کتنی ضرورت پڑنی ہے۔ میں نے اپنا ایک ماحول بنایا ہوا ہے یہاں پر۔ خوف کھاتے ہیں لڑکے مجھ سے۔ میں تمہیں یہ بات سمجھا رہا ہوں، جتنا خوف ہوگا، اتنی بات مانیں گے۔ ورنہ یہ تمہیں کھا جائیں گے۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے، ابھی تم جاؤ۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”نہیں یار آ تجھے کوئی کھابے شابے کھلاتے ہیں۔“ اس نے خالص غنڈوں کے سے انداز میں کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

”میں نے کھانا کھا لیا ہے، کل سہی۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور میری طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اگلے دن کالج جاتے ہوئے میں بہت پُرجوش تھا۔ میرے لیے ایک نئی دنیا کا در کھلنے جا رہا تھا۔ میں نے

بہترین شلوار قمیص پر ویسٹ کوٹ پہنا۔ تیار ہو کر چند کتابیں اٹھائیں اور کالج کی عمارت تک پہنچ گیا۔ مجھے سمجھ نہ آیا تھا کہ کلاس روم کدھر ہیں، میں اس طرف ایک کوریڈور میں جا رہا تھا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک گروپ میرے سامنے آ گیا۔ ان میں سے ایک چلبلی سی، چشمے والی لڑکی نے رک کر بڑے اسٹائل سے پوچھا۔

''نئے آئے ہو؟''

''ہاں، میرا آج پہلا دن ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا تو ایک پتلا سا لڑکا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''نواں آیاں اے سوہنیا......''

اس پر سارا گروپ خواہ مخواہ ... ہنس دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا مذاق اڑائیں گے، اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا تو ایک لڑکے نے میرا کالر پکڑ کر کہا۔

''ایویں ہی جا رہے ہو، تھوڑی خاطر داری تو کروا کر جاؤ نا یار۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے جھٹکے سے کالر چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ......'' یہ کہہ کر اس نے اپنے گروپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کریں یار اس کے ساتھ؟'' سبھی میری طرف دیکھنے لگے تو ایک لڑکی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''دیکھو نا یہ ویسٹ کوٹ پہنا ہوا، بڑا سیاست دان ٹائپ کا بن کر آیا ہے، اس کے تھوڑی دیر کان پکڑوا دیں، پھر تھوڑی تقریر بھی سنیں۔''

اس پر سب نے قہقہہ لگا دیا تبھی وہ لڑکا ہاتھ کے اشارے سے مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''چل بھئی کان پکڑ کر سوچ کیا تقریر کرنی ہے، جلدی کر۔''

''اوئے چھوڑ اس قصے کو، جانے دے مجھے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ میرے سامنے ایک بچہ ہو۔

''یہ تو ہونا ہی ہے تمہارے ساتھ، اکڑ دکھاؤ گے تو پھر کچھ خاص بھی ہو سکتا ہے، کیا سمجھے؟'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو میں اس کی بات نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں نے قدم بڑھایا، مجھے پھر کالر سے پکڑ کر کھینچا گیا۔ ایک دم سے غصہ میرے دماغ میں چڑھ گیا۔ میں پلٹا، جس نے میرا کالر پکڑا ہوا تھا، میں نے گھما کر تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ چٹاخ کی آواز سے کوریڈور گونج اٹھا۔ اردگرد کھڑے لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

شاید انہیں اس طرح کے ردعمل کی امید نہیں تھی۔ اگلے ہی پل لڑکیاں ایک طرف ہٹ گئیں اور چار پانچ لڑکے مجھے مارنے کے لیے لپکے۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا، وہ میرے سامنے آ گئے۔ میں نے کتابیں ایک طرف پھینک دیں اور لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس کے تھپڑ پڑا تھا، اس نے ابھر کے میرے گھونسا مارنا چاہا، میں ایک طرف ہوا اور ایک تھپڑ اور مارا جو اس کی گردن پر لگا۔ وہ پانچوں مجھے مار رہے تھے اور میں اکیلا ان کا مقابلہ کر رہا تھا، نجانے کتنے لوگ یہ دیکھ رہے تھے۔ تبھی میں نے فیصلہ کن انداز میں ایک کو تاک لیا، اسے پکڑا اور اس کے سینے پر زوردار گھونسا مارا، وہ وہیں دوہرا ہو گیا۔ میں جھکا اور ایک کی ٹانگ پکڑ لی، وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا، میں نے اسے تھوڑا سا پیچھے کیا اور پوری قوت سے ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ اس دوران میرے تھپڑ گھونسے لگتے رہے، دوسرا گرا تو میں نے تیسرے کو پکڑ لیا، وہ مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا چکا تھا۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور گھما کر اسے دیوار پر مارا، اس کا سر پھٹ گیا، میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں یہ دیکھتا کہ اس کا خون کتنا نکلا ہے، میں نے چوتھے کو پکڑا، اسے اپنی کمر پر لادا اور فرش پر دے مارا، جیسے ہی وہ گرا میں نے اس کی پسلیوں میں پورے زور سے ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا اٹھا۔ پانچواں یہ حشر دیکھ کر بھاگنے کے لیے پر تول رہا تھا، میں نے پیچھے سے اسے پکڑا، گھمایا اور ایک ستون میں دے مارا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پانچوں کوریڈور میں فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ سہمی ہوئی لڑکیاں ایک طرف کھڑی یہ منظر یوں دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ میں آگے بڑھا اور جس نے میرا کالر پکڑا تھا، اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

''کیا کہا تھا تم نے؟''

''چل یار معاف کر دے۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''کان پکڑو گے تو معاف کروں گا، ہاں مگر تقریر نہیں سنوں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے دردمندانہ انداز میں مجھے دیکھا، میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اسے چھوڑ دیا۔

میرے کپڑے پھٹ چکے تھے اور کافی ساری مار بھی پڑ چکی تھی۔ میرا جسم درد کر رہا تھا۔ اب کلاس روم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے میں واپس پلٹا اور ہاسٹل چلا گیا۔

pklibrary.com

اگلے دن جب میں کالج گیا تو کئی لڑکے گیٹ پر ہی میرے منتظر تھے۔ وہ کوئی پندرہ سولہ لڑکے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، کسی کے چین، کوئی ہاکی لیے ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا ایسا ہی کچھ ہوگا۔ گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر لالہ فخر کے ڈیرے سے آئے ہوئے میرے دوست لڑکے کھڑے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میرا حوصلہ آسمان کو چھونے لگا..... میں نے بڑے اعتماد سے گیٹ پار کرنا چاہا تو ایک نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''اوئے تم ہی لڑے تھے نا کل؟''

''ہاں اُوئے، میں ہی لڑا تھا۔'' میں نے بے باکی سے اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو کہنے والے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ وہ میری جانب بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک نوجوان سے لڑکے نے اسے روک دیا۔

''سچی بات کہوں، مجھے تیرا جواب پسند آیا، تُو کچھ بھی ہوسکتا ہے بزدل نہیں ہوسکتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے تم لوگ بڑے بزدل لگے ہو، ڈرپوک اور گھٹیا، صرف ایک بندے کے لیے اتنے لڑکے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''بات سُن شہزادے تم ہمیں بولا لگ رہے ہو، میں اگر یہ نہ چاہوں نا کہ تم گیٹ پار کر کے اندر چلے جاؤ تو تم جا نہیں سکتے ہو۔'' اس نے تیکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں ہنستے ہوئے پوچھا۔

''چل پھر دیکھ لیتے ہیں۔ بولو، روک سکتے ہو مجھے؟''

''لگتا ہے تم سمجھدار نہیں ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''سمجھدار ہوں جو تم سے اب تک سمجھانے والے انداز میں بات کر رہا ہوں، ورنہ جس طرح تم نے میرا راستہ روکا ہے، میں اب تک تمہیں اس کی سزا دے چکا ہوتا۔'' میں نے رعب سے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، وہ مجھے دیکھ رہا تھا، اور میرے اتنے بڑے بول کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے دوست لڑکے کچھ قریب آچکے تھے۔ وہ ہماری باتیں سُن رہے تھے۔

''لگتا ہے تم نہیں مانو گے؟ چل پھر پار کر گیٹ......''

اس نے شدید غصے میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور اگر میں پار کر گیا تو؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو پار تو کر شہزادے۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''دیکھ پھر جب تک میں یہاں ہوں، تم لوگوں کو یہ گیٹ پار کرنے نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا تو ایک لڑکا غصے میں میری جانب بڑھا، اس نوجوان نے روکتے ہوئے کہا۔

''چل کر پار......''

میں نے ان سب کی طرف دیکھا اور قدم بڑھا دیے، جیسے ہی میرا پہلا قدم اٹھا، ایک ڈنڈا میری کمر پر پڑا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دوست سب سنبھال لیں گے۔ گیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں گھوما اور ڈنڈا مارنے والے کی طرف دیکھا، وہ دوسری بار مجھے مارنے کے لیے ڈنڈا لہرا چکا تھا، وہ جیسے ہی میری طرف آیا، میں نے وہ ڈنڈا پکڑا اور جھٹکا دے دیا۔ ڈنڈا میرے ہاتھ میں آگیا۔ یہ 'بنوٹ' کا ایک خاص داؤ ہے، جس کا ان بے چاروں کو کیا پتا تھا۔ میں الٹے قدموں گیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ کئی لڑکے میری جانب بڑھے، میں اس وقت تک گیٹ پار کر گیا تھا۔ وہ سب میری طرف بڑھے تو میرے دوست لڑکے ان کے پیچھے آگئے۔ پھر دو سے تین منٹ لگے۔ انہیں یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ کئی لڑکوں کے سر پھٹ گئے۔ وہ خون سے لت پت بھاگتے پھر رہے تھے۔ دو تین لڑکے واقعتاً لڑائی میں ماہر تھے مگر وہ میرے دوستوں کے سامنے نہیں ٹک سکتے تھے، جن کا کام ہی لڑنا جھگڑنا تھا۔ کچھ لڑکے بھاگ گئے اور کچھ گیٹ پر لیٹے پڑے ہوئے تھے۔ وہ [illegible] مجھ سے بات کر رہا تھا وہ پیچھے ہوتے لڑکے کے ساتھ میری جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور بولا۔

''بول، اب کبھی جائے گا گیٹ کے اندر؟''

''تجھے میری دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''میں ویسے بھی کسی سستی شے کا قائل نہیں ہوں، ابھی بتا دے کتنی مہنگی پڑے گی ورنہ تیری ہڈی پسلی توڑ کر بتاؤں؟'' میں نے غصے میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

''تم باہر سے غنڈے بُلوا کر......'' اس نے کہنا چاہا تو میں غصے میں بولا۔

''یہ تو اب آتے ہی رہیں گے..... اگر تم اگلے دو منٹ یہاں رہے تو سمجھ دوسرا ہڈی توڑ راؤنڈ شروع ہو جائے گا۔'' میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف پھیل گیا تھا۔ میں اسی خوف کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے جھٹکا دے کر اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ مڑا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر وہاں سے چل پڑا۔ میں نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ہاسٹل کی طرف چل دیا۔ میرے کپڑے پھٹ چکے تھے۔

اسی شام ظفر مونڈی میرے پاس کمرے میں آ گیا۔ اس نے آتے ہی زوردار انداز میں کہا۔

’’او خوش کر دیا شہزادے تم نے، کمال کر دیا بھئی۔‘‘

’’کیا ہو گیا سرکار۔‘‘ میں نے خوش دلی سے کہا۔

’’پتا ہے، تم نے کسے گیٹ پر مارا ہے، زوبی کو...... گوالمنڈی کا غنڈا ہے وہ...... اب تو دو باتیں ہی ہوں گی۔‘‘ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

’’کون سی دو باتیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یا تو کل وہ بھرپور انداز میں تم پر وار کرے گا، یا پھر کبھی سامنا نہیں کرے گا، لکھوا لو مجھ سے۔‘‘ اس نے پُرتجسس لہجے میں کہا۔

’’چل پھر وہاں سے کاپی اٹھا اور لکھ دے۔‘‘ میں نے مذاق میں کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا تو وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

’’او کیا بات ہے تیری شہزادے، بڑی اونچی اڑان ہے تیری۔‘‘

’’تو آگے آگے دیکھ ہوتا کیا ہے، چل چھوڑ آ کھانا کھا کر آئیں۔‘‘ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ ہم ہاسٹل سے نکل کر ایک ریستوران میں آ گئے۔

اگلے دن میں کالج میں تھا۔ ظفر مونڈی کی بات میرے ذہن میں تھی۔ کالج گیٹ پر میں نے ٹھہر کر کھڑے اپنے دوستوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں جب کالج کے اندر گیا تو وہ بھی آ گئے۔ میں کلاس روم کی طرف بڑھ گیا۔ پروفیسر پڑھا رہے تھے۔ میں نے باقاعدہ اجازت لی۔ اجازت ملتے ہی میں کلاس روم میں داخل ہوا تو سب نے مجھے یوں دیکھا، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

کلاس ختم ہوئی تو میں باہر کاریڈور میں آ گیا۔ سبھی مجھ سے دوستی کے خواہاں تھے۔ ان میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ میرے ساتھ دو چار لڑکے اور لڑکیاں چلتی رہیں اور میں ان کے ساتھ کینٹین پر آ بیٹھا۔ میرے سب دوست جا بجا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بات نہیں کرنی تھی۔ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ دوستی میری مجبوری بھی تھی۔ ہمیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک لڑکی آئی، اس نے کسی دوسری ٹیبل سے کرسی اٹھائی اور بالکل میرے سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں اسے پہچان گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی، جو سب سے پہلے اس کالج میں مجھ سے ہمکلام ہوئی تھی جس کے بعد اک لڑائی چھڑ گئی تھی۔ وہ چشمے کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

’’سوری......‘‘

’’کسی نئی لڑائی کی بنیاد رکھنے آئی ہو؟‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

’’نہیں، میں دوستی کرنے آئی ہوں، کر لو تو ٹھیک، ورنہ سوری۔‘‘ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ میرے ساتھ سبھی ہنس دیے۔

’’سوری کیوں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بس...... غلطی میری تھی، اور میرے جیسا بندہ تمہیں سوری کہے، سمجھو تو یہ بہت بڑی بات ہے۔‘‘ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے چہرے اور سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

’’بندہ...... میں سمجھا نہیں۔‘‘

’’ہاں بندہ، میں لڑکی ہونے کا مارجن نہیں لینے والی، میں ایک دوست کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں، سمجھ میں آ جائے تو بتانا، صائمہ نام ہے میرا۔‘‘ اس نے کہا اور ایک دم سے اٹھ کر چلی گئی۔ میں سمجھ ہی نہ سکا وہ کیا شے ہے۔ خیر وہ دن خیر و عافیت سے گزار کر میں ہاسٹل چلا گیا۔

ہاسٹل تو تھا ہی کالج بھی ایک نئی دنیا تھی۔ مجھے چند دن لگے کالج اور پھر ہاسٹل کو سمجھنے میں۔ اس طرح میری زندگی کا ایک نیا دور آ گیا۔ ہر آنے والے دن میرے دوستوں اور دشمنوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ میرے اردگرد ہر طرح کے لڑکے لڑکیاں جڑتے چلے گئے۔ میں کافی عرصہ صائمہ سے دور رہا لیکن دھیرے دھیرے مجھے سمجھ آ گئی، وہ ایک عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس گروپ کی واحد لڑکی تھی جو کالج میں آ رہی تھی۔ ورنہ مجھ سے مار کھانے والے یا تو کالج چھوڑ چکے تھے یا پھر آتے ہی نہیں تھے۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ وہ میرے قریب ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

اس دن صائمہ مجھے اپنی نئی اور مہنگی کار میں شاہدرہ کے علاقے میں موجود جہانگیر کے مقبرے پر لے گئی۔ کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد وہ ایک روش پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

’’یہاں کیوں لے آئی ہو؟‘‘

’’مجھے یہاں کا ویرانہ بہت پسند ہے۔ کچھ لوگ ہوں گے اِکا دُکا، ورنہ ماحول میں کتنا سکون ہے۔‘‘

’’یہ سکون وہاں کالج میں بھی بیٹھ کر لیا جا سکتا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کالج کو چھوڑو...... یہاں کے ماحول کی سنو...... یہ

pklibrary.com

پوچھو تو جب میں تمہیں وہاں دیکھتی ہوں، تمہارا وحشی پن میری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، میں اب بھی تم سے خوف زدہ ہوں۔'' وہ نجانے کس رو میں کہہ گئی۔

''پھر مجھ سے دوستی کیوں کی؟'' میں نے پوچھا تو وہ الجھتے ہوئے بولی۔

''علی میری ایک بات سنو...... ایک لڑکی ہونے کے ناتے میرے لیے تم میں بے انتہا کشش ہے۔ سبھی لڑکیوں میں تمہارے لیے کشش ہوگی، لیکن میں تمہارے ساتھ کچھ وقت اچھا گزارنا چاہتی ہوں، مجھے تم سے محبت بھی نہیں ہے اور نہ کوئی عشق وشق ہے، بس تم اچھے لگتے ہو، جتنا وقت ہم یہاں اس کالج میں ہیں، میں چاہتی ہوں، ہم یہ وقت بہت اچھا گزاریں۔''

مجھ سے اگر کوئی لڑنے کے بارے میں بات کرتا، بنوٹ کے کسی پینترے کی گفتگو کرتا، کشتی کے کسی داؤ کے بارے میں بتاتا تو مجھے اس کی بڑی سمجھ آتی تھی لیکن اگر کوئی عشق، محبت اور پیار وغیرہ کی باتیں کرتا تو مجھے یہ بالکل ہی فضول اور غیر منطقی سی لگتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے لڑکیوں سے نفرت تھی یا مجھے وہ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بس مجھے سمجھ نہیں آتی تھیں۔

''اچھا تم اپنا وقت بہت اچھا گزارنا چاہتی ہو، مجھ سے پوچھا کہ میں بھی ایسا چاہتا ہوں یا نہیں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا تو چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''اب تم چاہو تو...... میرا تم پر کوئی زور تو نہیں ہے۔''

''ہاں بس یہ زور زبردستی والے جذباتی تعلق نہیں چلیں گے۔'' میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ اس دن ہم کافی وقت گزار کر ایک ریستوران میں آئے وہاں سے کھانا کھایا۔ صائمہ نے بڑے انداز سے بل دینے کی کوشش کی تو میں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اگرچہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن ان دنوں میں اسے بہت بُرا سمجھتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے ایک عورت مجھ پر خرچ کرے، یہ میری مردانگی کی توہین تھی۔ بس ایسی ہی سوچیں تھیں۔

ایسے ہی ایک دن وہ مجھے جلو پارک کی طرف لے گئی۔ اس نے کار پارک کی اور وہیں قریب ہی ایک کپڑا بچھا کر بیٹھ گئی۔ ہمارے اردگرد درخت تھے، سبزہ تھا، تنہائی کے ساتھ خاموشی تھی۔ وہ کھانا بھی لے کر آئی تھی۔ یونہی باتیں کرتے کھاتے پیتے کافی وقت گزر گیا۔ اس وقت وہ دونوں ہتھیلیوں سے پیچھے کی طرف ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی خاموشی میں کافی وقت گزر گیا تو اچانک دھیمے سے لہجے میں بولی۔

''علی میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''بولو، ایسی کیا خاص بات ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''خاص نہیں، بہت ہی خاص بات ہے۔'' اس نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بولی۔ ''دیکھو، بات جیسی بھی ہو، اس پر بھڑکنا مت، بلکہ غور کرنا، سوچنا میری بات پر۔''

''اچھا کہو، کیا کہتی ہو۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''علی، میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے، تم اس دنیا میں اکیلے ہو، یہ تم لڑتے جھگڑتے ہو، تم میں بے انتہا حوصلہ ہے۔ لیکن کب تک؟ ایک دن تم مارے جاؤ گے، یا تمہارے ہاتھوں کوئی قتل ہو جائے گا، پھر زندگی جیلوں میں گزرے گی، یہ حوصلہ، یہ قوت یہ سب دھوکا ہے۔ کیا فائدہ اس کا؟'' اس نے کہتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تو میں نے پوری ایمانداری سے کہا۔

''میں خود نہیں جانتا صائمہ کہ اس کا نقصان ہے یا فائدہ۔''

''میں نے دیکھا ہے، نہ تم کسی سے بھتا لیتے ہو، نہ کسی کو بلیک میل کرتے ہو، نہ کسی تنظیم کے ساتھ چلتے ہو، آخر ایسا کیوں کرتے جا رہے ہو؟'' اس نے پھر گھما کر یہ سوال کیا تو میں نے ویسا ہی جواب دیا۔

''میں نہیں جانتا، شاید میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، اس لیے۔''

''یہ دنیا ہے نا، یہ ہر کسی کو توڑ دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ٹوٹا ہوا ہو تو دوسرا کوئی ٹوٹا ہوا مضبوط کر دیتا ہے۔ دو ٹوٹے ہوئے مل کر مضبوط ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسا ہے نا؟'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''صائمہ تم وہ کہو، جو کہنا چاہتی ہو، پہیلیاں نہ ڈالو۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر سنو...... میں بھی ٹوٹی ہوئی ہوں اور تم بھی، میں تم......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''تم ٹوٹی ہوئی، میں سمجھا نہیں؟''

''چھوڑو، اس بات کو، جو میں کہہ رہی ہوں وہ سنو۔

میں اتنا پیسا لا سکتی ہوں کہ ہم ایک بہترین زندگی گزار سکتے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لو اور ہم نہیں غائب ہو جائیں۔ جہاں کم از کم چند برس ہمیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔ یا پھر...... اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے پیسا بنائیں، اور......" وہ کہنے لگی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

"پہلی والی بات تو ہو نہیں سکتی، دوسری بات کے بارے میں بتاؤ، اس میں پیسا کہاں سے بنانا ہے۔"

"یہیں اس کالج میں ہیروئن پھیلا کر۔ بلکہ جو کوئی مانگتا ہے، اسے دیں گے۔ پیسا بنائیں گے۔" اس نے ایک دم سے کہہ دیا۔

صائمہ تم نے میرے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن ایسا سب چل رہا ہے، ہمیں کرنا صرف یہ ہے کہ ان لوگوں کو بھگا کر اپنا نیٹ ورک بنانا ہے، بس۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں صائمہ، ان لوگوں کو بھگانا ہے اور کسی کو ایسا کرنے بھی نہیں دینا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"ابھی تم جذباتی انداز میں کہہ رہے ہو لیکن میری باتوں پر غور کرنا۔"

"اچھا کروں گا۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا اور اسے چلنے کو کہا، میرا من اس سے اُوب گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا، اس نے بھی اپنے مقصد کے لیے میرے ساتھ دوستی کی تھی۔

وقت گزرتا رہا، کالج کا ایک برس مکمل ہو گیا تھا۔ اس دوران نجانے کتنی لڑائیاں ہوئیں، کتنے جھگڑے ہوئے، لیکن میں اور میرے ساتھ جڑنے والے لڑکے اور لڑکیوں نے کالج پر اپنا رعب قائم کر لیا تھا۔ ہم جو چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ منشیات بیچنے والوں کا ایک گروہ جو کالج میں سرگرم تھا، اسے ختم کرتے ہوئے ہمیں کچھ وقت لگ گیا لیکن ہم نے کر دیا۔ اس دوران صائمہ نے پھر ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ میرے رنگ میں ڈھل گئی۔

کہتے ہیں انفارمیشن سب سے بڑی قوت ہے۔ صائمہ کہاں سے اور کیسے معلومات لاتی تھی، میں نہیں جانتا تھا لیکن اس کی لائی ہوئی ہر خبر سو فیصد درست اور پکی ہوتی تھی۔ بہت سے ایسے معرکے، جن میں بظاہر ہم شکست کھا چکے ہوتے تھے، ایسی ہی اطلاع پر ہم نے جیتے۔ نجانے اُسے کیسے خبر ہو جاتی تھی کہ گوالمنڈی میں کن لوگوں کی میٹنگ ہمارے خلاف ہوئی ہے۔ کون دوسرے کالج سے بندے تیار کر رہا ہے، کس نے ہمیں گھیرنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ اسے سب پتا ہوتا تھا۔ وہ میری شکست نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ مجھ پر بے تحاشا پیسا خرچ کرتی تھی۔ یوں جیسے اس کا مشغلہ ہی یہی ہو۔ میں اگر اسے روکتا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ میں نے بھی اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ میرا اور اس کا تعلق بس یونہی چلتا رہا۔

کالج کے آخری دن چل رہے تھے۔ امتحان قریب آ گئے۔ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا تھا۔ بس وقت گزاری کی تھی۔ انہی دنوں چاچا عبدالمجید نے مجھے ایک لڑکے سے متعارف کروایا۔ چھریرے بدن کا، سرخ و سفید، درمیانہ سا قد، تیکھے نین نقش، چہرے پر سنجیدگی، داڑھی مونچھیں جیسے ابھی پھوٹ رہی تھیں — گہری آنکھوں والا وہ لڑکا میرے پاس ہاسٹل میں آیا تھا۔

"میں ہوں شہباز وڑائچ۔" دروازے پر کھڑے اس لڑکے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا۔

"آؤ، اندر آ جاؤ۔"

وہ اندر آ کر بے تکلفی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک دم سے ہنس دیا، پھر بولا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں جس مقصد کے لیے آئے ہو، ہو جائے گا تم سے؟"

"مطلب تم چاچا کی صلاحیتوں پر شک کر رہے ہو؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو میں ہنس دیا اور خوشگوار لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

"کافی تیز لگتے ہو۔"

"گانٹھ کھلنے میں اگر دیر لگتی ہے نا تو رسی کاٹ دینی چاہیے۔ مجھے بھوک لگی ہے، کھانا یہیں منگوا لو۔ باہر گاڑی میں میرا بیگ پڑا ہے، وہ منگواؤ، مجھے فریش ہو کر تھوڑی دیر سونا ہے، پھر بات کریں گے۔" اس نے یوں کہا جیسے حکم دے رہا ہو۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایسی ہی صورتِ حال میں کہتے ہیں نا گدھے کو باپ بنانا۔"

"جو مرضی سمجھو، جتنی خدمت کرو گے اتنا پھل پاؤ گے۔" اس نے کہا اور جوتے اتارنے لگا۔ نجانے کیوں مجھے

pklibrary.com

اس کا بے تکلفانہ انداز بے حد پسند آیا تھا۔ وہ بستر پر پھیل گیا تو میں نے کار کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

شہباز وڑائچ میری جگہ امتحان دینے آیا تھا۔ چاچا عبدالمجید نے ہی اس کا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر ہے اس میں ایسی خوبی تھی جو اسے میرے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کو... میرے پاس تقریباً ایک ماہ رہنا تھا۔ مجھے وہ پہلی نگاہ میں ہی اچھا لگا تھا۔ اس رات میں اسے اچھے سے ریستوران میں کھانے پر لے گیا اور جس وقت ہم واپس آئے تو وہ میرے ساتھ اس طرح گھل مل گیا تھا جیسے ہم میں برسوں کی دوستی ہے۔

شہباز میرے پاس ایک ماہ سے بھی کم وقت رہا تھا۔ اس نے وہ مرحلہ بخوبی طے کرلیا تھا جس کے لیے وہ میرے پاس آیا تھا۔ جس دن وہ واپس جانے لگا تو میں نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''یار دل لگ گیا تھا تیرے ساتھ، کچھ دم مزید رہ جاؤ، کیا کرنا ہے جا کر؟''

''یار تم ہو خشک بندے۔ تم خود اپنی زندگی میں رنگینی نہیں لانا چاہتے ہو۔ اور سچ پوچھو تو مجھے یہ خشک زندگی پسند نہیں ہے۔'' اس نے صاف لفظوں میں میرا کچا چٹھا سامنے رکھ دیا۔

''میں نے تمہیں کسی رنگینی سے روکا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم چاہو بھی تو مجھے نہیں روک سکتے، مگر میری چاچا سے کمٹمنٹ تھی۔ وہ میں نے پوری کر دی۔ اب جانا ہے مجھے۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔ پتا نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔ بہر حال وہ اپنی بہترین یادیں چھوڑ کر چلا گیا۔ امتحان بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اب صرف رزلٹ کا انتظار تھا۔ وہ وقت تو گزارنا تھا۔

میں واپس چاچا عبدالمجید والے گھر آ گیا۔ میرا دن لالہ فخر کے ڈیرے پر گزرتا تھا اور شام اپنے گھر میں، لالہ ہی کے ایک شاگرد نے جم کے ساتھ ایک شوٹنگ کلب بنا لیا تھا، میں نے وہ جوائن کرلیا۔ میرا بہت وقت وہیں گزرنے لگا۔ چاچا عبدالمجید کے یہاں کچھ دن میں اکیلا رہا پھر دو تین لوگ مزید رہنے کے لیے آ گئے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ان کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بس وہ کھاتے پیتے، سوتے اور موج مستی کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک شام ہم ریستوران سے کھانا کھا چکے تو ان میں سے ایک کے من میں نجانے کیا آئی۔

''یار آج تو گانا سننے کو من کر رہا ہے۔''

''ابے او مغل شہزادے، وہ دور گیا، جب مغنیہ نغمہ سرا ہوا کرتی تھیں۔ تم لکھنو میں نہیں لاہور میں رہتے ہو۔'' دوسرے نے کہا۔

''بس سننا ہے آج، میں بڑا غمگین ہوں۔''

''کیا تمہاری معشوقہ نے تمہیں بھائی کہہ دیا ہے آج؟'' دوسرے نے جل کر کہا، تیسرا ابھی تک خاموش تھا، دونوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''چل اس چھوٹے سے پوچھتے ہیں، جو یہ کہے گا۔''

''میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''چل پھر آج اسے تجربہ کروا دیتے ہیں۔'' تیسرے نے ہنستے ہوئے کہا اور قریبی پبلک کال آفس میں چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے فون کیے اور واپس آ کر بولا۔ ''چل ٹیکسی پکڑ، چلتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھے گلبرگ تھرڈ کے علاقے کی جانب جا رہے تھے۔ کہنے کو تو طوائفیں ہیرا منڈی میں ہوتی تھیں، لیکن عرصہ ہوا، ہیرا منڈی اُجڑ چکی تھی۔ جب ہیرا منڈی اجڑی تھی، تب وہاں کی طوائفیں اپنی حیثیت کے مطابق مختلف علاقوں میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ جو امیر تھیں، وہ ڈیفنس، گلبرگ اور ماڈل ٹاؤن وغیرہ چلی گئی تھیں۔ ہم ایک مارکیٹ میں جا پہنچے۔ ایک دکان کے سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ تیسرے شخص کے ساتھ بڑے تپاک سے ملا۔ گپ شپ ہوئی اور ہمیں لے کر وہ پیدل ہی چل پڑا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہمیں ایک بنگلے میں لے گیا۔ پہلی نگاہ میں وہاں ایک گھریلو سا ماحول تھا۔ تیسرا شخص تھوڑی دیر کے لیے اس شخص کے ساتھ کہیں اندرونی کمرے میں گیا، پھر لاؤنج میں آیا تو وہ ہمیں ایک بڑے سے تہ خانے میں لے گیا۔ جو شاید بنایا ہی اس مقصد کے لیے تھا۔ وہاں وہی پرانا ماحول تھا، جو فلموں میں دکھائی دیتا تھا۔ سازندے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑے خوشامدانہ انداز میں ہماری پذیرائی کی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ایک موٹی سی ادھیڑ عمر عورت وہاں آ گئی۔ اس کے ساتھ دو تین لڑکیاں تھیں جنہوں نے کھانے پینے کا سامان اٹھایا ہوا تھا، وہ رکھ کر چلی گئیں۔ موٹی عورت اسی تیسرے شخص سے باتیں کرنے لگی۔ سازندے ہلکی ہلکی موسیقی بجا رہے تھے۔ تبھی دو لڑکیاں وہاں آ گئیں۔ ان میں سے ایک کو دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ وہ صائمہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت اتنی گہری تھی کہ

میں اسے پہچانتے ہوئے بھی شک میں پڑ گیا کہ ممکن ہے یہ کوئی اور ہو۔ ایک لڑکی وہیں سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے گانا شروع کر دیا، جبکہ صائمہ نرت بھاؤ دینے لگی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گیت کے ساتھ موسیقی کی تان تیز ہوتی گئی۔ وہ وہی پنجابی فلمی گانے گا رہی تھیں۔ میں بجائے لطف لینے کے بے چین ہو چکا تھا۔ مجھے وہاں پر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن جبر کیے بیٹھا رہا۔ اسی طرح دو گھنٹے گزر گئے۔

رات گئے جب ہم وہاں سے نکلے تو میرے اندر کئی سوالوں کے ساتھ دبا دبا غصہ بھی تھا۔ مجھے یاد تھا کہ صائمہ نے مجھے منشیات بیچنے کی ترغیب دی تھی۔ میں اگر کوئی آوارہ ہوتا تو شاید اس کام پر لگ جاتا، لیکن میری تربیت چاچا عبدالمجید کر رہا تھا۔ ہر ویک اینڈ پر میری اس سے تفصیلی بات ہوتی تھی۔ لیکن صائمہ ایک طوائف زادی نکلے گی، مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا۔ جب تک ہم گھر پہنچے، میں اسے ذہن سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے ذہن میں ابھرتی رہیں۔ صائمہ کا یہ رنگ دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ اس کی بہت ساری باتیں میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ایک افسردگی سی مجھ پر طاری ہوگئی اور یہ کئی دن تک رہی۔

انہی دنوں میں دوپہر کے وقت لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا کہ فون بج اٹھا۔ میں فون تک گیا، کریڈل اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ہلکی سی آواز ابھری۔

''صائمہ بات کر رہی ہوں۔''

''تمہیں یہاں کا نمبر کس نے دیا؟'' میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''یہ سوال نہیں کرتے۔'' اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''او...... چلو ٹھیک ہے، یہ تو پوچھ سکتا ہوں نا کہ......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ میں نے فون کیوں کیا۔ یہی نا؟'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''سوچا تھا تم سے کبھی بات نہیں کروں گی، کبھی نہیں ملوں گی، مگر تمہیں دیکھا تو پھر مجھ سے رہا نہیں گیا۔''

''کہو جو کہنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وقت بیت گیا ہے علی، اب شاید ہم نہ مل پائیں، ہاں کچھ دیر مل بیٹھ کر باتیں ہی کر سکتے ہیں۔ اور پھر وہ باتیں بھی کیا ہوں گی۔ دکھ دینے والی۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس کی آواز میں درد بول رہا ہو۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''نہیں میں ایک بار تم سے ملنا چاہتی ہوں، بس ایک بار، پھر کبھی نہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، جب چاہو۔'' میں نے کہا تو ہمارے درمیان اگلے دن ہی کے لیے وقت اور مقام طے ہو گیا۔

میں نے مارکیٹ میں اپنی کار پارک کی اور اسی مخصوص جگہ پر جا کھڑا ہوا، جہاں ہمارے درمیان طے ہوا تھا۔ وہ ایک مہنگی کار میں وہیں آ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو اس نے کار بڑھا دی۔ ہم نہر کنارے چلتے چلے گئے۔ حال احوال کے بعد ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ کچھ دیر بعد نہر کے ساتھ بائیں جانب ایک بنگلے کے سامنے گاڑی روک کر ہارن دیا۔ لمحوں میں گیٹ کھل گیا۔ ہم گاڑی سمیت اندر چلے گئے۔ دو ملازم ہمارے انتظار میں تھے۔ رہائشی حصے کے ساتھ ایک ایسا حصہ بھی تھا جو بانسوں سے بنایا گیا تھا۔ اس نے گاڑی پورچ میں روکی اور ہم وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

''ہاں بولو، کیا بات کرنی ہے مجھ سے؟''

''تم پوچھو کسی کھیل میں......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''تم جو کچھ بھی ہو، مجھے اس سے کیا لینا دینا، تمہاری اپنی زندگی ہے۔''

''تم جانتے ہو، یہاں لاہور کی روایات میں طوائف اور پہلوان کی بڑی دوستی رہتی ہے، دونوں کی آخرت بڑی خراب ہوتی ہے۔'' اس نے درد بھرے لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔

''کیا تم مجھے یہی کہنے یہاں لائی ہو؟''

''نہیں، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تو کہو نا، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

''علی تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں جب بھی کوئی اطلاع دی وہ ہمیشہ درست ہوتی تھی؟'' اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔

''ہاں، اور مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ تمہاری اطلاع درست کیسے ہوتی ہے۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی حیرت والی بات نہیں ہے، طوائف کے پاس کوئی کچھ نہیں چھپا سکتا، سب ننگے ہوتے ہیں۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا کہو کیا کہنا ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ نرم لہجے میں بولی۔

"میں کچھ کہنے سے اس لیے جھجک رہی ہوں کہیں تم مجھے غلط نہ سمجھو اور نہ ہی میں تمہیں اُلجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ علی مجھے تم سے محبت تھی اور اب بھی ہے، عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھول سکتی۔ اس ملاقات کے بعد میں تم سے نہیں ملوں گی، بس تمہیں ایک اطلاع دینا تھی، پھر تم جو بہتر سمجھو۔"

"تم نے جو کہنا ہے کہہ دو۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تم جن لوگوں کے ساتھ آئے تھے، انہیں میں ہی نہیں میری ماں بھی جانتی ہے اور بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ اب مجھے حیرت نہیں ہو رہی کہ تم کالج میں کیوں کامیاب رہے ہو، غنڈوں کے گروہوں سے کیسے تن تنہا نمٹ گئے ہو۔ یہ بھی مجھے اسی دن پتا چلا، تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں۔ علی...... یہ لوگ مجھے نہیں پتا...... یہ مافیا ہیں مافیا۔ ابھی تمہارا کچھ نہیں گیا۔ ابھی تم یہاں سے نکل سکتے ہو۔ جس دن تمہارے ہاتھوں کوئی قتل ہو گیا، پھر تم کہیں کے نہیں رہو گے۔ پھر جو یہ کہیں گے، وہی کرنا پڑے گا۔" اس نے تیز تیز کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کر کے ایک دم سے طویل سانس لیا۔

"میں تمہاری معلومات کو غلط نہیں کہوں گا۔ تم نے جو کہا، وہ بالکل درست ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے ان سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن صائمہ، میں نے بچ کر جانا کہاں ہے؟ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دن مر جانا ہے، وہ تو ویسے بھی مرنا ہے۔ مجھے کوئی بھی رونے والا نہیں۔"

"مجھے تمہیں بتانا تھا، بس بتا دیا، اب تم جانو اور تمہارا کام۔" اس نے دکھ سے کہا۔ کیونکہ میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ کچھ دیر بعد رہائشی حصے میں ہمارے لیے کھانا لگا دیا گیا۔ ہم نے کھانا کھایا، وہاں اپنے بارے میں باتیں کرتے کچھ وقت اور گزارا اور پھر وہ مجھے وہیں ڈراپ کر کے چلی گئی۔ اس دن مجھے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ ایسا اتفاق کیوں ہوا تھا؟ ہاں یہ میں سمجھ رہا تھا کہ صائمہ اگر دوبارہ ملی بھی تو ایسا ہونا ایک اتفاق ہی تھا۔

صائمہ نے جو بھی کہا تھا، وہ سچ تھا۔ میں اس کی بات سے متفق تھا یا نہیں، اس کی بات مانی یا نہیں، لیکن میں اس کے خلوص پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ بہ ظاہر اب ہمیں کبھی نہیں ملنا تھا۔ اب اس کی کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی میری ذات کے ساتھ۔ لیکن وہ مجھے ایک سوچ دے گئی۔ میں شام تک مختلف حوالوں سے سوچتا رہا۔ میں جب بھی کوئی فیصلہ کرنے لگتا، مجھے میرا جلتا ہوا گھر یاد آنے لگتا، مجھے اپنی ماں اور بہن کی نعش دکھائی دینے لگتی۔ مجھے اپنے باپ کے وہ دردناک الفاظ سنائی دیتے، جو اس نے مجھے بچانے کے لیے چیخ چیخ کر کہے تھے۔ مجھے واپس روہی جانا تھا، اور اس قدر طاقت ور ہو کر جانا تھا کہ میں اپنا بدلہ لے سکوں۔ اس رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر جینا ہے تو صرف اپنا بدلہ لینے کے لیے۔ اس کے بعد میں مر بھی جاؤں تو کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ صائمہ جسے مافیا کہہ رہی تھی، یہ میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ اسی نے مجھے اتنا مضبوط کرتا تھا، ورنہ اب تک میں سمجھ گیا تھا کہ میرے معاشرے کا نظام انتہائی بوسیدہ ہی نہیں، بدبودار بھی ہے اور یہاں وہ گدھ ہیں جو لاشوں کو نوچنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ میں اپنی لاش ان کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تو اس رات کے بعد ایک نیا علی زین میرے اندر جاگ گیا تھا۔

☆☆☆

چاچا عبدالمجید کے گھر رہتے میرا وہی معمول تھا، کھانا، پینا سونا، اور ورزش کے لیے جم جانا۔ جب من کرتا، میں لالہ فخر کے ڈیرے پر چلا جاتا۔ وہاں دوستوں کے ساتھ ہوتا۔ ان کے ساتھ گھومتا پھرتا، ہنوٹ کا کوئی داؤ سیکھتا، اکھاڑے میں اترتا، کوئی نیا اسلحہ آ جاتا تو اسے دیکھتا، سیکھتا اور چلانے کی کوشش کرتا۔ بس ایسے ہی آوارگی میں رہا۔ صائمہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ میں نے رابطہ کیا۔ میں اپنے دماغ میں ایک مقصد بنا چکا تھا اور کسی بھی وقت چاچا عبدالمجید سے بات کرنے والا تھا۔ میں نے صائمہ سے بات ہونے کے بعد انتقام لینے کا جو فیصلہ کیا تھا، روہی جانے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بھی بنا لیا تھا۔

ایک شام میں لالہ فخر کے ڈیرے سے واپس آیا تو چاچا عبدالمجید لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ اس کی شخصیت کافی رعب دار تھی۔ میں جب آیا تو وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ چائے وغیرہ پی کر

pklibrary.com

وہ چلا گیا۔ تبھی چاچا نے پوچھا۔

''کیسی گزر رہی ہے آج کل؟''

''چاچا، میں روہی جانا چاہتا ہوں۔ یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے ایک دم سے کہہ دیا تو چاچا نے بڑے اطمینان سے میری طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا کرنے جانا ہے؟''

''مجھے ان سے انتقام لینا ہے جنہوں نے میرا گھر اجاڑا ہے، مجھے یتیم کر کے دربدر کیا۔'' نجانے میرے لہجے میں کیا تھا کہ مجھے خود سے خوف آنے لگا، میری نفرت ابل پڑی تھی۔ میں خود پر قابو پانے لگا تو چاچا کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

''کیسے کرو گے؟''

''میں جاؤں گا، اور ان میں سے جو ملا، اسے ماردوں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہہ دیا تو انہوں نے پوچھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ایسا کر دو گے؟''

''ہاں میں کرلوں گا۔'' میں نے کہہ دیا۔

''دیکھو علی، میں تمہیں روک نہیں سکتا، تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو لیکن اگر تم ناکام ہو گئے تو؟ انہوں نے تمہیں مار دیا تو؟ تمہاری لڑائی لڑنے یہاں سے تمہارے ساتھ کوئی نہیں جائے گا۔ تمہیں اپنی جنگ اکیلے لڑنی ہے۔ فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جاتے ہیں۔'' انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''یہی ہوگا نا کہ میں مر جاؤں گا، تو کیا ہوا، میں......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولے۔

''یہی جذباتی پن ہے۔'' وہ چند لمحے میری جانب دیکھ کر رک کے پھر بولے۔ ''شکاری کو اس وقت میدان میں اترنا چاہیے، جب وہ شکار کرنے کے سارے ہنر جانتا ہو، جب اسے پتا ہو کہ وہ شکار کو گھیر کر قابو کر سکتا ہے۔ یہ لڑائی جھگڑے، مار پٹائی، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''مجھ میں حوصلہ ہے۔'' میں نے پہلی بار ان سے اختلاف کیا۔

''میں مانتا ہوں، تم میں بے انتہا حوصلہ ہے، اسی بل بوتے پر تم یہاں تک ہو، ورنہ کب کے خاک ہو چکے ہوتے یا کسی ہوٹل پر برتن مانجھ رہے ہوتے۔ کسی گھر میں ملازم ہوتے یا پھر دھکے کھا رہے ہوتے۔ تمہارا دشمن بہت طاقتور ہے، وحشی اور ظالم ہے۔''

''تو پھر اسے ظلم کی سزا ملنی چاہیے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''میں نے کب کہا نہیں ملنی چاہیے۔ ملنی چاہیے اور ضرور ملنی چاہیے لیکن اس وقت جب تم اپنی مرضی سے اسے سزا دے سکو۔'' چاچا نے سکون سے کہا۔

''یہ کب ہوگا؟'' میں نے حسرت سے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا لیکن ایک بات یاد رکھو، جنگل کا بادشاہ بھی اپنے شکار پر اس وقت تک نہیں جھپٹتا، جب تک اسے پورا یقین نہ ہو کہ وہ شکار اس کی دسترس میں آجائے گا۔ نشانہ اسی وقت لگتا ہے میرے بیٹے...... جب سامنے ہدف پوری طرح واضح ہو۔'' انہوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

''میں خود کو تیار کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کب منع کیا ہے۔ ابھی جو شخص میرے پاس بیٹھا تھا، میں نے اس سے تمہارے بارے میں بات کی ہے۔ بس دو دن ہیں پھر تمہیں ایک ایسے اکھاڑے میں اُتاروں گا جہاں تم کندن بن جاؤ گے۔ بس ایک بات یاد رکھنا، اپنے اندر کی آگ کو بجھنے مت دینا۔ تمہیں ایک دن روہی واپس جانا ہے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینا ہے جیسے ہی وہ ہدف پر آئے تب۔'' چاچا نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ میرے بارے اتنا سوچ رہے ہیں؟ میں ایک لفظ بھی مزید نہ کہہ سکا اور خاموش ہو گیا۔

دو دن بعد کیا ہوگا، یہی سوچتے ہوئے دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن چاچا عبدالمجید صبح صبح ہی آ گئے۔ مجھے جلدی سے تیار ہونے کو کہا۔ میں تیار ہو کر آیا تو ناشتے کی میز پر وہ صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

''یہ سرفراز صاحب ہیں، تمہیں ان کے ساتھ جانا ہے۔ یہ تمہیں بھرتی کروا دیں گے۔ اب یہی تمہارا خیال رکھیں گے۔ جب بھی وقت ملے، ملنے کے لیے آجایا کرنا۔'' چاچا عبدالمجید نے اطمینان سے کہا۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا تو سرفراز صاحب بولے۔

''اب بیٹا تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، جہاں ہو گے وہی ٹھکانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مؤدب لہجے میں کہا تو چاچا نے ناشتا شروع کر دیا۔

میں نے دو برس سخت ترین ٹریننگ میں گزارے۔

وہ وقت کیسا تھا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ گرمیوں میں تپش سے پسینا بہتا تھا تو سردیوں میں پہاڑوں کی چوٹی پر پسینا دلایا جاتا تھا۔ وہ دو برس میری زندگی کا انمول دور تھا۔ اگلا پورا ایک برس مختلف جنگلوں اور بیابانوں میں گزرا۔ مجھے سمجھ میں آگیا کہ چاچا عبدالمجید کیوں چاہتے تھے کہ میں یہ ٹریننگ کروں۔ میں بدل کر رہ گیا تھا۔ نہ صرف موت کا خوف میرے اندر سے نکل گیا تھا بلکہ موت سے آنکھیں ملانے کی قوت اپنے اندر پیدا کر چکا تھا۔

ان دنوں ہم شہر میں آگئے تھے۔ میں چاچا عبدالمجید کے پاس چند دن رہ کر واپس آیا تو مجھے یہ حکم ملا کہ میں ایک فیملی کے ساتھ رہوں۔ وہ فیملی ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کی تھی۔ ان کے دو بچے تھے، ایک بیٹا اور بیٹی، وہ کہیں ددھیال میں رہتے تھے، وہیں انہوں نے پرورش پائی۔ ان کے پاس ہم چھ لوگ تھے اور مختلف اوقات میں ان کی سیکیورٹی کے لیے موجود ہوتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں وہ دونوں میاں بیوی درویش صفت لوگ تھے۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے سے لے کر پڑھنے لکھنے تک۔ وہاں رہ کر میں نے دنیا اور دنیاداری کے بارے میں پڑھا، زندگی ایک نئے ڈھنگ میں داخل ہونے لگی تھی۔ وہاں ہمیں اس دنیا سے بھی متعارف کروا دیا گیا۔ جب بھی فائزہ ملک میرے ساتھ ایک ماں جیسا سلوک کرتیں تو مجھے میری ماں یاد آجاتی، جب کامران ملک میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے تو مجھے اپنے باپ کی آخری آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ میں وہاں ان کے پاس تقریباً چھ برس رہا۔ ہر آنے والا دن مجھے روہی کی یاد دلاتا۔ مجھے اپنی تربیت پر ناز ہونے لگا تھا۔ پھر ایک دن دونوں میاں بیوی کی نوکری ختم ہوگئی۔ اس لیے ہمیں بھی وہاں سے جانا پڑا۔ جس دن ہم ان سے الگ ہو رہے تھے، ہم سب یوں رو رہے تھے جیسے ہمارا اپنا کوئی بچھڑ رہا ہو۔ ایک ایسی محبت تھی، جس کی ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی لیکن جدا ہوتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔

میں واپس لاہور آگیا۔ میرے لیے یہاں بہت کچھ تھا۔ یہاں رہ کر میں نے بہت کام کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ لالہ فخر کا ڈیرا وہاں پر کیوں ہے؟ چاچا عبدالمجید آخر کون ہے؟ شہر میں اور بہت کچھ میرا منتظر تھا۔ یہاں رہتے ہوئے میں نے روہی کے بارے میں معلومات لینا شروع کر دیں۔ وہاں کون کیا کر رہا ہے؟ سرحد پار سے کیسے اور کیوں در اندازی ہو رہی ہے؟ دھیرے دھیرے مجھ پر سب کھلتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک دن مجھے پتا چلا کہ ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کو پتا یا سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ زیرِ زمین دنیا میں یہ ایک بڑے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اڑتی ہوئی خبر سنائی دی کہ دونوں راجھستان میں ہو سکتے ہیں؟ وہاں کیوں ہیں، اس کے پیچھے ایک طویل داستان ہے۔ خفیہ ایجنسیاں دکھاتی کچھ ہیں اور کرتی کچھ ہیں۔ پتایا سے راجھستان کا سفر کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت بڑے نیٹ ورک کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ان دونوں کی شخصیت بھی تو معمولی نہیں تھی، دوسرا یہ باور کرانا تھا کہ ہم یہ کر سکتے ہیں۔ جہاں اور بہت سارے لوگ اس کام پر لگ گئے، وہاں یہ خبر سنتے ہی میں نے اپنا پلان پیش کر دیا۔ میرے پلان کو زیادہ محفوظ سمجھا گیا۔ راجھستان میں میرا داخلہ ایک مجرم کی حیثیت سے ہونا تھا۔ اس کی بڑی وجہ مجرموں سے میل جول رکھنا تھا، انہی سے راستے ملنے کی امید تھی اور مجھے یہ ہدف دے دیا گیا۔ میں اس ہدف تک پہنچ کر کامیاب لوٹا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی دشمنی بھول جاتا۔ میں نے یہاں پر موجود اپنے ہر دشمن کو ختم کر دیا ہے۔

☆☆☆

مجھے اور ساوری کو صحن میں بیٹھے صبح ہو گئی تھی۔ یہ صبح کاذب تھی۔ ساوری نے آسمان پر تاروں کو دیکھا اور پھر میری جانب دیکھ کر پوچھا۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہاں رہتا ہوں یا چلا جاتا ہوں۔'' میں نے گول مول بات کی۔ حقیقت میں مجھے بھی علم نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں میرے لیے کیا حکم پوشیدہ تھا۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا تھا لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے اس جواب سے ساوری کو تشفی نہیں ہوئی۔ جس مقصد کے لیے اس نے سوال کیا تھا، مجھے اس کا جواب دینا تھا۔ تبھی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب جہاں میں رہوں گا، تم بھی تو وہیں ہوگی۔''

میرے یوں کہنے پر وہ بجائے خوش ہونے کے سنجیدہ ہی رہی۔ مجھے اس کی سنجیدگی سمجھ میں نہیں آئی۔

''اچھا خیر، صبح ہونے والی ہے، میں کچھ......'' وہ کہتے ہوئے اٹھنے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھا لیا، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات کیا ہے ساوری؟''

''یہ جو تم نے آخری بات کی ہے نا، یہ نرا جھوٹ ہے۔

pklibrary.com

میں جھوٹی باتوں پر کوئی امید نہیں باندھ سکتی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ایک طرح سے اس کی بات بالکل درست تھی۔ میں اگر اسے اپنے ساتھ لاہور لے بھی جاتا تو مجھے کون سا اس کے ساتھ رہنا تھا۔ میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔ یہاں بھی اپنی مرضی سے نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے پیار سے بولا۔

''ہونا وہی ہے جو رب کو منظور ہے، دل چھوٹا نہ کر، بس ہنستی مسکراتی رہا کر۔''

''اونہہ، ہنستی مسکراتی......'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھ گئی۔ اسے صحن میں پھرتا دیکھ کر رحماں مائی اٹھ کر صحن میں آ گئی۔ دونوں اپنے کام کاج میں لگ گئیں اور میں اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ جہاں کبھی میرن شاہ رہا کرتا تھا۔

اس شام میں ڈیرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بختاور میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سنا کیا خبریں ہیں ارد گرد کی؟''

''بالکل خاموشی ہے، نور حیات تو شہر میں ہے۔ اس کے بندوں کو بھی سانپ سونگھ گیا ہے۔ کسی نے بات تک نہیں کی۔ کوئی بندہ نہیں آیا پیروزاں کے جنازے پر۔'' اس نے اطمینان سے بتایا۔

''تم گئے تھے جنازے پر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں گیا تھا۔ دشمن کا جنازہ پڑھنا بھی عجیب سُرور دیتا ہے۔'' اس کے لہجے میں اب بھی نفرت جھلک رہی تھی، وہ لمحہ بھر خاموش رہا پھر بولا۔ ''میں دیکھنا چاہتا تھا علی، کون کون آتا ہے اس کے جنازے پر۔ خیر، وہ گئی اگلے جہان، اب اس کا ذکر ہی کیا کرنا۔''

''اب ایک کام اور کرنا ہے بختارو۔'' میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''کیسا کام؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں سرحد پار سے آئے جتنے بھی راجستانی ہیں، پتا کرنا ہے کون، کہاں پر، کیا کر رہا ہے۔ ان سب کو نگاہ میں رکھنا ہے۔'' میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیوں، ایسا کیا کرنا ہے ان کا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو، جو عام راجستانی ہیں، بے ضرر سے کاروباری، انہیں تو کچھ نہیں کہنا۔ لیکن جو کریمنل ہیں، کسی بھی حوالے سے غیر ملکی ایجنٹ ہیں، انہیں پکڑنا ہے، ان سے کام لے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں تمہاری بات تو ٹھیک ہے، آگے ہم نے کام دھندا بھی تو چلانا ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے میری بات سمجھ رہا ہو۔ مجھ میں اور بختاور میں یہی فرق تھا۔ وہ تربیت یافتہ نہیں تھا۔ جس میں جسمانی مضبوطی کے علاوہ ذہنی بالیدگی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ وقت اور حالات نے اسے اس نہج پر ڈال دیا اور وہ اس روش پر چل نکلا۔ وہ میری بات کو کسی اور ہی رنگ میں سمجھ رہا تھا۔ جبکہ میں جانتا تھا کہ خطرہ کہاں سے ہو سکتا ہے۔ جس طرح مارخور کی چھٹی حس اسے بتاتی ہے کہ سانپ کہاں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح میں بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ دشمن کس طرف سے وار کر سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنی معلومات کی حد تک علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران شعیب، آفتاب، جہانگیر اور مدثر بھی وہیں آ گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ باتوں میں شامل ہو گئے۔ اچانک مجھے یاد آیا تو میں نے پوچھا۔

''اوئے بختاور، یہ سانول کدھر ہے؟''

''یہیں کہیں ہو گا، کیوں خیریت ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''اس سے بات کرنی ہے یار، فون کرواسے۔'' میں نے کہا تو بختاور نے فون نکال کر اس کے نمبر پش کیے۔ لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ وہ ڈیرے کے پار باڑے میں تھا۔ مویشی واپس آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ہمارے پاس آ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

''یار اگر تیری شادی کر دی جائے تو کیسا ہے؟''

میری بات سن کر پہلے تو اس کے چہرے پر دکھ پھیل گیا۔ وہ کتنے ہی لمحے اسی کیفیت میں رہا پھر شکستہ سے لہجے میں بولا۔

''میں تم سے بحث نہیں کر سکتا، تم جو چاہو کرو۔''

''سانول، وہ کہتے ہیں نا، بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے، رحماں مائی اس دنیا میں اکیلی ہے، تم اس کا سہارا بن جاؤ، وہ تیرا سہارا بن جائے گی۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں۔'' میں نے صاف بات بتا دی تو بختاور نے کہا۔

''بات تو علی کی ٹھیک ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا آسرا بن جائیں گے۔''

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا جیسے تم لوگوں کی مرضی۔'' سانول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ سانول، پتا نہیں مجھے یہاں رہنا ہے یا نہیں، اس سارے مال ڈنگر کے، یہاں کی سب زمین جائداد کے مالک تم ہو۔ بس لوگوں پر رحم کرنا، وہ نیلی چھت والا تم پر رحم کرے گا۔'' میں نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''یار خوشی کا موقع ہے اور تم ایسے سوگ بنا رہے ہو؟'' جہانگیر نے اونچی آواز میں کہا تو سبھی ہنس دیے تو میں بولا۔

''میں چاہتا ہوں، آج ہی ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے۔''

''اوئے کیوں یار، سانول کی شادی دھوم دھام سے کریں گے۔ پورے علاقے میں پتا چلے کہ سانول کی شادی ہوئی ہے۔ انہیں یہ بھی پتا چلنا چاہیے کہ اب سانول اس علاقے کا سردار ہے۔'' بختاور نے خوشدلی سے کہا۔

''چل جو کرنا ہے کر، برات تیرے گھر سے آئے گی۔ تو لڑکے والا بن جا، میں لڑکی والا بن جاتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سانول اٹھتے ہوئے بولا۔

''تم کرو صلاح مشورہ، میں ذرا مویشی دیکھ لوں۔'' اس کی بات پر سبھی ہنس دیے۔ پھر شادی کا پروگرام طے کرنے لگے۔

اس رات جب میں پلٹ کر رہائشی حصے میں گیا تو ساوری میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میں پلنگ پر جا کر لیٹا تو میرے پاس آگئی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہیں سے اس نے پوچھا۔

''کھانا نہیں کھایا تھا، اتنی دیر کر دی ڈیرے پر؟''

''تم نے کہا تھا سانول سے پوچھوں۔ اسے بلایا تھا میں نے۔'' میں نے کہا تو وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے تجسس سے بولی۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

تب میں نے وہاں ہونے والی ساری باتیں بتا کر کہا۔ ''میرے خیال میں تم رحماں سے دوبارہ پوچھ لو، کہیں سانول کے ساتھ اس کی شادی کر کے ہم کوئی غلطی نہ کر رہے ہوں۔''

''نہیں میں نے اس سے بات کر لی تھی۔ وہ راضی ہے۔ تم چاہو تو خود بھی پوچھ سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اسے بلاؤ، میرا خیال ہے اس سے حتمی طور پر پوچھ لیں، کل کو کوئی......'' میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں بھیجتی ہوں اسے۔ کھانا لاؤں؟''

''ہاں لے آؤ۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی اور پھر رحماں اندر آ گئی۔ وہ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش تھی تبھی میں نے اس سے پوچھا۔

''رحماں، تمہاری شادی اگر سانول سے کر دیں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے ہولے سے جواب دیا۔

''کوئی شرط، کوئی خواہش کوئی تمنا ہو تو مجھے ضرور بتاؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بس مجھے عزت کی روٹی ملتی رہے، میں اسی میں خوش ہوں۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔

ساوری کھانا لے کر آئی، تو ہم مل کر کھانے لگے۔ درمیان میں اس نے مجھ سے ڈیرے پر ہونے والی باتیں کرید کرید کر پوچھیں۔ جب کھانا کھا چکے تو اس نے برتن ایک طرف رکھ کر پوچھا۔

''اچھا تم بولو، تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟'' اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''چھوڑو اس قصے کو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ایسے میں رحماں چائے لے کر آ گئی۔ ہم چائے پیتے رہے اور شادی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ رحماں اٹھ کر گئی تو سارے برتن وغیرہ بھی لے گئی۔ ساوری میرے پاس پلنگ پر پھیل کر بیٹھ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس کی ساری باتیں اس شادی کے گرد گھومتی رہیں گی۔ وہی ہوا، کچھ دیر بعد بولی۔

''علی، تم مجھ سے شادی کرو گے نا؟''

''ظاہری بات ہے ہماری شادی ہو گی۔'' میں نے اس کی بونگیوں کا لطف لیتے ہوئے کہا۔

''کیسے ہوگی ہماری شادی؟'' اس نے پوچھا۔

''اچھا تم میرے لیے دودھ لاؤ، پھر بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

''کوئی عقل ہے تمہیں، ابھی تو چائے پی ہے، کچھ دیر ٹھہر جاؤ، پھر پی لینا۔''

''میں نے سوچا جس طرح تم عقل کی باتیں کر رہی ہو، میں بھی ویسی ہی کر لوں۔'' میں یہ کہتے ہوئے مسکرا دیا تو ایک دم سے قہقہہ لگا کر بولی۔

''سیدھے کہو، میں اب چلی جاؤں۔''

''ہاں تو جاؤ نا مجھے سونے دو۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں سوچنے لگا، ہر عورت کو اپنا گھر بنانے کی کتنی فکر ہوتی ہے، شاید یہ اس کی فطرت میں ہے۔

☆☆☆

pklibrary.com

اس شام ڈیرے کے علاوہ گھر میں بھی ''جاگے'' کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ روہی میں 'جاگا' شادی بیاہ میں ایک روایتی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں شادی بیاہ والے گھر شادی کے گیت گائے جاتے ہیں، لڈی رقص یا جو بھی خوشی حاصل کرنے کے کھیل ہوں۔ یہ ساری رات چلتا ہے۔ اس رات دولھا اکیلا ہی دلہن کے گھر آجاتا ہے۔ یہ رسم بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ دولھا جب اونٹ پر سوار ہو کر دلہن کے گھر کے پاس آجاتا ہے تو دلہن کی سہیلیاں یا کزنز اسے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔ دولھا اپنی طاقت، مہارت اور ذہنی صلاحیت کے باعث گھر میں داخل ہوتا ہے۔ وہیں رات رہتا ہے۔ اس کی خوب خدمت کی جاتی ہے، صبح اسے تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ برات پہنچ جاتی ہے۔ اس دوران دولھا اپنی دلہن کا چہرہ سہاگ رات ہی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس وقت سانول کا انتظار ہو رہا تھا۔ دوسری جانب ساوری کئی لڑکیوں کے ساتھ تیار کھڑی تھی۔ وہاں پر موجود ہر مرد عورت متجسس تھی کہ کیا ہوگا؟ میں نے چونکہ بہت بچپن میں ایسی شادیاں دیکھی تھیں، اس لیے بھول گیا تھا۔ اس وقت مجھے بھی اتنا ہی تجسس تھا۔ جس طرح وقت گزرتا جارہا تھا، نجانے کیوں میرے اندر ایک بے چینی پھیلتی جارہی تھی۔ یہ سب اتنا پُرسکون کیوں ہو رہا ہے؟ دو دن پہلے پیروزاں کو مارا تھا، کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کا انتقام لینے کے لیے آتا؟

اتنی سمجھ تو مجھے بھی تھی کہ یہ دنیاداری ہے، جب تک مفاد وابستہ ہے، تب تک ساتھ دیا جاتا ہے، جب فائدہ دکھائی نہیں دیتا، تب اجنبی بن جاتے ہیں اور جہاں نقصان کا اندیشہ ہو، وہاں دشمنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس روہی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو پیروزاں اور میران شاہ کا انتقام لینے آجاتا۔

شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ روشنی کا انتظام کیا ہوا تھا۔ میں یونہی چلتا ہوا ڈیرے کے پھاٹک تک چلا گیا۔ بستی کی طرف سے عورتیں اور بچے آرہے تھے۔ میرے پاس آکر بختاور کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس وقت پتا چلا، جب اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے علی، بڑے پریشان لگ رہے ہو؟''

''بختاور...... سب ٹھیک ٹھیک ہو رہا ہے، کوئی لڑائی نہیں، کسی نے ڈسٹرب نہیں کیا، بس اسی وجہ سے۔'' میں نے صاف لفظوں میں کہا تو بختاور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ میں نے پہلی بار اسے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہماری بھی کیا زندگی ہے یار، کچھ گڑبڑ نہ ہو تو ہمیں چین نہیں آتا۔ فکر نہ کرو، جب تمہاری اور ساوری کی شادی ہوگی تو بڑے ہنگامے ہوں گے۔ یہ تو بے چارے سانول کی شادی ہے۔''

''تمہیں کیا پتا، میری شادی ساوری ہی سے ہوگی؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''اگر ہوگئی تو...... پتا نہیں یار زندگی ہے بھی یا نہیں۔''

''آج تو ہے نا ہمارے پاس۔'' میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں آج ہے، لیکن تم اسے بھی بدمزہ کر رہے ہو۔ آؤ، جاگا دیکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک راجستانی لڑکی بھی آجائے گی، سچ میں بجلی ہے، محفل کو تڑپا کر رکھ دے گی۔'' اس نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

''کون ہے وہ، تم جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہیں کی ہے، اس کے ماں باپ کبھی بھاگ کر یہاں آئے تھے، تب سے وہ یہیں ہیں۔ شادی بیاہ پر ناچتی ہے، رنگ باندھ دیتی ہے۔ ادھر ڈیرے پر ہی ہماری محفل سجے گی، اُدھر عورتوں میں کہیں۔'' بختاور نے بجانے والے انداز میں کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ڈیرے پر بھی کوئی بیس پچیس مرد ہوں گے۔ ان سب نے کھانا کھا لیا تھا۔ پاچا سائیں نے خشک گوشت بنوایا تھا۔ جو بہت ہی لذیذ بنا تھا۔ رہائشی حصے سے شور وغل کی آوازیں آرہی تھیں، سب خوش تھے۔ ہم وہیں ڈیرے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک اونٹ ریڑھا ڈیرے کے گیٹ پر رکا۔ اس میں سے سازندے اُترے، پھر ایک کومل سی لڑکی کو اتارا گیا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس پر سفید اور سنہری ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ اس نے کاندھوں پر ایک سیاہ چادر لی ہوئی تھی۔ سر پر آنچل تھا۔ پاؤں میں نازک کھسا تھا۔ وہ سازندوں کے ساتھ وہیں آگئی۔ ان کے لیے چادریں بچھائی ہوئی تھیں، وہ سب بیٹھ گئے تو لڑکی پاؤں میں گھنگرو باندھنے لگی۔ میں نے وہاں موجود سب لوگوں پر سرسری سی نگاہ ڈالی تو مجھے زمان موہل بڑا بے چین دکھائی دیا۔ ساز بجنے لگا اور لڑکی لہکنے لگی۔ اس نے پہلا گیت ہی راجستانی چھیڑا تھا۔

''موہے من کے تار ہلا دے رے......''

وہ لہکتی رہی، دوسرا گیت شروع ہو گیا۔ میں نے

زمان موہل کو دیکھا، وہ اسی طرح بے چین تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ ڈیرے پر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شراب کے نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ بختاور بھی کئی پیگ چڑھا چکا تھا۔ شعیب، آفتاب، مدثر اور جہانگیر الگ الگ جگہ پر بیٹھے ہوئے ہوش وحواس میں تھے۔ میں نے ایسے میں دیکھا، زمان موہل وہاں نہیں تھا۔ نجانے وہ کدھر چلا گیا تھا۔ میں ابھی اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر زمان موہل کا نام تھا۔ میں نے اس کی کال سنی۔

''علی مجھے یہ ناچنے والی لڑکی گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

''ایسا کیوں لگا تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا تعلق اس بندے سے ہے، جو ہمیشہ بختاور کے خلاف رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ پیروزاں کا ساتھ دیا ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تعلق کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو صاحباں کا مرزے سے تھا۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں نہیں پوچھتا، تمہیں کیسے پتا ہے، تم ادھر آکر بیٹھو، دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور فون کا میسج بکس کھولا اور جہانگیر کو میسج کر دیا کہ ''یہ ناچنے والی اور سازندے خطرہ ہو سکتے ہیں۔'' پھر فون جیب میں رکھ کر غیر محسوس انداز میں اپنا پسٹل نکالا اور چادر کے نیچے کر لیا۔ میں نے اپنا اور بختاور کا فاصلہ دیکھا، لمحوں میں سوچ لیا کہ کیا کیا ہو سکتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ ناچ گانا ہوتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت اچھا ناچی تھی اور گایا بھی خوب تھا۔ وہ لڑکی تھک کر سازندوں کے پاس جا بیٹھی تھی۔ میں نے اسے نگاہوں میں رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ساز وغیرہ سمیٹے تو لڑکی نے بھی اپنے گھنگھرو اتار دیے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑے اطمینان سے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے زمان موہل کی طرف دیکھا۔ وہ ہنوز پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا جواب دے۔ بختاور نے اسے جو روپے دینا تھا، وہ دیے تو وہ سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔ کچھ لوگ سو گئے تھے۔ ہم چند لوگ جاگ رہے تھے۔ جہانگیر اور مدثر ان کے پیچھے ہی باہر نکل گئے تھے۔ وہ بھی واپس آگئے تھے۔ ہم سب کھڑے تھے۔ بختاور کو بھی پتا چل گیا تھا۔ ان سب کے سامنے میں نے زمان موہل سے پوچھا۔

''زمان، تمہیں ایسا کیوں محسوس ہوا تھا؟''

''یار میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام پتا نہیں کیا ہے مگر اسے سب ردھی کہتے ہیں۔ جس سے اس کی یاری ہے، اس کا نام چھوٹو رام ہے۔ بختاور جانتا ہے۔'' زمان نے کہا تو بختاور نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یہ تھی ردھی؟''

''تو اور کیا؟'' اس نے تیزی سے جواب دیا۔

''تم جانتے ہو اسے؟'' میں نے پوچھا تو بختاور نے تیزی سے کہا۔

''اس کا نام ہی سنا ہوا تھا، لیکن چھوٹو رام تو میرے دشمنوں میں سے ایک ہے۔ یہی تو پیروزاں اور راجھستانیوں کے درمیان رابطہ کراتا ہے۔''

''تو پھر ایک بات یاد رکھو سوہنیو! آج رات پھر محتاط ہو جاؤ۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، یاد رکھنا۔'' آفتاب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''ویسے بھی جاگنا ہے۔ ہاں محتاط ہیں ہم۔'' بختاور نے کہا تو جو جاگ رہے تھے انہیں اِدھر اُدھر کام پر لگا دیا۔ جو سو رہے تھے انہیں اٹھا کر گھر بھیج دیا۔ ہم پوری طرح تیار ہو گئے تھے۔ لیکن صبح ہو گئی، کچھ بھی نہیں ہوا۔

اگلے دن سانول کی برات تھی۔ قریب قریب بستیوں سے لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ جہانگیر نے بڑے پیمانے پر سیکیورٹی کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ دن بہت سکون سے گزر گیا۔ سانول کی رحاں سے شادی ہو گئی۔ اسے رہائشی حصے میں ہی ایک کمرا دے دیا گیا۔ لوگ تھک ہار کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

وہ رات خطرناک تھی۔ لیکن جہانگیر مجھ سے بھی زیادہ تیز نکلا۔ اس نے چاچا سائیں کی بستی سے بندے منگوا کر سیکیورٹی بنائی، پھر خود سو گیا۔ مجھے بالکل بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ رہائشی حصے میں ابھی بھی عورتیں موجود تھیں۔ میں ڈیرے پر آگیا۔ مجھے اس وقت وہاں آئے کوئی دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ گیٹ کے باہر ایک ہیوی موٹر سائیکل آکر رکی، اسے ایک مرد چلا رہا تھا، اس کے پیچھے ایک پتلی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے پسٹل کو ہاتھ ڈال لیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے سیفٹی کیچ بھی ہٹا لیا۔ انہوں نے موٹر سائیکل دور ہی روک لی، پھر پیدل چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ سیکیورٹی والے لڑکے ایک دم سے بڑھ کر ان کے سامنے آگئے۔ چند لمحوں بعد ایک لڑکے نے کہا۔

''علی بھائی، یہ تو رات والی راجھستانی لڑکی ہے۔''

اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ پہلا سوال دماغ میں یہی آیا کہ یہ کیوں آئے ہیں؟

pklibrary.com

"آنے دو۔" میں نے اونچی آواز میں کہا تو وہ دونوں چلتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ میں نے انہیں چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا۔ "خیر تو ہے ناردمی؟"

"خیر ہی ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"کرو، شوق سے کرو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن میرا ہاتھ پسٹل پر اور نظر ان کی ایک ایک حرکت پر تھی۔

"رات میں جب یہاں سے گئی ہوں تو مجھے احساس ہوا کہ تم لوگوں نے مجھ پر کوئی شک کیا ہے، کیا یہ ٹھیک بات ہے؟" اس نے جذباتی سے لہجے میں کہا، مجھے فوری سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل وہ پوچھنا کیا چاہتی ہے۔ لیکن پھر میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کیسے شک ہوا؟"

"وہ بندے جو رات ہمارا پیچھا کرتے ہوئے گئے تھے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔ "اگر تم لوگوں کو مجھ پر شک ہوا ہے تو ٹھیک ہوا۔ کم از کم بختاور کو تو چاہیے تھا کہ وہ مجھے پہچان لیتا۔ مجھے یہاں روکنے کی کوشش کرتا۔"

"سیدھی بات کرو ردمی۔ کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"یہی کہ شک ہوا تو یوں ہوا، اگر ہو گیا تھا شک تو پھر مجھ سے پوچھا کیوں نہیں۔ یہی بات مجھے آج یہاں لے آئی ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا، چند لمحوں بعد میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"تمہیں یہاں پہچان لیا گیا تھا۔ جو تمہارا حوالہ ہے چھوٹو رام کا، تم اس کی محبوبہ ہو تو شک لازمی ہونا تھا۔"

"مجھے تو سب پہچانتے ہیں اور میں جان بوجھ کر یہاں آئی تھی کیونکہ چھوٹو رام میرا محبوب تھا، اب نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"تھا، مطلب وہ......" میں نے سرسراتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

"زندہ ہے، لیکن اب وہ میرا محبوب نہیں رہا، اس نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ میں اسے اب زندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس نے انتہائی نفرت سے کہا۔

"اور تم چاہتی ہو کہ ہم اسے قتل کر دیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، وہ خود ہی ہو جائے گا، جیسا وہ کر رہا ہے۔ میں تو اپنے بارے میں بتانے آئی تھی۔ اب مجھ پر شک نہ کریں، اگر کوئی شک ہے تو اسے جیسے چاہیں دور کر لیں۔" اس نے پھر سے جذباتی لہجے میں کہا تو مجھے لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ ورنہ رات جب وہ چلی گئی تھی تو بات ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ردمی، وہ بات کہہ دو، جو تم کہنے آئی ہو۔"

"سن لو گے نا۔" اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا تو میں ہنس دیا، پھر بڑے اطمینان سے کہا۔

"ہاں سن رہا ہوں۔"

"ہمارے قبیلے کے کوئی پچیس تیس گھر یہاں رہتے ہیں۔ ان میں ہم چار لڑکیاں ایسی ہیں جو ناچ گا کر کماتی ہیں۔ یہاں اتنا پیسا نہیں ہے۔ پوری روہی میں چند گھر ہیں جو اپنی خوشی پر ہمیں بلاتے ہیں۔ لیکن ہم خوش ہیں، اپنا گزارا ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایک غلطی کی ہے، چھوٹو رام سے دل لگا کے۔ میں سمجھتی تھی وہ مجھے بہت چاہتا ہے، لیکن نہیں، وہ مجھے کیا خود کو بھی نہیں چاہتا، میں نے اسے بہت روکا کہ تم غلط دھندے میں مت پڑو، مگر وہ نہیں رکا اور......"

"کیا دھندا کرتا ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہر وہ کام جس سے پیسا ملے، جس سے اس کا فائدہ ہو، چاہے اسے کسی کی [illegible] کرنا پڑے، [illegible] جاتا ہے، نجانے کیا کیا کرتا ہے۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں، وہ مجھے میرے باپ سے خریدنا چاہتا ہے۔ بات بھی ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کر کے مجھے یہاں رکھتا تو بات الگ تھی لیکن وہ مجھے پار لے جانا چاہتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد بڑھ گیا تھا۔

"جہاں شوہر، وہاں بیوی، اس میں کوئی حیرت والی بات تو نہیں ہے ردمی، وہ تجھے پار لے کر جائے گا، وہاں......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں نہیں چاہتی، وہ مجھے وہاں لے جا کر مجھے بیوی بنا کر نہیں رکھنا چاہتا، وہ میرے شو کروائے گا، مجھے جگہ جگہ نچوا کر میرے پیسے وصول کرے گا، جس کا کوئی مر جائے اس کے ہاں بین کروائے گا۔"

تھر کے علاقے میں بہت کم اور راجستھان میں یہ بھی ایک روایت پائی جاتی ہے کہ جن کا کوئی مر جائے، وہاں پر

رونے دھونے اور بین ڈالنے والی مخصوص عورتیں آتی ہیں۔ جنہیں رودالی کہا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی سمجھا جاتا ہے جیسے شادی بیاہ پر کسی کو ناچنے کے لیے بلانا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ علاقے کے بڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تبھی میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''تم کر لیتی ہو.... بین؟''

''ہاں نا تھوڑا بہت، نہیں آتا ہوگا تو وہ سکھا دے گا۔'' اس نے تلخی سے کہا پھر لمحہ بھر رک کر بولی۔ ''اگر یہ پیشہ کروانا ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے لیکن اس کا کوئی پتا نہیں وہ مجھے کب اور کہاں مار دے، بیوی تو نہیں چاہیے نا اسے۔''

''تمہارا خیال ہے میں اسے روکوں، تمہیں اپنے ہاں پناہ دوں؟'' میں نے بہت کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تو اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں، بس وہ میرا خیال چھوڑ دے لیکن اس کے عوض میں تمہیں دولت تو نہیں دے پاؤں گی، ہاں اور بہت کچھ ہے، جو میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔''

''مثلاً کیا بتا سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تو اتنا بتا سکتی ہوں کہ میرا سارا قبیلہ پیروزاں کے ساتھ تھا، اسی کے گن گاتا ہے۔ اس کے برے کام بھی آ رہا ہے۔ کیونکہ وہ ان سے کام لے کر انہیں پیسا بھی دیتی تھی۔ جب آپ اسے روکو گے نا، تو بہت کچھ سامنے آ جائے گا، یہ مجھ پر یقین رکھیں۔'' اس نے انتہائی محتاط انداز میں بتایا تو میں سمجھ گیا، وہ بھی خوف زدہ تھی، میں نے کون سا اسے یقین دلا دیا تھا تبھی میں نے پوچھا۔

''چھوٹو رام یہیں ہے؟''

''ہاں، آج کل تو یہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔

''چل ٹھیک ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ تو روٹی پانی کھا، اور......'' میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں اب میں چلتی ہوں۔ ملتے ہیں پھر۔'' اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ اس کا ساتھی بھی جلدی سے اٹھا اور دونوں بائیک کے پاس جا پہنچے، پھر گیٹ سے نکلتے چلے گئے۔ میں نے پسٹل کا سیفٹی کیچ لگایا اور جیب میں رکھ لیا۔ وہ دونوں میرے لیے ایک نئی سوچ چھوڑ گئے تھے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھ کر زمان موہل کی طرف چل دیا۔

میں نے اپنی جیپ اس کے گوپے کے باہر روکی تو وہ جلدی سے باہر آ گیا۔ مجھے یوں دیکھ کر حیرت سے بولا۔

''خیر تو ہے نا یوں اچانک......''

''بس یار، بہت دن ہوئے تم سے گپ شپ نہیں کی، میں نے سوچا تھوڑا وقت تمہارے ساتھ بھی گزار لوں۔'' میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ تو جب چاہو آؤ، لیکن میں ابھی تمہاری طرف آنے والا تھا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''خیر تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جو رات لڑکی ناچنے آئی تھی نا ردھی، آج میں نے سارا دن اسی پر لگایا ہے، اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا رہا۔ میں حیران ہوں کہ رات اس نے کچھ کیا نہیں، وہ تو اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے، جو ہمارے سخت خلاف ہے۔'' اس نے مجھے معلومات دیتے ہوئے کہا۔

''اسے لایا کون تھا؟'' میں سکون سے پوچھا۔

''ہاں یار، یہ پتا کرنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی ہم میں سے ہی ہوگا نا۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''یہ تو پتا کر لیتا ہوں۔ تم سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔''

''پوچھو۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا ان راجستانیوں سے بڑا تعلق رہا ہے، بتاؤ کون ہمارے سامنے آ سکتا ہے، کس میں کتنا دم ہے؟'' میں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

''یار وہ تو خود سہارا تلاش کرتے ہیں، چور کے کون سے پاؤں ہوتے ہیں، کوئی نہیں کھڑا ہو سکتا جب تک یہاں سے کوئی مقامی بندہ ان کی پشت پناہی نہ کرے۔ اس پھیلی ہوئی روہی میں کئی لوگ ہیں، یہ نور حیات جیسے، پیروزاں یا میرن شاہ جیسے تو بہت ہیں۔ ان سے بھی بڑے خطرناک لوگ ہیں لیکن وہ چھیڑتے نہیں کسی کو، جب تک کوئی ان کو نہ چھیڑے۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو میں سمجھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے ان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میرا کوئی پتا نہیں میں کب چلا جاؤں یہاں سے، میں چاہتا ہوں سانول کو کوئی نہ چھیڑے۔''

''فوری طور پر تو کوئی بندہ نگاہ میں نہیں ہے، ہاں تمہارے جانے کے بعد کسی نے سر اٹھا لیا تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی اور ہو نہ ہو، ایک نور حیات ہی سب سے بڑا دشمن موجود ہے۔'' اس نے صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''وہ ہوتا کہاں ہے آج کل؟''

''دو دن پہلے بہاول پور میں تھا۔ پھر اس کے بعد کا پتا نہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا میری ایک بات سنو، پورے علاقے کی صورت حال کیا ہے، اس کے بارے میں معلومات لو، باقی دیکھ لیں گے۔'' میں نے اس کے ذمے ایک کام لگا دیا تو وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تم پہلے اپنے گھر میں تو دیکھو، ردمی کو کس نے بلایا تھا؟''

''میں پتا کرتا ہوں۔ تم دو چار دن میں مجھے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا پھر میں اس سے پورے علاقے کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ مجھے وہاں کافی وقت لگ گیا۔ آدھی رات ہو چکی تھی جب میں اٹھ کر واپس چل دیا۔

میں ڈیرے پر پہنچا تو بختاور کے ساتھ جہانگیر بیٹھا ہوا گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ بھی شادی پر ہونے والی باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس کچھ دیر بیٹھا، پھر میں نے بختاور سے پوچھا۔

''یہ ردمی کو کس نے بلایا تھا؟''

''مجھے تو نہیں پتا نہیں کیا......'' یہ کہتے ہوئے رک گیا، پھر جیسے اسے بات کی سمجھ آ گئی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''واقعی، کس نے بلایا؟''

''ہم سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ رات کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اور پھر ہمیں یہ بھی نہیں معلوم اسے بلایا کس نے؟'' میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

''پتا کرتے ہیں، اپنے کان اور آنکھیں کھول کر رکھتے ہیں۔'' اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا تو میں اٹھ کر رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ صحن میں رحماں کے ساتھ ساوری بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔

''سانول کہاں ہے؟''

''باہر ہے کہیں۔'' رحماں نے کہا۔

''اس کا خیال رکھا کر۔'' میں نے کہا اور اماں سین والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ساوری ہاتھوں میں ٹرے تھامے اندر آ گئی۔

''اٹھو مجھے ٹرے رکھنے دو۔'' ساوری نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ اس نے ٹرے پلنگ پر رکھی اور میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرے سے کپڑا اٹھایا۔ بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ تنوری روٹیاں رکھی ہوئی تھیں، میری ایک دم سے بھوک بڑھ گئی لیکن مجھ سے پہلے ہی ساوری کھانے لگی۔

''بڑی بھوک لگی ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''تو اور کیا، تم تھوڑی دیر مزید نہ آتے تو میں نے کھانا نکال کر کھا لینا تھا۔''

''ہم کون سا میاں بیوی ہیں، جو تم ایسے کرتی ہو، کھا لیا کرو میرا کیا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

''اوئے سوہنے، میں نے تو تمہیں اپنا میاں مان لیا، اب نکاح کے دو بول رہتے ہیں، جب چاہے پڑھوا لینا۔''

اس نے ایک دم سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ میں اگر اس پر کچھ کہتا تو ایک نئی بحث چھڑ جانا تھی، سو میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ وہ دن بھر کی روداد سناتی رہی۔ اچانک اس نے پوچھا۔

''کیا بات ہے علی، بڑے خاموش ہو؟''

''یار ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی، یہ ردمی کو کس نے بلایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے بلایا تھا، کیوں کیا بات ہے؟'' ساوری نے بڑے اطمینان سے کہا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر دھیمے سے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے ان کے بارے میں، وہ پیروزاں......''

''رحماں مائی بھی تو پیروزاں کے پاس ہی رہتی تھی۔ یہ تم دماغ میں مت لاؤ، میں جانتی ہوں، وہ سب کیا ہیں۔ میں بچپن سے ادھر ہوں اور سب جانتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے بہت سوچ کر اسے بلایا ہے۔''

''مجھے تمہاری سوچ کی سمجھ نہیں آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''تم سکون سے رہو، جیسے ہی کچھ ہوا میں بتا دوں گی اور تمہیں سمجھ میں آ جائے گا۔ چھوٹو رام کوئی چیز نہیں، بات اس سے بھی آگے کی ہے۔ کھانا کھاؤ۔'' اس نے بے پروائی سے کہا تو میں نے بھی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں ایک سوچ میرے دماغ میں در آئی کہ مجھے اس علاقے میں رہنا ہے تو اب آنکھیں کھول کر رہنا ہوگا۔

☆☆☆

سہ پہر ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پھیلے

pklibrary.com

ہوئے تھے۔ نجانے یہ آوارہ بادل کہاں سے آگئے تھے۔ شاید کہیں راہ بھٹک گئے تھے۔ سارا دن سونے کے بعد میں فریش ہوکر ڈیرے پر آگیا۔ وہاں بستی کے دو چار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ زمان موہل کا فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کرکے ہیلو کہا تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''وہ چھوٹو رام تو بہت بے غیرت نکلا یار۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس نے آج رودھی کو اس لیے مارا ہے کہ وہ تمہارے پاس کیوں گئی۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''اوہ۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ چند لمحوں بعد میں نے تحمل سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''وہاں سے ایک بندے نے مجھے فون پر بتایا تھا، پھر میں نے بعد میں تصدیق بھی کی ہے۔ اس نے نہ صرف اسے مارا ہے بلکہ فون وغیرہ چھین کر اسے اپنے گھر بھی لے گیا ہے۔'' زمان نے مزید تفصیل بتائی۔

''کیا کرنا چاہیے پھر اس کا؟'' میں نے رائے چاہی۔

''کم از کم رودھی کو چھڑوا تو لینا چاہیے۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''تم ان کی بستی میں جاسکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جانے کو تو چلا جاؤں گا لیکن میں وہاں کچھ کر تو نہیں پاؤں گا۔'' اس نے بے چارگی سے کہا تو میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''کیا خیال ہے، ہم خود چلیں یا کسی کو بھیج دیں۔ تم جاؤ گے؟ بندے بھیج دوں تمہارے ساتھ؟''

''یار میں نے تمہیں بتایا ہے۔ مجھ میں اتنی قوت ہوتی تو میں خود چلا جاتا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''میں بندے بھیج دیتا ہوں۔'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا، تم تو میرا امتحان لینے لگے ہو یار'' اس نے بے چارگی سے کہا تو میں اطمینان سے بولا۔

''تم نے بتادیا، اب میں دیکھ لیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے پھنسی ہوئی جان بچ گئی ہو۔ پھر کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرکے فون بند کردیا۔ میں نے وہیں بیٹھے ساوری کو کال ملادی۔ اس نے کال ریسیو کی تو میں نے رودھی کے بارے میں بتایا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے اطمینان سے بتایا پھر فوراً ہی بولی۔ ''میں نے کہا نا، جیسے ہی کچھ ہوا، میں خود بتاؤں گی جو کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کردیا، نجانے کیوں میں بے چین ہوگیا۔ اگرچہ یہ بات بڑی مضحکہ خیز تھی لیکن نجانے کیوں ایک سوچ آکر چل گئی۔ کہیں یہ ساوری اپنے طور پر ہیروز اِن تو نہیں بننا چاہتی؟ میں کچھ دیر سوچتا رہا لیکن یہ سوچنے کی بہرحال بات ضرور تھی کہ اس نے یہ تجسس کیوں رکھا ہوا ہے۔ وہ بتاتی کیوں نہیں ہے؟

شام ڈھل گئی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹے لیٹے تھک گیا تھا۔ میں اٹھا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ باہر کچی سڑک پار کرکے میں تھوڑا آگے گیا تو مجھے جہانگیر کی کال آگئی۔

''کہاں ہو تم؟''

''یہیں ڈیرے پر ہوں، خیریت؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''ہم پانچوں یہاں گوپے پر ہیں، تکے بنارہے ہیں، آجاؤ اگر آنا ہے تو۔'' اس نے خوش کن لہجے میں کہا تو پیچھے سے مدثر کی آواز گونجی۔ ''اگر ساوری بھابی اجازت دے دے تو آجاؤ۔''

''میں آرہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کردیا۔۔۔ ساول کو فون کرکے اپنے بارے میں بتایا۔ پھر اندر سے بائیک لی اور گوپے کی طرف چل دیا۔ ڈیرے سے گوپے کا فاصلہ بھی کوئی پندرہ بیس منٹ کا تھا، میں بارہ منٹ میں پہنچ گیا۔ درمیان میں آگ دہکائے وہ تکے بنانے میں مصروف تھے۔

''ارے تیر کے مانند آئے ہو؟'' شعیب نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میں ذرا مدثر سے پوچھ لوں، اب مجھے اجازت لینی ہوگی۔'' میں نے کہا اور چارپائی پر بیٹھ گیا، سبھی ایک دم سے ہنس دیے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔

''شادی سانول کی ہوئی ہے، ساوری کے کمرے سے تم نہیں نکل رہے ہو، ہے نا عجیب بات۔'' آفتاب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''چل یار، دو چار دن ہیں یہ بھی موج کرلے۔'' جہانگیر نے کہا تو میں چونک گیا، اس نے جو کہا تھا اس میں کچھ تھا۔

''دو چار دن مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یار اب یہاں سب ٹھیک ہے، اب ہمیں لاہور

pklibrary.com

چلے جانا چاہیے۔‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

’’لیکن میرے خیال میں ابھی یہاں ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

’’کیوں بختاور، میں نہیں کہتا تھا، اس علی کا دل یہاں سے جانے کو نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ صرف ساوری ہے، ورنہ اب تو یہاں امن ہو چکا ہے۔‘‘

’’نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ساوری والی، میرا من کہہ رہا ہے کہ یہ جو اچانک خاموشی چھائی ہے نا، یہ فطری نہیں ہے۔ جیسے ہی ہم یہاں سے گئے، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔‘‘ میں نے کہا تو آفتاب بولا۔

’’دنیا سے چلے بھی گئے تو بھی اس دنیا میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ باتیں بزرگوں ہی کی ٹھیک ہیں، عشق بندے کو نکما کر دیتا ہے اور تم نکمے ہو گئے ہو، چل سیج پکڑ اور اپنے ٹھکانے آپ لگا۔‘‘

’’کب جانا ہے لاہور؟‘‘ میں نے ایک دم سے پوچھا۔

’’بس دو تین دن میں۔‘‘ جہانگیر نے پھر کوئی واضح نہیں بتایا تو میں خاموش ہو گیا۔ مدثر نے موضوع ہی بدل دیا تھا۔ وہ اوروہ مجھے پور وغیرہ کی باتیں کرنے لگا تھا۔ دراصل میرے آنے سے پہلے بختاور انہیں وہاں کی باتیں سنا رہا تھا۔ ہمیں وہیں بیٹھے آدھی رات سے بھی زیادہ وقت ہو گیا۔ مجھے احساس تو تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی ورنہ پھر مجھے ساوری کا طعنہ مل جانا تھا۔ جبکہ ان کی باتیں تھیں کہ پھیلتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

اچانک میرا فون بج اٹھا۔ صحرا کے سناٹے والے ماحول میں یہ رنگ ٹون کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو اتنے میں مدثر کی آواز آئی۔

’’شرط لگا لو، ساوری بھابی کا فون ہے۔‘‘

’’اسی کا..... ہے۔‘‘ بختاور نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

’’وہ ردمی ہے نا، اسے کچھ لوگ اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔‘‘

’’اب یہ تمہیں پتا ہوگا کہ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟‘‘ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر بولی۔

’’یہ وقت طنز کا نہیں ہے، مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوگا۔ انہیں روکنا ہوگا، اس وقت کہاں ہو تم؟‘‘

’’میں گوپے پر ہوں، سب کے ساتھ۔‘‘ میں نے بتایا تو اس نے تیزی سے منت بھرے لہجے میں کہا۔

’’تو پھر جلدی سے اُن کی بستی میں جاؤ، وہ قریب ہی ہے۔‘‘

’’جس نے تمہیں اطلاع دی ہے، اس نے بتایا نہیں وہ کدھر لے گئے ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

’’میں دوبارہ پوچھ کر بتاتی ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

’’ہاں جی بلا رہی ہے، یہ بتا یا کتنی دیر کان پکڑوائے گی؟‘‘ آفتاب نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے جواب دینے کے بجائے اس اطلاع کے بارے میں بتایا۔

’’چل اٹھ پھر بیٹھا کیوں ہے۔‘‘ بختاور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہوا تھا۔ ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ بختاور میرے ساتھ بائیک پر بیٹھ گیا اور ان چاروں کو فوروہیل پر آنا تھا۔ گوپے سے نکلتے ہی اندھیرے کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہاں آگ تھی، بیٹری لائٹ تھی۔ ہمارے چاروں طرف ٹیلے تھے، درمیان میں پنچے راستوں پر ہیڈ لائٹ کی ہیلی روشنی تھی۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اک ہو کا عالم تھا، جس میں بائیک کی آواز بہت تیز لگ رہی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے میں نے بختاور سے پوچھا۔

’’یہ ردمی کو کس نے اغوا کیا ہوگا؟‘‘

’’کیا تم سمجھتے ہو وہ اغوا ہوئی ہو گی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اس وقت، لگتا تو نہیں، خیر دیکھتے ہیں۔‘‘ بختاور نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ یہ معاملہ صرف ردمی کا نہیں تھا بلکہ علاقے کا تھا۔ اب ہم یہ سمجھتے تھے کہ جہاں تک رسائی ہے وہ ہمارا علاقہ ہے۔ اگر چھوٹو رام کی بستی میں کچھ ہماری اجازت کے بغیر ہوا ہے تو انہوں نے غلط کیا، یہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جب طاقت دکھائی جاتی ہے، طاقت کا یہی مظاہرہ دراصل یہاں کی عوام کو محکوم بنا کر رکھتا تھا۔ صدیوں سے یہ نظام یونہی چلا آ رہا۔ اس لیے یہ یہاں کی عوام کی گھٹی میں پڑ گیا تھا۔ وہ اس سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں وہی حاکم دکھائی دیتا تھا، جو ان کے حساب سے طاقت کا مظاہرہ کرتا۔ میں یہ سوچ چکا تھا، پہلے انہیں اسی پرانے طریقے سے یہ باور کروا دوں گا کہ میں حاکم

ہوں، پھر انہیں بدلنے کی کوشش کروں گا۔ میں یہی سوچتے ہوئے بائیک لیے جا رہا تھا کہ بختاور کی آواز نے میری سوچ کا تسلسل توڑ دیا۔ اس نے پوچھا۔

''یہ ان کا لاہور جانے کا کیا ہے، سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔

''ظاہر ہے انہیں وہاں سے کسی نے بھیجا ہے نا، وہ تمہارے میرے پابند تھوڑی ہیں۔ پیچھے کوئی بات ہوئی ہو گی۔ اب انہیں تو جانا ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں بھی جانا پڑے۔'' اس نے میرے کان کے قریب کہا۔

''شاید مجھے بھی جانا پڑے لیکن تم سنبھال لو گے نا یہاں سب کچھ؟'' میں نے کہا تو میرے لہجے میں ایک حسرت تھی، نجانے کیوں میں اس روہی سے نہیں جانا چاہتا تھا۔

''یار اگر صرف حوصلہ دینے کی بات ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہاں، سنبھال لوں گا، لیکن ماحول تمہارے سامنے ہے۔ کہیں سے بھی کچھ ہوسکتا ہے۔'' اس نے صاف لفظوں میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ میں شاید کوئی بات کہتا، اچانک موڑ مڑتے ہوئے سامنے سے تیز ہیڈ لائٹس سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ اس ویرانے میں روشنی کا تھوڑا سا احساس تو ہو جاتا۔ لمحہ بہ لمحہ ہم قریب آتے چلے گئے۔ بالکل قریب آ کر پتا چلا کہ وہ ایک کھلی جیپ تھی جس پر کچھ لوگ سوار تھے۔ ان کی رنگ برنگی پگڑیوں سے شک ہوا کہ وہ راجستھانی ہیں۔ میں چونک گیا۔ کہیں یہی ہمارے مطلوبہ لوگ تو نہیں ہیں؟ چند فٹ کے فاصلے پر انہوں نے بریک لگا کر جیپ آہستہ کی، فطری طور پر میں نے انہیں دیکھا تو اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔

''علی......!!''

ایک دم سے مجھے سمجھ آ گئی کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ یہ تو روہی کی آواز ہے، جب تک میں سمجھا، وہ جیپ میرے قریب سے کراس کر گئی۔ چیخ پھر سے بلند ہوئی لیکن گھٹی گھٹی تھی۔ میں نے ایک دم سے بریک لگائے اور بائیک کو موڑا۔ وہ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر تھے۔

''علی سامنے سے فائر ہوسکتا ہے۔'' بختاور نے اونچی آواز میں تنبیہ کی۔

''تم کس لیے ہو۔ پسٹل نکالو۔ اپنا بھی اور میرا بھی۔'' میں نے تیزی سے کہا اور رفتار بڑھا دی۔ اس نے میرا پسٹل بھی نکال لیا تھا۔ بختاور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ فائر ہونا ممکن تھا۔ لیکن سامنے سے فور وہیل کی ہیڈ لائٹس جل رہی تھیں.... مجھے انہیں روکنا تھا، لیکن وقت اتنا کم تھا کہ انہیں فون بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے لمحے میں سوچا اور رفتار تیز کرتے ہوئے جیپ کو کراس کیا اور اس کے سامنے چلا گیا۔ اب میں دونوں کے درمیان تھا۔ دونوں کو بریک لگانا پڑے۔ جیپ بھی رک گئی اور فور وہیل بھی۔ میں نے بائیک کو چھوڑا، بختاور سے پسٹل لیے بغیر میں جیپ کی جانب بڑھا۔

جیپ میں چار افراد تھے اور ان کے درمیان.... روہی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

''مجھے بچا لو علی...... یہ مجھے لے جا رہے ہیں۔''

''کہاں لے جا رہے ہیں اور کیوں؟'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''پتا نہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا تو ان میں سے جو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، بڑے تحمل سے بولا۔

''دیکھ بھائیا، ہم نے اس چھوری کو چھوٹو رام سے خریدا ہے اور اب لے کے جا رہے ہیں۔''

''اتار اسے۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''نہ بھائیا، یہ تو زیادتی ہے۔ ہم نے پیسا بھرا ہے، نہیں یقین تو پوچھ لے چھوٹو رام سے۔'' اس نے تیزی سے فون نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں.... مجھے نہیں جانا ان کے ساتھ۔'' روہی چلاتے ہوئے بولی تو میں نے بھی تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جب لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو پھر تم اسے زبردستی کیوں لے جا رہے ہو...... نہیں لے جا سکتے۔''

میں نے محسوس کیا اس وقت، بختاور میرے دائیں جانب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہولے سے پسٹل مجھے پکڑا دیا۔ میں نے فور وہیل کی طرف دیکھا، وہ چاروں بھی اُتر آئے تھے۔

''بھائیا، ہم نے کچھ نیا تو نہیں کیا، ہم بیوپار کرتے ہیں۔'' اسی راجستھانی نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے جیپ سے اتارتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''تم اُترو نیچے، دوسری بات کی تو گولی مار دوں گا۔''

خلافِ توقع وہ بڑے آرام سے اتر آیا۔ میں نے ایک مزید راجستانی سے کہا۔ ”تم بھی آؤ۔“ وہ بھی اتر آیا تو میں نے چاروں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اسے ساتھ لے جانا ہے۔ پھر بختاور سے کہا۔ ”ان کے ساتھ بیٹھو اور گوپے پر لے آؤ۔“ پھر ردھمی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم آؤ ردھمی میرے ساتھ۔“

میرے کہتے ہی ردھمی تیزی سے جیپ میں سے اُتر آئی۔ بختاور جیپ میں بیٹھ گیا۔ میں بائیک کی طرف بڑھا تو ردھمی میرے پیچھے آکر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد ہم گوپے پر تھے۔ ان چاروں کو چارپائیوں پر بٹھایا، خود بھی اردگرد بیٹھ گئے۔ انہیں پانی پلا کر میں نے پوچھا۔

”اب بتا، یہ کیسا بیوپار ہے؟“

”بھائیا، یہ ہم کون سا نیا بیوپار کر رہے ہیں۔ لڑکی بکتی ہے، ہم خریدتے ہیں اور بیچ دیتے ہیں۔ ہمارا یہی بیوپار ہے۔ کل چھوٹو رام سے سودا طے ہوا، اس نے خود ہمیں بلایا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اتنی رات گئے چوروں کی طرح بیوپار؟“ میں نے غصے میں پوچھا۔

”بھائیا، کچھ بیوپار کے اصول بھی ہوتے ہیں نا۔“ اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”جب یہ لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی پھر کیوں؟“

”سبھی ایسا کرتی ہیں، اگر ان لڑکیوں کی مانیں تو ہمارا دھندا تو چل ہی نہیں سکتا، ہم کچھ نہ کرسکیں پھر۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر رکا، گہری سانس لے کر بولا۔ ”اب تم لوگوں نے کچھ لینا ہے تو بتاؤ اور ہمیں جانے دو۔“

”میں نے ابھی تمہیں کچھ نہیں کہا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس لڑکی کو لے جانے دوں گا، یہ بھی نہیں جائے گی اور تم لوگوں کو بھی سزا ملے گی۔“ میں نے غصے میں کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر سرسراتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو بھائیا؟“

”ان کی جیپ سے اسلحہ بھی نکلا ہے۔“ آفتاب نے بتایا۔

”اور شراب کی بوتلیں بھی۔“ مدثر بولا تو میں نے ردھمی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تمہیں چھوٹو رام نے مارا بھی تھا اور......“

”ہاں نا، کل دوپہر سے مار رہا ہے، میرے باپ کے

حب الوطن

نواب مشتاق احمد خان ایجنٹ جنرل حیدرآباد دکن کا بیان ہے کہ ایک بڑھیا اپنی گٹھری لیے ہوئے بڑی مشکل سے ان کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹکٹ چیکر نے آکر سب کے ٹکٹ دیکھے۔

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دن تھے۔ ان دنوں اول درجے اور تیسرے درجے میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی لیکن بلا ٹکٹ سفر کرنے پر ضرور پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ بڑھیا کی باری آئی تو اس نے ٹکٹ چیکر سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! میں اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہوں۔ میری کل کائنات یہی گٹھری ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔“

نواب صاحب خود ایک ریلوے افسر رہ چکے تھے۔ وہ خاموشی سے مشاہدہ کرتے رہے کہ دیکھیں چیکر کیا کرتا ہے؟ چیکر نے جو کچھ کیا عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس نے اپنی کاپی سے رسید کاٹی اور رندھی ہوئی آواز میں بڑھیا کو جواب دیا۔

”اماں! مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی مظلوم ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ ٹکٹ کے بغیر ریل میں سفر کرنے سے پاکستان کیسے چلے گا؟ جس کے لیے تم نے اور میں نے بڑی قربانیاں دی ہیں اس لیے رسید تو بنے گی تاکہ ملک کا نقصان نہ ہو۔ البتہ اس کی رقم میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔“

اوکاڑہ سے ثنا کا تعاون

آگے نوٹ پھینکے، مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر گیا، وہاں مجھے مارا، یہی منواتا رہا کہ اس کی بات مان لوں، نہیں تو مجھے بیچ دے گا، میں نہیں مانی تو اس نے بہت مارا ہے مجھے۔ میں دکھاؤں اپنے زخم، کتنا مارا ہے مجھے۔ میں پھر بھی نہیں مانی تو ان بیوپاریوں کو بلوا لیا۔ علی مجھے بچالو، یہ مجھے نوچ کھائیں گے۔“ وہ ہذیانی انداز میں کہتی چلی گئی۔

”چلو جاؤ تم اندر جاکے آرام کرو۔“ میں نے اسے کہا تو وہ اندر چلی گئی۔ تبھی میں نے ان بیوپاریوں سے کہا۔

”تمہیں عورتوں کا کاروبار کرتے شرم نہیں آتی؟“

”ہمارا آج کا بیوپار نہیں ہے بھائیا، پرکھوں سے ہے۔ لوگ بیچتے ہیں تو ہم خریدتے ہیں۔“ اس نے نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی سے دلیل دی، پھر لمحہ بھر سانس لے کر

pklibrary.com

بولا۔ ''چل بھائیا تم ہمیں یہ لڑکی مت لے جانے دو مگر ہمارا روپیہ واپس کروا دو، ہم چپ چاپ واپس چلے جائیں گے۔''

''اُصولی طور پر اس لڑکی کو میں نے تم سے چھین لیا ہے۔ اس کا چھوٹو رام کا کچھ لینا دینا نہیں۔ ہاں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ دوبارہ یہ کام نہیں کرو گے تو میں روپیہ واپس کروا سکتا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''اگر یہ بات ہے بھائیا تو پھر ہمیں جانے دو۔ لڑکی رکھو تم۔ بات ختم۔''

''چل ٹھیک ہے، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں نے کہا تو بختاور سختی سے بولا۔

''ارے یہ کیا، ان کے چھتر تو مار نے دو، ایویں... جانے دیں۔''

''چل مار لے چھتر جتنے مارنے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ پانچوں ان پر پل پڑے۔ سامنے سے کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ لیکن ان کی چیخ وپکار، ہائے وائے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ مارا ماری سن کر ردھی بھی باہر آ گئی۔ وہ بھی اس دھنائی میں شریک ہو گئی۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ شعیب کے ہاتھ میں تکے بنانے والے سیخ آ گئی، اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''اوئے رک جاؤ۔''

سبھی رک گئے۔ اس نے سیخ کو آگ میں ڈال دیا، ساتھ میں پڑی دوسری سیخیں بھی آگ میں ڈال دیں۔

''کیا کرنے لگے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کے پچھواڑے پر نشان لگاؤں گا، ساری زندگی یاد رکھیں گے کہ عورتوں کا بیوپار نہیں کرنا۔'' شعیب نے عجیب انداز میں کہا۔ اس نے کچھ زیادہ ہی غصہ کر لیا تھا۔ عورتوں کا بیوپار کرنا، بات تھی بھی انتہائی افسوس ناک۔ وہ دوبارہ سے کوئلے دہکا کر سیخیں گرم کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کو لاتا، اس کے پچھواڑے سے کپڑے ہٹاتا اور سیخ سے داغ دیتا۔ سناٹے والے ماحول میں ایک دردناک، دل دہلانے والی چیخ بلند ہوتی۔ پھر سسکیاں اور رونے کی آوازیں گونج اٹھتیں۔ شعیب ان پانچوں کو نشان زدہ کر چکا تو ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اب جاؤ، بھاگ جاؤ اور کبھی عورت کے بیوپار کا مت سوچنا۔''

ان میں سے کسی نے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گوپے کے تھڑے سے اترے، جیپ میں بیٹھے اور لمحوں میں گم ہو گئے۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' بختاور نے پوچھا۔

''جیسے تم کہو، یا پھر اپنی بھابی ساوری سے پوچھ لو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا۔ پھر بولا۔

''چل آ، ہاتھ لگتے میں اس چھوٹو رام کا کام بھی کر ہی دیں۔''

''چل پھر۔'' میں نے کہا تو ردھی کو فوروہیل میں بٹھایا، بختاور میرے پیچھے بیٹھا اور ہم چھوٹو رام کی بستی کی جانب چل پڑے۔

رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا، جب ہم چھوٹو رام کی بستی میں... پہنچے۔ بستی کیا تھی کوئی دس پندرہ کچے کوٹھے اور اتنے ہی جھونپڑے نما گوپے تھے۔ کسی گھر کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ بس تھڑے بنے ہوئے تھے، جسے صحن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہم نے ایک ببول کے درخت کے پاس فوروہیل روک دی تھی۔

'' ردھی بتا، اس چھوٹو رام کا گھر کہاں ہے؟''

''وہ سامنے......'' ردھی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اندھیرا تھا۔ اتنی سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن اندازہ ہو گیا تھا۔ چند منٹ بعد ہم چھوٹو رام کے گھر کے سامنے جا رکے۔ باقی لوگ ایک طرف ہو گئے۔ میں اور ردھی دروازے کے سامنے تھے۔ وہ ایک کچا کمرا تھا جس کا میں نے دروازہ بجایا تو اچانک اندر سے آواز آئی۔

''کون ہے بے اس وخت......''

تبھی میں نے ردھی کو اشارہ کیا تو اس نے تیزی سے کہا۔ ''دروجہ کھول۔''

''اے تو کیسے آ گئی؟'' اندر سے حیرت بھری آواز ابھری تو اس نے جواب دیا۔

''چھوڑ گئے ہیں وہ مجھے۔ اب دروجہ کھولو تو بتاؤں۔ ورنہ میں باپو کے گھر جا رہی ہوں۔ پھر ادھر مت آنا۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اندر کا دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا، بدہیئت سا کالی عمر کا شخص دھوتی کرتہ پہنے کھڑا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا یا ملگجے اندھیرے میں بدہیئت نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے ردھی کے ساتھ دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''یہ کسے ساتھ لائی ہے تو ردھی؟''

''باہر آ۔'' میں نے کہا اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے زور لگا کر اپنا گریبان

چھڑوانے کی کوشش کی تو کرتہ پھٹ گیا۔ لیکن میں نے جو اسے جھٹکا دیا تھا، اس کی وجہ سے وہ باہر آ گیا۔

''کون ہو بھائی تم؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اتنی جلدی تمہیں بتا دوں۔ تم سے تو بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ لیکن وہیں ڈیرے پر جا کر۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ بختاور آگے بڑھا۔ اسے دیکھ کر چھوٹو رام کے اوسان خطا ہو گئے۔ بختاور نے کوئی بات نہیں کی، اسی کا کرتہ پھاڑ کر اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ جہانگیر اسے پکڑ کر فور ڈھیل کی جانب بڑھ گیا۔

''چل رُدمی تو جا اپنے گھر۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ابھی مجھے تم لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں نے اسے بھی جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ لوگ چلے گئے تو میں اور بختاور اس کے کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ کوئی آدھا گھنٹا لگا ہو گا ہمیں۔ اس کے کمرے سے کافی ساری منشیات، دو گنز، تین پسٹل، کچھ کاغذات، پاسپورٹ، سیل فون، ملکی، غیر ملکی اور بھارتی کرنسی نکلی۔ وہ سب کچھ سمیٹ کر ہم بائیک پر ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ وہاں کوئی بندہ بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ کیا وہ ایسے بے سدھ سوئے ہوئے تھے؟ وہ نشہ کرتے تھے؟ یا پھر جان بوجھ کر باہر نہیں نکلے۔ ورنہ سناٹے بھرے ماحول میں تو ہمارے جانے کی ..... آوازیں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

چھوٹو رام بندھا ہوا ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔ سامنے والی چارپائی پر جہانگیر تھا۔ باقی تینوں اندر کہیں کمرے میں تھے۔ وہاں رُدمی دکھائی نہیں دی تھی۔

''وہ اندر ساوری کے پاس گئی ہے؟'' جہانگیر نے میرے پوچھنے پر بتایا تو میں جہانگیر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے سامنے چھوٹو رام تھا۔ ملگجے بلب کی روشنی میں اب وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر سخت لہجے میں پوچھا۔

''تم یہ عورتوں کو بیچنے کا دھندا کب سے کر رہے ہو؟''

''بہت عرصے سے۔'' اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''ان عورتوں کو بھی بیچ دیتے ہو، جو بکنا نہ چاہیں؟'' میں نے تلخ انداز میں پوچھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''اب جو کوئی اپنی بیٹی بیچنا چاہے تو مجھے کیا، یہ جو رُدمی ہے، اس کے باپ نے مجھے بیچا تو میں نے خرید لی۔ اب اس میں میرا کیا قصور۔''

''قصور یہ ہے کہ تم نے اسے مارا، پیٹا، تشدد کیا اور منافع پر آگے کسی کو یوں بیچ دیا جیسے یہ کوئی انسان نہیں، بھیڑ بکری یا گائے ہو۔'' میں نے دکھ سے کہا۔

''دیکھیں جی یہ دھندا چل رہا ہے تو میں بھی کر رہا ہوں۔ میں نے کچھ نیا نہیں کیا۔ مجھے یوں اٹھا کر لے آئے، بنا کسی قصور کے، یہ اچھا نہیں کیا آپ لوگوں نے۔'' اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''جسے تم قصور نہیں مان رہے ہو نا، دراصل یہی تمہارا قصور ہے۔'' بختاور نے سخت لہجے میں کہا تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنک کر بولا۔

''دھیرج رکھو تم، مجھے پتا ہے تیری میری دشمنی ہے، اب تم مجھے اٹھا لائے ہو تو یہ بہانے مت بناؤ، سیدھا کہو اپنی دشمنی کے لیے لے کر آئے ہو۔''

''اوئے چھوٹو بکواس بند کر، نیچی رکھ اپنی آواز......'' میں نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے ایک دم سے تھپڑ مار دیا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس طرح بھی پیش آسکتا ہوں۔ چند لمحے رک کر میں نے کہا۔ ''جب تمہیں زمان ہوٹل نے روکا تھا کہ رُدمی کو کچھ نہیں کہنا، پھر بھی تم نے اپنی من مانی کی۔''

''میں نے کب من مانی کی، یہ تو روایت ہے۔ میں نے پوری رقم دی جو رُدمی کے باپ نے مانگی۔''

''جب تک تیرے جیسے بے غیرت اس علاقے میں ہیں، عورتوں کی خرید و فروخت ایسے ہی رہے گی۔''

''اب کرنا کیا ہے اس کا، گولی مار دوں۔'' آفتاب نے اکتائے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

''ابھی اسے کچھ نہیں کہنا، کل دن کے وقت سب کے سامنے اسے زندہ جلاؤں گا۔ مجھے اس پورے علاقے میں عورتوں کا یہ بیوپار روکنا ہے۔''

''چل ٹھیک ہے، اسے اچھی طرح باندھ کے ڈال دے ادھر۔'' مدثر نے کہا اور رسّی تلاش کرنے اندر کی طرف چل دیا۔

''تم جاؤ، میں ہوں اس کے پاس۔'' بختاور نے کہا اور اپنی بستی میں فون کرنے لگا۔ میں وہاں سے اٹھا اور رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

میں کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ ایسے میں مجھے پازیب کھنکنے کی آواز آئی، دروازہ کھلا اور ساوری اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے

بولی۔
''لے دودھ پی لے۔''
''رکھ دے یہاں۔'' میں نے تھوڑے سے سخت لہجے میں کہا۔
''دودھ پی لو، پھر مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ تبھی وہ بولی۔
''علی، تم ہو تو اسی روہی کے لیکن تمہیں روہی کے بارے میں ابھی پتا نہیں ہے۔ کیا تم جانتے ہو، دوسری جگہوں پر جتنے صحرا ہیں، ان میں سایہ نہیں ہوتا، کہیں سبزہ نہیں ہوتا، یہ روہی ہے، جس میں سبزہ بھی ہوتا ہے اور سایہ دار درخت بھی۔ یہاں ٹیلے اپنا رخ بدلیں بھی تو اتنا نہیں بدل سکتے، سبزہ اپنی نشانیاں رکھتا ہے۔ وہ رستے بھولنے نہیں دیتا۔''
''تیرے کہنے کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
''صرف میری سُن اپنی مت کہہ۔'' اس نے اسی سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش رہا، وہ چند لمحے میرے چہرے پر دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''ضروری نہیں کہ انسان کسی اسکول میں پڑھے تو ہی اسے عقل آتی ہے، وقت بہت بڑا استاد ہوتا ہے، یہ تم ہی کہتے ہو نا، وقت نے مجھے بھی بہت کچھ سکھایا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی لیکن میں اِن طاقت وروں کے ساتھ ضرور رہی ہوں۔ میں دیکھتی اور سمجھتی رہی ہوں کہ یہ لوگوں پر خوف کیسے طاری کرتے تھے۔ میں یہ بھی اچھی طرح سمجھتی ہوں، کب، کسے، کہاں استعمال کرنا ہے۔ میں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوں جہاں یہ سب تماشے ہوتے رہے ہیں۔''
''یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟'' میں نے اکتاہٹ سے کہا۔
''میں اس لیے بتا رہی ہوں، تم جو کچھ سرحد پار کر کے آئے ہو، وہ لوگ اسے بھول نہیں گئے۔ وہ انتہائی خاموشی سے تمہارے اردگرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں، آج یا کل یا چند دن ہیں، وہ سامنے آنے والے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔
''یہ تمہیں کیسے پتا؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔
''تم جس چھوٹو رام کو اٹھا کر لائے ہو، وہ ایک معمولی مہرہ ہے۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ وہ بیوپاری جنہیں تم نے جانے دیا، وہی ان لوگوں کے میزبان ہیں۔ یہی روہی مجھے سب کچھ بتانے والی ہے۔ یہ بک کر نہیں جا رہی تھی، بلکہ اسے سزا کے طور پر لے جایا جا رہا تھا۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔
''ساوری، تم مجھے سب کچھ بتا کیوں نہیں دیتی ہو؟'' میں دبے دبے غصے میں کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔
''دیکھو علی، میں تمہیں اس لیے سب کچھ نہیں بتانا چاہتی، کل کلاں تم نے چلے جانا ہے۔ یہاں کا سب نظام مجھے دیکھنا ہوگا، میں نے اسے اپنے طور پر چلانا ہے۔ اگر تم کہو تو، اگر تم مجھے یہ حق دو تو۔''
''تم ایسے کیوں سوچ رہی کہ یہ سب نظام تمہیں سنبھالنا ہے؟'' میں نے دھیمے سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔
''یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم مجھے ساتھ لے کر لاہور جاؤ گے یا مجھے یہاں پر چھوڑ جاؤ گے؟''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں اگر یہاں رہتا ہوں تو مجھے یہ ساری معلومات لینی چاہیے۔ اگر مجھے جانا ہے تو پھر مجھے ایسی بات بھی نہیں کرنی چاہیے۔'' میں کہتے ہوئے خود ہی خاموش ہو گیا۔
''اب تم بتاؤ۔ اگر یہاں رہنا ہے تو پھر میں سب بتا رہی ہوں، اور اگر تم نے نہیں رہنا تو پھر تمہیں یہاں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ تم جاؤ اپنی دنیا میں۔'' اس نے صاف لفظوں میں کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بات تو ٹھیک کر رہی تھی۔
''اور اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو؟'' میں نے پوچھا۔
''تو پھر یہ روہی والے جیسے رہیں، ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں یوں کہا جیسے ان کا تعلق واسطہ ہی روہی والوں سے نہ ہو۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، وہ اتنی بھی ظالم ہو سکتی ہے؟ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، وہ سرد لہجے میں بولی۔
''جو بھی کرنا ہے تمہیں کرنا ہے، اب یہ فیصلہ تمہارا ہے، بولو کیا کہتے ہو۔''
میں سناٹے میں آ گیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں؟

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

pklibrary.com

حقیقت

اعتزاز سلیم وصلی

تحریک آزادی کشمیر کے حوالے سے ایک حساس تحریر

pklibrary.com

لاقانونیت اور جبر و استبداد کے زیرِسایہ زندگی بسر کرنا آسان نہیں... ظلم جب حدوں کو پار کرلے تو ذرہ ذرہ سراپا احتجاج بن جاتا ہے... ایک حسین وادی میں بنی گئی کہانی جس کی ہر دہلیز پر لہو کی بوندیں ٹپک رہی تھیں...

ستمگر حاکموں اور غداروں کی سفاک سازشوں کے مہلک جال

"ماں جی۔" میں نے انہیں پکارا۔ بوڑھا جسم ہونے کے باوجود ان کے جسم میں پھرتی تھی۔ اس کی وجہ شاید وہ سخت زندگی تھی جو انہوں نے گزاری تھی۔ انہوں نے سبزے سے بھری اس پہاڑی پر رک کر مجھے دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ واپس چلی جائیں، اب میں سفر کرلوں گی۔"

"نہیں میری بیٹی۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے یہی کہا گیا ہے کہ تمہیں بس اڈے پر پہنچا کر واپس جانا

ہے۔‘‘ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ ہم عام استعمال ہونے والی سڑک سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی اور ماں جی بھی تیز تیز سانس لے رہی تھیں مگر وہ رکنا نہیں چاہتی تھیں۔ پہاڑی سے نیچے اُتر کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ ایک فوجی گاڑی دکھائی دی۔ وہ رک گئیں اور مجھے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔ فوجی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم نے سڑک کی دوسری جانب سفر شروع کر دیا۔

’’اور کتنا فاصلہ ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بس دس پندرہ منٹ اور۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’وہ میرے ساتھ کسی اور کو بھی بھیج سکتے تھے۔‘‘ میں نے ان کی حالت پر نگاہ دوڑائی۔

’’خطرہ تھا۔ دو عورتوں کو کوئی نہیں پوچھے گا مگر مرد کی تلاشی ضرور لی جاتی۔‘‘ تقریباً بیس منٹ بعد ہم ایک بس اڈے پر موجود تھے۔ یہاں اردگرد فوجی گاڑیاں گھوم رہی تھیں مگر خوش قسمتی سے کسی نے ہم سے کچھ نہ پوچھا۔ ماں جی نے ایک ٹکٹ خرید کر مجھے تھمایا۔

’’شکریہ۔‘‘ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ مسکرا دیں۔ مسکراتے ہوئے ان کے چہرے کا جھرا ہوا حصہ عجیب محسوس ہوا مگر اس سیاہ [illegible] کے باوجود ان کا چہرہ میرے لیے دنیا کا حسین ترین چہرہ تھا۔ بس پندرہ منٹ بعد نکلنی تھی۔

’’میں اب چلتی ہوں۔‘‘ انہوں نے کہا تو میں نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ابھی کچھ سوال پوچھنے تھے۔

’’جس نے آپ کو میرے ساتھ بھیجا ہے، وہ آپ کا بیٹا تھا؟‘‘

’’میرے ایسے ہزاروں بیٹے اس وادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔‘‘ انہوں نے جواب دیا۔

’’آپ اب کہاں جائیں گی؟‘‘

’’واپس اپنے کام پر۔‘‘

’’مگر آپ کی جان کو خطرہ ہوگا وہاں۔‘‘ میرے لہجے میں موجود پریشانی انہوں نے محسوس کی مگر کوئی جواب نہ دیا۔ بس سفر کے لیے تیار تھی۔ میں نے ان کو رخصت کیا۔ شاید کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لیے۔

بس میں بیٹھ کر واپس سفر کرتے ہوئے میں خیالوں میں گم تھی۔ یہاں آتے ہوئے حالات مختلف تھے۔ میری سوچ کیا تھی اور اب کیا ہوگئی۔ یہ زندگی کے چند خوفناک دن تھے جو میں نے اس وادی میں گزارے۔ میں ان آنکھوں سے جو دیکھتی آئی تھی اور میرے کان جو مستقل سُن رہے تھے وہ سب جھوٹ تھا۔ میرا سر مسلسل چکرا رہا تھا۔ کیا یہ سب میں پوری دنیا کو بتا پاؤں گی؟ کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ حقیقت بیان کر سکوں؟ کیا میرے لوگ اس سچ کو قبول کر پائیں گے؟ کئی سوالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ نظروں کے سامنے گزرے واقعات کی ایک فلم چل رہی تھی۔

☆☆☆

’’واقعی یہ جنت ہے۔‘‘ میں نے اونچے پہاڑ کی طرف دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے وشال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی سفر کی اس خوبصورتی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس کی خاموشی سے ہوا۔ وشال بہت زیادہ بولتا تھا مگر اس سارے سفر میں وہ اردگرد کے مناظر کی دلکشی میں گم دکھائی دیا۔

’’یہ وہی پہاڑ ہیں جن پر خوبصورت دیوی کی حفاظت کرنے والی پریاں اُترتی تھیں۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا۔ ’’میرا تو دل کر رہا ہے بس سے اُتر کر کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر ان حسین مناظر کو قید کر لوں۔‘‘ اس نے اپنے کیمرے والے بیگ پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے کوئی جواب دیے بغیر باہر دیکھا۔ سڑک سیدھی نہیں تھی، مشکل راستہ تھا مگر بس ڈرائیور ان اونچے نیچے راستوں پر سفر کرنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ ہم سری نگر سے کوئی پانچ سات کلومیٹر دور تھے۔ ہم نیشنل ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے پنجاب کے راستے کشمیر میں داخل ہوئے تھے۔ حالات ابھی تک ٹھیک نہیں تھے اس لیے چینل کے مالک جنہیں میں گرو جی کہتی تھی، نے ہمیں خبردار کیا تھا۔

’’جب سے سیاسی سطح پر کشمیر کی آزاد حیثیت ختم ہوئی ہے تب سے حالات بہت خراب ہیں، تمہارے مجبور کرنے پر میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں گر۔تما مگر تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ میرا دوست میجر جیانت آج کل سری نگر میں ہی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ایک جوان کی ڈیوٹی لگائے گا۔ ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہوگا تمہیں۔‘‘ میں جانتی تھی، ایک مشہور چینل کا مالک ہونے کے باوجود گرو جی کے لیے میڈیا کی ایک ٹیم کو کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت لے کر دینا کتنا مشکل ثابت ہوا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی ہر بات پر ہاں میں سر ہلانا ضروری سمجھا۔ میرے ساتھ چینل کا بہترین کیمرا مین وشال بھیجا گیا۔ وشال بھی میری طرح ایڈونچر پسند تھا۔ اس کا کیمرا ابھی حکومت مخالف پروگرام کرنے کی وجہ سے کئی بار ٹوٹا تھا اور کئی بار اسے جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا تھا۔ کشمیر

pklibrary.com

میں حالات البتہ مختلف تھے۔ بھارتی جنتا صرف جسمانی مار پر یقین رکھتی تھی اور کشمیر میں جان جانے کا خطرہ تھا۔ ویسے تو میرے پروگرام کے لیے میرے ساتھ پوری ٹیم بھیجی جاتی مگر یہاں صرف مجھے اور وشال کو جانے کی اجازت ملی۔ میں نے سیل فون نکالا۔ نیٹ ورک غائب تھا۔

''یہ کیا؟'' میں نے وشال کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔

''نمستے سری نگر۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''حالات کی وجہ سے دن میں اکثر موبائل سروس بند کر دیتے ہیں۔''

''یہ بات تم پہلے بتا سکتے تھے یا پھر خواب میں پہلے ہی... پر اپنی اس گرل فرینڈ...... کیا نام تھا اس کا، ہاں۔ شالنی گریوال کے ساتھ سیر پر نکلے ہوئے تھے۔'' میں نے طنز کیا۔ وہ ہنس پڑا۔

''میرا کام یہاں صرف کیمرا پکڑ کر آپ کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ علاقائی معلومات آپ نے خود اکٹھی کرنی ہے۔''

''ہم صرف دو ہیں، تمہیں کیمرے کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ بہت سے کام کرنے پڑیں گے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں پکڑے سیل فون سے باہر کی ویڈیو بنانا شروع کر دی۔ اسی دوران بس میں موجود ایک شخص ہماری طرف آیا۔ یہ وہی تھا جس سے ہم نے ٹکٹس خریدے تھے۔

''سر ویڈیو بند کر دیں، آگے فوج ہے۔'' وشال نے موبائل کا کیمرا بند کر دیا۔ بس رک گئی۔ فوج کے دو جوان جلدی سے بس میں سوار ہوئے۔ سب کے کاغذات چیک کرنے کے بعد ہمیں سری نگر میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ بس سے اُتر کر میں نے ایک یونیورسٹی کا بورڈ دیکھا۔ وشال میرا اور اپنا بیگ لے کر میری طرف آیا۔

''کسی ہوٹل میں جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''میجر جیانت نے یہیں رکنے کا کہا تھا۔ چھ بجے اس کا بھیجا گیا جوان پہنچ جائے گا۔'' چھ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نے دور ایک پُل کو دیکھا جو سری نگر کے دو تقسیم ہوئے حصوں کو آپس میں جوڑ رہا تھا۔ اس کی دوسری طرف سورج غروب ہو رہا تھا۔ یہ دو فروری کی ایک خوبصورت شام تھی۔

☆☆☆

سورج چمک رہا تھا مگر گل بانو کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ دماغ صدمے کی وجہ سے کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اس کو لگا وہ مر چکی ہے۔ زندگی کی واحد علامت دل کا دھڑکنا تھا۔ نور احمد کی لاش نظروں کے سامنے آنے کے بعد اسے بے نور کر چکی تھی۔ وہ نیچے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کے ارد گرد بس لوگوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

گل بانو اور نور احمد بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے جہاں جان کی قیمت بہت کم تھی۔ کبھی کوئی شک کی بنیاد پر مارا جاتا تو کسی کی روح یقین کی سولی پر چڑھ کر نیلے آسمان کی طرف پرواز کر جاتی۔ شہر کیا تھا۔ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں ہر جگہ موت کے فرشتے گھومتے تھے۔ کوئی نہ کوئی ہنگامہ یا احتجاج ہر وقت جاری رہتا۔ نور احمد محنت مزدوری کرنے والا شخص تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ہر ماں کی طرح گل بانو کی بھی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے پڑھ لکھ کر ماں، باپ کو سکون کا بڑھاپا گزارنے کے قابل بنائیں مگر انسان کی ہر خواہش اس ایک زندگی میں پوری ہو جاتی تو وہ آخرت کی زندگی کو بھول جاتا۔

نور احمد جس کالج کے سامنے فروٹ چاٹ بیچتا تھا وہاں کا ایک طالب علم فوج نے شک کی بنیاد پر اٹھا لیا۔ چند دن بعد اس کی لاش ملی۔ سری نگر کی سڑکوں پر اس کالج کے باقی اسٹوڈنٹس احتجاج کر رہے تھے۔ پتھراؤ، نعروں کی گونج اور چیخ پکار کے شور میں نور احمد نے گھر پہنچنے کی جلدی کی۔ اس نے بھاگ کر سڑک پار کرنی چاہی۔ اسی دوران گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ہوائی فائر تھا جس کے جواب میں اسٹوڈنٹس نے پتھر برسانے شروع کر دیے۔ اس کے بعد ہجوم پر گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ گولی کو کیا معلوم، کون طالب علم ہے اور کون روزی کی طلب میں سڑک پر موجود ہے۔ ایسی ہی ایک آوارہ گولی نور احمد کی گردن کے پار ہو گئی۔ اس کے بعد جو کچھ وہاں ہوا، وہ اس شہر کا معمول تھا۔ ایک ایمبولنس نور احمد کی لاش کو لے کر پہنچی تو گل بانو کو یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

گل بانو کو ہوش میں لانے والی ان کی پڑوسن تھی جو اسے سنبھال رہی تھی۔ نور احمد کا جنازہ تیار تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شوہر کا منہ دیکھ سکے۔ نجانے کس نے کفن دفن کا بندوبست کیا اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ گل بانو کو شوہر کا زخم بھول کر بچوں کی روزی کا سوچنا پڑا۔ بڑا بیٹا دس جبکہ چھوٹا بیٹا سات سال کا تھا۔ نور احمد نے کچھ رقم مشکل وقت کے لیے بچا رکھی تھی، وہ اب ان کے کام آئی۔

اس دن وہ کسی سوچ میں گم اپنے بڑے بیٹے حماد کی طرف دیکھ رہی تھی جب پڑوسن رضیہ اس کے گھر آئی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی اہم بات بتانے والی ہے۔

''کیسی ہو گل بانو؟'' اس نے گل بانو کے پاس بیٹھ کر

پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔'' وہ خیالات سے باہر آئی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی اور بولی۔ ''نور احمد بھائی بہت اچھے انسان تھے، اللہ جنت نصیب کرے۔ بچے بے چارے یتیم ہو گئے۔'' گل بانو خاموش رہی۔ رضیہ نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑی۔ ''اب کیا سوچا ہے پھر؟ بچوں کی روزی روٹی کا کیسے بندوبست کرو گی؟''

''کسی کے گھر کام کروں گی جب تک حماد محنت مزدوری کے قابل نہیں ہو جاتا۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتی تھی۔ میرے پاس کام ہے اگر تم کرنا پسند کرو تو۔'' رضیہ نے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

''کیا کام؟'' گل بانو نے پوچھا۔

''یہاں سے کوئی سات کلومیٹر دور وہ علاقہ ہے جہاں عام لوگوں کا داخلہ منع ہے۔'' رضیہ نے سرگوشی کرنے کے انداز میں کہا۔ ''وہاں فوجی افسروں کے گھر ہیں۔ وہاں مجھے صفائی کا کام ملا ہے۔'' گل بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ان فوجی افسروں کے گھر میں تم نوکری کرتی ہو جو ہمارے لوگوں کو مار رہے ہیں جنہوں نے ہماری آزادی کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ انہوں نے کئی جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میرا شوہر ان کی اندھی گولی کا نشانہ بن گیا۔'' گل بانو کا لہجہ نم ہو گیا۔ ''میں یہ نہیں کر سکتی رضیہ۔'' رضیہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں بعد وہ کھڑی ہوئی۔

''پیٹ میں دو وقت کا کھانا نہ جائے تو آزادی اور وطن نام کی چیزیں یاد نہیں رہتیں۔'' اس کے الفاظ تلخ تھے۔ گل بانو کو ان الفاظ کی حقیقت کا احساس تب ہوا جب صبح کے ناشتے کے لیے پیسے نکالتے ہوئے ان میں کمی محسوس ہوئی۔ جمع پونجی اب ختم ہونے والی تھی۔

☆☆☆

''کیا دیکھ رہی ہو گر-تھا؟'' وشال کی آواز مجھے اس منظر کی کشش سے باہر لے آئی۔ میجر جیانت کا بھیجا گیا فوجی ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ میں نے وقت دیکھا۔ چھ بج چکے تھے۔

''میں نے تو سنا تھا فوجی وقت کے پابند ہوتے ہیں۔'' میں نے اردگرد دیکھا۔ تقریباً دس منٹ بعد آرمی کی گاڑی ہمارے قریب آ کر رکی۔ اس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک لمبے قد کا فوجی سوار تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ پھرتی سے نیچے اترا اور اس فوجی گاڑی کا دروازہ کھولا۔

''سوری میم۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''راستے میں احتجاج کی وجہ سے سڑک بند تھی، اس لیے دیر ہو گئی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ہاتھ میں اسے کے فورٹی سیون تھی۔ جو گاڑی وہ لائے تھے وہ میجر جیانت نے خاص طور پر بھیجی تھی۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیانت صاحب کا گیسٹ ہاؤس خالی ہے وہاں جانا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی سری نگر کی سڑکوں پر سفر طے کرنے لگی۔ دس منٹ بعد وشال خاموشی سے اکتا گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ایک پروگرام کرنا ہے کشمیر کے موضوع پر۔ مگر اس پروگرام میں تم دکھاؤ گی کیا؟''

''میرا ارادہ مقامی لوگوں کا انٹرویو لینے کا ہے اور اس کے ساتھ بدلتے حالات پر کچھ حکومتی ارکان سے گفتگو کروں گی۔'' میں نے اسے جواب دے کر فوجی جوان سے پوچھا۔ ''میجر جیانت نے کوئی ہدایت دی ہے تمہیں؟ علاقوں کی تفصیل وغیرہ کا تو بتایا ہوگا؟''

''جی بتایا ہے۔ کچھ علاقوں میں جانے سے منع کیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کی طرف احتجاج اور [illegible] ہوتا ہے زیادہ۔ اس طرف نہیں جا سکتے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فوجی کا نام شنکر معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ موجود ڈرائیور سارے راستے خاموش رہا تھا۔

''میرا جیانت صاحب سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا نہ ہی یہاں موبائل سروس ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''موبائل سروس حالات کی وجہ سے بند رہتی ہے شاید رات کو ایک دو گھنٹوں کے لیے آئے۔ اور جیانت صاحب بھی مصروف ہیں، ان سے شاید ملاقات نہ ہو سکے آپ کی۔'' تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم جس گیسٹ ہاؤس پہنچے، وہ ویران پڑا تھا۔ یہ شہری علاقے سے ہٹ کر ایک سنسان جگہ پر تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے قریب ترین آباد علاقہ کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

''جیانت صاحب کو کیا سوجھی اس ویران جگہ پر گیسٹ ہاؤس تعمیر کرنے کی؟'' وشال کی بڑبڑاہٹ میرے کانوں تک پہنچی۔ میرے گھورنے پر اس نے نظریں گھما لیں۔ شنکر کھانے پینے کا سامان ساتھ لایا تھا۔ رات کا کھانا ہم نے نو بجے کھایا۔ اس کے بعد نیند نے گھیر لیا۔ سفر کی تھکن نے جسم کے جوڑ ہلا دیے تھے۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو بادلوں نے آسمان پر قبضہ جما رکھا

تھا۔ دور کہیں پہاڑوں سے کالے بادل شہر پر حملہ کر رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر وشال کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ اپنے لیے کافی بنا کر میں ٹیرس پر آ گئی۔ سردی کا موسم اب عروج سے زوال کی طرف سفر کر رہا تھا مگر یہاں دہلی کی نسبت سردی زیادہ تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے درجۂ حرارت کم تھا اور آج بادلوں نے سردی کی ہمت بڑھا رکھی تھی۔ میں نے نیچے جھانکا۔ شنکر گیٹ پر کھڑا ڈیوٹی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وشال بھی جاگ گیا۔ ہم نے مل کر ناشتا تیار کیا۔

''سری نگر کا مطلب تو لکشمی اور سورج کا شہر ہے مگر میرا خیال ہے اس کا مطلب خوبصورت شہر ہونا چاہیے تھا۔'' وشال نے باہر گرتی بارش کی بوندیں دیکھ کر تبصرہ کیا۔ ''پھر میں سوچتا ہوں گر۔تھا کا لفظی مطلب بھی تو چالاک ذہن کی لڑکی ہوتا ہے۔'' میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اچھا شہر ہے مگر دہشت گردوں کا خطرہ رہتا ہے یہاں، ہمارے فوجی جوان اکثر ان کا نشانہ بنتے ہیں۔ کچھ سال پہلے میڈیا کی ٹیم بھی نشانہ بنی تھی۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ڈراؤ مت۔'' اس نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

''بھگوان مجھے ان خطروں سے بچائے۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ کچھ دیر بعد شنکر نے آ کر اطلاع دی۔

''گاڑی تیار ہے۔'' ہم دونوں باہر نکلے۔ ہماری منزل شہر کا مرکزی حصہ تھا۔ سری نگر شہر کو دریا دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ درمیان میں دو پل اس شہر کو جوڑتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ مرکزی حصے میں ہر طرف فوج تھی۔ کوئی شہری گھر سے باہر نہیں تھا۔

''یہ کھانے پینے کا بندوبست کیسے کرتے ہیں؟'' میں نے شنکر سے پوچھا۔

''جب حالات بہتر ہوں تب یہ کما لیتے ہیں۔ اور یہاں کے اکثر لوگ خراب حالات کے لیے پیسے جوڑ کر رکھتے ہیں۔'' اس نے مجھے بتایا۔ ایک جگہ میں نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ شنکر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے مجھے اترنے کا کہا۔ وشال نے کیمرا سنبھالا۔ وہ ریکارڈنگ کرتا رہا اور میں نے بولنا شروع کر دیا۔

''دہلی نیوز کے پروگرام ٹاک ٹائم میں سب کا سواگت ہے۔ میں ہوں آپ کی میزبان گر۔تھا کور اور آج ہم اس وادی میں موجود ہیں جسے جنت کہا جاتا ہے۔ ارد گرد کا ماحول دیکھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں حالات کیسے ہیں۔ حالات کی خرابی کے باعث کوئی شہری گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ہمارے فوجی یہاں کے حالات کو قابو کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، آپ ان فوجی جوانوں کو دیکھ سکتے ہیں جو علاقے کی سیکیورٹی کے لیے یہاں موجود ہیں۔'' میں نے وشال کو اشارہ کیا۔ اس نے کچھ دور کھڑے فوجیوں کو دکھایا۔ اسی طرح باتوں کے درمیان میں نے یہ علاقہ کھنگالنا شروع کر دیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد مجھے ایک پچاس پچپن سال کا کشمیری شخص ملا۔ وہ بازار آیا تھا مگر بازار بند دیکھ کر وہ سر جھکائے گھر واپس جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات تھے۔ میں نے اسے روک لیا۔ ابھی میں اس سے بات کرنے ہی والی تھی کہ اچانک دو تین فوجی بھاگتے ہوئے آئے۔

''یہاں آپ انٹرویو نہیں کر سکتیں۔'' ایک نے سخت لہجے میں مجھے حکم دیا۔

''کیوں؟'' میں اس کی طرف مڑی۔ اسی دوران ایک فوجی نے وشال کے ہاتھ سے کیمرا چھین کر ریکارڈنگ بند کر دی۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟ ہم نے میجر جیانت سے اجازت لی ہے۔'' میجر جیانت کا نام سن کر وہ کچھ نرم ہوئے۔ کیمرا چھیننے والے فوجی نے کیمرا وشال کو واپس کر دیا۔

''سوری میم مگر یہاں اجازت نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مقامی شخص کو سخت لہجے میں کہا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ...'' وہ شخص چپ چاپ سر جھکا کر واپس چل دیا۔

''یہ علاقہ خطرناک ہے یہاں کسی وقت بھی احتجاج کرنے والے آ سکتے ہیں، بہتر ہے کہ آپ دو دن ٹھہر کر یہاں آئیں۔'' اس نے کہا۔ میرا ارادہ اسے سخت جواب دینے کا تھا مگر وشال نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم اپنی گاڑی کی طرف واپس آ گئے۔ شنکر وہیں موجود تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور واپس گیسٹ ہاؤس کی طرف سفر شروع کیا۔

''اگر ایسی صورت حال رہی تو شاید پروگرام کا آدھا حصہ بھی مکمل نہ ہو سکے۔'' میں نے وشال کو کہا۔ وہ خاموش تھا۔ شنکر نے ہم سے واقعے کی تفصیل پوچھی اور کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''فوج کو یہی حکم ہے، ان کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے سر ہلا دیا۔

''چلو دیکھتے ہیں، کل کیا ہوتا ہے۔'' ہم واپس گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ہمیں کل کا انتظار تھا جو انتظار ہی رہا۔ وہ رات میری زندگی کی ایک خوفناک رات تھی۔

☆☆☆

رضیہ نے گل بانو کو دیکھ کر چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور کرسی اس کے لیے خالی کر دی۔ ''بیٹھو گل بانو۔'' اس کے

pklibrary.com

ساتھ ہی اس نے بیٹی کو چائے بنانے کا کہا۔ گل بانو اسے کسی الجھن کا شکار محسوس ہوئی۔ ’’کیا ہوا بہن؟ کچھ پریشان لگ رہی ہو؟‘‘

’’مجھے کام کی ضرورت ہے۔‘‘ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ یوں لگا جیسے وہ حالات سے ہار چکی ہو۔ پچھلے دو دن سے وہ اور بچے ایک وقت کا کھانا کھا رہے تھے۔ پیٹ کے جہنم کی آگ کے شعلوں نے آج اسے مجبور کر دیا۔ وہ رضیہ کے پاس چلی آئی۔ رضیہ نے اسے تسلی دی۔

’’مل جائے گا کام، کل چلنا میرے ساتھ۔‘‘ اس نے گل بانو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ واپس آگئی۔

دوسری صبح وہ رضیہ کے ساتھ شہر کے اس حصے میں آئی جہاں عام شخص کا داخلہ بہت مشکل تھا۔ تین بار اس سے پوچھ گچھ ہوئی اور رضیہ کی مدد سے وہ اس بنگلے تک پہنچی جہاں صفائی کا کام اس کا منتظر تھا۔

فوجی قبضے کے بعد اس وادی میں فوجی افسران نے حقیقی معنوں میں عیاشی کی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے جو تربیت ہوتی تھی اس میں وہ ذہنی طور پر غیر انسانی سلوک کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ اس لیے مختلف جگہوں پر قبضہ کرنا، کسی کے گھر میں گھسنا اور لڑکیوں کی گرفتاری ایک عام بات تھی۔ کچھ عرصے سے فوجی افسران نے یہاں جائداد خریدنا شروع کردی تھی۔ انہیں اس کام میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ وہ فوجی افسران جن کو حکومت کی طرف سے دی گئی رہائش اور سہولت پسند نہ آتی، وہ الگ جگہ پر گھر خرید لیتے تھے۔ کچھ افسران تو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہیں موجود تھے۔ یوں اس علاقے میں ایک کالونی انہی فوجیوں کی تھی۔ جس گھر میں گل بانو کو کام ملا تھا وہ کسی میجر کا تھا۔ اس نے پوری معلومات حاصل کی اور تصدیق کے بعد اسے ملازمت پر رکھا۔ میجر کی نسبت اس کی بیوی ایک نرم مزاج عورت تھی جس نے اس سے اچھا سلوک کیا۔

یوں گل بانو نے روزی کا بندوبست کرلیا۔ دونوں بچوں کو اس نے اسکول بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس شام وہ رضیہ کے ساتھ گھر واپس آرہی تھی جب راستے میں رضیہ نے پوچھا

’’بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے؟‘‘

’’ابھی تو پڑھ رہے ہیں۔‘‘ اس نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔

’’مقامی لوگوں کی پڑھائی کا کیا فائدہ؟ محنت مزدوری پر لگا دو۔‘‘ اس نے مشورہ دیا۔

’’میں حماد کو مجاہد بناؤں گی۔ جہاد کرے گا وہ۔‘‘ یہ سوچ نہ جانے کب اور کیسے اس کے دماغ میں آئی تھی۔ رضیہ اچھل پڑی۔ اس نے ارد گرد دیکھا اور اسے سخت لہجے میں کہا۔

’’ایسی بات آئندہ تمہاری زبان پر نہ آئے گل بانو۔ کسی نے سن لیا تو پورے خاندان سمیت مار دیں گے۔‘‘ رضیہ کی دھمکی سے اس نے ڈرنا ہوتا تو وہ ایسا سوچتی کیوں؟ گل بانو نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے حماد کے دماغ میں یہ باتیں بٹھانا شروع کر دی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے جہادی تنظیم میں کیسے بھیجنا ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا حماد کا مستقبل کیا ہوگا مگر وہ اپنے بیٹے کو اپنے باپ کا اور اپنی سرزمین کا بدلہ لینے پر اکسا رہی تھی۔

دو سال بعد جب حماد بارہ سال کا تھا تب ایک بھیانک رات نے گل بانو کے خواب، خواب ہی رہنے دیے۔

☆☆☆

آدھی رات کے بعد کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے کمرے کے پاس کوئی موجود ہے۔ میرا جسم کانپ اٹھا۔ چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف آگئی۔ وشال ساتھ والے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں اس کی طرف جانا چاہتی تھی کہ اچانک دھماکا ہوا۔ کسی نے میرے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا۔ سنسان جگہ کا سناٹا فائرنگ کے شور سے ٹوٹ گیا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے نیچے گرالیا۔ وشال کی آواز مجھے سنائی دی۔

’’گریتھا، تم ٹھیک ہو؟‘‘ میں اسے جواب نہیں دے سکتی تھی کیونکہ کھڑکی کے پاس کوئی موجود تھا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ میں بیڈ کے نیچے کھسک گئی۔ وہ جو بھی تھا، ٹوٹی کھڑکی کے راستے سے اندر آنا چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ میں نے سانس روک لی۔ یہی وقت تھا جب مجھے شنکر کی للکار سنائی دی۔

’’خبردار۔‘‘ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آواز گونجی۔ وہ اجنبی چیختا ہوا پیچھے گرا۔ اس کے بعد کچھ اندازہ نہ ہوا۔ فائرنگ کی آواز وقفے وقفے سے آرہی تھی۔ دس منٹ بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ میں بیڈ سے باہر آئی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تین نقاب پوش ہمارے گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے پاس جدید ساخت کا اسلحہ تھا۔ ایک کے پاس اسنائپر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے پورے گیسٹ ہاؤس کی لائٹس آن کردیں۔ گیٹ کے پاس ایک لاش موجود تھی۔ ایک لاش میرے کمرے کے پاس تھی۔ خوف کی وجہ سے میرا پورا

جسم کانپنے لگا۔ میرے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ ایک نقاب پوش اندر داخل ہوا۔

''خبردار! ہلنا مت۔'' میں نے ہاتھ کھڑے کر لیے۔

اس نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ چاپ چل پڑی۔ لاؤنج میں وشال صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر بھی ایک شخص موجود تھا۔ تیسرے شخص نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور وہ زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ وہ ان کا لیڈر لگ رہا تھا۔

''ان کے ساتھی دونوں فوجی کہاں ہیں؟''

''ایک مارا گیا ہے اور ایک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔''

''اور علی؟''

''وہ شہید ہو گیا۔'' اس نے سر ہلا دیا۔ لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد لیڈر کھڑا ہوا۔ وہ کچھ الجھن میں تھا۔ وشال نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کون ہو تم لوگ؟ یہاں کیوں آئے ہو؟'' لیڈر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے ساتھی کو اشارہ کیا۔ ان کے پاس ایک ویڈیو کیمرا تھا۔ چند سیکنڈ کا کھیل تھا یہ۔ اس نے جیکٹ کی زپ کھولی اور ہاتھ نکال کر [illegible] باہر نکالا۔ [illegible] شروع ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ وشال کے ماتھے میں سوراخ ہو چکا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں قریب ہی موجود تھے۔ بھیانک رات گزر چکی تھی مگر صبح ہرگز روشن نہیں تھی۔ وشال کی لاش قریب ہی پڑی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میری وجہ سے یہاں آیا تھا۔ اور کچھ گھنٹے پہلے گولی کا نشانہ بن گیا۔ لیڈر مجھے ہوش میں دیکھ کر میری طرف آیا۔

''تم نہیں پوچھو گی کہ کون ہیں ہم؟'' اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

''تم جو بھی ہو۔ انسان نہیں ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ ہنس پڑا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ایک نیوز چینل چلا دیا۔ یہاں ایک نیوز کاسٹر ہیجانی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''کچھ دیر پہلے ہی خبر ملی ہے کہ کشمیری آتنگ وادی تنظیم نے دہلی نیوز کے مشہور پروگرام ٹاک ٹائم کی میزبان گریتا کور کو اغوا کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو بھی جاری کی ہے جس میں ان کے ساتھی کیمرا مین کو قتل کر دیا گیا۔ اس بارے میں مزید معلومات ہم اپنے نمائندہ راجیش سے حاصل کریں گے۔ جی راجیش۔'' نیوز کاسٹر کے ساتھ ہی اسکرین پر ایک اور نمائندہ ظاہر ہوا۔ اس کا چہرہ جوش کی شدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔

''جی کرن۔ ابھی ابھی خبر کے ساتھ خوفناک ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی ہے جس میں وشال نامی کیمرا مین کو بے دردی سے مار دیا گیا ہے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ گریتا کور کی رہائی کے لیے کوئی شرط رکھی گئی ہے۔ کشمیری آتنگ وادیوں کے اس قتل کے جواب میں بھارتی فوج کیا جواب دے گی یہ تو جلد ہی معلوم ہو جائے گا مگر اس کے ساتھ دہلی نیوز کی ٹیم اور ان کے مالک بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں کیونکہ حالات کی خرابی کی وجہ سے کسی میڈیا کی ٹیم کو کشمیر میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' لیڈر نے موبائل بند کر دیا۔

''تو میری رہائی کے بدلے میں تمہیں اپنا کوئی دہشت گرد ساتھی چھڑوانا ہو گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یہ تمہاری سوچ سے بڑا کھیل ہے بی بی۔'' اس کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ واپس آ گئی۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا مجھے۔

☆☆☆

گل بانو نے رضیہ کے سامنے حماد کے مجاہد بن جانے کا ذکر تو کر دیا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ رضیہ عام عورتوں جیسی ہی تھی۔ پیٹ کی ہلکی اور 'کسی کو نہ بتانا' کا وعدہ کر کے سب کچھ اگلی نسل تک پہنچانے والی۔ بات اس چھوٹے سے محلے میں پھیلتی چلی گئی۔ حماد مجاہد بنتا یا نہیں۔ مگر اب محلے کے اکثر لڑکے اس سے دور رہنے لگے تھے۔ ایک خوف کا دائرہ تھا جس کے چکر میں سب آ گئے۔ گل بانو کو اس بات کا اندازہ بہت بعد میں ہوا۔

انہی گلی محلوں میں نجانے کتنے ایسے بھیس بدل کر گھوم رہے تھے جن تک بات پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ وہ جہادی تنظیم جنہیں وہ آتنگ وادی کہتے تھے۔ اس میں کوئی شامل ہو کر کل کو ان کے سامنے ہتھیار اٹھا کر آزادی کا نعرہ بلند کرنے کی جرأت کرے، اس سے بہتر تھا وہ اس کی آواز پہلے ہی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتے۔

گل بانو نے اس شام دونوں بیٹوں کو کھانا کھلا کر سلا دیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سارا دن ایک آرمی آفیسر کے گھر کا کام کرنے کے بعد وہ تھک جاتی مگر اس تھکن کے باوجود نیند آج کل آنکھوں سے ناراض تھی۔ اس نے ایک کرسی کمرے سے باہر نکالی اور اس پر بیٹھ کر مستقبل کا سوچنے لگی۔ اسے

احساس ہی نہ ہوا، کوئی چپکے سے اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کھانسنے پر گل بانو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ حماد تھا۔

''ابھی تک سوئے نہیں حماد؟''

''نہیں امی۔ آواز سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو آپ تھیں۔ آپ کیوں نہیں سو رہیں؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''بس نیند نہیں آ رہی۔'' اس نے پیار سے حماد کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ حماد کا قد لمبا تھا۔ نجانے کیوں وہ ابھی سے فخر کر رہی تھی۔ ''میرا بیٹا بڑا ہو کے کیا بنے گا؟''

''مجاہد! جہاد کروں گا، اپنے وطن کو ان سے حاصل کروں گا۔''

''شاباش!'' گل بانو نے اس کا ماتھا چوما۔ ''بڑا ہو کر میرا بیٹا اپنے باپ کا اور ہر بے گناہ کا بدلہ لے گا جو ان ظالموں کے ہاتھوں مارا گیا۔'' وہ ماں بیٹا دو الگ وجود تھے مگر ماں کی گود میں بیٹھ کر وہ اس کے وجود کا حصہ لگ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب گل بانو کو کچھ احساس ہوا۔ اس نے سونگھنے کی کوشش کی۔

''حماد۔'' حماد نے سر اٹھایا۔ وہ بھی کچھ محسوس کر رہا تھا۔ اس سے ہونٹ ہلے۔

''پیٹرول۔'' حماد کے منہ سے یہ لفظ سن کر اس کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہاں گھر جلائے جاتے تھے۔ جس کسی پر شک ہوتا، اس کے گھر کو جلا دیا جاتا تھا۔ کیا آرمی تک اس کے خیالات پہنچ چکے تھے؟ یہ سوال اس کے دماغ میں جنم لے چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب اس نے حماد کو ہدایت دی۔

''اندر تمہارا بھائی سو رہا ہے۔ اسے جگا کر دروازے کی طرف لے آؤ۔'' اسے اندر بھیج کر وہ باہر نکل آئی۔ اس نے دروازے کی طرف جھانکنا چاہا جب اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ گل بانو کو یہ آگ قیامت کی آگ محسوس ہوئی تھی۔ یہ گھر کے چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ وہ باہر نکل سکتی تھی مگر اندر اس کے دونوں بیٹے تھے۔

''حماد......!'' وہ چیخی۔ اس نے اپنے کمرے کی چھت پر سایہ دیکھا۔ سائے نے نیچے چھلانگ لگائی اور اس کے بعد چھت پر بھی آگ بھڑک اٹھی۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اندر کی طرف دوڑی۔ اس نے حماد کو دیکھا۔ آگ اس کے جسم کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ ماں اور چھوٹے بھائی کو خود سے دور رکھنا چاہتا تھا مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کے وجود سے دور رہ کر بھی ان دونوں کا بچنا ناممکن لگ رہا تھا۔ آگ کی تپش گل بانو کو اپنے وجود کے گرد گھیرا ڈالتی محسوس ہوئی۔

''امی۔'' حماد کے منہ سے نکلنے والے اس لفظ نے اس کی تڑپ میں اضافہ کر دیا۔ اس نے پانی کی بالٹی اٹھائی اور بیٹے کو بچانے کی آخری کوشش کی۔ آخری ناکام کوشش۔

آگ صرف ایک گھر تک محدود نہ رہی۔ پڑوس کا گھر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ کتنے لوگوں کی جان گئی۔ کتنے گھر برباد ہوئے۔ حکمرانوں کو اس سے کیا مطلب؟ اگلے دن دوپہر تک اس 'اتفاقی آگ' پر قابو پا لیا گیا۔ گھر کے جل کر تباہ ہوئے ملبے سے لاشیں نکالنے کی ہمت کسی نے نہ کی۔ ہاں مگر اس ملبے کا کچھ لوگوں نے جنازہ پڑھا اور اس ملبے کے ڈھیر پر فاتحہ ضرور پڑھی کچھ لوگوں نے۔ ایک ماں کی، دو بیٹوں کی اور ایک ننھے مجاہد کی۔

☆☆☆

اگلے دن شام کو مجھے جس جگہ لایا گیا وہ میرے لیے اجنبی تھی۔ دوپہر کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک گاڑی میں بٹھا کر وہ مجھے یہاں لائے تھے۔ اب میں ایک کمرے میں بند پڑی تھی۔ دروازہ لاک تھا اور کھڑکی کے پاس ایک شخص ہاتھ میں پسٹل لیے نگرانی کر رہا تھا۔ رات کے آٹھ بجے لیڈر دوبارہ میرے پاس آیا۔ اس نے ایک اور ویڈیو مجھے دکھائی۔ یہاں ایک نیوز کاسٹر حکمران جماعت کے ایک اہم عہدیدار سے سوال پوچھ رہی تھی۔

''فیضان خان نام بتایا جا رہا ہے اس آتنگ وادی کا جس کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے ٹاک ٹائم کی ہوسٹ کو اغوا کرنے والوں نے۔ آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''ابھی اس مسئلے پر حکومت اور آرمی کے کچھ لوگ بات کر رہے ہیں۔ آج سب اکٹھے ہوں گے تو فیصلہ کیا جائے گا۔'' بالوں سے پاک سر والے اس سیاستداں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا حکومت آتنگ وادی گروپ سے ہار مان لے گی؟'' نیوز کاسٹر نے ایک اور سوال کیا۔

''ہمارے لیے فی الحال گر۔ تھا کور کی رہائی ضروری ہے۔ اس کے لیے ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔'' سیاستداں نے اپنا لہجہ متوازن رکھا تھا۔

''فیضان خان کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ یہ ایک ظالم تنظیم کا لیڈر ہے جس کی گرفتاری کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''یہ آرمی اور ان کے افسران کا فیصلہ تھا جس پر حکومت کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' اس نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔ ''ظاہر ہے وہ اس جگہ موجود ہیں اور ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ

pklibrary.com

کیا کرنا ہے۔'' اس کے بعد نیوز کاسٹر نے مختلف شہروں میں ہونے والے احتجاج دکھانا شروع کر دیے جو میری رہائی کے لیے تھے۔ لیڈر نے موبائل بند کر دیا۔

''گرو۔تھا کور جی۔ ایک ویڈیو ریکارڈ کرنی ہے۔''

''میں کوئی ویڈیو ریکارڈ نہیں کرا رہی۔'' میں نے صاف انکار کیا۔ ''تم لوگوں نے جو وشال کے ساتھ کیا ہے وہی میرا انجام بھی ہے۔ اس لیے میں تیار ہوں اب۔''

''وشال بہت آسان موت مرا ہے بے بی۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ہم تینوں باری باری تمہارے ساتھ اس بستر پر جو کچھ کریں گے وہ تم صرف سوچ سکتی ہو۔''

میں کانپ اٹھی۔ ''پانچ منٹ بعد آؤں گا۔ تیار رہنا یہ بولنے کے لیے۔'' اس نے میرے سامنے ایک کاغذ پھینکا جس پر لکھا تھا۔

''میں گرو۔تھا کور اس وقت ان دہشت گردوں کی قید میں ہوں۔ میری حکومت سے درخواست ہے کہ مجھے رہا کروانے کے لیے ان کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ یہ ویڈیو بھی یقیناً سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی تھی۔ پانچ منٹ بعد ایک بار پھر میرے ہاتھ پیر رسی سے باندھ دیے گئے۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھنے کے بعد مجھے لیڈر نے بولنے کا حکم دیا۔ میں نے ان کے دیے گئے الفاظ بول دیے۔ ریکارڈنگ کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

رات کے نو یا دس بجے کا وقت تھا جب مجھے محسوس ہوا جیسے باہر کوئی گاڑی آکر رکی۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کے قہقہے سنائی دینے لگے۔ میں چپ چاپ لیٹی رہی۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

آدھی رات کے بعد کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ میری سانس رک گئی۔ کوئی شخص رسی کی مدد سے چھت سے کھڑکی تک پہنچا ہوا تھا۔ کھڑکی کے باہر نگرانی کرنے والا سو رہا تھا۔ وہ بے خبر تھا کہ کوئی اس تک پہنچ چکا ہے۔ میں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ رسی کے ذریعے نیچے اترنے والے کے وجود پر بلب کی روشنی پڑی۔ وہ شنکر تھا۔ جیسے ہی اس نے رسی چھوڑی۔ اس کے پیروں نے زمین کو چھوا۔ یہی وقت تھا جب سویا ہوا پہرے دار جاگ گیا۔ اس کے منہ سے آواز نکلنے سے پہلے شنکر نے اس کی گردن بازو میں جکڑ لی۔ اس کے بعد وہ دونوں کھڑکی سے ہٹ گئے۔ میں اٹھی اور کھڑکی اندر سے کھول دی۔ میں نے دیکھا۔ شنکر نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔ اس کے بعد وہ میری طرف آیا۔ اس نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں نے دیکھا، خنجر پر خون لگا ہوا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔

''کتنے آدمی تھے یہاں؟''

''تین۔''

''دو نہیں رہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میجر جیانت صاحب کو بتایا تم نے؟ اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ؟'' ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ مسکرایا ہو۔ اس نے جواب دینے کے بجائے مجھے بیٹھنے کا کہا اور دبے قدموں باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں باہر آگئے۔ اس نے باہر جانے کے بجائے ایک اور کمرے کا رخ کیا۔ اس کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اندر دیکھنے کا کہا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

☆☆☆

گرو جی میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات واضح تھے۔ ''میرے منع کرنے کے باوجود تم کشمیر گئیں۔ وہاں کیا ہوا۔ کیسے اغوا ہوئیں۔ کیسے رہا ہوئیں، تم نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک ماہ ہو گیا ہے تمہیں یہاں آئے، تم پروگرام بھی نہیں کر رہیں۔''

''سر میری طبیعت۔''

''یہ طبیعت والا بہانہ چھوڑو۔'' انہوں نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''تمہارے اس ایک کشمیر کے پروگرام کی وجہ سے میرے چینل پر پورے پندرہ دن پابندی لگی رہی۔ کم از کم مجھے تو بتا دو کہ تمہیں کس نے چھڑوایا؟''

''ایک بوڑھی عورت نے۔'' میں نے جواب دیا۔ انہوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میری دماغی حالت پر شک ہو۔

''دہشت گردوں کے ٹھکانے سے تمہیں ایک بوڑھی عورت نے نکالا۔ جہاں تک فوج بھی نہیں پہنچ سکی، تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟''

''آپ نے کس سے کہا تھا کہ کشمیر میں مجھے مکمل سیکیورٹی دی جائے؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''میجر جیانت سے۔''

''تو ان سے پوچھیں کہ مجھے کب کس نے اغوا کیا اور

pklibrary.com

کس نے پھنسایا؟''

''میں ان سے نہیں پوچھ سکتا۔'' انہوں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ہی بتاؤ وگرنہ۔''

''کیوں نہیں پوچھ سکتے آپ؟'' میں نے ان کے چہرے پر نظریں جمائیں۔

''کوئی وجہ ہے تو کہہ رہا ہوں۔ اب بتاؤ کیا ہوا تھا وہاں؟'' میں نے گہری سانس لی اور بولنا شروع کر دیا۔ وشال اور اپنے سفر سے لے کر اپنے اغوا اور شنکر کی واپسی تک۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔

''تو شنکر ایک فوجی جوان ہیرو تھا جس نے تمہیں وہاں سے نکالا۔ پھر یہ بات راز میں کیوں رکھی؟ اس پر تو ایک بہترین پروگرام کیا جا سکتا ہے اور ہمارا چینل ٹاپ ٹرینڈ میں آجائے گا۔'' انہوں نے جوش سے کہا۔

''اس پروگرام میں ایک اور کہانی سنانی بھی ضروری ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''ایک تھی گل بانو جس کا شوہر اندھی گولی کا شکار ہو گیا۔'' گروجی حیرت سے مجھے دیکھنے لگے مگر میں بولتی چلی گئی۔ بات کے اختتام پر میں نے کہا۔ ''گل بانو اور اس کے دو بیٹے آگ میں جل گئے۔''

''تم مجھے الجھا رہی ہو۔ ایک کشمیری عورت جس کا شوہر شک کی بنا پر فوج نے گولی سے [illegible] دیا گیا تھا اس سے تمہارے اغوا کا کیا تعلق؟''

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''گروجی جس میجر جیانت کو آپ نے مجھے سیکیورٹی دینے کا کہا تھا دراصل اسی کے فوجیوں نے مجھے اغوا کرلیا۔'' وہ اچھل پڑے۔ میں نے ان کی حیرت کو نظرانداز کر دیا اور حقیقت بیان کی۔ ''جب میں اور وشال وہاں پہنچے تو شنکر کے بھیس میں جو نوجوان فوجی بن کر ہمیں ملا تھا وہ کشمیری مجاہد تھا۔ وہ میجر جیانت کی ساری پلاننگ سے واقف تھا۔ میجر جیانت اور کچھ فوجی افسران ایک میڈیا پارٹی سمیت کئی لوگوں کو اغوا کر کے ان کا الزام مجاہدوں کی تنظیم پر لگانا چاہتے تھے۔ یہ وہ دہشت گردی کا کھیل ہے جو پوری وادی میں برسوں سے کھیلا جا رہا ہے اور انتقام لینے کے چکر میں کئی معصوموں کو مار دیا جاتا ہے۔ آغاز مجھ سے ہوا۔ مجھے اجازت ہی اس لیے ملی تھی کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کریں لیکن ان کے منصوبے کا علم میجر جیانت کے ایک ذاتی گھر کی نوکرانی گل بانو کو ہو گیا جس نے مجاہدین کو خبر کر دی۔ اس لیے جس شنکر نے مجھ تک پہنچنا تھا وہ راستے میں مار دیا گیا اور اس کی جگہ ایک مجاہد مجھ تک پہنچا۔ اس رات جب میجر جیانت کے فوجیوں نے مجھے اغوا کیا اور وشال کو مار کر ویڈیو سوشل میڈیا پر ڈال دی۔ اس رات کشمیری مجاہد اور اس کا ساتھی وہیں تھے۔ ایک کو فوجیوں نے مار دیا مگر شنکر کے روپ میں آنے والا مجاہد بچ گیا اور اس نے ان کا تعاقب کر کے ٹھکانا معلوم کرلیا۔ یہاں ایک دلچسپ بات سنیں۔ شنکر جب پہلی بار ملا تھا تب میں نے یا وشال نے اس کی تصدیق نہ کی اور میجر جیانت کے دل میں ویسے بھی چور تھا۔ اس نے ہم سے کوئی رابطہ نہ کیا یوں کشمیری مجاہد کے لیے راستہ آسان ہو گیا۔ اس نے اگلی رات دو فوجیوں کو مار کر مجھے آزاد کروایا اور ایک کمرے میں شراب کے نشے میں بے ہوش پڑا میجر جیانت مجھے دکھایا۔ ہم وہاں سے بھاگ نکلے اور گل بانو مجھے واپس بس اڈے تک لے آئی۔ راستے میں اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی تھی۔''

''گل بانو تو آگ میں مر چکی تھی اور وہ کشمیری مجاہد کون تھا؟ گل بانو کا بیٹا؟''

''نہیں۔ گل بانو کے دونوں بیٹے آگ میں جل گئے مگر چہرہ جلنے کے باوجود گل بانو کسی طرح بچ گئی۔ اس باہمت خاتون نے زندگی کے کئی سال ان فوجی افسروں کی نوکری میں گزار دیے اور ساتھ ساتھ جہادی [illegible] کے لیے [illegible] کرتی رہی۔ جہاں تک بات اس کشمیری مجاہد کی ہے تو وہ۔'' میں مسکرا دی۔ ''وہ فیضان خان تھا جس کی رہائی کے لیے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ یہ فوج کا دوسرا جھوٹ تھا۔ فیضان خان کبھی پکڑا ہی نہیں گیا۔ اس کے ساتھی ضرور گرفتار ہوئے ہیں۔''

گروجی نے اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''اب ایک خبر تم بھی سن لو، میجر جیانت گھر میں مردہ پایا گیا ہے۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی ہے اور کاٹنے والی اس کی گھر کی بوڑھی ملازمہ تھی جس نے بعد میں خودکشی کرلی۔'' میں اچھل پڑی۔ میرے منہ سے نکلا۔

''گل بانو۔'' اس نے سر ہلا دیا۔

''وہ وہاں شناخت بدل کر نوکری کر رہی تھی۔ میڈیا یہ خبر نہیں دے سکتا۔ میجر جیانت سو رہا تھا جب اس کو مار کر اس نے پکڑے جانے کے ڈر سے خودکشی کرلی۔ شاید وہ مجاہدین کی تنظیم کی معلومات رکھتی تھی اس لیے اس نے اپنی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی۔''

مارچ کی شام کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ گروجی اور میں اب خاموش تھے۔ ہمیں معلوم تھا ہم چاہ کر بھی دنیا کو حقیقت نہیں بتا سکتے۔۔

❖❖❖

pklibrary.com

pklibrary.com

حسنِ باطن

منظر امام

ظاہری حسن و خوبصورتی کے سب شیدائی ہوتے ہیں... کیونکہ وہ پہلی نظر میں ہی تسخیر کرلیتا ہے... مگر ایسا حُسن بھی ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ دل میں اُترتا ہے... اور اپنی جگہ بنا لیتا ہے... بدصورتی کے لبادے میں چھپی خوبصورتی کے کرشمے...

بدمزاجی اور بدصورتی میں سے اجاگر ہونے والی سوزِ جستجو......

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے پریشان کردیا تھا۔

دستک بھی اپنی زبان رکھتی ہے۔ پتا چل جاتا ہے کہ یہ کس قسم کی دستک ہے۔ جارحانہ، دوستانہ...... وہ جو دستک تھی، وہ جارحانہ سی تھی۔ میں بستر سے اٹھ کر دروازے تک گیا۔

سامنے محلے کا ایک آدمی شبیر کھڑا تھا۔ اگرچہ مجھے اس محلے میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لیکن مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوچکا تھا۔ وہ ایک تُندخو انسان تھا۔

محلے والوں سے اس کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ خدا خیر کرے اس کا یوں رات گئے میرے دروازے پر آ کر اس طرح دستک دینا بلاوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"جی فرمائیں۔" میں نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

"تم اس محلے میں نئے آئے ہو نا؟" اس نے سوال کیا۔

"جی ہاں، نیا آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اسی لیے تم مجھے نہیں جانتے۔" اس نے کہا۔ "میں صغرا کو تنگ کرنے والوں کو چیر کر رکھ دیتا ہوں۔"

"صغرا؟ کون صغرا؟"

"وہی جس کو تم نے آج دن میں چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔" اس نے کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ وہ میری بہن ہے۔"

"میں تو آپ کو بھی نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "آپ کی بہن کو کہاں سے جانوں گا؟"

"اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" وہ غرایا۔ "تمہیں نیا سمجھ کر چھوڑ رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا اور میں دروازے پر کھڑا رہ گیا تھا۔ خدا جانے یہ کیسی آفت آ گئی تھی۔ اسے کہتے ہیں سر منڈاتے ہی اولے پڑنا۔ میں تو ابھی اس محلے سے ٹھیک سے واقف بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی کو چھیڑنے کا الزام لگ گیا اور وہ بھی ایک خطرناک آدمی کی بہن کو چھیڑنے کا۔ اب رات کو میں کس کے پاس جا کر یہ ماجرا بیان کر سکتا تھا۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ میں دفتر بھی نہیں جا سکا۔ منہ ہاتھ دھو کر محلے کے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں شہاب صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک معقول انسان تھے۔ کسی زمانے میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ پڑھے لکھے انسان تھے۔ اس محلے میں آتے ہی میری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس محلے کا یہ دستور تھا کہ وہ کسی غیر شادی شدہ کو مکان کرائے پر نہیں دیتے تھے۔

لیکن شہاب صاحب کی وجہ سے آسانی ہو گئی تھی۔ انہوں نے میری سفارش کر دی تھی۔ وہ محلے کے ایک معزز آدمی تھے اسی لیے ان کی بات مان لی گئی تھی اور مجھے ایک معقول سا مکان کرائے پر مل گیا تھا۔

میں شہاب صاحب کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ "ارے احمد صاحب، میرا خیال ہے کہ ناشتا کرنے آئے ہوں گے؟"

"جی ہاں اور آپ کی تلاش میں بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"خیریت؟"

"پتا نہیں خیریت ہے بھی یا نہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "رات ایک صاحب بہت غصے میں میرے پاس آئے تھے۔"

"ارے کون آ گیا تھا؟"

"اس آدمی کا نام شبیر ہے۔ مجھے اس کے بارے میں محلے والوں نے بتایا تھا۔"

"ارے وہ کیوں آیا تھا آپ کے پاس؟"

"پتا نہیں، وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کی بہن کو چھیڑا ہے جبکہ میں اس کی بہن کو جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"اوہو، تو وہ یہ چکر لے کر آپ کے پاس بھی پہنچ گیا تھا؟"

"کیسا چکر؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔"

"وہ کئی لوگوں کے پاس اسی قسم کی شکایت لے کر جا چکا ہے۔ بدتمیز آدمی ہے۔ لڑائی جھگڑے پر اتر آتا ہے۔"

"یوں ہی بلاوجہ؟"

"ہاں بلاوجہ ہی سمجھ لیں۔ پتا نہیں کیا مزاج ہے اس کا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ محلے کے لوگ اس کی بہن کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی بہن جا کر اپنے بھائی کو بھی بتاتی ہو۔"

"کمال ہے۔ اب بتائیں میں اس بندے سے کیسے جان چھڑاؤں؟"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟" شہاب نے کہا۔ "تم ایسا کرو، ایک بار اس کی بہن کو دیکھ لو۔"

"یہ کیسا مشورہ دے رہے ہیں آپ؟"

"یہ بالکل صحیح مشورہ ہے۔ تمہاری الجھن کو دور کرنے کا مشورہ ہے۔ اس کے بعد تم مجھ سے ملنا اور اپنے تاثرات بتانا۔"

"کمال ہے، میں دیکھ لوں گا اس کو لیکن وہ ملے گی کہاں؟"

"اپنے گھر۔ تم نے اس کا گھر دیکھا تو نہیں ہو گا۔ اس کے گھر کے سامنے جامن کا ایک بہت بڑا سا درخت ہے۔ محلے بھر کے ناکارہ لڑکے جامن توڑنے کے چکر میں اس کے گھر کے سامنے جمع ہو کر پتھر برساتے رہتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کی بہن گھر سے باہر نکل کر ان کو گالیاں دیتی رہتی ہے۔ بس یہی پہچان ہے۔"

"یہ تو بہت زبردست پہچان بتادی۔" میں مسکرادیا۔

شہاب صاحب بھی ہنس دیے۔ "اس کے علاوہ اور کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔"

میں اسی شام کو اس مکان اور اس درخت کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں واقعی بہت سے لڑکے جمع تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس درخت پر جامن دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن لڑکوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ اپنی تفریح میں لگے ہوئے تھے۔ میں وہاں سے کچھ فاصلے پر جاکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اپنے بچپن کے دن یاد آنے لگے تھے جب اسی قسم کی شرارتیں ہوا کرتیں اور بڑوں سے مار کھانی پڑتی۔ لیکن شرارتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

میرا خیال ہے کہ پوری زندگی کا سب سے حسین وقت بچپن ہی کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے سب کچھ لے لے اور بچپن کے چند ایام واپس کر سکے تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہوگا۔

بہر حال میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اچانک ان لڑکوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ وہ سب کے سب بھاگ لیے۔ جو درخت پر تھے، وہ بھی کود کود کر فرار ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور کوئی چیختا گالیاں دیتا ہوا دروازے پر آیا۔

وہ ایک لڑکی ہی تھی۔ خدا کی پناہ۔ کالا رنگ، چھوٹا سا قد، بے پناہ بدصورتی تھی اس میں۔ اور یہی شبیر کی بہن تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس کو کوئی چھیڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے شبیر کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہو گئی تھی کہ لوگ اس کی بہن کو چھیڑا کرتے ہیں۔ شہاب صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں ایک بار اس کی بہن کو دیکھ لوں پھر میرے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔

میں دل ہی دل میں شبیر اور اس کی خوش فہمی پر لعنت بھیجتا ہوا واپس آ گیا۔ شہاب صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلا سوال یہی کیا۔ "کیوں بھائی دیکھ آئے اس حسینہ کو؟"

"جی شہاب صاحب دیکھ آیا ہوں لیکن آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں اس کو دیکھنے گیا ہوں گا؟"

"بھائی یہ انسانی فطرت ہے۔ تمہارے دل میں ایک تجسس جاگ اٹھا تھا۔ اس کا تقاضا یہی تھا کہ تم اس کو دیکھنے پہنچ جاؤ۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ میں اس کو دیکھنے چلا گیا تھا اور وہ بے چاری ایسی ہے کہ کوئی اس کو چھیڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"اب کون اس شبیر کو سمجھائے؟"

کئی دن گزر گئے۔ اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ دو تین بار شبیر سے میری ملاقات ہوئی۔ ملاقات کیا بس آمنا سامنا ہوا۔ لیکن وہ میرے برابر سے گزرتا چلا گیا۔ اس نے دھیان تو دیا تھا لیکن کوئی بات نہیں کی۔ شہاب صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اب تم پر دھیان بھی نہیں دے گا۔

ایک بار اس کی بہن صغرا سے بھی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ میں ایک جنرل اسٹور پر کھڑا تھا کہ وہ بھی کچھ لینے وہاں آ گئی۔ دکان دار میرا سودا باندھنے میں لگا ہوا تھا کہ اس نے آتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ "یہ کیا بات ہوئی کب سے بچے کو بھیج رہی ہوں لیکن تم نے ابھی تک سامان ہی نہیں بھیجا۔ تم جانتے ہو کہ میں دیر برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ایک منٹ ٹھہر جا بہن۔" دکان دار نے کہا۔ "میں ذرا ان سے نمٹ لوں۔" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"کیوں یہ کوئی لاٹ صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پہلے میں آرڈر دے چکی ہوں، میرا سامان بندھے گا۔"

مجھے اس کی بات سُن کر برا سا لگا تھا۔ میں خود کو روک نہیں سکا۔ میں تلخ ہو کر بولا۔ "محترمہ میں کوئی لاٹ صاحب تو نہیں ہوں لیکن ایک معزز انسان ضرور ہوں۔"

"اوہو۔" اس نے طنزیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ وہ سر تا پا میرا جائزہ لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پھر کچھ نہ کچھ کہے گی لیکن اس کے برعکس اس کا لہجہ بہت دھیما ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے معزز صاحب، پہلے آپ ہی لے لیں، میں انتظار کر لیتی ہوں۔"

وہ دکان سے ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت دکان دار نے مجھ سے کہا۔ "جناب، یہ تو کمال ہو گیا۔ ورنہ یہ کہاں سننے والی ہے۔ آپ کی بات سن کر ہی ایک طرف ہٹ گئی۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ اس محلے میں نئے آئے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں بھائی ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

اس پر دکان دار نے چور نگاہوں سے اس لڑکی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ کہیں وہ سن نہ لے پھر دھیرے سے بولا۔ "بھائی جان اس کے بھائی سے ذرا بچ کر رہیے گا۔ وہ او کھے مزاج کا بندہ ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔"

میں اس کو پیسے دے کر دکان سے باہر آ گیا۔ اس وقت

اس لڑکی نے غور سے میری طرف دیکھا تھا پھر میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں اپنے دفتر آتا جاتا رہا لیکن ایک شام ایک تبدیلی ہو ہی گئی۔ اس دن مجھے دفتر میں دیر ہو گئی تھی۔

عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن اس دن ہو گیا۔

میں جب اپنے محلے میں پہنچا تو اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ سڑک پر ہی میں بس سے اتر کر گھر کی طرف چل پڑا۔ اس وقت گلی میں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ میں چلتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک بائیک میرے پاس آ کر رک گئی۔ اس پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے دل میں کچھ کھٹکا سا تو ہوا لیکن میں نے ان پر زیادہ دھیان نہیں دیا، آگے چلتا گیا۔

ان میں سے ایک نے گونج دار آواز میں حکم دیا۔

''اے جلدی کر۔ جو کچھ ہے تیرے پاس جلدی دے دے۔''

یہ اتفاق ہے کہ اس دن میرے پاس کچھ پیسے تھے جو میں دفتر سے لایا تھا اور وہی پورے ماہ کا خرچ تھا۔

مجھے ہچکچاتا دیکھ کر جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا، وہ بائیک سے اتر آیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ عام طور پر یہ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، چونکہ انہیں پکڑے جانے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اسی لیے وہ جلدی جلدی نکل جانا چاہتے ہیں۔

میری چیخ شاید دور تک گئی تھی یا میں اتنا ہی حواس باختہ ہو گیا تھا کہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ بلکہ بے ہوش بھی ہو گیا تھا۔ اسی گلی میں جہاں میں رہتا تھا۔

نہ جانے کب تک بے ہوش رہا ہوں گا۔ ہوش اس وقت آیا جب کسی کی آواز سنی۔ وہ کسی عورت یا لڑکی کی آواز تھی جو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔

''کم بختوں کو شرم بھی نہیں آتی۔ جب چاہے کسی کو لوٹ لیا۔ جب چاہے کسی پر حملہ کر دیا۔ خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو۔''

میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں کسی بستر پر تھا۔ میرے بازو اور شانے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بستر کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی اور یہ وہی تھی شبیر کی بہن۔ کیا اتفاق تھا۔ میں خود کو کہاں دیکھ رہا تھا۔ اسی لڑکی کے گھر یا اسی بدمعاش کے گھر جس نے مجھ پر اپنی بہن کو چھیڑنے کا الزام لگایا تھا۔

نقاہت تو ہو رہی تھی لیکن میں اٹھ بیٹھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میں اس وقت جاگ رہی تھی۔ جب تمہارے چیخنے کی آواز آئی۔ میں فوراً گھر سے نکل کر باہر آئی تو تم گلی میں پڑے ہوئے تھے۔ تمہاری قمیص خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک دو محلے والوں کو بلانا چاہا لیکن کوئی نہیں آیا۔ سب ڈرتے ہیں کیونکہ میرا بھائی ہی ایسا ہے۔ روزانہ وہ بھی پھڈے کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے لوگوں نے سوچا کہ کون پولیس تھانے کے چکر میں پڑے گا۔ اسی لیے کوئی نہیں آیا۔ سوائے ڈاکٹر موٹو کے۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ ڈاکٹر موٹو کون ہے تو وہ اسی محلے کا ڈاکٹر ہے۔ رہتا بھی اسی محلے میں ہے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اللہ کا بندہ اسی وقت میری مدد کو آ گیا۔ وہی تمہیں یہاں تک اٹھا کر لایا ہے۔ اسی نے تمہاری مرہم پٹی کی ہے۔ دوائیں دی ہیں تاکہ تم درد محسوس نہ کرو۔ کہہ رہا تھا کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ گوشت پر زخم آیا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کیسی لڑکی تھی۔ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس کا بھائی ایک بدمعاش انسان ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ وہ مجھ پر الزام تو لگا ہی چکا تھا۔

کبھی کبھی سب کچھ کتنا عجیب ہو جاتا ہے۔ میرا اس سے واسطہ ہی کیا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک بدمعاش کی بدصورت بہن تھی لیکن اس وقت اسی نے میرا خیال ..... رکھا تھا۔

''تم بہت عجیب لڑکی ہو۔'' میں نے اس کے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے میرا اتنا خیال رکھا۔''

''ارے اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ کبھی کبھی کوئی بچہ درخت سے گرتا ہے تو میں اس کا بھی خیال رکھتی ہوں۔''

''کون بچہ؟''

''ارے تم کو نہیں معلوم۔ یہ میرے گھر کے سامنے جامن کا درخت ہے نا، تو محلے کے بچے دن بھر اس پر چڑھے رہتے ہیں۔ ویسے تو میں ان کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہوں لیکن ان کا خیال بھی رکھتی ہوں۔ کوئی گر جائے تو اس کی مرہم پٹی کر دیتی ہوں۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ لو، تم میرا نام بھی نہیں جانتے؟ میں تو پورے محلے میں مشہور ہوں۔ صغرا نام ہے میرا۔''

''میرا نام راشد ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں تم سے مل چکا ہوں۔''

''ہاں یاد ہے مجھے اس دن تم دکان پر ملے تھے۔ چلو اب اپنے گھر جاؤ، میں کیسی بھی ہوں، لڑکی تو ہوں نا اور کسی مرد

کارات گئے کسی لڑکی کے گھر سے نکلنا اچھا نہیں لگتا۔''
میں اس کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آ گیا۔
اس وقت بھی گلی سنسان پڑی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میں بہت کچھ سوچتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ جو کچھ بھی ہو، وہ عجیب ہی تھا۔ وقت کس طرح کسی کو گھیر کر کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔
اس کا جو پہلا تاثر تھا۔ وہ زائل ہو چکا تھا۔ وہ تو ایک مہربان لڑکی تھی۔ کام آنے والی۔
تکلیف تو تھی لیکن پین کلر کی وجہ سے آرام بھی مل رہا تھا۔ میں نے دوسرے دن دفتر فون کر دیا تھا کہ میرے ساتھ ایسا حادثہ ہو گیا ہے۔ میں دو تین دن نہیں آسکوں گا۔
دوسری صبح دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ دروازہ کھولا تو وہی لڑکی یعنی صغرا اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے لیے دروازے پر کھڑی تھی۔
''یہ لو جی۔'' اس نے ٹرے میری طرف بڑھا دی۔ ''آپ کے لیے ناشتا لے کر آئی ہوں۔''
''ارے تم نے اتنی زحمت کیوں کی؟''
''اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ میں نے تو بھائی سے بھی کہہ دیا ہے۔ میں راشد صاحب کے لیے ناشتا لے کر جارہی ہوں۔ میں اس سے کوئی بات چھپاتی نہیں ہوں۔ میں نے بتا دیا کہ کس طرح تم گلی میں پڑے ہوئے تھے۔ میں اٹھا کر لے آئی تھی پھر میں نے ڈاکٹر مونو کو بلا کر تمہاری مرہم پٹی کروائی تھی۔''
''پھر کیا کہا تمہارے بھائی نے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ کیا کہتا، وہ تو خوش ہو گیا تھا کہ میں کسی کے کام آرہی ہوں۔ اچھا چلو یہ ٹرے لو۔ میں جارہی ہوں کسی نے دیکھ لیا تو کہانی بنا دے گا۔'' میں نے ٹرے لے لی۔ اس نے بڑے سلیقے سے سب کچھ اس ٹرے میں بھر دیا تھا۔
اس کی صورت چاہے جیسی بھی ہو لیکن اس کے کردار کا یہ پہلو بہت متاثر کرنے والا تھا۔
ایک ہفتے بعد میرے زخم بھی ٹھیک ہو گئے۔ میں نے صغرا کو منع کر دیا تھا کہ وہ میرے لیے ناشتا وغیرہ نہ لایا کرے۔
ایک دن وہ میرے لیے سالن بنا کر لے آئی تھی۔ ''یہ لیں جی اب اس سے انکار تو نہیں کریں گے نا؟ میں بہت مزے کا قورمہ بناتی ہوں۔ پورا خاندان تعریف کرتا ہے۔''
اس دن پہلی بار میں نے اسے اپنے گھر کے اندر بلا لیا تھا۔ گھر کیا تھا چاروں طرف کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

میر ثانی
اس بڑے شاعر کی سرگزشت جس کی زندگی المناک حادثات کا مجموعہ ہے۔ **زویا اعجاز** کے قلم کا شاہکار

تلاش صدر مملکت
امریکی صدر کی زندگی کے عروج و زوال کی داستان عبرت اثر، **زین قیصر** کی جادو بیانی

شاعر آوارہ
اردو کے اس بڑے شاعر کا احوال زیست جس نے زندگی کو کھیل سمجھ لیا تھا، **زین مهدی** کی تلاش

ایک تھی فردوس
پاکستان کی مقبول و معروف اداکارہ کا تذکرہ، **عقیل عباس جعفری** کی تحقیق

رنگ عشق
ایک باکمال صوفی کے کمالات کا تذکرہ جسے بھلا نہ پائیں گے، **امجد جاوید** کی فسوں سازی

سفید خون
اپنا خون جب سفید ہو جائے تو ایسی ہی کہانی جنم لیتی ہے، **مونا شہزاد** کی پراثر بیانی

اس کے علاوہ
دلچسپ سفر کہانی ''سفر پہلا پہلا'' لہو گرما دینے والی طویل روداد ''روسیاہ'' ادب پرستوں کے لیے دو انعامی سلسلے۔ اور بھی بہت کچھ جو سرگزشت کا خاصہ۔ صرف ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں، آپ خود اسیر ہو جائیں گے۔

''ارے راشد صاحب، یہ کیا؟ یہ گھر کس طرح بکھرا ہوا ہے؟''

''اکیلے آدمی کا گھر ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں آپ اکیلے کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''واہ، آپ کے ساتھ کیا مجبوری ہو سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا مجبوری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری مجبوری تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''میں نہیں سمجھا۔''

''راشد صاحب، میں ایک بدصورت لڑکی ہوں۔'' اس نے دکھ سے کہا۔ ''مجھ سے کون شادی کرنا پسند کرے گا۔ حسرت ہی رہی کہ کوئی پسندیدگی کی ایک نظر ہی ڈال لے۔ میری کئی سہیلیاں ہیں۔ ہر ایک کی کہانیاں ہیں کہ فلاں لڑکے نے گھور کر دیکھا۔ فلاں نے کوئی پیغام بھیجا۔ فلاں نے شادی کی آفر کی لیکن میرے ساتھ تو کبھی ایسی کوئی کہانی نہیں ہو سکی ہے۔'' وہ بولے جا رہی تھی اور میں گم صم سا سن رہا تھا۔ ''جانتے ہیں میرا بھائی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ بہت عجیب بات بتا رہی ہوں آپ کو۔ وہ چاہتا یہ کہ کوئی تو ایسا ہو جو مجھے چھیڑے۔ اسی لیے وہ جان بوجھ کر ہر ایک سے بھڑ جاتا ہے کہ تو نے میری بہن کو چھیڑا ہے۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ وہ ایک نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔'' وہ اچانک رونے لگی تھی۔

میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ یہ اس کے اندر کا فرسٹریشن اور محرومیاں تھیں۔ اسی قسم کی فرسٹریشن اس کے بھائی میں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ انسان کا ایک نیا روپ میرے سامنے آیا تھا۔

''صغرا ایک بات بتاؤ، اگر میں تمہیں چھیڑوں تو......؟'' میں نے کہا۔

''آپ؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''اس کی ہنسی میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی۔ ''رہنے دیں راشد صاحب، کوئی اور بات کریں۔''

''جانتی ہو میں تمہیں چھیڑ کر چپ نہیں رہوں گا۔''

''تو پھر کیا کریں گے؟''

''میں تمہیں بیاہ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''راشد صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہی جو تم سن رہی ہو۔ میرے لیے تم دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم میرے لیے ہمیشہ ایسی ہی رہو گی۔'' اس وقت اس کے چہرے پر بلا کی چمک تھی۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کسی کو اگر محبت مل جائے تو وہ خوب صورت ہو جاتا ہے۔ خوب صورتی اندر سے پیدا ہونے والے خوش گوار احساس کا نام ہے۔

میں نے اس لڑکی سے کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔ میں سیریس تھا۔ انسان کو پہچان لینا بھی ایک آرٹ ہوا کرتا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس کی کہانی بہت مختلف تھی۔

میں اس کی بے رنگ کہانی میں رنگ بھرنا چاہتا تھا۔

دوسری شام کو اس کا بھائی شبیر مجھے بازار میں مل گیا۔ میں سیدھے اس کے پاس چلا گیا۔ سلام کیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

''شاید تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''میں وہی ہوں جس کے گھر تم رات کو آئے تھے کہ میں نے تمہاری بہن کو چھیڑا ہے۔''

''اب کیا چاہتے ہو؟''

''اب یہ بتانے آیا ہوں کہ ہاں میں نے کل تمہاری بہن کو چھیڑا ہے۔ اب تم مجھ سے پوچھو کہ کیوں؟''

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھتا رہا......

''تم نہیں پوچھو گے تو میں خود بتا رہا ہوں کہ میں اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟'' اس کی حیرت دیکھنے والی تھی۔

''ہاں، اگر تم کہو تو میں اپنے دو تین بڑوں کو تمہارے پاس بھیج دوں۔''

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک مجھے گلے لگا لیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک ایسے بھائی کے آنسو تھے جو اپنی بہن کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔

اب اس شادی کو چار برس گزر چکے ہیں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا بیٹا بھی ہے اور وہ اپنے ماموں سے بہت مانوس ہے۔ شبیر کی تو وہ جان ہے اور زندگی یہ پیغام دیتی گزر رہی ہے کہ حسن باطن میں ہوتا ہے، ظاہر میں نہیں......

❖❖❖

غلطی

عنائشہ چوہدری

خواہش کے بادل چھٹ جائیں تو صرف تیرگی رہ جاتی ہے... شہرِ دل اور شہرِ دنیا کو الوداع کہنا پڑ جاتا ہے... تبدیلی کا عمل ناگزیر ہے... مگر تیزی سے بدلتی دنیا نے ہر شے کے انداز ڈھنگ بدل دیے ہیں... خصوصاً حقیقی زندگی میں سلیقے سے بات کرنے کا طریقہ تک بدل چکا ہے... ہر صنف کے فنون و لوازمات الگ الگ ہوتے ہیں... مگر وقت کے ساتھ محبتیں... عادتیں اور دوستی کے رشتوں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں... سرعت سے بدلتی دنیا کے اس اضطراب کی نقش گری... جس میں دوستی... انسانیت نے اپنا اعتبار ہی نہیں مفہوم بھی کھو دیا ہے...

دوڑتی بھاگتی زندگی کا ساتھ دینے والوں کی غلطی کا دردناک احوال......

''عرفان اللہ کی بھتیجی بھی اغوا ہوگئی ہے۔''

محلہ چاہ جموں میں ایک ہی بات زبان زدِ عام تھی۔ حاجی پان شاپ پر بھی دوپہر سے یہی موضوعِ زیرِ بحث تھا۔

''کیا؟ اوہ نہیں...... یہ ہوا کیسے؟'' ہر نیا جاننے والا شخص یہی دریافت کرتا۔

''بھئی اغوا کیسے ہوتے ہیں؟ ویسے ہی ہوئی ہے وہ بھی۔'' جواب ملتا۔

''ابھی تو اس کی بیٹی کا غم تازہ تھا۔ اب بھتیجی بھی......''
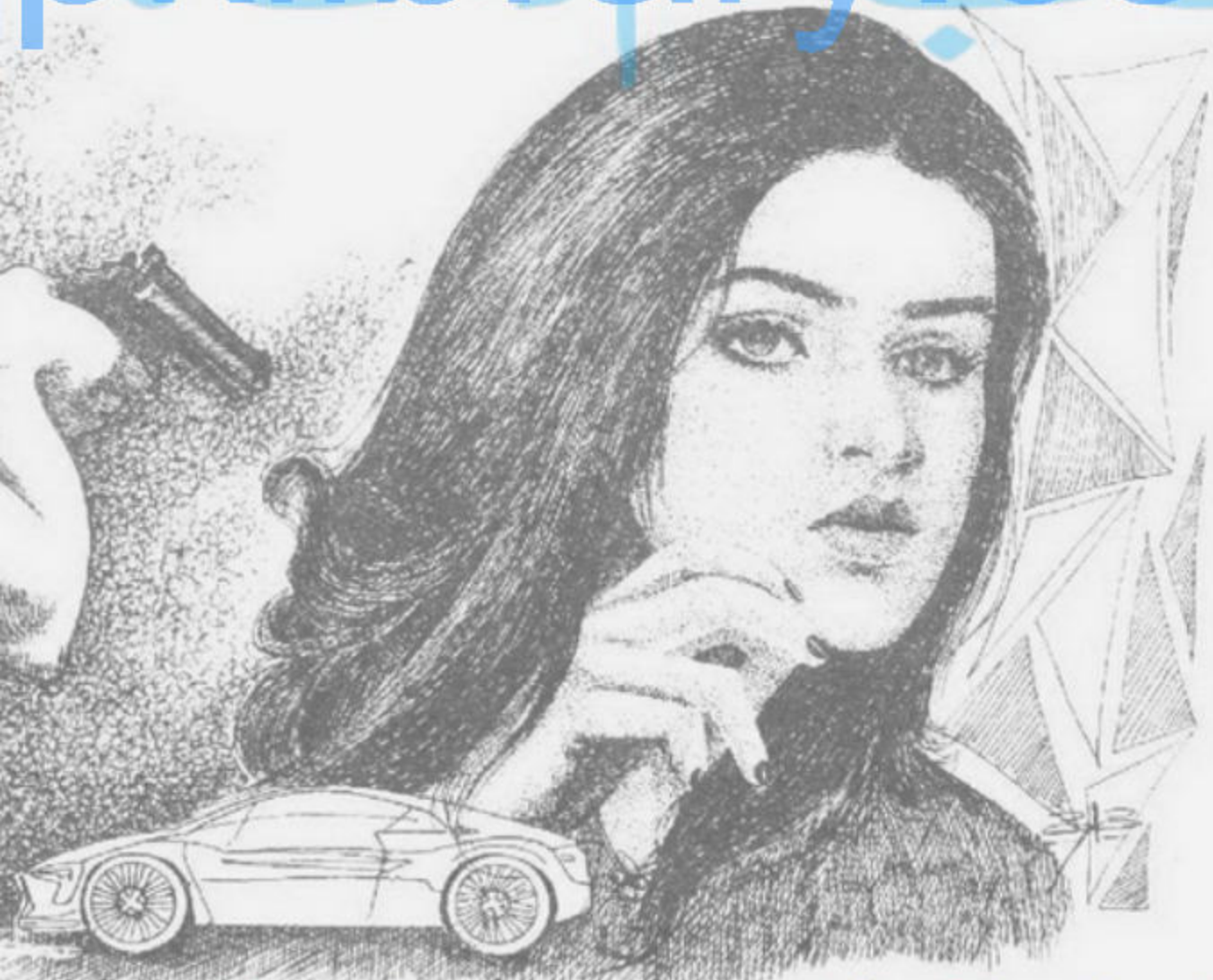
pklibrary.com

کسی نے تاسف سے کہا۔

''بیٹی کا غم تو اس بے چارے کی بیوی کو ہی نگل گیا۔ اب بھتیجی کا یہ صدمہ جانے کسے نگلے گا؟'' عرفان اللہ کے ہمسائے نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہ تو پہلے ہی بن ماں باپ کی بچی ہے۔'' دوسرے ہمسائے نے اپنے تئیں انکشاف کیا۔

''مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔'' عبدالغفار نامی ایک رکشا ڈرائیور نے اپنی رائے دے کر دیگر گاہکوں کی طرف بے نیازی سے دیکھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے غفار بھائی؟'' ایک نوجوان نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''بھئی! سیدھی سی بات ہے۔ زمانہ کیسا خراب ہے تم سبھی کو علم ہے۔ دونوں لڑکیاں جوان جہان تھیں۔ ہوسکتا ہے کہیں پسند کا سلسلہ ہو۔ گھر والے مانتے نہ ہوں اور انہوں نے یہ راہ اپنالی ہو۔'' عبدالغفار اتنا کہہ کر فخریہ نظروں سے سب کی طرف دیکھنے لگا۔

''اماں یار! کیسی باتیں کرتے ہو؟'' عرفان کے ہمسائے نے سختی سے ٹوکا۔ ''ثنا شا اور سامیہ ہمارے سامنے پلی بڑھی ہیں۔ ہم نے آج تک ان کے کردار میں کوئی بھی کمی نہیں دیکھی۔''

''یہ تو بہت دور کی بات ہے۔'' دوسرے ہمسائے نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے ان کے سروں سے کبھی دوپٹا ڈھلکتے نہیں دیکھا۔ اسکول اور کالج جاتے ہوئے تو وہ باقاعدہ حجاب اوڑھا کرتی تھیں۔ آنکھوں کے سوا بدن کا ہر حصہ ڈھکا ہوتا تھا۔''

''آنکھوں کی بات بھی خوب کہی آپ نے!'' عبدالغفار ہنسا۔ ''یہ سارا فساد آنکھوں سے ہی تو شروع ہوتا ہے۔ آپ نے وہ گانا نہیں سنا ہوا...... نیناں ٹھگ لیں گے۔''

''ویسے ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو بات ٹھیک ہی ہے۔'' سجاد نامی ایک محلے دار نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''یہ ہماری پبلک کی عمومی سوچ ہے۔ وہ حجاب اوڑھنے اور نقاب کرنے والی خواتین کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کے اندر کھوج کا مادّہ انہیں ستاتا ہے کہ وہ اس پوشیدہ خاتون کو کسی بھی طرح طشت از بام کر دیں۔'' سجاد نے عوامی سوچ پر نشتر چلایا تو حاضرین میں سے اکثریت جز بز ہو کر رہ گئی۔ بات تو سچ تھی لیکن بات تھی رُسوائی کی۔

''بہر حال! ثنا شا اور سامیہ کے متعلق میں ایسی کسی بھی بات پر یقین نہیں کرسکتا۔ ان کا کردار بہت مضبوط اور صاف ستھرا رہا ہے۔ کسی لڑکے میں انوالو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ہمسائے نے ایک بار پھر دفاع کیا۔

''ہوسکتا ہے آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہی ہو۔'' عبدالغفار نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''بظاہر سب کچھ ایسا ہی ہو...... لیکن ہمیں تصویر کے دونوں رخ دیکھنے چاہئیں۔''

''اور اس تصویر کا دوسرا رخ کیا ہے؟ ذرا ہم بھی تو جانیں۔'' سجاد نے دلچسپی لی۔

''یہ......'' عبدالغفار نے سجاد کے ہاتھ میں پکڑے جدید ساخت کے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم لوگ مان لو کہ ہماری زندگیوں میں پریشانیوں اور مسائل کی اصل وجہ یہی ہے۔ جس کے ہاتھ میں یہ ہو۔ وہ ایسے کسی بھی تعلق سے بچ ہی نہیں سکتا۔ کیا پتا، لڑکیاں بظاہر بہت نیک پروین ہوں لیکن اندر کھاتے دوستیاں تعلق سب کچھ چلتا ہو۔''

عبدالغفار کی یہ منطق سن کر سبھی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔

''اب تم بُرا مانو یا جو مرضی سوچو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ لڑکیاں اپنی مرضی سے ہی کہیں گئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ عرصے بعد خود ہی واپس بھی آجائیں۔'' اس نے ایک مشہور سیاست دان کے انداز میں پیشین گوئی کی۔ حاضرین میں سے اکثریت اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔

''بھائی! دہی چوک جانے کا کتنا لوگے؟'' ایک زنانہ سواری اس کے رکشے کے پاس آکر رکی۔

''دو سو دے دینا میری بہن! آجاؤ بیٹھو!'' عبدالغفار کا انداز یکسر ہی تبدیل ہوگیا تھا۔

''میں شام تک لگاتا ہوں چکر اِدھر کا۔ پھر بات ہوگی۔'' اس نے الوداعی طور پر ہاتھ ہلایا اور سواری کو لیے آگے بڑھ گیا۔

''بڑا ہی شاطر بندہ ہے۔'' سجاد نے ہی سب سے پہلے ناپسندیدگی ظاہر کی۔

''ہاں! بس ایسا ہی ہے۔'' دکان کے مالک حاجی نے بھی منہ بنا کر جواب دیا۔

''اللہ معاف کرے! کسی کی بہن بیٹی کے بارے میں ایسی کوئی بھی بات کرتے ہوئے انسان کو سو بار سوچنا چاہیے۔ ہم سب بھی بہن بیٹیوں والے ہیں۔'' سجاد نے جھرجھری لی۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے!'' حاجی نے کہا۔ ''عرفان اللہ کے گھر قیامت ٹوٹی پڑی ہے۔ اس پر انہیں ایسی کسی بھی سوچ کا علم ہوگیا تو بے چاروں کے دل پر کیا گزرے گی؟''

''قیامت سے بھی بڑی قیامت کہو بھائی!'' ہمسائے

نے دکھ سے کہا۔ ''ایک ہی گھر سے دو لڑکیوں کا اغوا کوئی معمولی بات ہرگز نہیں ہے۔''

''مجھے تو یہ کسی جرائم پیشہ گروہ کا کام لگتا ہے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ ایک بار پہلے بھی شہر میں بچوں کے اغوا کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔'' دوسرے ہمسایہ نے یاددہانی کروائی۔

''بالکل یاد ہے بھئی! پچھلے محلے کا ایک لڑکا اغوا ہوا تھا۔ آج تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ ماں بے چاری رو رو کر نابینا ہوگئی۔'' حاجی نے لقمہ دیا۔

''بس تو پھر یہ بھی مجھے ایسے گروہ کا کام لگتا ہے۔'' سجاد کی قیاس آرائی جاری تھی کہ اسی لمحہ عرفان اللہ کے گھر سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ سب لوگ متوحش نظروں سے اس گھر کی جانب دیکھنے لگے۔ اسی اثنا میں عرفان کا چھوٹا بیٹا مزمل باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور حلیہ منتشر تھا۔ وہ سامیہ کا غیر رسمی منگیتر بھی تھا۔ اس کی نسبت بچپن سے ہی طے تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' مبشر نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں! خیر تو کہیں بھی نہیں ہے...... امی جی کے بعد اب ابو جی بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔'' وہ چوبیس سالہ مضبوط اعصاب کا حامل مرد بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''الٰہی خیر! اسپتال لے چلتے ہیں۔ شاید کوئی سانس باقی ہو۔'' ارسلان نے اس کا ہاتھ تھاما۔

مزمل نے کرب و مایوسی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''آپ کیوں بھول رہے ہیں کہ ایک ڈاکٹر ہمارے گھر میں بھی موجود ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔ اشارہ اپنے بڑے بھائی جواد کی طرف تھا۔

''میں مسجد میں اعلان کروا کے آتا ہوں۔'' مزمل نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ شدتِ کرب سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔

''یااللہ! خیر کرنا! اس گھرانے پر آئی سختیوں کا خاتمہ فرما دینا۔ جانے کس حال میں ہوں گی دونوں بچیاں؟ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' مبشر کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔

☆☆☆

اس آفت زدہ گھرانے کی وہ لڑکی ایک تنگ اور نیم تاریک کمرے میں پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر رسیوں سے اور منہ چوڑی ٹیپ سے جکڑا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد پہلا احساس گردن میں اینٹھن اور ہاتھوں میں شدید جلن کا تھا۔ جسم بے آرام اور ذہن زیادہ تھی۔ اس نے کسمسا کر خود کو کسی آرام دہ حالت میں لانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس ذرا سی کوشش میں ہی وہ ہانپ گئی۔

''میں کہاں ہوں آخر؟'' ذہن میں ایک ہی سوال دستک دے رہا تھا۔

''یااللہ! میری مدد کرنا! میں آخر یہاں آئی کیسے؟'' دوسرے خیال نے سر ابھارا۔

اس سوال کا ادھورا جواب بہرحال اس کے پاس موجود تھا۔ آج کالج سے واپسی پر ہی یہ حادثہ اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اٹھارہ سالہ سامیہ نعمان مقامی کالج میں پری میڈیکل سال دوم کی طالبہ تھی۔ پڑھائی میں کافی ہوشیار بھی تھی۔ اس کی زندگی بہت سیدھی سادی اور ایک ہی دائرے میں مقید تھی۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔

''کون لایا ہوگا مجھے یہاں آخر؟'' اس نے پھوڑے کی طرح دکھتے سر سے نڈھال ہوتے ہوئے سوچا۔

اس کی یادداشت میں آخری تصور بس سے اترنے کے بعد کا تھا۔ اس کا گھر بس اسٹینڈ سے ایک سڑک اور دو گلیوں کی مسافت پر تھا۔ سڑک پر تو خاصی رونق ہوتی تھی۔ گلیاں البتہ قدرے سنسان ہوا کرتی تھیں۔ گلی کے وسط تک پہنچتے ہی اسے اپنے دائیں سمت کسی گاڑی کے رکنے کا احساس ہوا۔ وہ غیر اختیاری طور پر ایک جانب ہوگئی۔

''ایکسکیوزمی مس! ڈسٹرب کرنے کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔'' اسے گاڑی سے ایک آواز سنائی دی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹھٹک کر رک گئی۔

''جہانگیر پارک اسی ایریا میں ہے؟'' اسی نرم اور شستہ آواز نے اسے مخاطب کیا۔ اس کے سامنے گاڑی کا شیشہ نیچے کیے ایک خوش پوش نوجوان بیٹھا تھا۔

سامیہ سمجھ گئی کہ وہ کسی آن لائن ٹیکسی سروس کا ڈرائیور اور اس میدان میں بالکل ہی نوآموز ہے۔ ''آپ نے رانگ ٹرن لیا ہے۔ جہانگیر پارک پچھلی سڑک کی پہلی گلی کا نام ہے۔ یہ تیسری گلی ہے۔'' سامیہ نے بھی شائستگی سے جواب دیا۔

''اوہ...... اچھا...... چلیں تھینک یو!'' ڈرائیور خوش خلقی سے مسکرایا۔

''اٹس او کے۔'' سامیہ نے سرسری سے انداز میں جواب دے کر قدم آگے بڑھانے چاہے تو ایک تیز پھوار نے چہرے کا نقاب بُری طرح بھگو دیا۔ سامیہ کو اپنے ناک اور حلق میں مرچیں سی بھرتی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے

pklibrary.com

اضطراری طور پر نقاب ناک سے نیچے سرکا دیا تاکہ مکمل کر سانس لے سکے اور یہ اس کی دوسری بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ اس بار پھوار پہلے سے زیادہ تیز اور جان لیوا تھی۔

آن کی آن میں دماغ پر ایسی دھند طاری ہوئی کہ اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔ اس نے خود کو چکرا کر گرتے اور پھر عقب سے کسی کی جانب سے سنبھالتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کے بعد ہوش کی کوئی بھی رمق باقی نہ رہی۔

سنگی فرش پر لیٹی سامیہ کے ذہن میں یہ خیالات گردش کرتے اس کے غم و غصے میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر نظر دوڑا کر اپنے بدن اور لباس کا جائزہ لیا اور کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ پا کر آنکھوں میں بھرے آنسوؤں سے شکر ادا کیا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور موجودہ حالات سے باخبر لڑکی تھی۔ مغویہ کو سب سے پہلا خطرہ عزت کا ہی لاحق ہوتا ہے۔

”یا اللہ! میری مدد فرمانا۔ مجھے یہاں سے بحفاظت نکالنا۔ گھر میں سب کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ اس کے ذہن میں مزمل کا تصور سب سے پہلے ابھرا۔ اس کے بعد دیگر اہل خانہ بھی یکے بعد دیگرے پردۂ تصور پر اجاگر ہونے لگے۔

”وہ سب پہلے ہی نتاشا کی وجہ سے کتنے پریشان تھے۔ اور اب میرے لیے بھی......“ ذہن میں ایک اور سوچ ابھری۔

”آہ...... نتاشا......“ اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ ”کیا وہ بھی اسی کرب و اذیت سے گزری ہوگی؟ اب وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی؟ اللہ جی! وہ میری بہنوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔ مجھے اپنے ساتھ اس کی سلامتی بھی عزیز ہے۔“ وہ بند ہونٹوں سے گڑگڑا کر دعا کرتی رہی۔

یہ التجائیں اور تڑپ جانے کتنی دیر جاری رہی۔ نیم تاریک کمرے میں وقت کا ہر تصور ختم ہو چکا تھا۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی دو نوجوان اندر چلے آئے تھے۔ انہی میں سے کسی نے سوئچ بورڈ سے کمرے میں روشنی کی تھی۔

سامیہ نے اپنے حواس بحال کیے اور نوواردوں کی جانب متوجہ ہوگئی۔ ان میں سے ایک لڑکا دوپہر کو ٹکرانے والا ٹیکسی ڈرائیور ہی تھا البتہ اس وقت دوپہر کی نسبت بہت عجیب و غریب حلیے میں تھا۔ اس کی جینز نہایت تنگ اور گھٹنوں کے علاوہ رانوں سے بھی باقاعدہ پھاڑ کر فیشن ایبل بنائی گئی تھی۔ گلے میں موٹی سنہری زنجیر اور ہاتھوں میں عجیب ساختہ ڈوریاں تھیں۔

دوسرا لڑکا بھی تقریباً اسی کا ہم عمر تھا۔ اس کا حلیہ پہلے والے سے بھی بدتر تھا۔ وجود سے اٹھنے والی ناگوار بدبو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی نشے کا شکار بھی ہے۔ اس بو سے سامیہ کا دل متلانے لگا۔

دونوں لڑکے بڑے غصے سے اس کے سامنے فرش پر ہی براجمان ہوگئے تھے۔ ان کی نظریں گاہے بگاہے اس کی جانب اٹھتیں اور اسے ہراساں کر دیتیں۔ سامیہ کے لیے ان نظروں کا سامنا کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ کچھ وقت اور گزرا تو اسے اندازہ ہوا کہ ان کی باہمی گفتگو برداشت کرنا اس سے بھی دشوار تر کام ہے۔ ان کی گفتگو لغویات سے بھری ہوئی تھی۔ سامیہ نے ایسی زبان کبھی سنی ہی نہ تھی۔ اسے اپنی سماعت مفلوج ہوتی محسوس ہوئی۔ اسی پل کمرے میں کسی کی آمد ہوئی تھی۔

☆☆☆

”ہاں بھئی لونڈو! لے آئے چھوکری کو؟“ وہ یکدم ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دونوں لڑکے اس کی آواز سن کر ہڑبڑا گئے۔

گزشتہ نصف گھنٹے سے زائد کی گفتگو میں سامیہ کو اندازہ ہوا تھا کہ ان میں سے ٹیکسی ڈرائیور کا کردار ادا کرنے والے لڑکے کا نام ’جاسم عرف جسو‘ اور غلیظ تر حلیے کے مالک لڑکے کا نام ’جنید عرف جونی‘ تھا۔

”یس باس!“ جاسم نے فوراً مؤدبانہ جواب دیا۔

”کوئی لوچا تو نہیں ہوا نا؟“ نووارد نے سختی سے پوچھا۔ ”پچھلی دفعہ اس کی رشتے دار کو اٹھاتے وقت ثبوت چھوڑنے لگے تھے تم۔“

”نہیں باس! دھندے کی قسم! کوئی لوچا نہیں ہوا۔ اس بار ہم نے فارمولا نمبر دو استعمال کیا تھا اور اپنا یہ جونی برقع پہن کر پیچھے بیٹھا تھا۔“ جاسم نے فوراً صفائی دی۔

نووارد نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور سامیہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ غصے میں آتا محسوس ہوا تھا۔ اگلے دو منٹ تک جاسم اور جنید کے شجرۂ نسب کو کائنات کی ہر غلیظ اور مکروہ مخلوق سے منسوب کرنے کے بعد وہ چنگھاڑ کر بولا۔

”دل کرتا ہے تم لوگوں کا بھیجا اُڑا دوں حرام خورو! یہ کوئی طریقہ ہے مہمان کو لانے کا؟“

”بب...... باس! ہر لڑکی کو ایسے ہی تو لا کر باندھا جاتا

ہے۔'' جونی ہکلایا۔

''الو کے پٹھو!'' نووارد چلایا۔ ''کیا تمہیں دوسری لڑکیوں اور اس میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا۔ یہ اپن کی مہمان ہے۔ اپن نے خود بلوایا ہے اسے! سمجھ لو یہ ڈارلنگ ہے اپن کی! اور تم ایسی اسپیشل مہمان کو زمین پر پٹخو گے؟''

''سوری باس! میں سمجھ گیا۔ ابھی کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ ایک دم فائیو اسٹار نہیں بلکہ تو شکل تو شکل لعل اسٹار جیسی وھانسو سیٹنگ بناؤں گا۔''
جاسم نے اسے یقین دہانی کروائی اور جنید کو آنکھوں کا خفیف اشارہ کر کے باہر لے گیا۔

ان کے جاتے ہی نووارد سامیہ کی طرف بڑھا اور بازوؤں سے پکڑ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ اس کے سیاہ ہاتھوں کا سخت لمس سامیہ کو بے چین کر گیا۔ سرخ آنکھیں، موٹے ہونٹ، کھردرے ہاتھ، جا بجا پھٹی جلد اور چیچک زدہ چہرہ اس کے دل میں کراہت پیدا کرنے لگے۔

''سوری سوئٹ ہارٹ! اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اپن کے یہ لونڈے بھی ایک نمبر کے ڈفر ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ کسی ڈارلنگ کو کیسے ٹریٹ کیا جاتا ہے۔'' اس نے سامیہ کے چہرے کی ٹھوڑی پر انگلی پھیری۔
سامیہ کراہت و ناگواری سے بل کھا کر رہ گئی۔ اس کی ناپسندیدگی آنکھوں سے عیاں تھی۔ نووارد نے طیش میں سامیہ کا چہرہ دبوچا اور پھنکار کر بولا۔

''اس تھوبڑے کی عادت ڈال لے میری بلبل! تجھے یہیں رہنا ہے اب...... سمجھی؟''

یہ الفاظ سامیہ کے اعصاب پر بم کی طرح گرے۔ اس کا ذہن ایک پل میں ہی مفلوج ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

جاسم اور جنید نے اگلے دو گھنٹوں میں کمرے کی حالت ہی بدل دی تھی۔ فرش پر قالین نما چٹائی بچھانے کے بعد لوہے کا پلنگ بھی ڈال دیا گیا۔ ایک طرف کرسی لا کر رکھ دی۔ باس اب مطمئن نظر آنے لگا۔

''چلو بھئی لونڈا لوگ! کلٹی کھاؤ اب یہاں سے۔ باقی حساب کتاب کل ہوگا۔'' اس نے نیا حکم جاری کیا۔

جاسم اور جنید خاموشی سے سر جھکائے باہر نکل گئے۔ ان کی اس خاموشی اور تابعداری میں بھی سامیہ کو ناگوار چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے جاتے ہی باس نے اپنی جیب سے ایک بوتل نکال لی۔ ڈھکن کھلتے ہی برآمد ہونے والی ناگوار بُو نے اس کی الجھن بڑھا دی۔ وہ شراب کی بوتل تھی

نہلے پہ دہلا

کل حجام کی دکان پر ایک سلوگن پڑھا......
''ہم دل کا بوجھ تو نہیں لیکن سر کا بوجھ ضرور ہلکا کر سکتے ہیں۔''

لائٹ کی دکان والے نے بورڈ کے نیچے لکھوایا......
''آپ کے دماغ کی بتی بھلے ہی جلے یا نہ جلے مگر ہمارا بلب ضرور جلے گا۔''

چائے والے نے اپنے کاؤنٹر پر لکھوایا......
''میں بھلے ہی عام ہوں مگر چائے اسپیشل بناتا ہوں۔''

ایک ریسٹورنٹ نے سب سے الگ فقرہ لکھوایا......
''یہاں گھر جیسا کھانا نہیں ملتا، آپ اطمینان سے تشریف لائیں۔''

الیکٹرونک دکان پر سلوگن پڑھا تو دم بہ خود رہ گیا۔
''اگر آپ کا کوئی فین نہیں ہے تو یہاں سے لے جائیں۔''

گول گپے کے ٹھیلے پر ایک سلوگن لکھا تھا......
''گول گپے کھانے کے لیے دل بڑا ہونا چاہیے منہ بڑا نہیں، یار! آزمائیں۔''

پھل والے کے یہاں تو غضب کا فقرہ لکھا تھا......
''آپ تو بس صبر کریں، پھل ہم دے دیں گے۔''

گھڑی کی دکان پر تو ایک زبردست فقرہ دیکھا۔
''بھاگتے ہوئے وقت کو اپنے بس میں رکھیں، چاہے دیوار پر ٹانگیں، یا ہاتھ پر باندھیں۔''

ایک نجومی (جیوتشی) نے اپنے بورڈ پر سلوگن کچھ یوں لکھوایا......
''آیئے...... صرف 100 روپیہ میں اپنی زندگی کے آنے والے اپنے سو ڈے دیکھیے۔''

شراب کی دکان پر لکھا تھا......
''شراب کی بوتل خود خالی ہو کر دوسروں کو فل کر دیتی ہے۔''

بالوں کی ایک کمپنی نے تو اپنے ہر پروڈکٹ پر یہ لکھوا کر حد ہی کر دی......
''ہم بھی بال بال بچاتے ہیں۔''

پشاور سٹی سے خورشید احمد کا تعاون

جسے بڑی رغبت سے پی رہا تھا۔ ہر گھونٹ کے بعد چہرے کی سیاہی اور آنکھوں کی سرخی مزید بڑھ جاتی۔ بوتل خالی کرنے کے بعد وہ لڑکھڑا کر اٹھا اور آگے بڑھ کر سامیہ کے منہ سے ٹیپ نوچ پھینکی۔ چہرے کے رُوئیں ٹیپ کے ساتھ ہی کھنچ جانے کی تکلیف سے وہ بے ساختہ چیخ اٹھی۔

"کیا ہوا میری بلبل؟" وہ خباثت سے مسکراتا ہوا اس کا چہرہ سہلانے لگا۔

"کون ہو تم؟" سامیہ نے اپنا چہرہ پیچھے کیا۔

"ہاں! یہ ہوئی نا عقلمندوں والی بات۔ ورنہ لڑکیاں پہلا سوال یہی کرتی ہیں کہ کہاں ہوں میں؟" اس نے سر ہلایا۔ "احتشام نام ہے اپن کا۔ یار لوگ شامی کہتے ہیں۔ کوئی شام بھی کہہ لیتا ہے حالانکہ تھوبڑا تو اپن کا رات جیسا ہے۔" وہ اپنی بات کے بعد خود ہی ہنسنے لگا۔

سامیہ کو اس کے میلے پان زدہ دانت دیکھ کر کراہت محسوس ہونے لگی۔ شامی سے اس کی کوئی بھی کیفیت پوشیدہ نہیں تھی۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"موج مستی کرنے لایا ہوں تیرے کو بھی۔ تیری یہ مست جوانی اور ہیروئنوں و شرما فگر بس کیا تھا اپن کے دل میں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"پلیز مجھے جانے دو! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ جانے دو مجھے!" اس نے عقب میں بندھے ہاتھ بھی لاشعوری طور پر جوڑ دیے۔

"نہ میری بلبل! بالکل نہ...... تجھے چھوڑنے کے لیے تو نہیں اٹھوایا اپن نے۔ تو یہیں اچ رہے گی۔" وہ سرد مہری سے بولا۔

"پلیز...... خدا کے لیے۔" سامیہ تڑپ گئی۔

"اب تو آگے یہی اچ بولے گی کہ تمہیں رب کا واسطہ ہے۔ رسول ﷺ کا واسطہ ہے۔ پھر اپن کو ماں اور بہن کے واسطے ڈالے گی۔ تو میری چڑیا! اپن دھندے اور جذبات میں رشتوں، مذہب کو بیچ میں لاتا اچ نہیں ہے۔" اس نے توقف کیا اور پھر کچھ یاد آنے پر کہنے لگا۔

"سالا تم لڑکی لوگوں کا ہر بات ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟" وہ اپنی بات کے اختتام پر ایک بار پھر خود ہی ہنس دیا۔ "وہ تمہارے تائے کی بیٹی بھی اسی طرح کے ترلے واسطے ڈال رہی تھی۔"

"نتاشا...... وہ کہاں ہے؟ اس نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟" سامیہ تڑپ اٹھی۔

"وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی ہے۔" اس نے بے دردی سے بتایا۔

"کون سی منزل؟ آخر کیا دشمنی ہے تمہاری ہم لوگوں سے؟ اگر تمہیں اغوا کے بدلے رقم چاہیے تو وہ نہیں ملے گی۔ ہم بس سفید پوش لوگ ہیں۔" سامیہ نے حقیقت بیان کی۔

"پتا ہے اپن کو! سب پتا ہے۔ اغوا برائے تاوان کا دھندا بڑا پرانا اور خطرناک ہے بلبل! پہلے بندہ اٹھاؤ۔ پھر پیسہ مانگو۔ گھر والوں سے بھاؤ تاؤ کرو۔ پولیس کے ٹانگ اڑانے کے الگ خطرے۔ اب اغوا کے بعد اور بھی بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ پیسہ بھی چوکھا ہاتھ آتا ہے۔" وہ بڑے مزے سے بولا۔ سامیہ اس کی بے حسی پر ساکت رہ گئی۔

"نتاشا کہاں ہے؟ بولو! کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟" وہ چلا اٹھی۔ شامی غصے سے اٹھا اور اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

"آنکھ اور آواز نیچے رکھ کر بات کر...... اپن مجرم ہے مگر بے غیرت نہیں جو عورت کی اونچی آواز اور اٹھی ہوئی آنکھ برداشت کر لے۔"

سامیہ کا دایاں رخسار اور جبڑا سن ہو کر رہ گیا۔ دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی اور اس نے بلا سوچے سمجھے شامی کے منہ پر تھوک دیا۔ شامی کا چہرہ سیاہی اور آنکھیں سرخی کی انتہا پر پہنچ گئیں۔ وہ طیش میں اس پر پل پڑا۔ اس کے گھونسوں اور ٹھوکروں میں بلا کی وحشت تھی۔

"بہت پچھتائے گی تو! اپنی اس حرکت پر بہت پچھتائے گی۔" اس نے سامیہ کی کمر ٹانگوں سے کوٹ ہی ڈالی۔

سامیہ اذیت و کرب سے بولنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ شامی کچھ دیر اپنی بھڑاس نکال کر ہانپ گیا۔ اس کے موبائل پر کوئی فون آگیا تھا جسے سننے کے لیے اسے باہر جانا پڑا۔ سامیہ کے حواس اب بے گانہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

سامیہ کے لیے زندگی میں ایک ہی موسم ٹھہر چکا تھا۔ اس موسم کے شب و روز جبر، برداشت اور اذیت کا دوسرا نام تھے۔ احتشام اس کے لیے حقیقی معنوں میں درندہ ثابت ہوا تھا۔ اس نے سامیہ کے پاؤں پلنگ کی پائنتی سے باندھ رکھے تھے۔ زنجیر کی طوالت بس اتنی تھی کہ کمرے سے ملحقہ بیت الخلا تک چلی جاتی۔ کھانے پینے کا انتظام شامی کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ روزانہ بازار سے ہی کچھ نہ کچھ لایا کرتا۔

سامیہ کا معدہ بُری طرح خراب ہو چکا تھا لیکن جسمانی استحصال کا کرب ہر چیز سے سوا تھا۔ سامیہ کو اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ شب و روز موت کی تمنا کرتی مگر تقدیر مہربان ہو کے ہی نہ دیتی۔ اس قید خانہ میں وقت کا بھی ہر تصور ختم ہو چکا تھا۔

قید خانہ میں پہلی ہلچل جاسم اور جنید کی اچانک آمد سے ہوئی۔ وہ شامی سے ملاقات ... کے لیے آئے تھے۔

''سوری باس! آپ کا فون آف تھا اس لیے آنا پڑا۔'' جاسم نے کہا۔

''ہاں تو بول؟ کیسے آنا ہوا؟'' شامی شراب کے نشے سے کافی سُرور میں تھا۔

''مال اٹھا لیا ہے باس!'' جنید نے دبے، دبے جوش سے بتایا۔ ''باہر گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔''

''ابے! اسے تو پرسوں اٹھوانا تھا نا آج یہ کام کاہے کو کر لیا؟'' وہ چونک گیا۔

''موقع مل گیا تھا باس! ہم آج بھی اس کی ریکی کر رہے تھے۔ گھر والوں کو کسی فنکشن میں جاتے دیکھا۔ اس نے کھانا آرڈر کیا ہوا تھا۔ ڈلیوری والا دروازے پر آ کر فون کرنے لگا تو ہم نے اسے [illegible] کے اسی کے گیٹ اپ میں اسے چھاپ لیا۔'' جنید نے تفصیل بتائی۔

''شاباش! یہ کام کیا نا! اسے پارسل کر [illegible] اب آگے۔ اپن ابھی فون چالو کر کے بتا دے گا انہیں کہ پارسل ریسیو کر لیں۔'' شامی خوش ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی جا کے کر دیں گے۔'' جاسم نے شرافت سے کہا۔

''اور خبردار! کسی مستی یا بدمعاشی کا سوچنا بھی مت۔'' شامی نے اُنگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

''باس! پہلے کوئی شکایت ملی ہے کیا آپ کو؟ اب بھی ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' جنید منمنایا۔

''تم لوگوں کے بھوسے بھرے دماغوں کا اپن کو پتا ہے۔'' شامی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگوں کا دماغ کسی قابل ہوتا تو ان چھوکری لوگوں کو اٹھوانے کا وہ آئیڈیا اپن کے دماغ میں نہ آتا۔'' اس کے انداز میں ایک فخر نمایاں تھا۔

''بالکل باس! مولا قسم! ایسا آئیڈیا میرے دماغ میں تو بالکل نہیں آ سکتا تھا۔ مطلب اپنا تو بڑا سیدھا سادھندا تھا۔ اس دھندے سے اتنا بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، یہ تو اب اندازہ ہوا ہے۔'' جنید نے دانت نکوسے۔

''اب تک اس بلبل کو ملا کر صرف تین چھوکریاں اٹھائی ہیں۔ ذرا ہاتھ سیدھا ہو جائے تو چھوکریوں کی تعداد بڑھا دیں گے۔'' شامی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''باس! ذرا احتیاط سے ہی کام کریں گے ویسے یہ آئیڈیا مارکیٹ میں نیا ہے۔ ابھی صرف ہم لوگوں نے ہی اپلائی کیا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اور بھی پارٹیز سامنے آ جائیں۔'' جاسم نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

''برابر بولا رے تو! ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن ابھی اپن تین لوگوں کے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ چوتھا صرف چھوکری لوگوں کی انفارمیشن دیتا ہے۔ اصل بات تو اس کو پتا نہیں ہے کہ اپن لوگ یہ انفارمیشن کیوں لیتے ہیں۔ جب تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھاتے رہیں گے۔ اگر کوئی پارٹی سامنے آ گئی تو خیر ہے دیکھ لیں گے۔ اب ہر کسی کا دماغ اپن جیسا تو ہوتا نہیں۔ جتنی دیر میں یہ آئیڈیا آئے گا اپن لوگ ڈیڑھ دو درجن چھوکریاں پارسل کر چکے ہوں گے۔'' شامی نے سفاکی سے کہا۔

سامیہ کے بدن میں پھریری دوڑ گئی۔ وہ ان کی باتوں پر اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ اسے [illegible] ایک ہی بات سمجھ آئی تھی کہ یہ لوگ سفاک اور بے حس ہیں۔ لڑکیوں کو اغوا کرتے ہیں۔ لیکن اصل سوال اب بھی حل طلب تھے کہ ان کا چوتھا بندہ کیا تھا؟ لڑکیوں کے اغوا کرنے کا خیال شامی کے ذہن میں کیسے آیا؟ وہ لڑکیوں کو کس بنیادی اصول کے تحت اغوا کرتے؟ کون سی لڑکیاں کہاں بھیجی جاتی ہیں؟ ان کا چوتھا ساتھی کون تھا؟ وہ انہیں کس قسم کی معلومات فراہم کرتا تھا؟

سامیہ کے ذہن میں یہ سوالات بُری طرح ادھم مچا رہے تھے اور تجسس بن کر اس کے اعصاب پر سوار ہو چکے تھے۔ ان خیالات میں غرق سامیہ کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ جاسم اور جنید کس وقت وہاں سے رخصت ہو گئے۔

''کن خیالوں میں گم ہے ری تو؟'' شامی نے چرس بھرا سگریٹ سلگایا۔

''آپ لوگوں کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اس کے ذہن میں ایک نئی حکمتِ عملی پروان چڑھی تھی جس کے تحت اندازِ تخاطب میں تبدیلی خود بخود در آئی۔

''اپن لوگوں کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی تو؟'' شامی سگریٹ کے کش لیتا سُرور میں آنے لگا۔

''میری کزن کہاں ہے؟'' وہ لجاجت سے بولی۔

''اپنے اصل ٹھکانے پر۔ جہاں اسے ہونا چاہیے

تھا۔'' اس نے اپنا سابقہ جواب دہرایا۔

''کیوں اغوا کرتے ہیں آپ لوگ لڑکیاں؟'' سامیہ نے آزردگی سے پوچھا۔

''دھندا ہے یہ اپنا۔ کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔'' شامی نے ناک اور منہ سے دھواں خارج کیا۔

''کیا بگاڑا ہوتا ہے انہوں نے آخر؟ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کے گھر والوں پر آخر کیا بیتی ہوگی؟'' سامیہ کو نتاشا کی گمشدگی کے بعد اپنے اہلِ خانہ کی حالت یاد آئی۔ اب اس کے غیاب پر تو جانے کیا قیامت برپا ہوئی ہوگی۔

''جب پہلے یہ سب ان کے گھر والے نہیں سوچتے تو اپن لوگ کیا سوچے؟'' شامی کے جواب نے اسے مزید الجھا دیا۔

کم عمری، نادانی اور ایک مخصوص دائرے میں زندگی بسر کرنے والی سامیہ کے لیے جرائم کی یہ باریکیاں سمجھنا دشوار تھا۔ اس نے تو اب تک جرائم محض ناول، کہانیوں، ڈراموں اور فلموں میں ہی پڑھے اور دیکھے تھے۔

''آپ یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' سامیہ نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''کیا نہیں چھوڑ دیتا؟'' شامی کی آواز نشے سے بوجھل ہونے لگی۔

''یہی جرم بھری زندگی......'' سامیہ نے مزید اپنائیت سے کہا۔ ''جہاں ہر ایک لمحہ خطرے سے بھرپور ہے۔''

''ہمم! کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہے تو! اپن کے دھندے میں خطرہ تو ہر پل ساتھ ہوتا ہے۔'' شامی نے دوسرا سگریٹ بھی سلگا لیا۔

''پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ سب؟ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔'' سامیہ نے اگلا قدم بڑھایا۔

''چھوڑ کر کیا کرے گا اپن؟ کمائے گا کیا اور کھائے گا کیا؟''

''گھر بسا لیتا...... رزق کا وعدہ تو اللہ نے کر ہی رکھا ہے۔ وہ ذات تو ہر حال میں نوازتی ہے انسان کو۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''بیوی بچوں کی زنجیریں نہیں ڈال سکتا اپن پاؤں میں۔'' اس نے منہ بنایا۔

''ازدواجی زندگی کا سکون نصیب ہوگا آپ لوگوں کو۔ زندگی میں حلال آئے گا تو برکت بھی پیدا ہوگی۔'' سامیہ کے کہنے پر شامی خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دکھائی دینے لگی۔

سامیہ کے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال ابھرا۔

''کوئی بھی شخص ماں کے پیٹ سے تو مجرم پیدا ہو کر نہیں نکلتا۔ آپ نے بھی یہ راہ یقیناً کسی مجبوری میں ہی اپنائی ہوگی۔''

''ہاں! برابر بولا تو نے...... مجرم ماں کے پیٹ سے نہیں پیدا ہوتا لیکن اگر ماں ہی مجرم ہو تو......'' وہ اس کے لہجے کی نرمی سے پگھلتا دکھائی دے رہا تھا۔

''تو آپ کی والدہ؟'' سامیہ مضطرب ہوئی۔

''ہاں! اپنے دیور کے قتل کا الزام تھا اس پر۔ دیور بری نظر رکھتا تھا۔ شوہر کوئی مزاحمت کرنے کے بجائے الٹا پیسے لے کر کھاتا۔ عدالت نے عمر قید کی سزا دے دی۔ میں جیل میں پیدا ہوا۔ میری پرورش جیل میں ہوئی ہے۔'' اس نے بوجھل انداز میں بتایا۔

''اور آپ کی والدہ؟ وہ کہاں ہیں؟'' سامیہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''قید کے آخری سال مر گئی تھی۔ اپن کو وہیں پڑھایا لکھایا گیا تھا۔ باہر نکل کر باپ کو تلاش کیا لیکن وہ بھی مر کھپ گیا تھا۔ بس رل کھل کے پل ہی گیا۔'' اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

سامیہ کو لوہا گرم لگ رہا تھا۔ اس نے اور چوٹ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیا آپ اس زندگی سے خوش ہیں؟ سچ سچ بتائیے گا۔'' سامیہ نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔ شامی نے بوجھل سے انداز میں سر جھکایا۔

''نہیں رے! اصل خوشی تو اپن کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ زندگی کا حسن تو تیرے پاس آکر محسوس ہوتا ہے۔'' اس نے سامیہ کا رخسار چھوا۔

سامیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ معاملات بالکل درست سمت میں گامزن تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ یکدم جھنجھنا اٹھی۔ شامی نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر سر کو بے طرح جھٹکے دیے۔

''یہی اچ سننا چاہتی تھی نا اپن کی زبان سے؟'' وہ پھنکار کر بولا۔

''چھوڑ دو مجھے!'' وہ اذیت سے بے حال ہو کر کراہ اٹھی۔

''نہ نہ...... اب بھی شہد ٹپکا نا اپنی زبان سے۔ الو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے کیا اپن کو؟ تیرے کو کیا لگتا ہے تریا چلتر سے واقف نہیں اپن؟''

pklibrary.com

''تو کیا وہ سب جھوٹ بولا تم نے؟'' سامیہ نے پوچھا۔

''اپن کی اتنی عمر نہیں ہے جتنی عورتیں بھگتا چکا ہوں۔ سب کی سب ایک جیسی۔ اس بستر پر آکر گھر داری کے خواب دکھانے لگتیں اپن کو...... ہر ایک کو اپن کا ماضی جاننے کا شوق...... اپن نے بھی ہر ایک کو الگ کہانی سنائی اور وہ یہ سمجھنے لگتیں کہ جال میں قدم رکھ دیا ہے پنچھی نے۔'' شامی نے اس کے بالوں اور سر کو مزید جھٹکے دیے۔

''عورت کی آنکھیں اور دماغ اپنے ہاتھ کی لکیروں کے مافق پڑھ سکتا ہے اپن! آئندہ کبھی اپن کو اپنے چلتر دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ جن ڈراموں اور فلموں کی کہانیاں تیرے جیسوں نے دیکھ کر مجرم کو پیار محبت سے گھر داری میں اُلجھانے کا سبق پڑھا ہوتا ہے نا! اپن لوگ بھی ایسے اچ اپنا ڈیفنس سیکھتے ہیں۔ کیا سمجھی؟'' اس نے سامیہ کے بال چھوڑ دیے تھے۔

''اپن کے نزدیک عورت جات کی کوئی اوقات اچ نہیں ہے۔ اگلی بار یہ ڈرامے کرنے سے پہلے اپنا انجام سوچ لینا۔'' اس نے تنبیہ کی۔

اس لمحہ سامیہ کو شامی سے شدید نفرت اور اپنے وجود سے کراہت محسوس ہونے لگی۔ زندگی نہایت غلیظ ہو چکی تھی۔ اہلِ خانہ کے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ وہ کرب کی کس انتہا پر تھے۔ یہ سب صرف اسی ایک شخص کی بدولت ہوا تھا۔ سامیہ کے وجود میں نفرت کی شدید لہر اٹھی اور دماغ پر ایک دھندی طاری ہو گئی۔

''تجھے بددعائیں لگیں گی مظلوموں کی...... کُتّے کی موت مرے گا تو۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

شامی نے محظوظ ہو کر اس کی جانب دیکھا اور اطمینان سے بولا۔ ''ہلکا لے رہی ہے اپن کو تو۔ کُتّے کی نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر موت مرے گا اپن۔ کیڑے پڑیں گے اپن کی لاش میں۔ جہنم کی آگ میں جلے گا اپن۔ اور اپن اس سب کے لیے تیار بھی ہے۔''

اس کی بات پر سامیہ حیران ہونا بھی بھول گئی۔ وہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد ہی شخص تھا۔ جرائم اور عملی سوچ میں یکتا۔ ایسے جہاندیدہ اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان کا ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی بھلا کیا بگاڑ سکتی تھی؟ وہ تن بہ تقدیر رہنے کے سوا اور کچھ بھی کرنے کی اہل نہ تھی۔ سامیہ نے شدتِ اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کے دل میں شامی کا انجام دیکھنے کے سوا کوئی اور جذبہ نہ تھا۔

☆☆☆

وقت دبے قدموں سرکتا رہا۔ گرما کا موسم سرما میں منتقل ہو گیا۔ سامیہ کے پاس اس موسم کے لیے کوئی کپڑا یا سوئٹر نہ تھا۔ شامی نے کچھ عرصہ قبل ایک ہی جوڑا لا کر دیا تھا اور اب اس کے کہنے کے باوجود ہر ضرورت نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ ان دنوں سامیہ اکثر ایک ہی بات سوچا کرتی تھی کہ وقتاً فوقتاً شامی کے ساتھ رہنے والی لڑکیاں اب کہاں تھیں؟ انہیں قید سے تو آزاد نہیں کیا گیا ہوگا۔ شاید زندگی سے رہائی ہی مل ہو گی انہیں۔ سامیہ کو ان نادیدہ لڑکیوں کی خوش قسمتی پر بے پناہ رشک آیا۔ اس کربیہ زندگی سے موت ہی بدرجہا بہتر تھی۔

موسم کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی سامیہ کی بے بسی اور وحشت بھی بڑھتی گئی۔ ناکافی خوراک، جسمانی استحصال اور ذہنی بے سکونی ہلکے بخار اور پھر شدید بخار میں ڈھل گئی۔ اس بخار کی حدت ہڈیوں میں ہمہ وقت رقصاں درد اور کپکپی سے اسے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ ٹائیفائیڈ یا نمونیہ کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کا ذہن اب قابو میں نہ رہتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے خود کلامیاں کرنے لگتی۔

''بات سنو! مجھ پر ایک احسان کر دو۔'' اس نے بخار سے جلتا اپنا رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ گئے ہو تو پلیز جانا مت...... مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر جانا...... وعدہ کرو...... وعدہ کرو مجھ سے کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ تم میری آخری امید ہو۔ پلیز یہ امید مت توڑنا۔''

وہ کتنی ہی دیر اپنے مرض سے التجائیں کرتی رہی۔ اس کی رنگت سرسوں کی طرح زرد ہو چکی تھی۔ آنکھیں حلقوں میں دھنس کر عجیب تاثر دیتیں۔ اس کے ارتکاز اور دعاؤں میں دروازے پر آہٹ نے خلل ڈالا۔ وہ متوحش ہو گئی۔ شامی کی آمد کا مطلب مزید اذیت و جبر کے سوا کچھ نہ تھا۔

''الٰہی! میں نہیں جانتی کہ اپنی کس غلطی یا کوتاہی کی سزا بھگت رہی ہوں۔ مجھے اس بھیڑیے کے چنگل سے رہائی دلوا دے۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ ہر اختیار تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ میری التجا سن لے!'' آنسو ایک تواتر سے بہتے رہے۔

شامی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہاں بول!'' اس نے اپنے مخصوص کرخت انداز میں کہا۔

''کیا...... یہ لوچا کیسے ہو گیا؟'' اس کے تاثرات میں یکدم تبدیلی پیدا ہوئی۔ سامیہ سپاٹ نظروں سے اس کی

pklibrary.com

جانب دیکھتی رہی۔

"اپن نے کہا تھا..... منع کیا تھا تم لوگوں کو..... عورت جات سے دور رہنے کا بھی بولا تھا۔ اب دیکھ لو..... وہی اچ ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔" اس نے دوسری جانب سے بات سننے کے بعد دہاڑ کر کہا۔

"ابے سور کی اولاد..... اپن کنویں میں چھلانگ لگائے گا تو کیا تم سب بھی یہی اچ کام کرو گے۔ اپنا بھیجا فارغ ہو گیا ہے کیا؟ پہلے اپن کے جیسا جگرا تو لاؤ۔" وہ غصے سے نہایت خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

سامیہ کا ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ اسے گفتگو کا سیاق و سباق سمجھ ہی نہ آرہا تھا۔ شامی کچھ لمحوں تک کرسی پر بیٹھا اپنی پیشانی مسلتا رہا۔ اس کے چہرے پر لمحاتی تذبذب اب ایک چٹانی کیفیت میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے قمیص تلے پوشیدہ پسٹل نکالا اور سامیہ پر تان لیا۔

"تیرا وقت پورا ہو گیا ہے بلبل! جا اور جی لے اپنی نئی زندگی۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔

ٹریگر پر انگلی کا بڑھتا دباؤ سامیہ کے دل میں سکون پیدا کرنے لگا۔ اس نے آسودگی سے آنکھیں موندلیں۔ وہ ذہنی طور پر اپنی پیشانی پر کوئی انگارا دہکتا محسوس کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے اب تک یہی پڑھا اور سنا تھا کہ بارود کا مس بدن میں کسی انگارے کی سی کیفیت ہی پیدا کرتا ہے۔

اس کے آنکھیں موندتے ہی دو تغیرات رونما ہوئے۔ دروازے پر دہاڑ اور گولیاں چلنے کی دہری آوازوں نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سامنے شامی کا پسٹل بردار ہاتھ خون اگل رہا تھا۔ اس کے پسٹل سے نکلنے والی گولی سامیہ کے بائیں کندھے میں پیوست ہوئی تھی۔ اذیت بے حد تھی لیکن اب تک برداشت کیے گئے کرب سے تو بہر حال کم ہی تھی۔

"پکڑو اس کو..... نکلنے نہ پائے یہاں سے یہ۔" ایک پولیس اہلکار کی آواز سماعت میں پڑی۔ سامیہ کی آنکھیں نقاہت سے دھندلانے لگی تھیں۔

"تم جانتے نہیں ہو اپن کو..... چانڈیو صاحب تمہاری بینڈ بجا دیں گے۔" شامی نے دھمکی دی۔

"دیکھ لیں گے جب وہ وقت آئے گا..... ابھی تو چل ذرا شاہی مہمان خانہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔" پولیس اہلکار نے درشتی سے کہا اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

خواتین اہلکار فوری طور پر سامیہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ بخار کے بعد اس نئے زخم کی ٹیسوں نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی۔

☆☆☆

ہوش کی وادی میں واپس آتے ہی ایک نامانوس ماحول اس کے سامنے تھا۔

دیواریں، بستر اور مخصوص بُو سے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی اسپتال میں ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اسے آخری لمحات یاد آ گئے۔ اس نے اضطراری طور پر اپنے کندھے کی جانب دیکھا جہاں سفید پٹی کی موجودگی ان ہولناک لمحات کی مجسم نشانی تھی۔ ہڈیوں میں درد اور نقاہت میں بھی قدرے فرق محسوس ہو رہا تھا۔

"اب کیسی ہو تم؟" ایک نامانوس آواز سماعت میں پڑی تو اندازہ ہوا کہ وہاں ایک نرس بھی موجود تھی۔

"ٹھیک ہوں سسٹر!" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"پولیس کو بیان دینا ہے تمہیں۔ وہ کئی روز سے تمہارے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" نرس نے عجلت میں کہا اور وارڈ سے باہر نکل کر ایک پولیس اہلکار کو بلا لائی۔

سامیہ کے سامنے ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کھڑا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی غالب تھی۔ وہ غنودہ نظروں سے بلال نامی اس اہلکار کو دیکھنے لگی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے بیٹی اب؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ لہجے میں شائستگی اور متانت بھی واضح تھی۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ بہتر محسوس کر رہی ہوں اب۔" وہ نقاہت سے بولی۔

پھر وہ بلال کے سبھی سوالات کے تسلی بخش جواب دیتی رہی۔ اس نے نتاشا کے غیاب، آن لائن ٹیکسی کی آمد، اپنے اغوا، جاسم اور جنید سے ملاقات اور پھر شامی کی آمد کے متعلق ہر بات بلا کم و کاست بیان کر دی تھی۔ ان کربناک لمحات کو یاد کرتے ہوئے سامیہ کی آنکھوں میں بار بار آنسو اُمڈ رہے تھے۔

"یہ لوگ ٹریس کیسے ہوئے تھے؟ آپ کس طرح پہنچے ان تک؟" اس نے اہلکار سے پوچھا۔

"دونوں لڑکوں نے اپنے باس ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک مغویہ کو قید کر لیا۔ وہ کئی روز اسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بناتے رہے۔ ان کی بدقسمتی اور ناتجربہ کاری تھی اور پھر لڑکی بہت ہوشیار اور بااعتماد تھی۔ اس نے دونوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے پہلے ایک دوسرے کے خلاف کر دیا۔ اس

کے بعد جاسم کا فون استعمال کرتے ہوئے پولیس سے رابطہ کر لیا۔ وہ تو فوری گرفتار ہو گیا تھا۔ جنید البتہ اس وقت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جاسم کی مخبری پر ہی جنید کے گھر اور شامی کے اس خفیہ ٹھکانے تک پہنچے ہم۔ تھوڑی اور دیر ہو جاتی تو دونوں ہی کسی نہ کسی طرح فرار ہو جاتے۔'' بلال نے بتایا۔

''ان مغویہ لڑکیوں کو کہاں بھیجا جاتا تھا؟'' سامیہ کے دل میں نتاشا کی یاد نے چٹکی لی۔

''شامی کا دماغ بہت شیطانی تھا۔ اس نے لڑکیوں کے دام کھرے کیے ہوئے تھے۔ اغوا کے دھندے میں آتے ہی اس نے کچھ بااثر افراد سے تعلقات استوار کیے۔ انہی کے توسط سے یہ لڑکیاں بیرونِ ملک اسمگل کی جاتیں۔ جہاں کسی طبقہ کو گھریلو ملازماؤں کی ضرورت پڑتی ہے تو ایک ملک کے بااختیار مقتدر افراد کو ہر خطہ اور رنگ و نسل کی گھریلو لڑکیاں اپنے حرم میں جمع رکھنے کا شوق چراتا ہے۔ تمہاری کزن بھی ایسے ہی کسی مقام پر پہنچ چکی ہے۔''

''لیکن کیوں؟ آخر کیوں؟ ایسی کیا غلطی ہو گئی تھی ہم سے؟ ہماری زندگی تو بہت سیدھی سادی اور اُلجھنوں سے پاک تھی۔ ہم نے کیا غلطی کر دی آخر؟'' وہ بلکنے لگی۔

''کیا تمہیں واقعی اندازہ نہیں کہ ان لوگوں نے کیوں اغوا کیا تھا تمہیں؟'' بلال نے تاسف سے اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں ہمدردی کے علاوہ ایک بے عنوان سا جذبہ بھی تھا۔ غصہ، کوفت، جھنجلاہٹ اور بے بسی کے مابین کوئی انوکھا ہی روپ تھا جسے سامیہ مکمل طور پر سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''نہیں! میں نے شامی سے کئی بار پوچھا لیکن وہ ٹال دیا کرتا۔ اس نے تو مجھے یہ بھی نہ بتایا کہ نتاشا کو کہاں بھیجا گیا۔ صرف یہی کہتا رہا کہ وہ اپنی اصل منزل تک پہنچ چکی ہے۔'' سامیہ نے لاچاری سے بتایا۔

بلال نے ٹھنڈی آہ بھر کر اس کی جانب دیکھا اور دھیرے دھیرے دونوں لڑکوں سے اپنی تفتیش کے بارے میں مزید انکشافات کرنے لگا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ سامیہ کو پاتال میں گرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی بات کے اختتام پر سامیہ کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔

''کیا یہ عمل واقعی غلطی تھی؟ اوہ خدایا! میں نے تو ایسا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔''

سوالات در سوالات بھنور کی طرح دماغ میں چکراتے رہے۔ انجام کار اس نے بے بسی اور نقاہت سے آنکھیں موند لیں۔ اسے ایک طویل بے ہوشی یا موت کے سوا کوئی اور تمنا نہ تھی۔

☆☆☆

سرما کی نکھری دھوپ ہر سو پھیلی تھی۔ آسمان پر آوارہ بادلوں کے ٹکڑے کہیں کہیں محفل سجائے بے نیازی سے براجمان تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا لیکن سامیہ کے دل و دماغ پر چھائی سنسنی کوئی بھی خوشگواریت محسوس ہونے ہی نہ دے رہی تھی۔ وہ اس وقت بلال کے ہمراہ اپنے محلے میں موجود تھی جہاں زندگی کی ہر رونق جوں کی توں برقرار نظر آ رہی تھی۔ یہاں آنے سے قبل مزمل، تایا اور جواد کے نمبروں پر فون بھی کیا لیکن سبھی کے نمبر بند ملتے۔ سامیہ کی نم آنکھیں آنسو چھلکانے لگیں۔ ضبط محال تر تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پان کی دکان تک پہنچ گئے۔ سامیہ نے ارادتاً آج نقاب نہیں کیا تھا۔ اسے علم تھا کہ نقاب میں اسے فوری طور پر پہچان لیا جائے گا۔

پان کی دکان پر آج بھی ویسا ہی مجمع تھا جو کسی کرکٹ سیریز میں قومی ٹیم کی ناقص کارکردگی پر دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔ سامیہ کے لیے ایک اور صدمہ بانہیں کھولے اس کا منتظر تھا۔ اس کا گھر جلنے کا ڈھیر بنا سامنے ہی موجود تھا۔ سامیہ کو اپنی بصارت پر یقین کرنا دشوار ہونے لگا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس لمحہ سامیہ کو محسوس ہوا کہ اس نظارہ کے بعد قیامت خیزی اور بھلا کیا ہوگی؟ لیکن اصل قیامت تو ابھی اس کی منتظر تھی۔

''السلام علیکم حاجی صاحب! ایک چھوٹی سی زحمت دینی تھی آپ کو۔'' بلال نے دکان کے مالک کو مخاطب کیا۔

''ہاں جی! حکم کیجیے۔'' اس نے بھی عاجزی سے جواب دیا۔

''عرفان اللہ صاحب کا گھر تلاش کر رہے ہیں ہم۔ ذرا گائیڈ تو کیجیے گا۔'' بلال نے اصل مدعا کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''اس علاقے میں نئے معلوم ہوتے ہیں آپ۔'' حاجی نے سوال داغا۔

''جی ہاں! حیدرآباد سے آئے ہیں ہم۔ یہاں پہلی بار ہی آنا ہوا ہے۔ انہیں کئی بار فون بھی کیا تھا لیکن کسی نے ریسیو ہی نہیں کیا۔''

''کیسے رشتے دار ہو بھئی آپ اُن کے؟ آپ کو علم ہی نہیں ہے عرفان اللہ کے انتقال کو کئی مہینے بیت چکے ہیں۔'' مجمع سے ایک شخص کی آواز آئی۔

سامیہ اس شخص کو جانتی تھی۔ وہ رکشا ڈرائیور عبدالغفار تھا۔ سامیہ مڈل اور میٹرک کلاس میں اسی کے ہمراہ بورڈ کے

pklibrary.com

پرچے دینے جاتی رہی تھی۔ اس انکشاف نے زخمی روح پر ایک اور چابک رسید کردیا۔

''رشتے دار نہیں ہیں ہم ان کے۔ وہ دوست تھا میرا۔'' بلال نے فوراً بات بنائی۔ وہ مزید وضاحت دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور سمع خراش تبصرہ سامنے آیا۔

''اچھا ہی ہوا آپ کو علم نہ ہوا۔ قیامت ہی تھی جو اُن کے خاندان پر گزر گئی۔ ان کی دونوں بچیاں گھر سے بھاگ گئی تھیں۔ عرفان اللہ سے یہ صدمہ برداشت نہ ہوسکا۔ مرگیا بے چارہ۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''کیا؟ دونوں بچیاں ہی؟'' بلال نے حیرت کی بھرپور اداکاری کی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟ وہ تو بہت شریف اور باکردار بچیاں تھیں۔''

''اس ڈیجیٹل دور میں کیا چیز ممکن نہیں ہے میرے بھائی؟ جوان خون تھا۔ بہکتے ہوئے کوئی دیر لگتی ہے بھلا؟'' عبدالغفار نے اسی... انداز میں جواب دیا۔

''میرا دل نہیں مانتا۔ دونوں بچیاں ہی کیسے؟'' بلال نے تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ ''ہوسکتا ہے اغوا کرلیا ہو کسی نے انہیں۔''

''پہلے ہم بھی یہی سوچتے تھے کہ اغوا ہوئی ہوں گی۔'' حاجی نے ایک پان تیار کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وقت نے فوراً ہی ہمارا خیال غلط ثابت کردیا۔ اغوا ہوئی ہوتیں تو تاوان کا کوئی مطالبہ سامنے آتا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہی ہوا تا کہ لڑکیاں اپنی مرضی سے کہیں غائب ہوئی تھیں۔ پھر عرفان کے لڑکوں نے گھر اونے پونے داموں میں فروخت کردیا۔ ٹھیکیدار نے خرید کر اسے نئے سرے سے تعمیر کرنا شروع کیا ہے۔'' حاجی کے انداز و انکشاف پر سامیہ کے آنسو بہہ نکلے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنی دکان کے لیے قرض عرفان اللہ سے ہی لیا تھا اور ان بچیوں کی شرافت کے گن گاتے نہ تھکا کرتا۔

''بدنامی آخر کب تک برداشت کرتے وہ؟ اس لیے کنارہ کش ہوگئے بس۔'' ایک اور تجزیہ سامنے آیا۔

''تو کہاں گئے وہ لوگ؟ کچھ تو آئیڈیا ہوگا آپ لوگوں کو؟ میں ان سے تعزیت ہی کرلوں گا۔'' بلال نے ان تبصروں کے سامنے بند باندھا۔

''کسی کو بتا کر نہیں گئے۔ بس اتنا علم ہوا تھا کہ ان کے چھوٹے بیٹے نے کسی کولیگ سے پسند کی شادی کرلی ہے۔ اس لڑکی کا باپ، بھائی ٹھیک ٹھاک پیسے والے ہیں اور مزمل کو باہر سیٹ کروانے کے چکروں میں ہیں۔ میرے بیٹے کو پاسپورٹ دفتر میں ہی ایک بار ملا تھا مزمل۔'' ایک اور محلے دار نے معلومات کا تبادلہ کیا۔

سامیہ کے وجود کو گویا کوئی ٹرین پوری قوت سے کچل گئی۔ اس کی سماعت میں مزید کچھ بھی سننے کی تاب نہ تھی۔ اس نے بلال کی جانب ملتجی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کا عندیہ بھانپ گیا اور الوداعی تعزیتی کلمات ادا کرنے لگا۔ اسے بھی اس ساری صورتِ حال سے بہت دکھ ہوا تھا۔ سامیہ کے ساتھ چند روز میں ہی وہ اس لڑکی کی فطرت و کردار کا اندازہ لگا چکا تھا لیکن اس نے جن لوگوں کے درمیان تمام عمر گزاری تھی ان کے یہ تاثرات و ہرزہ سرائی یقیناً بہت تاسف انگیز تھی۔ وہ سامیہ کی درخواست پر ہی اسے ذاتی حیثیت میں یہاں لایا تھا۔

سامیہ بے جان قدموں سے اس کے ساتھ چلتی کسی زندہ لاش کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ بلال نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ وہ اسے ساتھ لیے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا جہاں حیدرآباد کی گاڑی حسبِ دستور کچھ تاخیر کا شکار تھی۔ ٹکٹ خرید کر وہ اسٹیشن پر ہی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ سامیہ سپاٹ نظروں سے خلاؤں میں جانے کیا تک رہی تھی۔ اسی لمحہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اسکرین پر اپنے ساتھی اہلکار کا نمبر دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کا وجدان بھانپ گیا تھا کہ دوسری جانب کوئی اچھی خبر نہیں ملے گی۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا اور فون بائیں کان سے لگا لیا۔ سامیہ بھی اسی سمت بیٹھی تھی۔ اسپیکر سے آنے والی آواز اس کی سماعت تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''کیا بات ہے چیمہ؟ خیریت تو ہے؟'' بلال نے دریافت کیا۔

''اپنی نوکری میں خیریت بھلا کبھی ہوئی بھی ہے؟'' چیمہ کی آواز بھاری اور لہجہ گمبھیر تھا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''میں نے تجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ شامی کو اس کے ہوتے سوتوں نے آزاد کروا کے انڈر گراؤنڈ کردیا ہے۔ کیس بھی خارج کروادیا گیا ہے۔'' اس انکشاف نے بلال کو خاموش کروادیا۔

''میرے ذہن میں بھی یہی خدشہ تھا۔ شامی کا اعتماد اور بے خوفی یونہی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ رہائی مل جائے گی کسی نہ کسی طرح۔'' بلال نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ہاں! یہ تو ہم زمانے سے دیکھتے آرہے ہیں کہ مجرم کو بری کروانے کے لیے ہزاروں ہتھکنڈے پہلے ہی تیار ہوتے ہیں۔ پھر بدنام ہم ہی ہوتے ہیں کہ پولیس اپنا کام ڈھنگ

سے نہیں کرتی۔ اب ان حالات اور نتائج میں کس کا دل چاہے گا کام کرنے کو؟'' جیمہ کی مایوسی ہر ایک لفظ سے عیاں تھی۔

''بُرا ہوا...... بہت بُرا ہوا......'' بلال نے اضطراری انداز میں فون دائیں کان سے لگا لیا۔ وہ طرفہ گفتگو کا ایک ماخذ سامیہ کی سماعت سے دور ہو گیا۔

''اور اس گواہ کا کیا بنا؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''شامی کی رہائی سے پہلے اسی کا پتا صاف کروایا گیا فلیٹ پر۔ پوری چھ گولیاں ماری گئیں اسے جاسم اور جنید کو بھی مروا دیا گیا ہے۔ وہ وعدہ معاف گواہ بن جاتے تو شامی کو کوئی نہ بچا پاتا۔ مجھے تو اب اس دوسری لڑکی کا مستقبل بھی یہی نظر آتا ہے۔ شامی پارٹی اپنے خلاف کوئی بھی گواہ نہیں چھوڑے گی۔''

''ہمم...... میرے ذہن میں بھی یہی خدشہ تھا۔ سوچتے ہیں اس بارے میں بھی کچھ نہ کچھ۔'' بلال نے پیشانی مسلی۔

اس کے ذہن میں بہت سے سوالات و خدشات تھے۔ وہ سامیہ کے ہمراہ یہاں تک چلا تو آیا تھا لیکن اس کے بعد یہ ذمے داریاں اٹھانا اس کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ اس کی ہمدردی اور خدا خوفی اپنی جگہ تھی لیکن وہ ذاتی زندگی میں اتنا بھی بااختیار نہ تھا کہ ایک جواں سالہ لڑکی کو اپنے گھر یا کسی رشتے دار کے ہاں پناہ دلوا دیتا۔ لے دے کے صرف دارالامان ہی بہترین جائے پناہ ثابت ہو سکتا تھا۔

بلال نے سامیہ سے حتمی بات کہنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے رخ تبدیل کر کے سامیہ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھیانک تلاطم تھا۔ نظریں چند قدم کے فاصلے پر دوسری بینچ پر تھیں جہاں چار خوش باش افراد پر مشتمل ایک خاندان ابھی ابھی آ کر براجمان ہوا تھا۔ بلال کے فون پر دوبارہ گھنٹی بجنے لگی۔ اس بار یہ کال بیوی کی جانب سے تھی۔ بلال اس سے بات چیت میں مشغول ہو گیا۔

سامیہ کا ذہن کسی چٹان کے سے دباؤ میں تھا۔ شامی کی رہائی نے اسے مایوسی اور شکستگی کی اتھاہ دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ اس کا ذہن و حواس مختلف حصوں میں منقسم تھے...... جیمہ کے الفاظ، اپنے سامنے دکھائی دینے والا مختصر خاندان اور کچھ روز قبل بلال کی جانب سے ہونے والے انکشافات بیک وقت دماغ میں رقصاں تھے۔

''بہت انجوائے کیا یہ ٹرپ...... میری زندگی کا تو یادگار سفر تھا یہ۔'' بیس، بائیس سالہ لڑکے نے اپنی ساتھی خواتین کو مخاطب کیا۔ ان خواتین میں سے ایک ادھیڑ عمر اور

قابلِ رحم

ایک صاحب: ''میں نے دو شادیاں کیں لیکن دونوں بیویاں مر گئیں، اب کیا کروں؟''

دوسرا: عورت ذات پر رحم۔''

☆☆☆

شوہر نے دفتر سے آتے ہی جلدی جلدی ہاتھ دھوئے غالباً زور کی بھوک لگ رہی تھی، اتفاق سے سامنے سے بیگم نمودار ہو گئیں، ذرا کرخت لہجے میں کہنے لگیں۔ ''یہ آپ دفتر سے آتے ہی کیا کر رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں...... وہ ذرا...... ہاتھ دھو کر منے کو اٹھانے لگا تھا۔'' شوہر نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

برناڈ اور چرچل

انگریزی کے مشہور ڈراما نویس جارج برناڈ شا نے ایک روز چرچل سے کہا۔

''میری ذہانت، صحت اور لمبی عمر کا راز یہ ہے کہ میں عورت سے دور رہتا ہوں، شراب نہیں پیتا، گوشت نہیں کھاتا۔ تمباکو کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ صرف پھلوں، سبزیوں اور دودھ پر گزارہ کرتا ہوں۔''

چرچل نے جواب دیا۔

''مسٹر شا! میں تو چوبیس گھنٹے شراب پیتا ہوں، ہر وقت میرے ہاتھ میں سگار رہتا ہے، شادی شدہ بھی ہوں، گوشت خور بھی ہوں اور خوش خوراک بھی۔ اس کے باوجود نہ میں آپ سے کم عمر ہوں، نہ آپ سے کم ذہین اور صحت بھی آپ سے خراب نہیں۔''

کراچی سے جاوید کاظمی کی شوخی

دوسری نوجوان تھی۔ چوتھا ادھیڑ عمر فرد البتہ قدرے لاتعلق دکھائی دے رہا تھا۔

''ہاں! بہت انجوائے کیا بھائی...... سچ میں۔'' نوجوان لڑکی نے اسے جواب دیا۔

سامیہ کا ذہن لفظ 'بھائی' پر اٹکا اور فوری طور پر اس منظر کے ساتھ ایک اور اسکرین روشن ہو گئی۔ یہ نیا منظر اسپتال کا تھا۔

''تم لوگ غالباً اپنے بھائی اور اہلِ خانہ کے ساتھ کسی شادی پر حیدرآباد آئے تھے۔'' اس نے بلال کو کہتے سنا۔

''میں نے تو اس ٹرپ کا ایک ایک لمحہ پکچرز اور ویڈیوز میں قید کر لیا ہے۔ گھر جاتے ہی یہ ڈیٹا موبائل سے کسی یو ایس

بی میں ٹرانسفر کروں گا۔'' لڑکے نے پُرجوش ہو کر بہن سے کہا۔

سامیہ کا ذہن 'موبائل' پر اٹکا اور دوسرا منظر ایک بار پھر متحرک ہو گیا۔

''شادی کے بعد تم لوگوں میں سے کسی کا موبائل فون چوری ہوا تھا۔'' بلال کی آواز سماعت میں دوبارہ گونجی۔

''ہاں! جواد بھائی اکیلے واپس چلے گئے تھے کراچی۔ ہم لوگ ابھی وہیں تھے۔ میری تائی امی کسی دوسرے رشتے دار سے ملنے گئیں تو کسی نے گن پوائنٹ پر بیگ اور موبائل چھینا تھا راستے میں۔'' سامیہ نے خود کو کہتے سنا۔

''میرے پاس ڈیٹا بھی کافی قیمتی ہے۔ تم ایسا کرنا کہ مجھے بھی کوئی یو ایس بی لا دینا۔ پہلی فرصت میں ڈیٹا ہی ٹرانسفر کروں گی۔ آج کل موبائل میں ڈیٹا رکھنا بہت خطرناک ہے بھئی۔'' نوجوان لڑکی نے بھائی سے کہا۔

سامیہ کا ذہن اس بار موبائل اور ڈیٹا کے الفاظ پر اٹکا تھا۔

''تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ موبائل سے پکچرز اور ویڈیوز ہٹا دو گے تو کسی آفت میں نہیں پڑو گے۔ یہی تو سب سے بڑی بھول ہوتی ہے تم لوگوں کی۔'' دوسرے منظر میں بلال کی تاسف انگیز آواز ابھری۔

''میں تو ٹرین میں بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اپنی بیسٹ پکچرز اور ویڈیوز فیس بک پر ڈالوں گا۔ آگ لگ جائے گی...... آگ۔'' لڑکے نے تفاخر سے بہن کو دیکھا۔

پکچرز...... ویڈیوز نے دوسرا منظر پھر متحرک کر دیا۔

''لیکن ہم دونوں نے تو فیس بک یا انسٹاگرام پر بھی کوئی ڈیٹا شیئر کیا ہی نہیں۔'' سامیہ نے بلال کی بات کا پس منظر بھانپ کر جواب دیا تھا۔

''میں نے فیس بک پر تو نہیں البتہ واٹس ایپ اسٹیٹس پر ضرور ڈالی تھیں تصویریں کچھ دیر پہلے۔'' لڑکی نے بھائی کو فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔

واٹس ایپ...... اسٹیٹس...... نے سامیہ کے ذہن پر ہتھوڑا زنی کر کے دوسرا منظر متحرک کر دیا۔

''تم شاید بھول رہی ہو بیٹی کہ سوشل میڈیا کے نام پر ایک آفت واٹس ایپ بھی ہے۔ لوگ یہاں اپنے اسٹیٹس کی تصویریں، ویڈیوز اپ لوڈ کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔'' بلال نے کہا تھا۔

''ہاں جی! تو یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں۔ چوبیس گھنٹے بعد یہ اسٹیٹس خودبخود ڈیلیٹ بھی تو ہو جاتے ہیں۔'' سامیہ نے خود کو کہتے سنا۔

''واہ...... کتنے ویوز آئے؟ کیا کمنٹس ملے؟'' پہلے منظر میں لڑکا بہن سے مخاطب ہوا۔

''ارے برو! نائنٹی پلس ویوز ہوئے تھے اور کمنٹس سے تو انباکس ہی بھر گیا تھا۔ سی ویو والی پکچرز نے میلہ لوٹ لیا۔ ابھی ٹرین میں بیٹھ کر سی ویو والی اور بھی پکچرز اپلوڈ کروں گی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''واؤ...... ڈیٹس گریٹ۔'' لڑکا پرجوش ہوا۔

سامیہ کا ذہن فوری طور پر دوسرے منظر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہی تو حماقت ہے تم لوگوں کی۔'' اسپتال میں بلال اسے کہتا نظر آیا۔ ''تمہیں ایسا لگتا ہے کہ چوبیس گھنٹے بعد وہ اسٹیٹس ڈیلیٹ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات کیوں بھول جاتے ہو کہ کسی دوسرے کے فون میں اسکرین شارٹس لینے کس قدر آسان ہیں۔ چلو! یہ بھی چھوڑو۔ یہ میرا موبائل فون دیکھو۔'' بلال نے ایک جدید موبائل نکال کر کوئی مخصوص فولڈر اس کے سامنے کیا۔

''یہ وہ تصویریں اور ویڈیوز ہیں جو میرے کلائنٹس نے اسٹیٹس پر لگائیں۔ میں نے دیکھیں اور پھر میرے موبائل نے کسی فرماں بردار ملازم کی طرح انہیں خودبخود سنبھال لیا۔ اب اگر کسی کی فون بک میں پچاس نمبر بھی ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ بیس سے پچیس موبائلز میں تو یہ اسٹیٹس ازخود محفوظ ہوئے ہی ہوں گے۔ تم دونوں بہنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تم لوگوں نے شادی میں زرق برق، بھرپور میک اَپ والی تصاویر لگائیں۔ تمہاری تائی کا فون چوری ہوا۔ اب یہ تمہاری بدقسمتی تھی کہ جاسم سوفٹ ویئرز کا ماہر تھا۔ اس نے فون کا لاک کھول لیا۔ یہ فون شامی کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہاں اس نے تمہاری بھی تصاویر دیکھ ڈالیں۔ شیطانی دماغ میں نیا خیال آیا۔ لڑکوں کو حکم دیا کہ جو بھی لڑکی پہلے ملے اٹھا لو۔ نتاشا اسی لپیٹ میں آئی۔ اپنی تائی کی وفات کے باعث تم گھر تک محدود رہیں۔ پھر ایگزامز کے لیے نکلنا پڑا کالج اور تمہیں بھی اغوا کر لیا گیا۔ آگے کی کہانی تمہیں معلوم ہی ہے۔''

''لیکن انہیں لڑکیوں کا ایڈریس کیسے ملتا تھا؟'' سامیہ نے اپنی اُلجھن بیان کی۔

''یہ بھی تفتیش کی تھی دونوں لڑکوں سے۔ اس معاملے میں کوئی چوتھا شخص بھی شامل تھا جس کو مطلوبہ لڑکی کا نمبر دے

کر تا م، پتا نکلوایا جاتا۔ لڑکی کی ریکی کروا کے اغوا کر لینا ان جیسوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور پھر اغوا کے بعد کسی نہ کسی منزل پر پہنچا دینا دشوار ہے کیا؟ راستے لڑکیاں خود ہی فراہم کر دیتی ہیں۔ تمہی نے اپنے ایگزامز کے لیے دعا کا کوئی اسٹیٹس لگایا تھا۔ نتاشا کے اغوا اور تائی کی وفات کے بعد تم میں سے کسی کو خیال ہی نہ آیا کہ مرحومہ کا فون مختصر اوقات کے لیے آن ہوتا ہے۔ شامی نے تمہارا اسٹیٹس دیکھ کر مرحومہ کے فون سے تمہارا نمبر عارضی بلاک کروایا تا کہ 'ویوز' نہ دیکھ سکو۔'' بلال نے تلخی سے بتایا۔

سامیہ کے ذہن میں آندھیاں برپا ہو گئی تھیں۔ وہ آج تک اسی مان اور بھرم میں جیتی رہی تھی کہ وہ بہت محتاط اور صاف ستھری زندگی بسر کرتی آئی ہے۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک ذرا سی غلطی کس قدر تباہی کا پیش خیمہ بن گئی۔ اس کے تئیں واٹس ایپ اسٹیٹس پر 'پرائیویسی' لگا کر اپنی انا اور خودستائشی کے جذبے کی تسکین کرنا بے حد محفوظ رستہ تھا۔ ذہن میں تو یہی اطمینان بسیرا کیے ہوئے تھا کہ سب 'کانٹیکٹس' اپنے اور بااعتماد افراد ہیں۔ یہ اعتماد ایسی بھیانک غلطی بھی ثابت ہو سکتا تھا؟ اس منظر میں دکھائی دینے والی سامیہ کے چہرے پر ثبت اذیت و کرب بنچ پر بیٹھی سامیہ پر دس گنا ماند ہے اثر انداز ہو رہا تھا۔ الفاظ کی بازگشت اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس کا ارتکاز اب پہلے منظر کی طرف منتقل ہو گیا جہاں وہ دونوں بہن بھائی اپنی ہی لے میں مگن تھے۔

''ایک سیلفی لیتے ہیں برو! دیکھنا ذرا میری کلاس فیلوز کے کیسے کیسے کمنٹس آتے ہیں تمہاری پرسنالٹی پر۔'' لڑکی بچوں کی طرح پرجوش ہو رہی تھی۔

لڑکا فوری طور پر تیار ہو گیا۔ سامیہ کے وجود میں کوئی طاقتور برقی رو دوڑ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا تنفس بری طرح بگڑ چکا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا تم لوگ؟ عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا؟ کچھ اندازہ بھی ہے کہ یہ غلطی کس قدر مہنگی ثابت ہو گی؟'' وہ چلا کر بولی۔

چاروں افراد حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ سامیہ نے دونوں کے ہاتھ سے موبائل فون چھینے اور پوری قوت سے ایک جانب اچھال دیے۔ لڑکی اور اس کے بھائی کے چہرے بگڑ گئے۔

''پاگل ہو گیا تم؟ یہ نقصان تمہارا باپ بھرے گا کیا؟'' لڑکا غصے سے چلایا۔

''پاگل... نہیں... وہ تو میں پہلے تھی... اور تم اب بھی ہو... رک جاؤ! مت کرو یہ غلطی... یہ شامی بہت حیوان ہوتے ہیں۔ روح تک روند دیتے ہیں... یہ عبدالغفار بہت متعصب ہوتے ہیں... برسوں کی ریاضت مٹی میں ملا دیتے ہیں... یہ مزمل بہت منافق اور بے وفا ہوتے ہیں... ماضی کی سبھی چاہتیں بھول کر دل اور زندگی میں بڑی آسانی سے کسی اور کو جگہ دے دیتے ہیں... مت کرو یہ غلطی! اس کا تاوان بہت مہنگا ہے۔''

سامیہ کا بدن بری طرح اینٹھنے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑ چکے تھے اور منہ سے جھاگ نکلنے لگ تھا۔ بلال اس کی حالت دیکھ کر لپکتا ہوا اس کی جانب چلا آیا۔

''سامیہ! اٹھو، کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''یہ آپ کے ساتھ تھی انکل؟'' لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔ ''اسے کسی مینٹل ہاسپٹل داخل کروایئے۔ ایسے پاگل کو کھلے عام گھومنے دینا شہریوں کے لیے جانی نقصان وہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔'' لڑکی جارح مزاجی پر اتر آئی۔

بلال کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے سامیہ کے لیے محفوظ ٹھکانا سوجھ گیا تھا۔ اس کو دماغی امراض کے کسی بھی ادارے میں منتقل کر کے وہ اپنے ضمیر کی خلش سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر ایمبولینس کے لیے فون ملا دیا۔

اس کے عقب میں نوجوان لڑکا اپنے کرچی فون لیے چلا آیا تھا۔

''کمینی کہیں کی۔'' اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''تباہ و برباد کر کے رکھ دیے فون۔''

''کوئی بات نہیں... لاہور پہنچتے ہی نیا سیل فون لے لینا۔'' ادھیڑ عمر شخص نے اسے دلاسا دیا۔ ''میں نے اس لڑکی کی ویڈیو بھی بنائی ہے۔ فون لیتے ہی اسے اسٹیٹس پر ڈالنا۔ لوگ حیران ہو جائیں گے۔ بلکہ میں تو ابھی اپلوڈ کرنے لگا ہوں۔'' وہ سنجیدہ صورت شخص اطمینان سے بولا۔

''ونڈرفل... کمنٹس اور ویوز کے بارے میں مجھے بھی ضرور بتایئے گا۔'' اس کی اہلیہ نے سراہتے ہوئے جواب دیا۔

وہ چاروں اس ویڈیو کے بارے میں مزید رائے زنی اور تجزیہ کرنے لگے۔ بلال نے کسی طرح سامیہ کو گھسیٹ کر بینچ پر لٹا دیا تھا۔ ایمبولینس اب کسی بھی لمحے پہنچنے والی تھی۔

❖❖❖

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے.... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الاؤ کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الاؤ ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھناؤنے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ سانسوں کا تموج بڑھ گیا۔ دھماکے کے بعد ہی دوسری جانب سے لائن منقطع ہو چکی تھی اور میرا پورا وجود فکر و تشویش سے شل ہونے لگا تھا۔ دھماکے کی آواز بلاشبہ کسی چھوٹے کیلبر کے پستول کے فائر ہی کی تھی۔

میں اسی وقت کمرے سے نکلا اور تقریباً دوڑتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کے آندھی طوفان کے مانند نصف گھنٹے کے اندر اندر نیوشی جا پہنچا۔ ٹیکسی میں نے یعقوب ترمذی کی رہائش گاہ کے عین گیٹ کے سامنے رکوائی۔

ڈرائیور کو میں نے کرایہ ادا کیا اور ساتھ ہی اسے رکنے کو بھی کہا۔ وہ پریشان سا ہوا، کیونکہ میری گھبراہٹ، پریشانی اور عجلت پر نجانے سارے راستے کیا سوچتا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے دو ایک بار پوچھا بھی اور میں سرِدست ماسوائے ''ایمرجنسی'' کہنے کے کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

میں بھاگ کر گیٹ پر آیا اور اس کا بغلی دروازہ دھکیلا، وہ کھلا ملا۔ میں دیّانہ وار اندر جا گھسا اور تقریباً دوڑتا ہوا مرکزی دروازے کی جانب لپکا، جو مجھے چوپٹ کھلا ملا......

تیزی سے اندر لپکا اور سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا جہاں زوہریہ تھی۔ میں نشست گاہ سے گزر ہی رہا تھا کہ اچانک میرا پیر فرش پر دھری کسی شے سے ٹکرایا اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ سنبھلا تو مڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ کوئی انسانی جسم تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اعصاب تنے ہوئے تھے۔ جلدی سے سوئچ بورڈ تلاش کر کے لائٹ آن کی تو بُری طرح ٹھٹکا۔

قالین پر گرا وجود حماد کا تھا۔ اس کے سینے سے خون بہہ کر نشست گاہ کے دبیز قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر مڑا اور زوہریہ کے کمرے میں داخل ہوا تو دھک سے رہ گیا۔

☆☆☆

بستر خالی تھا۔ زوہریہ وہاں نہیں تھی۔ چادر الٹی پڑی تھی اور بیڈ سے فرش پر لٹک رہی تھی۔

گویا شریطہ یا اس کے ساتھی اپنی ''کارروائی'' کر گئے تھے، مگر کیسے؟ زوہریہ کو کہاں لے گئے اور کیوں؟ کیا ان کا مقصد زوہریہ کو محض اغوا کرنا تھا؟

وقت بالکل نہیں تھا اور جلدی فیصلہ کرنا ضروری تھا۔

میں نے پہلے تو مقامی پولیس سے رابطہ کرنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل کر انٹرپول کی پریتی سے رابطہ کر لیا اور اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے رابطہ منقطع کر دیا، کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا مگر اس واقعے کا ان کے علم میں لانا بھی اہم تھا۔

میں نے زوہریہ کا ہی لینڈ لائن فون استعمال کیا تھا۔

اس کے بعد میں تیزی سے باہر لپکا، شکر تھا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھلا مانس باہر موجود تھا۔

میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا اور اسے اس علاقے کا نام بتایا جس کا ایڈریس مجھے اس حرافہ شریطہ نے ''ملاقات'' کے لیے دے رکھا تھا۔

ڈرائیور نے راستے میں خیریت پوچھی تھی، میں نے اسے سرسری بتا دیا کہ گھریلو معاملہ ہے۔

اس نے لگ بھگ آدھے گھنٹے میں مجھے مطلوبہ جگہ پر اتار دیا۔ میں نے اسے کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔

رات گہری ہونے لگی تھی۔ جگہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ یہ ایک ویران علاقہ تھا اور قدرے مضافاتی بھی۔ یہاں ارب قریب میں درخت، سڑک اور میدان کے کنارے کہیں کہیں چھوٹے بڑے مکانات نظر آ رہے تھے۔

جس مکان کے سامنے میں کھڑا تھا، یہی شریطہ کے دیے ہوئے پتے پر پورا اترتا تھا۔ میں نے پہلے تھوڑے فاصلے سے اس کا جائزہ لیا، وہ ایک گراؤنڈ ہاؤس تھا اور خاصا پرانا بھی۔ اس کے اردگرد درخت تھے اور دیگر چھوٹے بڑے چند مکانات دور بنے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں قریب میں گودام نما عمارتیں بھی دکھائی دیں۔ وہاں بھی گہرے سکوت اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے مکان کا غور سے جائزہ لیا اور اس کے دروازے پر مجھے کوئی تالا لگا نظر نہ آیا جس کا مطلب تھا کہ اندر مکین یا پھر شریطہ تھی (جس کی اندر موجودی کی مجھے امید نہ ہونے کے برابر تھی)۔

میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور پہلے گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لیا۔ عقبی سمت میں مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا، سوائے سپاٹ بوسیدہ دیوار کے۔

دروازے پر آ کر میں نے دستک دینے کے بجائے ہولے سے اسے اندر کی طرف دھکیلا...... اگلے ہی لمحے میں چونک پڑا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔

''کیا یہ بھی کوئی ''ٹریپ'' تھا؟'' میرے جھٹکے ہوئے

ذہن میں ابھرا۔

دھیمے قدموں سے دروازے کا ایک پٹ ذرا اندر دھکیل کر میں رکا اور جھانکا۔ تاریکی کے غالب عنصر میں مجھے مدھم سی روشنی کا شائبہ ہوا۔

تب میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ روشنی الٹے ہاتھ پر بنے ایک کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے آتی محسوس ہوئی۔ ابھی میں نے اس طرف ایک قدم اٹھایا ہی تھا کہ اچانک مجھے لگا جیسے میرے قریب اور عقب سے کوئی انسانی وجود متحرک ہوا ہو...... میں بدک کر پلٹا۔

ایک سائے کو میں نے دروازے کی جانب تیزی سے لپکتے ہوئے دیکھا اور میں بھی اس کی جانب دوڑا مگر تب تک وہ...... باہر نکل چکا تھا، نہ صرف یہ بلکہ اس نے باہر سے مکان کے دروازے کو بند بھی کر دیا۔ میرے قریب پہنچنے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کے دوران مجھے باہر دروازے پر ہی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی تالا لگا رہا ہو۔

''ہے، کون ہو تم؟ دروازہ کھولو......'' میں چیخا اور زور زور سے دروازے پر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مارنے لگا، مگر وہ اپنا کام کر کے رفو چکر ہو چکا تھا، کام اس کا محض اتنا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا۔

اس نے یقیناً یہاں اصل گل کچھ اور ہی کھلایا ہوگا۔

اس خیال نے ہی مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا اور میں دروازے کی جانب سے توجہ ہٹا کے اسی کمرے کی جانب پلٹ کر لپکا۔

''ٹریپ'' اندر ایک لاش کی صورت میں موجود تھا۔ ایک عام سے بیڈ پر کسی خاتون کی خون میں ڈوبی لاش پڑی تھی۔ اس کا پھٹی پھٹی آنکھوں والا حسین چہرہ کمرے کے اندر روشن بلب میں بڑا ڈراؤنا منظر پیش کر رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے اُسے پہچاننے میں مطلق دیر نہ لگی تھی۔ وہ شریطہ تھی۔ اس کا لباس بُری طرح مسکا ہوا تھا۔ ایک خنجر اس کے سینے میں دستے تک پیوست تھا۔ وہیں سے خون کی موٹی دھار بہہ بہہ کر اسے نصف حد تک نہلائے ہوئے تھی۔

شریطہ کے مردہ چہرے پر حیرانی، بے بسی اور خوف کے تاثرات مرتے دم تک ثبت تھے۔ یوں جیسے اسے یقین ہی نہ ہو کہ اس کے ساتھ ایسا سفاکانہ ظلم بھی ہو سکتا تھا۔

پل کے پل میں سمجھ گیا کہ اس سے ''کام'' لینے والے نے اس غلامانہ زندگی کو ہی نہیں بلکہ اب اس کی لاش کو بھی ''کیش'' کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی وقت باہر مجھے پولیس سائرن کی آوازیں سنائی دیں۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر رمیش اگروال کے یہاں سے انڈیا دفان ہو جانے کے بعد بھلا یہاں میرا یا زوہریہ کا کون ایسا دشمن بچا تھا؟ جس نے یہ خطرناک جال بچھایا تھا۔ زوہریہ کا اغوا اور میرا یہ حال...... کرنے والا وہ کون تھا؟

مکان چھوٹا، تنگ اور ایک ہی کمرے کا تھا۔ میں بھلا کہاں جا سکتا تھا۔ پولیس نے باہر سے دروازے کا لاک توڑ کر مجھے برآمد کر لیا۔ میں نے خاموشی سے اپنی گرفتاری دے دی کہ اس کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مجھے گرفتار کرنے والے مقامی پولیس کے وردی پوش افراد تھے، ان میں ایک اپنی مخصوص وردی سے ان کا آفیسر معلوم ہوتا تھا، میں نے اس سے فقط اتنا ہی کہا تھا کہ میں بے قصور ہوں نیز یہ میرے خلاف ایک جال بچھایا گیا ہے، وہ میرے بارے میں مزید معلومات انٹرپول کے آفیسر اور سب آفیسر سے لے سکتے ہیں۔

میں نے انہیں انٹرپول آفیسر کیپٹن آرتھر گبنل اور پرکی کے نام بتا دیے، ساتھ ہی یعقوب ترمذی سے بھی اپنے مراسم کا بتایا۔

پولیس آفیسر ایک لمبا تڑنگا اور سیاہ رنگت کا خرانٹ آدمی معلوم ہوتا تھا، اس کے چہرے کے کرخت تاثرات اسے کسی کو خاطر میں نہ لانے والا شخص ظاہر کرتے تھے۔ اس کے چوڑے سینے پر لگے ریحان بصری کے ٹیگ کو میں نے ذہن نشین کر لیا تھا۔

اس نے حقارت آمیز طنزیہ نظروں سے میری جانب گھورتے ہوئے مجھے ہتھکڑیاں لگوا دی تھیں۔ میں شاید بُرا پھنسا تھا۔

مجھے نیلی اور سفید رنگ کی وین کے اندر سوار کرایا گیا، جس کی باڈی پر پولیس کا مخصوص مونوگرام چسپاں تھا۔

پولیس آفیسر ریحان بصری کا انداز مجھے مشینی محسوس ہوا۔ یوں جیسے کوئی روبوٹ ہو اور اس کے اندر کسی ماسٹر مائنڈ نے ایک پروگرام فیڈ کر دیا ہو اور بس وہ اسی پر عمل پیرا تھا۔

ایک بڑی سی عمارت کے پھاٹک سے وین اندر داخل ہوئی اور احاطے میں مرکزی دروازے کے سامنے رک گئی۔ مجھے نیچے اتارا گیا اور پھر دو اہلکار مجھے بازوؤں سے دبوچ کر

عمارت کے اندر لے چلے۔

ایک سلاخ دار مگر صاف ستھرے لاک اپ میں مجھے بند کر دیا گیا۔ اندر روشنی تھی۔ ایک دیوار گیر بینچ اور بیڈ تھا۔ ایک چھوٹے پارٹیشن کے عقب میں کموڈ تھا۔ میں بینچ پر بیٹھ گیا۔

آج مجھے احساس ہوا کہ رومی کا ساتھ میرے لیے کس قدر اہم ہوتا تھا، مجھے اس کا بھی ادراک ہونے لگا کہ طارق اور رومی کا مشورہ غلط نہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے میں یہاں سے پاکستان کوچ کر جاؤں۔ ان کے مشورے میں ایسا کیا تھا جس پر میں نے عمل کرنے سے تساہل بلکہ بے پروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

کیا میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ان خونی سوداگروں کا یہاں سے صفایا کرنے کے بعد میرا کوئی دشمن نہیں بچا تھا، کسی حد تک یہ بات بھی تھی، لیکن اصل وجہ میری وہ مایوسی تھی کہ میں ذہنی طور پر خود کو واپسی کے لیے تیار نہ کر سکا تھا۔ میرے بھائی عادل کے سفاک قاتل یہاں سے فرار ہو چکے تھے۔ اگرچہ طارق اور رومی بھی ان دونوں کی سرکوبی کے لیے جا چکے تھے، مگر مجھے تسلی نہیں ہو رہی تھی، ایک پیاس سی میرے سینے میں سوزاں تھی...... ایک انتقام کی پیاس...... جس طرح رمیش نے سفاکی، حقارت اور بے رحمانہ بغض کے ساتھ مجھے میرے بھائی کا حشر کرتے ہوئے یہ باور کروایا تھا کہ ”دیکھ لیا مجھ سے دشمنی کا انجام......“ تو میں بھی اسے یہ بتا دینے کی ازلی خواہش رکھے ہوئے تھا سینے میں کہ اسے بھی اس سے بڑھ کر بدترین انجام سے دوچار کر کے کہوں...... ”اب تم نے دیکھ لیا رمیش......! میرے معصوم بھائی کے ساتھ ظالمانہ حرکت کا بھیانک نتیجہ......“

بے شک طارق اور رومی انڈیا جا کے بھی رمیش کی سرکوبی کرتے، لیکن میرے اندر ایک تشنگی رہ جاتی۔ ایک پھانس ایک کسک...... رہتی کہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو میں اپنے ہاتھوں سے اس انجام سے دوچار نہ کر سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ گوہر شاہ بھی نامعلوم تھا، اب یہ ملعون بھی فرار ہو چکے تھے جبکہ میں ایک نامعلوم دشمن کی سازش کا شکار ہو چکا تھا۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھ سے پوچھ گچھ کے لیے مجھے بلایا جائے گا، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ البتہ ایک اہلکار نے آ کر سلاخ دار دروازے کے نیچے سے ٹرے کھسا دی اور خاموشی سے پلٹ گیا۔

میں نے اس سے بات کرنا چاہی مگر وہ پلٹ کر جا چکا تھا۔ اس کی بیلٹ میں ڈنڈا لگا ہوا تھا۔

میں نے ٹرے کی طرف دیکھا مگر اسے اٹھایا نہیں، واپس آ کر بینچ پر آ بیٹھا۔

بیڈ پر لحاف رکھا تھا۔ مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ میں بیڈ پر آ گیا اور لحاف اوڑھ کر بیٹھ گیا۔

میرا ابھی تک کوئی بلاوا نہیں آیا تھا۔ راہداری سنسان تھی۔ کچھ بتیاں بجھنے لگیں، چند ایک جلتی رہیں۔

میں سخت بے چینی اور بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ فکر و تشویش اپنی جگہ تھی۔ شریطہ کا قتل کیا گیا تھا جس کا الزام ایک سوچی سمجھی سازش یا منصوبہ بندی کے تحت میرے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دیارِ غیر میں ایسی نازک اور حساس صورتِ حالات کا شکار ہونا کم خطرناک بات نہ تھی۔

رات سرکتی گئی۔ کوئی بلاوا نہیں آیا۔ بالآخر میں سو گیا۔

اگلے دن جاگا تو مجھے دو پولیس اہلکار اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں پہنچے، جہاں وہی رات والا خرانٹ آفیسر موجود تھا۔ اس کے ہمراہ ایک اور پولیس آفیسر بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور غیر وردی کا شخص کھڑا نظر آیا جس کی تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے جسم پر عام سا مگر صاف ستھرا لباس تھا۔ دو اہلکار بھی وہاں موجود تھے۔ کچھ گمبھیر تا سا ماحول تھا۔

میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ کر ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ اسٹیل کی ایک کرسی پر مجھے اسی طرح بٹھا دیا گیا۔

وہ تینوں چند لمحے مجھے گھورتے رہے، پھر ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں جمائیں، سر کی جنبش ہوئی اور پھر وہی پہلا والا آفیسر چند قدم میری جانب بڑھا اور قریب آ کر بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”سیف...... ڈاکٹر سیف۔“ میں نے بتایا۔

”اوہو......!“ اس کے بجائے دوسرے آفیسر کے منہ سے برآمد ہوا، پھر وہی مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

”کیا تم وہی پاکستانی ڈاکٹر ہو جس نے ابھی کچھ ہی دن پہلے......“ اس نے وہی دہرایا جو میں رومی کے ساتھ ایک مقامی اسپتال میں سرجن امرناگ اور ڈاکٹر رمیش اگروال کا بھانڈا پھوڑ چکا تھا۔

”یقیناً میں وہی ہوں اور میں گزارش کروں گا کہ

انٹرپول کے آفیسر آئزک بیل اور انسپکٹر پریٹی سے میرے رابطے کا بندوبست کیا جائے۔'' میں نے اس سے استدعا کی۔ اس پر آفیسر ریحان بصری برہمی سے بولا۔

''خاموش رہو اور ہم پر حکم چلانے کی کوشش مت کرو۔ مت بھولو کہ تم ایک سنگین جرم میں گرفتار کیے گئے ہو۔''

''یہ میرے خلاف سازش ہے آفیسر!'' میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم آخر کن لوگوں کو سپورٹ کرنا چاہتے ہو؟'' برملا میں نے یہ بھی کہہ ڈالا۔

میری بات سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، مگر اس کے ساتھ کھڑے آفیسر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے روک دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

''ہم تمہارا رابطہ ان مذکورہ افراد سے کروا دیں گے لیکن تم اپنے جرم سے انکاری ہو تو گزشتہ شب ایک اجنبی اور ویران جگہ پر کیا کرنے گئے تھے؟''

''مجھے ابھی تک صفائی کا موقع ہی نہیں دیا گیا، ورنہ میں بتا چکا ہوتا، آپ مجھے بھلے مانس آفیسر لگتے ہیں۔ میں آپ کو ساری بات بتا دیتا ہوں، کیونکہ اس دن ایک نہیں دو وارداتیں ہوئی ہیں اور ایک قتل نہیں بلکہ دو قتل اور ایک اغوا ہوا ہے۔''

کہتے ہوئے میں نے اسے سب بڑی صراحت سے بتا دیا۔

''بکواس کر رہا ہے یہ......'' اس بار پہلی مرتبہ وہ سادہ لباس والا آدمی میری طرف دیکھ کر غصے سے بولا۔ وہ مجھے بڑی نفرت انگیز نظروں سے گھورتا رہا تھا۔

میری اب تک کی تفصیل پر وہ ایک دم جیسے پھٹ پڑا اور بدستور میری طرف اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بولا۔

''اس شخص نے میری بیوی شریطہ کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی تھی، انکار کی صورت میں، اس نے اسے ہراساں کیا اور جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی، مجھے شریطہ نے خود رو رو کر بتایا تھا۔''

مجھے اس شخص کے اس سفید جھوٹ پر بری طرح طیش آ گیا۔ میں اسی لہجے میں اسے گھور کر بولا۔ ''اب تم بکواس کر رہے ہو وہ بھی سفید جھوٹ......''

''تمہاری اس بات کا ثبوت کیا ہے؟'' دوسرے آفیسر نے مجھ سے گھور کر پوچھا۔

''یعقوب ترمذی سے رابطہ کر لو جہاں شریطہ ملازمت کرتی تھی۔ اُدھر ہی ان کے پرانے ملازم حماد کا قتل اور ان کی بیٹی زدہریہ کا اغوا ہوا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ واردات بھی تمہاری ہو سکتی ہے۔'' ریحان بصری نے طنزیہ لہجے میں لقمہ دیا۔

''اچھا!'' میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔ ''گویا میں کوئی طلسماتی انسان ہوں اور بیک وقت دونوں جگہوں پر مجھ اکیلے آدمی نے اتنی خطرناک اور سنگین وارداتیں کر ڈالیں، کچھ عقل کی تو بات کرو آفیسر ریحان بصری صاحب!''

میرے جوابی وار نے اُس کا چہرہ سرخ کر ڈالا۔ میرا مقصد اسے غصہ دلانا نہیں تھا مگر میں ایسی خرافاتی گفتگو سے پہلو تہی بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خاموشی سے سن لیتا۔

دوسرے آفیسر نے پھر مداخلت کی۔ ''ٹھیک ہے، تم ہمیں یعقوب ترمذی کا پتا دو۔''

''یہ ان میں اہم اور سب سے پہلے کرنے والا کام تھا جو اَب پوری رات گزارنے کے بعد کیا جا رہا ہے، تو یہ بھی صد شکر، پتا نوٹ کریں۔'' طنزیہ انداز میں یہ کہتے ہوئے میں نے ریحان کی جانب بھی دیکھ لیا تھا اور دوسرے آفیسر کو یعقوب ترمذی کا پتا نوٹ کروا دیا۔

''ریحان! تم اسی وقت پولیس ٹیم لے کر اس پتے پر پہنچو۔'' دوسرے والے آفیسر نے ریحان سے مخاطب ہو کے کہا۔ ''اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو وہاں رپورٹ ہوگی۔ وہاں پہنچ کر حالات وہی ہوئے جیسا کہ ڈاکٹر سیف نے بتایا ہے تو مجھے فون کرنا۔ میں بھی اسے وہاں لے کر پہنچ جاؤں گا۔''

اس دوسرے آفیسر کی بات ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی مجھے معقول لگا تھا، مجھے ابھی تک اس کا نام نہیں معلوم ہو سکا تھا، اس کے سینے پر ایسا کوئی ٹیگ بھی نہیں چسپاں تھا تاہم بعد میں اس نے اپنا نام مجھے مسعود خسر زادہ بتایا۔ وہ اس کا معاون آفیسر تھا، یہاں پولیس کی یہی ریت تھی کہ کسی کیس کی تفتیش میں ایک معاون آفیسر کورٹ کی طرف سے یہاں از خود نازل ہو جاتا تھا، یہ ایک اچھا عمل تھا۔ اس طرح کسی ایک پولیس آفیسر کی ''اجارہ داری'' نہیں رہتی تھی اور انصاف کی امید بن جاتی تھی۔

میں ایک بار پھر لاک اَپ میں تھا۔ کھانے کو مجھے پنیر، بریڈ اور سوپ دیا گیا۔ وہ میں نے زہر مار کیا۔ شریطہ کا دعوے دار شوہر زمان رشید معلوم ہوا۔

دوپہر میں جا کر دو پولیس اہلکاروں نے میرے ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑیاں باندھ کر مجھے لاک اَپ سے

نکالا۔

میں سمجھا تھا وہ مجھے کسی کمرے میں لے کر جائیں گے، مگر وہ مجھے سیدھا عمارت سے ہی باہر لے آئے۔

یہاں ایک پولیس کار کھڑی تھی۔ اس کے اندر معاون کار آفیسر مسعود موجود تھا۔ یہ ڈرائیور کے برابر والی نشست تھی اور وہ بھی موجود تھا۔ کار اسٹارٹ تھی۔ مجھے لانے والے وہی دو پولیس مین مجھ سمیت کار کی عقبی نشست پر سوار ہو گئے۔

کار روانہ ہوگئی۔ میں سمجھ گیا کہ ہماری منزل یعقوب ترمذی کی رہائش گاہ ہے اور جیسا کہ اس نے پہلے آفیسر ریحان کو ہدایات کی تھی، اس پر عمل کیا گیا تھا۔

میرے دل میں تجسس جاگا کہ وہاں پہنچنے تک میں...... مسعود سے پوچھوں، لیکن اس نے بھی کوئی بات نہ کی۔ میں نے بھی کوئی سوال نہ کیا، کیونکہ مجھے معلوم تھا بھلا اس سے کیا مختلف بات ہوسکتی تھی جیسا کہ میں نے بیان کی تھی۔

یہ میرا خوامخواہ کا تجسس تھا، نجانے کیا بات تھی کہ پھر بھی میرا دل نامعلوم خدشات اور بے چینیوں کا شکار رہا۔ یوں جیسے کوئی انہونی سی ہونے والی ہو۔ کچھ ایسا کہ اس کی توقع ہی نہ ہو۔

میں نے اسے اپنا محض واہمہ قرار دیا اور خاموشی اور صبر سے منزل پر پہنچنے کا منتظر رہا۔

نصف گھنٹے بعد ہم یعقوب ترمذی کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے، حسب توقع وہاں پولیس وین کھڑی تھی اور شاید باقی لوگ ریحان سمیت اندر تھے۔

ایک پولیس مین وہاں ہماری رہنمائی کے لیے موجود تھا۔ ہم بھی کار سے اتر کر اس کی رہنمائی میں گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھے حیرت سی ہوئی، کیونکہ جیسی افراتفری اور گہما گہمی کی میں توقع رکھے ہوئے تھا، ایسا کچھ بھی نہیں نظر آرہا تھا۔ بہرکیف...... ہم اندر ایک نشست گاہ میں پہنچے تو وہاں ریحان، چند پولیس مین اور یعقوب ترمذی سبھی آرام دہ صوفوں پر موجود تھے اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یعقوب ترمذی بالکل نارمل کیفیت میں بیٹھا تھا، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دوسرا حیرت کا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب اس نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور منہ پھیر لیا کہ جیسے مجھے جانتا ہی نہ ہو۔

چلو مجھے نہ جانتا ہو لیکن اس کی بیٹی اغوا ہو چکی تھی اور وہ پھر بھی یوں مطمئن اور لاتعلق اور بے پروا سا نظر آرہا تھا۔ کیوں؟

میرے اندر کھد بد ہونے لگی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں مجھے ایک دور رکھی کرسی پر بٹھا دیا گیا اور وہاں ایک پولیس مین کھڑا ہوگیا۔

''اسے جانتے ہیں آپ؟'' ریحان نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے یعقوب ترمذی سے پوچھا۔ اس نے میری طرف دوبارہ نظر ڈالی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تو آج اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں تو شناسائی کا کیسا سوال؟''

میرا دماغ اس کے جواب پر بھک سے اُڑ گیا۔ یکلخت مجھے لگا جیسے وہاں ایک زہریلا جال بچھا دیا گیا ہے اور مجھے اس میں یہ لوگ لپیٹنے والے ہیں۔ اس کے بعد میری بھیانک موت دور نہیں تھی۔ اس جاں گسل اور بھیانک تصور نے ہی مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

یعقوب جیسے آدمی کا مجھے پہچاننے سے انکار کرنے کا اور کیا مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ درون خانہ اس سنسنی خیز سازش میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں خاموش رہا، اپنے اندر کے غبار پر قابو پاتا رہا۔ اپنے شل ہوتے اعصاب کو تھپک تھپک کر پُرسکون کرتا رہا کہ جب انسان کسی ایسے اَن دیکھے اور خطرناک جال میں پھنسا دیا جائے تو اسے سوائے اللہ کی مدد کے اور کوئی نہیں نکال سکتا، گویا میں نے خود کو تن بہ تقدیر کر دیا، شور اور واویلا کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔

''مگر اس کا کہنا ہے کہ......'' اس بار مسعود نے اس سے کہا اور وہ سب مختصر الفاظ میں گوش گزار کر ڈالا جو میرے اور اس کے اور اس کی بیٹی زوہریہ کے حوالے سے بنتا تھا۔

''یہ سراسر جھوٹ بولتا ہے۔'' یعقوب نے گویا پھر میرے اعصاب پر ضرب کاری لگائی۔ میں نے سنبھالا لیا اور خود کو پُرسکون کرتے ہوئے ایک نظر یعقوب ترمذی پر ڈالتے ہوئے مسعود سے کہا۔

''جھوٹ سچ کیا ہے، اس کا پتا تو تب ہی چلے گا جب ان کی اغوا شدہ بیٹی زوہریہ سامنے ہوگی۔ وہ کہاں ہے؟'' میرے تئیں یہ ایک کاری وار تھا لیکن سازش کرنے والے اس کا بھی ''بندوبست'' کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس پر یعقوب نے کہا۔

''وہ اغوا ہی کب ہوئی ہے؟ گزشتہ دنوں کے واقعے

pklibrary.com

کے بعد میں نے اسے اپنی کسی رشتے دار کے ہاں بھیج دیا ہے۔ تاکہ اس کے ذہن سے اس تلخ اور منحوس واقعے کی یاد نکل جائے۔''

''چلیں، اس سے فون پر بات ہی کروا دیں ہم سے......'' میں نے کہا۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔'' یعقوب ڈھٹائی سے بولا۔ ''میں اپنی بیٹی کو بار بار تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے خود کو سنبھالا ہے، وہ پردیس میں ہے، اس طرح کے سوالات سے وہ دوبارہ تشویش زدہ اور پریشان ہو جائے گی، جبکہ ڈاکٹرز نے اسے مزید فکر و تشویش سے دور رکھنے کی ہدایات کی ہیں۔'' ترمذی نے بڑی مکاری سے کہا۔ بلاشبہ اس کا جواب جچا تلا ثابت ہو رہا تھا۔ ایک مضبوط جواز کے ساتھ۔ میں بالآخر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

مسعود خسر زادہ نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ فرسٹ آفیسر ریحان کے چہرے پر فتح مندی مترشح تھی۔ ترمذی کے چہرے سے بھی ایک بوجھ اترتا تاثر عیاں تھا۔

''میرا خیال ہے تم نے بہت وقت دے دیا۔'' وہ پھر بولا۔ ''خود میں بھی بیمار رہتا ہوں۔ ان کی اپنی کوئی دشمنیاں ہیں، میں اور میری بیٹی ان سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ میرے اب آرام کرنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔''

''حماد کی لاش میں نے دیکھی تھی۔'' میں نے آخری بار ثابت کرنے کی سعی چاہی تھی۔

''خواب میں دیکھی ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے یعقوب ترمذی غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور...... اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''چلیں مسٹر مسعود؟'' ریحان نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' میں نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''زوہریہ کے بعد ان کے ملازم کی اچانک غیر موجودگی ایک ٹھوس ثبوت بن سکتا ہے۔ وہ تو کترا کے نکل گیا۔''

''واپس چلو۔'' مسعود نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا اور میں نے ریحان بصری کے چہرے سے طمانیت چھلکتی ہوئی محسوس کی۔

ناچار میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ بہت سی باتیں از خود ہی سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ پر زور ڈال کر سوچنا پڑ رہا تھا۔

سردست سازش کے اس ان دیکھے جال، جس میں ایک طرف مجھے قانون کے پھندے میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی تو دوسری جانب یہاں کوئی دشمن کی باقیات میں چھپا ہوا ڈبل چال سے زوہریہ کا پتا بھی صاف کرنا چاہتا تھا۔

میں ایک بار پھر پولیس اسٹیشن میں تھا۔ لیکن ابھی لاک اپ کے بجائے، ایک سیل روم میں بچھی کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ درمیان میں میز تھی اور سامنے ایک اور خالی کرسی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ مسعود خسر زادہ آ گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے تاثرات تھے، جو ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس کیس کو حل کرنے کے لیے اپنے دل میں مخلصانہ عزم رکھتا ہے۔ سازشوں کے بہر ظلمات میں وہ ایک روشنی کا واچ ٹاور ہی تھا۔

وہ میرے سامنے والی کرسی پر خاموشی سے آ کر براجمان ہو گیا۔

''اب کیا کہتے ہو؟'' اس نے بولے سے کہا۔

''صاف ظاہر ہے، زوہریہ کو اغوا کرنے کے بعد انھوں نے اس کے باپ یعقوب ترمذی کو ڈرا دھمکا کر بیان دینے پر مجبور کر دیا تاکہ میرے گلے میں قانون کا پھندا مزید کس دیا جائے، لیکن ترمذی اب بھی نہیں جانتا کہ دشمن کس قدر سفاک ہیں، کام نکل جانے کے بعد وہ اس کی بیٹی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

اب تک جو تجزیہ کر سکا تھا، وہ میں نے مسعود کے گوش گزار کر دیا۔

''اتنے یقین سے تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو؟'' مسعود سوچتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولا۔

''جس نے اپنی کھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھا ہو...... اس کے لیے یہ سب کہنا بہت آسان ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''شریطہ کا قتل بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، جس کا قتل مجھ پر تھوپا جا رہا ہے۔ آپ پہلے وہاں تفتیش کریں، مجھے یقین ہے کہ میرا ایسا کوئی ثبوت وہاں موجود نہیں ہوگا، ماسوائے میری وہاں موجودگی کے، جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ میں نے ہی یہ قتل کیا ہے۔''

''اوہو...... اس سے تو واقعی نہ صرف بہت کچھ ثابت ہو جائے گا بلکہ...... تمہاری یہ بات بھی وزن دار کہلائے گی

جو ابھی تم نے مجھ سے کہی۔'' میری تجویز پر مسعود ایک دم پُرامید اور جوشیلا نظر آنے لگا۔

''پلیز، آفیسر! یہ ساری تفتیش آپ اپنی نظروں کے سامنے کروائیں اور ساتھ ہی ریحان پر بھی نظر رکھیں بلکہ ہو سکے تو یعقوب ترمذی کی فون کالز بھی خفیہ طور پر ٹریس کروائیں، چھپا ہوا دشمن اور قاتل ظاہر ہو جائے گا۔''

''میں ایسا ہی کرنے والا ہوں۔'' وہ جوش سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک بات اور......'' میں نے کہا۔ وہ رک گیا۔

''ایک احسان مجھ پر کریں۔ انٹرپول کے آفیسر آئزک بیل اور اس کی اسسٹنٹ مس پرینی کو ان تازہ حالات کی جان کاری دیں، مجھ سے ان کی ملاقات کی راہ ہموار کروائیں، ان سے مل کر آپ کو اور بھی بہت کچھ کہنے اور سننے کا موقع ملے گا۔''

میں نے مذکورہ دونوں انٹرپول افسران کے بارے میں اسے آگاہ کر دیا۔ آخری میری درخواست مسعود خسرزادہ سے یہ تھی کہ وہ یہاں میری سیکیورٹی کا بھی خفیہ بندوبست کر رکھے۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر کو جنبش دی تھی۔ میں مطمئن تھا کہ اس بھلے انسان آفیسر پر میں بہت کچھ ''باور'' کروانے میں کامیاب رہا ہوں۔

کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں، نہ پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔ اگر یہاں ابومعد جیسے بے ضمیر پولیس آفیسر تھے تو خالد جیسے بھی فرض شناس موجود تھے، جو فرض پر قربان ہوا، یہ عین اسی طرح، یہاں ابومعد جیسے ضمیر فروش کا سیاہ کردار اگر ریحان ادا کر رہا تھا تو خالد جیسے شہید پولیس آفیسر کا کردار ادا کرنے کے لیے مسعود خسرزادہ بھی یہاں موجود تھا۔

ہر مشکل میں آسانی کی راہ ہوتی ہے۔ صبر، استقامت اور اللہ پر بھروسا، اس چھپی راہ کو تلاش لیتا ہے۔

وہ دن ابھی بیت رہا تھا، جب سیکنڈ تفتیشی آفیسر مسعود پُرعزم ہو کے مجھ سے سیل میں تنہا ملاقات کے بعد رخصت ہوا تھا۔ مجھے لاک اپ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہاں میں اکیلا تھا۔

اندیشوں اور وسوسوں بھری یہ شب جیسے بھاری سل کی طرح سرک رہی تھی۔ رات کا کھانا مجھے دیا گیا۔ وہ میں نے نہیں کھایا۔ بھوکا ہی رہنا مناسب سمجھا۔ آخر کو معدے کی بھی ''ورزش'' ہونی چاہیے۔ یہ قول پرانے حکماء کے ایک دن کا روزہ جسم کو ہی نہیں دماغ کو بھی تر و تازہ رکھتا ہے اور بہت سی چھپی ہوئی بیماریوں سے بچاتا ہے۔

یہیں میں نے محسوس کیا کہ ایک پولیس اہلکار جو کھانے کی ٹرے لایا تھا، کئی بار آ کر مجھے دیکھ گیا تھا اور تیسری بار اس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میں نے ابھی تک کھانا کیوں نہیں کھایا؟ میں نے صاف جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ ''کھالوں گا تھوڑی دیر میں۔'' جیسا جواب دے کر اسے مزید کریدنے کی کوشش میں تھا۔ آخر اسے کیوں فکر لاحق ہے؟

جب چوتھی بار وہ تسلی کرنے کی غرض سے آیا تو میں جھوٹ موٹ سوتا بن گیا، مگر ایک آنکھ کی جھری بنا کر کروٹ کے بل لیٹا سلاخوں کے پار اس کی مشکوک حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔

وہ کبھی گردن اونچی کر کے اندر دیکھتا، جہاں کھانے کی ٹرے جہاں کی تہاں پڑی تھی پھر میری طرف دیکھتا، پھر اپنے ہونٹ بھینچنے لگتا، ذرا دیر کھڑا رہا پھر واپس لوٹ گیا۔

یوں مجھے آج ''کچھ ہونے والا'' جیسا ماحول محسوس ہو رہا تھا کیا......؟ اس کا اندازہ تو تھا مگر پوری جان کاری نہیں تھی۔

☆☆☆

اندیشوں بھری یہ رات ابھی اپنے آخری دموں پر تھی۔ میں سوتا بنا ہوا تھا، اب کھانے کی ٹرے وہاں خالی پڑی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق وہ اہلکار دوبارہ ایک نیم تاریک گوشے سے نمودار ہوا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھے سوتا دیکھا اور پھر جھکا، خالی ٹرے دیکھ کر اس نے اٹھالی اور چند ثانیہ مجھے پھر دیکھتے رہنے کے بعد چلا گیا۔

کھانا میں نے نہیں کھایا تھا۔ میں نے اسے جُل دیا تھا، کھانا ایک موٹا بند، مکھن، پنیر اور انڈوں کا خاگینہ قسم کا تھا، وہ میں نے ایک شاپر میں ڈال کر چھپا دیا تھا۔ یوں میں اس پر یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔

ذرا ہی دیر بعد وہ پھر نمودار ہوا۔ میں اس کی پُراسرار حرکات و سکنات دیکھنے کے لیے سلاخ دار دروازے کے رخ پر ہی کروٹ لیے سوتا بنا ہوا تھا۔

دفعتاً ہلکی کھٹ پٹ کی آواز میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی۔ میں محتاط ہو گیا۔ وہ نہایت آہستگی اور چوروں

کے سے انداز میں لاک کھول رہا تھا، اس کے بعد اندر آ گیا۔

میں نے اداکاری شروع کر دی اور ہولے ہولے پیٹ پکڑ کر کراہنے لگا۔ یوں جیسے مجھے نیند میں ہی تکلیف کا احساس ہوا ہو۔

وہ میرے بیڈ کے قریب آ گیا اور جھک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنا پیٹ میں نے بدستور پکڑے رکھا تھا اور بیٹھے بیٹھے جھکا ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، کھانا کھا کر ایسا ہوا ہے۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی سر اٹھا کر اس چہرے کو بھی بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھا، وہاں مجھے کچھ اُلجھن کے تاثرات محسوس ہوئے تھے، یوں جیسے وہ دل میں کہہ رہا ہو کہ ابھی تک یہ زندہ کیوں ہے؟

''کھانے میں کچھ نہیں تھا، تمہاری پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، دیر سے کیوں کھانا کھایا تم نے؟'' اس نے کہا۔ ''سو جاؤ، آرام آ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ نکل گیا۔

میں ایسے ہی بیٹھا رہا، پھر دوبارہ اسی کروٹ پر سو گیا۔ اب میرا شبہ یقین کی حد تک پختہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس نے رات کے کھانے میں زہر دیا ہو گا، مجھے سوتا دیکھ کر وہ تصدیق کے لیے اندر آیا تھا۔ مجھے کراہتے پا کر وہ اُلجھا ضرور تھا... پھر یہ سوچ کر تھوڑی دیر بعد ''نتیجہ'' ظاہر ہو جائے گا، وہ چلا گیا۔

اب میں نے دوسری چال چلی اور ساکت ہو گیا۔ عین توقع کے مطابق وہ پھر نمودار ہوا۔ میں نے بھی اسے اچھی ''مشکل'' میں ڈال رکھا تھا۔ مجھے بے حس و حرکت پا کے اس نے پھر لاک اَپ کھولا اور اندر آ گیا۔ مجھ پر جھکا، میرے سینے پر ہاتھ رکھا، پھر گردن کی شہ رگ دیکھنے لگا۔ میں اپنی ایک آنکھ کی باریک درز بنائے اس کی مشکوک حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

وہ پھر مجھے اُلجھا ہوا دکھائی دینے لگا، اگر تو کسی سازش کے تحت (جس کا مجھے یقین تھا) اس نے مجھے رات کے کھانے میں کچھ ملا کے دیا تھا تو وہ یقیناً اب تسلی کرنا چاہتا تھا مگر میری سانسیں چلتی پا کر اسے اُلجھن ہوئی تھی، تب اس نے مجھے جھنجوڑا، مجھے جگانے کی کوشش چاہی۔

میں منصوبے کے مطابق ایسے ہی پڑا رہا۔ حتیٰ کہ اس رذیل نے مجھے اس قدر زور سے ہلایا، جس میں یقیناً اس کی جھلاہٹ کا بھی دخل تھا۔ میں بیڈ سے نیچے فرش پر آن گرا، جاگ کے پھر بھی نہیں دیا تھا۔ اسی طرح بے ہوش اور بے سدھ رہنے کی ایکٹنگ کرتا رہا۔

اس سازشی اہلکار کا دماغ ضرور گھوم گیا ہو گا، تب ہی میں نے ایک رخ سے اسے اپنی آنکھ کی جھری بنا کے دیکھا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اس نے جیب سے فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا اور پھر کان سے لگاتے ہوئے ہولے سے بولا۔

''سر! یہ پتا نہیں کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا ہے۔ مر کر ہی نہیں دے رہا۔ جی ہاں! میں نے تو زہر کی اچھی خاصی مقدار اس کے کھانے میں ملا دی تھی سر...... وہ...... جی؟...... شیور سر! میں نے خود اس کے کھانے میں زہر ملایا تھا، کھانا اس نے دیر سے ہی کھایا تھا، مگر مجھے یقین ہے اس نے کھا لیا ہو گا کیونکہ ٹرے میں نے خود آ کر دیکھی تھی، وہ خالی تھی۔ اب یہ بے ہوش ہو گیا ہے، مگر اس کم بخت کی سانسیں ابھی تک چل رہی ہیں۔ جی سر؟ کیا کہا؟ او...... تو سر! یہ خطرناک ہو گا، میں اس کا لاک اَپ میں گلا کیسے دبا سکتا ہوں......؟ جی......؟ اچھا...... میرا بھی یہی خیال تھا کہ بعض لوگ سخت جان ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے صبح تک اس کی جان نکل جائے، ابھی بھی اس کی حالت بس مرنے کے قریب ہی لگ رہی ہے مجھے...... او کے سر!''

یہ ساری باتیں کر کے وہ چلا گیا۔ میں اسی طرح فرش پر پڑا رہا۔ میری چال کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ میں نے بروقت حاضر دماغی سے ایک خطرناک اور جان لیوا سچویشن پر فی الحال قابو پا لیا تھا۔ اگر میں شور مچاتا یا واویلا کرتا تو صورتِ حال میرے لیے ہی مہلک ثابت ہو سکتی تھی اور میں تاریک راہوں میں مارا جاتا۔

میں ساری رات اسی وجہ سے نہیں سویا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ صبح پھر آئے گا اور آیا بھی...... اس بار بھی میں نے خود پر مصنوعی بے ہوشی طاری رکھی تھی، اگرچہ رت جگے کے بعد واقعی مجھ پر بے ہوشی جیسی نیند کا غلبہ تھا۔

وہ نابکار اہلکار اندر آیا اور ایک بار پھر مجھے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ دل میں تو ضرور اس نے کہا ہو گا کہ 'کیسا ڈھیٹ ہے کم بخت کی ابھی تک سانسیں چل رہی ہیں۔'

اس نے پھر مجھے جگانے کی کوشش چاہی۔ اس بار میں نے آنکھیں کھول دیں اور یوں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کوئی مردہ ایک دم زندہ ہو گیا ہو، کچھ ایسا ہی انداز میرا تھا ایک لمحے کو تو وہ اہلکار بھی ڈر کے مجھ سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

pklibrary.com

''آر یو او کے......؟'' اس نے بے اختیار میری طرف دیکھ کر قدرے بوکھلا کر پوچھا۔
''ایک دم او کے......'' میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بنا کر اسے دکھایا۔ ''البتہ رات کا کھانا کھا کے میرے پیٹ میں مروڑ ضرور اٹھے تھے لیکن...... پھر شاید میرے معدے نے وہ کھانا ہضم کر لیا۔ کیا باسی کھانا دیا گیا تھا مجھے......؟'' میں نے آخر میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ جیسے جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔
''یہ کیا بکواس؟ ہم بھلا قیدیوں کو کیوں باسی کھانا دیں گے؟''
''ہاں! یہ بات بھی صحیح ہے۔'' میں نے کہا پھر ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''تو پھر تم رات میں کئی بار یہاں آکر میرا معائنہ کیوں کرتے رہے تھے؟''
میری اس بات نے اسے بدکا دیا۔ اس نے ایک بار چوروں کی طرح سلاخ دار بیرک سے باہر سنسان راہداری کی جانب دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی اور سوپیر سوپ پھیرنے لگے تھے۔ سپاہی اور [illegible] بھی آنے لگی تھیں۔
مجھے اس کی یہ حرکت بھی مشکوک محسوس ہوئی۔ [illegible] کے مجھے کسی متوقع خطرے کا احساس ہوا اور میں [illegible] گیا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ یہ ابھی میرا قصہ پاک کر ڈالتا۔ میں [illegible] زیادہ ہی بڑبولا ثابت ہوا تھا۔
''اچھا ٹھہرو، میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آتا ہوں۔'' اچانک اس نے یوں کہا جیسے اس کے ذہن میں کوئی جارحانہ خیال آتے آتے پلٹ گیا ہو۔ وہ اب پھر سے وہی داؤ آزمانے کے چکروں میں تھا۔
''ضرور، مجھے بہت بھوک لگی ہے، کل تو سارا کھانا قے میں ہی نکل گیا تھا۔'' میں نے اسے پھر چڑایا۔ ''تم بہت اچھے ہو، تمہارا شکریہ۔ میں یہاں سے باہر جا کر جیل مینوئل کی بہت تعریفیں کروں گا۔''
''ہم......'' وہ میری بات سن کر ایک گہری ہمکاری خارج کرتا مسکراتا ہوا چلا گیا۔
تھوڑی دیر گزری، وہ دوبارہ آگیا، اس بار اس کے ہاتھ میں ناشتے کی پلیٹ تھی۔ وہ اس نے باقاعدہ اندر آکر میرے ہاتھ میں تھما دی، کہاں تو وہ باہر ہی سے نیچے کھسکا کر چلا بنتا تھا اور اسے پروا بھی نہیں ہوتی کہ میں اسے چکھوں یا نہیں۔ مگر اب ''بات'' اور تھی۔
''چلو، شروع ہو جاؤ۔'' اس نے یوں حکم دیا جیسے مجھے زبردستی کھلا کر چھوڑے گا۔
''میں نے منہ ہاتھ نہیں دھویا اور کموڈ پر بھی جانا ہے ابھی......'' میں نے اس کے ٹلنے کا بہانہ بناتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تم جاؤ، میں کرلوں گا ناشتا۔''
وہ چند ثانیے ہونٹ بھینچے پُرسوچ انداز میں مجھے گھورتا رہا۔ پھر پلٹ گیا۔
میں نے اس کی غیر موجودگی کی تسلی کی اور اس ناشتے کو بھی شاپر میں ڈال کر کونے میں رکھ دیا۔
تھوڑی دیر گزری، وہ دوبارہ آگیا۔ میں اس وقت بیرک کے اندر اسے تپانے کے لیے ورزش کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر پہلے تو زلزلے کے سے آثار ابھرے پھر نزلے کے...... اس کے بعد ممکن تھا کہ کرونا کی بھی کچھ علامتیں وہ ظاہر کرتا، دانت پیس کر اس نے بیرک کا دروازہ کھولا اور جیب سے دودھاری چاقو نکال لیا۔
''باپ رے...... ی ی...... یہ کیا ہے؟'' میں نے آنکھیں پھیلا کر خوف زدہ ہو کر پوچھا۔
''یہ چاقو ہے، اندھے ہو۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔
''زہر نے کام نہیں کیا تو کیا ہوا، یہ تو ضرور کام کرے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف بڑھا۔ میرے ہونٹوں [illegible] اسے دلیر بنا ہی دیا تھا، ساتھ ہی بے پروا بھی بنا دیا۔
تب ہی میں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، پھرتی کے ساتھ جھکائی دی اور اس کے چاقو والے ہاتھ پر اپنی کھڑی ہتھیلی کا وار کیا، یہ داؤ میں نے رومی سے سیکھا تھا جو وہ اکثر اس مختصر سے الیے میں فوراً ہی بروئے کار لایا کرتی تھی۔
چاقو اس کے ہاتھ سے نکلا، وہ تھوڑا جھکا، میری دائیں ٹانگ کا گھٹنا حرکت میں آیا اور اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ اس کے دانتوں تلے شاید زبان آگئی اور وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کے مانند خرخرانے لگا، جیسے ہی اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی کئی پولیس والے دوڑتے ہوئے وہاں آگئے۔
انہوں نے کرنٹ دینے والے ڈنڈے اٹھا رکھے تھے۔ پستولیں البتہ ان کے ہولسٹرز سے جھول رہی تھی جو بیلٹ سے منسلک تھیں۔
''خبردار! ہاتھ اٹھا کر دیوار سے لگ جاؤ۔'' ایک نے درشت آواز میں کہا۔
''یہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے احتجاج کیا۔ تاہم ان کا حکم ماننے میں بھی چنداں دیر نہیں لگائی۔ کیونکہ مجھے پستول سے زیادہ کرنٹ والے اس ڈنڈے سے ڈر لگتا

تھا۔ کہیں وہ مجھ پر آزما ہی نہ ڈالتے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔

وہ اندر آگئے اور مجھے قابو میں کر لیا۔ چاقو کو کسی رومال میں لپیٹ کر قبضے میں کر لیا۔

''اس پر تمہیں اس اہلکار کے ہاتھوں کے نشانات مل جائیں گے۔'' میں نے احتجاج جاری رکھا۔ وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔

''جھوٹ بول رہا ہے یہ......'' میری جان کے بیری پولیسیے نے اپنے ساتھی اہلکاروں سے کہا۔ ''اس نے مجھے بہانے سے اندر بلایا اور چھپے ہوئے خنجر سے مجھ پر وار کیا۔''

اس کے سفید جھوٹ پر مجھے بالکل بھی غصہ نہیں آیا اور طنز سے بولا۔ ''میرے پاس چاقو آیا کہاں سے؟ میری تو ہر روز جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔''

معاملہ یہ اس طرح نمٹا کہ مجھے زدوکوب کرنے کے بعد ایک کمرے میں لے جایا گیا، جہاں وہی بدذات آفیسر ریحان موجود تھا۔ وہ جان کا بیری پولسیا ضرور اسی کا ہی ٹاؤٹ ہو سکتا تھا۔ اسے یقیناً اب تک اپنے معاون آفیسر مسعود خسرزادہ کے ذریعے کافی حد تک حالات کا اندازہ ہو چکا ہوگا، اسی لیے اس نے میرا ہی پتّا صاف کرنے کا بھیانک اور مکروہ پلان بنایا تھا۔

مجھے اس کے چہرے سے غیظ و غضب کے تاثرات کے علاوہ ایک طرح کی جھلاہٹ آمیز پریشانی اور بوکھلاہٹ کے آثار بھی مترشح ہوتے محسوس ہوئے۔

''تم نے قانون کے ایک محافظ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی جرأت کیسے کی؟'' وہ مجھے گھورتا ہوا غصے سے بدک کر بولا۔

''اچھا!'' میں نے طنزیہ کہا۔ ''ایک قیدی، جس کی صبح و شام لاک اپ میں جامہ تلاشی لی جاتی رہی ہو، اس کے پاس بھلا چاقو کہاں سے برآمد ہو سکتا ہے؟''

''چاقو......؟'' وہ ایک دم انجان بن گیا۔ ''کیسا چاقو؟ تم نے اس کا گلا دبوچنے کی کوشش کی تھی۔''

اس کی بات پر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ بولا۔

''اوہو...... تو گویا میرا یقین کی حد تک یہ شبہ درست نکلا کہ مجھے لاک اپ میں ہی قتل کرنے کی سازش رات ہی کو تیار کر لی گئی تھی۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم۔'' اس نے غضبناک انداز میں بپھر کر ایک ہاتھ سے میرا گریبان دبوچ لیا۔

''آفیسر!'' میں نے مرعوب ہوئے بغیر حتمی لہجے میں اس سے کہا۔ ''ایسا نہیں چلے گا...... وہ چاقو...... تمہارے چار پانچ ساتھی اہلکاروں نے دیکھا ہے۔ اس پر ابھی تک تمہارے اسی ٹاؤٹ کے ہاتھوں کے نشانات موجود ہیں۔''

میری بات پر وہ پریشان سا ہوا پھر بولا۔ ''ممکن ہے، وہ چاقو تم نے پہلے ہی سے کہیں چھپا رکھا ہو اور موقع کی تاک میں ہو......'' اسے آگے بولنے کا موقع نہ مل سکا، کیونکہ اسی وقت...... کمرے میں دو افراد داخل ہوئے اور انہیں دیکھتے ہی گویا تائید ایزدی کا قائل ہو گیا۔ اللہ نے میری مدد کا بندوبست پہلے ہی کر ڈالا تھا۔

آنے والوں میں ایک تو معاون آفیسر مسعود خسرزادہ تھا، جبکہ دوسرا انٹرپول کا فرسٹ آفیسر آئزک بیل تھا۔

انہیں دیکھتے ہی اس مردود ریحان نے فوراً میرا گریبان چھوڑ دیا۔ یہی نہیں ان دونوں مذکورہ افسران کو اچانک اور شاید غیر متوقع طور پر بھی اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کا چہرہ بھی ست کر رہ گیا۔

میں نے شروع سے آخر تک ان دونوں کو رات والے واقعے کے بارے میں سب بتا دیا بلکہ رات کے کھانے اور آج صبح کے ناشتے کے بارے میں آگاہ بھی کر دیا کہ وہ ابھی تک لاک اپ میں شاپر کے اندر محفوظ اور مخفی مقام پر رکھے ہوئے تھے۔ اسی لیے اس کا فوراً کیمیائی تجزیہ کروایا جائے۔ نیز چاقو کا ذکر بھی چلا۔

یہ اشیا فوراً ہی برآمد کر لی گئیں۔ اب تو ریحان کی حالت دیدنی ہو گئی، اس کے فرشتوں کے بھی خیال و گمان میں نہ ہوگا کہ میں نے رات کا کھانا اور ناشتا بچا رکھا ہوگا اور یہ بھی کہ مجھے اس خطرے اور بھیانک سازش کا بھی پہلے ہی ادراک ہو چکا تھا۔

اگلے چند گھنٹے فیصلہ کن ثابت ہوئے اور دیسی اصطلاحات میں...... آفیسر ریحان کی پیٹی اتروا کر اسے گویا لائن حاضر کر دیا گیا۔

اس کے خلاف اسی کے معاون آفیسر اور میرے ہمدرد مسعود خسرزادہ نے انکوائری کروا ڈالی تھی۔

☆☆☆

المختصر میں لاک اپ سے باہر اور زبردستی تھوپے ہوئے اس کیس سے بری قرار دیا جا چکا تھا۔

میں نے آئزک بیل اور بالخصوص مسعود کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جس نے مجھے ایسی گمبھیر اور خطرناک صورتِ حالات سے نکالا تھا، کیونکہ اصل دیانت دارانہ کوشش مسعود ہی کی تھی۔

pklibrary.com

مزید تحقیقات سے یہ بھی علم میں آیا کہ سرجن امرتا گ اور ڈاکٹر رمیش اگروال کو بھی یہی شخص "بیک سپورٹ" کر رہا تھا اور اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر مجھے نشانہ بنایا تھا۔ اس کے خلاف مزید تحقیقات کا وعدہ مجھ سے نہ صرف آئزک بیل نے بھی کیا تھا بلکہ مسعود خسر زادہ...... نے تو میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ وہ عابد کریم کو نہیں چھوڑے گا اور ایک دن اسے قانون کے شکنجے میں ضرور جکڑ کر رہے گا۔

مجھے اس کی تسلی ہوگئی تھی۔ میں اب پاکستان لوٹنا چاہتا تھا، کہ اس سے پہلے پھر کسی دشمن کی سازش کا نشانہ بنوں۔

یوں میرے دونوں بہی خواہ افسران نے میری بہ حفاظت پاکستان روانگی کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔

اگلے دن رات دس بجے کی فلائٹ تھی میری۔ یہ پرواز دراصل اٹلی جا رہی تھی۔ آئزک بیل تو نہیں البتہ مسعود مجھے سی آف کرنے ائرپورٹ تک آیا تھا۔ میں نے اس کا... تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے گلے بھی لگایا پھر میں اسے خدا حافظ کہہ کر اپنا سامان سنبھالے ڈپارچر لاؤنج میں آ گیا۔

یہاں پہنچا تو عجیب قسم کی گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔ پتا چلا کہ ایک بھارتی فلم یونٹ اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے اٹلی جا رہا تھا اور ان میں مشہور بھارتی اداکار اور اداکارائیں بھی شامل تھیں۔ لوگ ان کے ساتھ گھلنے ملنے باتیں کرنے کے علاوہ سیلفیاں بنانے میں محو تھے۔ ان میں مجھے اسمارٹ اور ہینڈسم اداکار بھی دکھائی دیے اور کچھ اپنی صورت سے ہی ولن محسوس ہوئے، جبکہ اداکاراؤں میں تین چار عورتیں بھی تھیں، ان میں اپنے نقش و نگار سے ایک مجھے ہیروئن کے عہدے پر فائز لگی، جبکہ ایک دو سائڈ ہیروئن محسوس ہوئیں، دو ایک ادھیڑ عمر تھیں، جو مجھے "ویمپ" ہی لگ رہی تھیں۔ ہیروئن ٹائپ کی شوخ و شنگ لڑکی مجھے کافی خوب صورت اور حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل انیس، بیس کے درمیان ہوگی، اس کے لائٹ براؤن بال شانوں تک تھے۔ رنگت صاف اور جلد ملائم تھی۔ وہ سبک اندام اور چنچل سی تھی۔

فلم ڈائریکٹر کا بھی معلوم ہوا، وہ خاصا موٹا اور مضحکہ خیز آدمی تھا مگر اس وقت نٹ کھٹ نوجوان بننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کسی مزاحیہ فلم کے ہدایت کار کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وہاں حرکتیں بھی کچھ ایسی ہی تھیں، یعنی بار بار وہ اپنے دونوں ہاتھ کا فرضی کیمرا بنا کر کسی لڑکی کا اینگل لینے لگتا اور قہقہہ بلند کرتا۔

مجھے فلم بینی سے کبھی شغف نہیں رہا، البتہ ایک چینل سے پرانی ویسٹرن کلاسک فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا، جن میں کاؤ بوائے اور ریڈ انڈین ہوتے تھے۔ چند مشہور انڈین فلمیں بھی دیکھ رکھی تھیں۔ اسی طرح کچھ معروف انڈین ایکٹر اور ایکٹریس سے بھی جان کاری تھی، لیکن اس فلمی یونٹ میں مجھے کوئی جانا پہچانا اداکار نظر نہیں آیا، بھلا نظر بھی کیسے آتا، ایک عرصہ ہوا تھا بھارتی فلمیں دیکھے ہوئے۔ البتہ جو شائقین تھے، وہ ان نئے فنکاروں کو پہچان رہے تھے اور ان کے ساتھ مل کے خوش ہو رہے تھے۔ مجھے ان خرافات اور مستیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اسی لیے میں خاموشی سے جا کر ایک سیٹ پر جا بیٹھا اور اگلی اناؤنسمنٹ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ میری طرح اور بھی کچھ لوگ تھے جو ان سے لاتعلق بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ شٹل بس میں سوار ہونے کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہینڈی تھام لی۔ ائرپورٹ کی طرف مسافروں کو لے کر جاتی ہوئی شٹل بس میں بھی ان پاگل دیوانے لوگوں کا یہی حال رہا۔ وہاں بھی ہڑبونگ مچی رہی۔

میں انہیں پاگل ہی کہوں گا، جو بڑی اسکرین پر دیکھ کر یہ [illegible] شائقین اپنے پسندیدہ فنکاروں کو دیکھ کر پاگل ہوتے ہوں گے جو اب انہیں پوری طرح دیوانہ ہونے کا یہاں موقع مل رہا تھا۔ میں مسکرا بھی دیتا اور بھی بیزاری سے سر جھٹک دیتا۔

طیارے میں بورڈنگ ہو رہی تھی، میں بھی اپنا بورڈنگ کارڈ دکھا کر دیگر مسافروں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔

اسی وقت میرے کانوں سے ایک کھرکھراتی آواز ٹکرائی۔

"ایکسکیوزمی! اگر تم برا نہ مناؤ تو میں کھڑکی کی طرف والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں؟"

میں نے دیکھا، وہی موٹا مزاحیہ سا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ مجھے اس کا انداز بچوں والا لگا۔ جبکہ میں اپنی سیٹ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی خوش اخلاقی کو لوٹاتے ہوئے جواب میں بولا۔

"ابھی آپ فی الحال اپنی ہی سیٹ پر تشریف رکھیں، اس بارے میں بھی غور کر لیں گے۔"

"بہت خوب......!" وہ یہ کہتے ہوئے اپنی ہی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ "ویسے انسان کو اتنی بھی جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس کے

پھولے پھولے گالوں والے چہرے پر جھینپی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ یوں اس کی یاوہ گوئی جاری رہی۔

''اب دیکھیے نا، بھلا ہماری علیک سلیک کتنی دیر کی ہے، بلکہ ہے ہی نہیں اور میں نے آپ سے جھٹ مطالبہ کر دیا۔ پہلے ہائے، ہیلو کی جاتی ہے، نام پوچھے جاتے ہیں پھر ازراہِ اخلاق اپنی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے...... مسٹر......'' میں نے استفسارانہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے فوراً مصافحے کے لیے اپنا موٹا سا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور بولا۔

''مجھے ہدایت کار اجے ورما کہتے ہیں اور یقیناً آپ کو بھی کچھ کہتے ہی ہوں گے؟''

''ضرور...... مجھے سیف کہتے ہیں۔'' میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے نام کے ساتھ ''ہدایت کار'' کا لاحقہ مجھے مرعوب کردے گا۔

''گڈ! سیف، اگر انگریزی میں معنی کریں تو محفوظ اور ہندی میں کریں تو تلوار...... بنتا ہے۔''

''اس قدر معلومات بہم پہنچانے کا بہت شکریہ...... مجھے بھی نجانے کیا سوجھی کہ میں نے خالصتاً ہندی کا ایک لفظ اس کی جانب جواب میں اچھال دیا۔

''اچھا لگا یہ جواب......'' اس نے کہا۔ ''میں ٹیلی ویژن پر مزاحیہ سیریلز اور سیریز بناتا ہوں، بھارت اور اس کی فلم انڈسٹری میں میرا بڑا نام ہے۔ اب ایک فلم بنا رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں اپنے فلمی یونٹ اور کچھ سندر سی اداکاراؤں کے ساتھ اٹلی جا رہا ہوں۔''

''بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اٹلی والوں کو بھی آخر ہنسنے کا حق ہے'' میں نے اخلاق کے پردے میں اپنے اندر کا غبار نکالا۔ کیونکہ میں اس وقت بالکل تنہائی کے موڈ میں تھا جو اس نے غارت کر دیا تھا۔ حیرت بھی تھی مجھے کہ ہدایت کار ٹائپ لوگ تو کسی کو گھاس تک نہیں ڈالتے اور یا پھر...... شاید مزاحیہ فلموں اور ڈراموں کے ہدایت کار ایسے ہی ہوتے ہوں۔

''ان کی سمجھ میں کیا خاک آئے گی فلم۔'' اس نے شاید میرا طنز سمجھے بغیر ہی منہ بنا کر کہا۔ ''البتہ ہمارے ہائی فائی میوزک، سندر اداکاراؤں کے ڈانس...... اور ان کی حرکتیں......''

''اوٹ پٹانگ......'' نہ چاہتے ہوئے میرے منہ سے لقمہ گرا۔

''خیر، ایسی بات بھی نہیں، اردو ہندی سمجھنے اور بولنے والے ہر جگہ ہی ہیں۔'' اس بار اس نے برا منالیا تھا لیکن پھر شاید اسے یہ یاد آتے ہی کہ اس نے مجھ سے سیٹ بدلنے کی گزارش کی تھی، فوراً ہی ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے اب آپ میری درخواست پر توجہ دیں گے۔''

''کون سی؟ آپ کی فلم میں کام کرنے کی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا اپنی فلم ڈبونے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''جی......؟'' میں نے اسے گھورا۔

''مم...... میرا مطلب ہے کہ کھڑکی والی سیٹ میری کمزوری ہے، میں دراصل آکسیجن کی کمی کا شکار رہتا ہوں۔''

''ارے......'' میرے منہ سے حیرت برآمد ہوئی۔

''معاف کیجیے گا ہدایت کار صاحب! یہ کسی ٹرین یا موٹر کار کی کھڑکی نہیں ہے۔ طیارے کی بند کھڑکی ہے۔''

''باہر کے مناظر دیکھ کر بھی میں آکسیجن جذب کر لیتا ہوں۔''

''جس طرح کوئی سمندری مخلوق پانی سے اندر آکسیجن جذب کرتی ہے۔'' میں نے ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بھی سمجھ لیں۔'' اس نے سر دھنا۔

''تو پھر تشریف لے آیئے۔ جگت بازی کی معافی چاہتا ہوں۔'' میں مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

سیٹ بدلنے کے بعد...... بھی اس کا باتیں کرنے کا ارادہ ملتوی ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا، اگر اس وقت سیٹ بیلٹ باندھنے کی اناؤنسمنٹ نہ ہوتی۔

مقررہ وقت پر طیارے نے ٹیک آف کیا اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھا، آنکھیں موندیں غنید سے زیادہ سوچوں میں کھو گیا۔

مجھے ابھی تک ڈاکٹر رمیش اگروال کے تعاقب میں اور اس سے اپنے بھائی عادل کا بدلہ نہ لینے کا بے حد افسوس تھا۔ اس قدر کہ خواہ یہ ملعون رمیش اگر طارق اور رومی کے ہاتھوں جہنم واصل ہو بھی جاتا تو بھی میرے اندر ایک پھانس، ایک کسک رہ جاتی کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس مردود کو ٹھکانے کیوں نہیں لگایا۔

بے شک اب تک میں نے امرناگ کو عبرت کی

تصویر بنا کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، بعین اسی طرح میں...... گوہر شاہ، تاج سے لے کر رمیش اگروال کو بھی اسی بھیانک انجام سے دوچار کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔

اچانک ایک مترنم سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ آنکھیں کھولیں تو ایک حسین ایئر ہوسٹس کا مسکراتا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ میرے ساتھ بیٹھا اجے ورما اونگھ رہا تھا۔ میں نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کوئی بھی ڈرنک لینے سے انکار کر دیا۔

وہ چلی گئی۔ میں نے پھر آنکھیں موند لیں۔

اچانک طیارے کے ٹھہرے ٹھہرے اور پُرسکون سے ماحول میں ایک کرخت آواز گونجی۔ جس نے مجھے سوچوں کے بھنور سے ابھرنے اور آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''اٹینشن...... کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ طیارے کو ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔''

اس آواز اور جملوں نے مجھے ہی نہیں اور بھی کئی اونگھتے ہوئے مسافروں کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ چند ایک دبی دبی کراہ سے مشابہ چیخیں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ میرا دل جیسے یکلخت رک رک کر دھڑکنے لگا۔ وہ پانچ مسلح افراد تھے۔ چہروں پر سیاہ نقاب تھے۔ مجھے وہ غیر ملکی محسوس ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید اور خطرناک گنز تھیں۔

میں ساکت بیٹھا انہیں گھورتا رہا۔ میرے ساتھ بیٹھا وہ مجہول سا ہدایت کار شاید اونگھتا ہوا گہری نیند کی وادیوں میں لڑھک گیا تھا۔

''آنکھیں اور کان کھول کر ہماری بات غور سے سنو۔'' ان میں سے ایک نے جو مقابلتاً ان میں زیادہ کیم شحیم دکھائی دیتا تھا، بڑک مارنے کے انداز میں دوبارہ مخاطب ہوا۔ جس قدر اس کا جثہ تھا، اس کے برعکس اس کی آواز باریک تھی، جسے بھاری اور رعب دار بنانے کی وہ ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''اپنے ساتھ کی سیٹوں پر محوِ خواب ساتھیوں کو جگا دو فوراً تاکہ وہ بعد میں ہڑبڑاہٹ میں سارا کھیل نہ بگاڑ دیں ہمارا۔''

سب سے پہلے اس کی ہدایت پر میں نے عمل کیا اور کہنی کا ٹہوکا مار کے اجے ورما کو جگا دیا۔

''اٹھیے، جناب ہدایت کار صاحب! اب ذرا ریئل ایکشن فلموں کی شوٹنگ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔''

اجے ورما ہڑبڑا کر جاگ گیا اور پھر سامنے مسلح ہائی جیکروں کو دیکھتے ہی اس کی گھگی بندھ گئی۔ دبے دبے غصے سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''رام...... رام...... تمہیں اس وقت بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔ یہ کوئی ایکشن فلم ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ اسی وقت وہی ہائی جیکر آگے بول رہا تھا۔

''کسی نے بھی کوئی چالاکی کرنے یا اپنی سیٹ چھوڑنے کی ذرا بھی کوشش کی تو اس کی دنیا چھڑا دوں گا برسٹ مار کے...... ہمارے پاس ہینڈ گرینیڈ بھی ہیں، ہم نے سر سے کفن باندھا ہوا ہے۔ ہمارے دو مسلح ساتھی کاک پٹ پر قابض ہو چکے ہیں۔ امید ہے آپ سب ہم سے تعاون کریں گے۔ شکریہ۔''

''وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' اجے ورما نے ہولے سے گویا جل کر کہا۔ ہائی جیکرز کے ایک ساتھی نے شاید اس کی بڑبڑاہٹ سن لی اور وہیں سے اس نے اپنی گن کی نال کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے دہاڑ ماری۔

''تم نے کچھ کہا......؟ کیا بکواس کی تھی ابھی......؟''

''کک...... کچھ نہیں...... ٹھ...... ٹھیک ہے کیا تھا میں نے......'' اجے ورما خوف بھری لکنت زدہ آواز میں بولا۔

مسافروں کے چہروں پر خوف و دہشت طاری تھی۔ کچھ کمزور دل مسافروں پر غشی بھی طاری ہونے لگی تھی، جنہیں ہائی جیکروں کے حکم سے ایئر ہوسٹس سنبھالنے میں مصروف ہو گئی۔

ڈرے سہمے مسافروں میں کسی میں بھی ہائی جیکرز سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ پوچھتے آخر اب وہ ہم سمیت کہاں کا قصد رکھتے ہیں......؟ وغیرہ۔

ہائی جیکرز واکی ٹاکی ٹائپ جیسے آلے پر اپنے ان دو ساتھیوں سے بھی رابطے میں تھے جنہوں نے بقول ان کے اندر کاک پٹ میں پائلٹوں کو بھی یقیناً گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

کچھ معلوم نہ تھا کہ طیارے کو کب سے اس کے مقررہ راستے سے ہٹا کر اپنے مطلوبہ راستے پر لگا دیا گیا ہے۔ یوں اب وہ کس ملک کی فضائی پٹی سے گزر رہا تھا، اس کے بارے میں بھی ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا۔

''کیا اب ہماری منزل انگلی نہیں ہو گی؟'' کسی بے صبرے مسافر نے سوال کرنے کی جرأت کر ڈالی۔

''فی الحال نہیں......'' لیڈر نے جواب دیا۔

pklibrary.com

"تو پھر کہاں جا رہے ہیں ہم......؟" ایک اور بے صبرے نے پوچھا۔

"انڈیا کے راستے سری لنکا یا نیپال......" اس نے جواب دیا۔

"تامل ناڈو......" میرے اندر ابھرا۔ کیونکہ جہاز میں زیادہ تر انڈین اور سری لنکن ہی سوار تھے۔

کچھ دیر گزری تھی کہ اچانک کاک پٹ سے دھماکے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد طیارے کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یک بیک کئی ہراساں چیخیں طیارے کے محدود ماحول میں گونج اٹھیں۔

ایک ہی جھٹکے سے طیارے کے مسافروں میں بُری طرح بھگدڑ مچ گئی تھی۔ جس طرح کسی معمولی بیماری کے جھٹکے سے انسان خوف زدہ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح ہوائی جہاز کے ایک جھٹکے نے تمام مسافروں کے چہروں پر موت کی زردی طاری کر دی تھی۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو انسان شروع میں کسی بیماری کو خاطر میں نہیں لاتا، مگر ہوائی جہاز میں سفر کرنا اور دورانِ پرواز کسی معمولی سی بھی خرابی کے باعث انسان کے دل و دماغ کے ساتھ فوراً خوف چپک جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی زندگی ہوا میں معلق ہوتی ہے۔ آگ اور پانی کے بعد ہوائی حادثے کی موت بھی بڑی دردناک اور اذیت ناک ہوتی ہے، موت سے پہلے موت کا ذائقہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

یوں طیارے کو لگنے والا یہ جھٹکا معمولی نوعیت کا ہرگز نہیں تھا۔ پھر ابھی ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جہاز بُری طرح ڈولنے لگا۔ مسافر مارے دہشت کے اب رونے چلّانے لگے، بلکہ کئی لوگوں نے بہ آواز بلند اپنے اپنے مذہب کے مطابق زور زور سے دعائیہ کلمات بھی ادا کرنا شروع کر دیے، جو مسلمان مسافر تھے وہ کلمہ طیبہ کا وِرد کرنے لگے۔

جہاز کا عملہ کدھر تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کچھ پتا نہ تھا، سب کو اپنی اپنی پڑ گئی تھی، حتیٰ کہ انہیں اب خطرناک مسلح ہائی جیکرز کی موجودگی کی بھی پروا نہ رہی تھی، ہوتی بھی بھلا کیسے کہ موت ان کے سامنے رقصِ اجل کرنے لگی تھی، میں نے دیکھا ہائی جیکرز بھی اس صورتِ حال پر پریشان اور بوکھلائے ہوئے دکھائی دینے لگے، ممکن تھا کہ یہ ان کا ہی شاخسانہ ہوا، وہ بھی اِدھر اُدھر ڈولنے لگے تھے۔ ان پر قابو پانے کا موقع بھی اچھا تھا مگر کس میں ہمت ہوتی۔

مجھے یہی لگا کہ مبینہ طور پر اندر کاک پٹ میں موجود ان کے دو ساتھی ہائی جیکرز نے پائلٹس کے ساتھ کچھ کیا ہے اور وہیں ان سے کوئی خطرناک غلطی ہو گئی ہے۔ جس کا خمیازہ اب ہم سب کو طیارے کی افسوسناک اور خوفناک تباہی کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

اجے ورما نے "رام...... رام" کی گردان شروع کر دی تھی اور خوف سے اس کی حالت پتلی ہونے لگی تھی۔

اُدھر اچانک کاک پٹ سے ہائی جیکرز کا ایک ساتھی گن تھامے حواس باختہ نکلا اور اپنے لیڈر سے کچھ کہا۔ اس کا لُبِ لباب یہی تھا کہ پہلے سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا لیکن اچانک درمیان میں کو پائلٹ نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تھی کہ گڑبڑ ہو گئی، اس کے دوسرے (ہائی جیکر کے) ساتھی نے بوکھلا کر اس کو پائلٹ پر برسٹ چلا دیا، جس کے نتیجے میں طیارے کی اسکرین اور کنٹرول پینل بُری طرح متاثر ہوا۔

"تم لوگوں نے ہمیں مصیبت میں ڈال دیا، بتاؤ اب کیا کریں؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ سن کر ایک غصیلے اور پُرجوش مزاج مسافر سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان پر چڑھ دوڑا، کہ ڈولنے کے سبب خود کو نہ سنبھال سکا اور گر پڑا، باقی کسر ایک ہائی جیکر نے اسے گولی مار کے پوری کر دی۔ طیارے میں بیک وقت کئی خوف زدہ چیخیں ابھریں۔

"رام...... رام...... رام...... رام......" اجے ورما کا وِرد جاری تھا اور اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا کر سیٹ پر رکھ لی تھیں، بلکہ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے بھی دبوچ لیا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اس کی گرفت سے خود کو چھڑایا اور اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین بھی کر ڈالی۔

میں خود سخت تشویش زدہ تھا۔ یہ دہری مصیبت تھی۔ خطرناک ہائی جیکرز موت کے فرشتوں کی طرح سر پر نازل تھے اور اس پر مستزاد طیارہ آؤٹ آف کنٹرول ہو چکا تھا۔ ایمرجنسی پلوز (غبارے نما تکیے) اور آکسیجن ماسک کھل چکے تھے۔

"کوئی اس طیارے کو کنٹرول بھی کر رہا ہے یا ہم پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگیں لگا دیں۔" ہائی جیکرز کے لیڈر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"فرسٹ پائلٹ بھی زخمی ہے لیکن وہ اپنی سی کوشش کر رہا ہے کریش لینڈنگ کی۔" اس کے ساتھی نے جواب میں کہا۔ "ہم سب کو بھی اب سیٹوں پر بیلٹ باندھ کے بیٹھ جانا چاہیے۔"

pklibrary.com

''گگ ...... گگ ...... کریش لینڈنگ!'' اجے ورما یہ سن کر مزید حواس باختہ ہو گیا۔ ''ہائے بھگوان! ایسے سین تو میں اپنی فلموں میں کروایا کرتا تھا۔ کیا پتا تھا آج میں بھی میرے ساتھ ایسا ہو جائے گا۔''

جہاز میں چند سیٹیں خالی تھیں۔ جبکہ ہائی جیکرز کی تعداد زیادہ تھی، ان کا لیڈر اور چند ایک ساتھی تو براجمان ہو گئے، باقی دو تین بچ گئے۔ دو نے مجھے اور اجے ورما کو گریبان سے پکڑ کر سیٹوں سے اٹھا کے دھکا دے دیا۔

میں اور اجے ورما ...... دونوں ہی شرابیوں کی طرح ڈولتے جہاز کی ہم راہی میں گرتے پڑتے دوسرے بیٹھے ہوئے مسافروں کی گودوں میں جا گرے۔

میں تو ایک نازک اندام حسینہ پر جا گرا ...... جبکہ اجے ورما نے ایک موٹی سی اطالوی خاتون کی گود بلکہ ''گودڑ'' سنبھال لی جس کا خمیازہ اسے بے شک ایک چیخ کے ساتھ کرارے دار تھپیڑ کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا مگر وہ اسی میں ہی خوش تھا کہ ''جگہ'' تو میسر آ گئی، خواہ کسی خاتون افلاطون کی گود ہی سہی۔

مجھے اس حسینہ نے خود سے اٹھانے کے لیے [illegible] کراہ کے ساتھ جو جنبش کی تھی، وہ کافی تھی۔ [illegible] خود ہی [illegible] سا ہو کر اٹھ پڑا۔ میں اس سیٹ کی پشت گاہ [illegible] سنبھال کے بہ مشکل کھڑا ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

''چٹاخ ...... چٹاخ ...... چٹاخ ...... رام ...... رام ...... چٹاخ پٹاخ ...... رام ...... رام ......''

تھپڑوں کی بارش میں اجے ورما کا وردِ زباں پر جاری و ساری تھا کہ عورت نے اس کی ڈھٹائی کو دیکھتے ہوئے زورِ زباں روکا اور زورِ بازو سے کام لیا۔

یوں اگلا منظر بھی اجے ورما کے حوالے سے خاصا قابلِ رحم ثابت ہوا، کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے اسے ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے ایک اور مسافر پر نازل ہوتے دیکھا۔

اِدھر مجھے جانے کیا سوجھی کہ میں گرتا پڑتا کاک پٹ کے قریب جا پہنچا اور کسی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ایک نوجوان سا پائلٹ جس کے سینے سے خون ابلا پڑ رہا تھا، اپنی سیٹ پر لڑھکا پڑا تھا، جبکہ ایک دوسرا پختہ العمر پائلٹ، جو ابھی زندہ تھا مگر زخمی نظر آتا تھا، جہاز کے بچے کھچے کنٹرول پینل سے نبرد آزما تھا، اس کی پیشانی سے خون کی لکیریں بھی بہہ رہی تھیں۔

اندر دھواں تھا اور الیکٹرک وائیرز کے جلنے کی مخصوص بُو پھیلی ہوئی تھی، ایک گن بدست ہائی جیکر اس کے سر پر موجود تھا۔ اس سے، گن سنبھل رہی تھی نہ اپنا آپ ......

میں نے آرام سے اس کے ہاتھ سے گن لی اور ایک طرف پھینک دی۔ وہ میرا منہ تکنے لگا۔

''اب اس کی ضرورت کیا رہ گئی ہے، ہم ایک ہی کشتی کے سوار بن چکے ہیں۔ اسے تسلی سے اپنا کام کرنے دو۔'' میں نے جیسے بزرگوں کی طرح اسے پچکارا۔ وہ مجھے گھورتا رہ گیا۔

''سب تباہ ہو گیا، بچنے کی کوئی ایک فیصد بھی امید نہیں رہی ہے۔'' پائلٹ نے روہانسی آواز میں اعلان کیا۔

''آپ حوصلہ رکھیں اور طیارے کی کم از کم کریش لینڈنگ کی کوششیں کریں۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

''کیا میں یہاں بھیڑیں چرا رہا ہوں؟'' وہ مجھے غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیسے کنٹرول کروں؟ سب آؤٹ آف کنٹرول ہو چکا ہے۔''

اسکرین تڑخی ہوئی تھی اور وہاں سے ہواؤں کا طوفانی شور تکرار رہا تھا۔ پائلٹ بے چارہ اپنی سی کوشش میں مصروف تھا شاید مجھ [illegible] حوصلہ [illegible] پر اپنا کر رہا تھا اور اب ریڈیو ٹرانسمیٹر پر ''[illegible] ے [illegible] فلائٹ زیرو زیرو [illegible] کی [illegible] ...... '' کا پیغام بھی [illegible] رہا تھا۔

اسی دوران زمین نظر آ گئی، یہ ایک طویل صحرا تھا۔

''او مائی گاڈ ......'' پائلٹ کے منہ سے نکلا اور میں ...... بھی دھک سے رہ گیا، یوں لگا جیسے میں پتھر کا بن گیا ہوں، دیوہیکل طیارے کی تباہی اور اپنی موت سامنے دیکھنے کا ...... یہ ہیبت ناک منظر ہی ایسا تھا کہ میں جامد ہو کر رہ گیا۔

جہاز کو ایک طوفانی جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ پوری دنیا ہلنے لگی ہو اور برق رفتاری سے گھوم بھی رہی ہو۔ اس کے بعد کان پھاڑ دھماکے ہونے لگے، سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا اور میں خود بھی ہوش و حواس کی دنیا سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

زندگی اور موت کی پلک جھپک اسی کو کہتے ہیں اور اس زیست و اجل کی کشاکشی میں کبھی زندگی ہار جاتی ہے تو کبھی موت کو مات ہو جاتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کسی اچانک رونما ہونے والے حادثے میں بند ہونے والی آنکھ دوبارہ عالمِ دنیا میں کھلے گی یا عالمِ بالا میں ......

کم از کم میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میری آنکھ عالمِ دنیا

میں ہی کھلی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی سخت شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہو۔ ذہن پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ وجود کی حسیات بیدار ہوئیں تو سارے جسم میں ناقابلِ برداشت اذیتوں کی لہر بھی سرایت کرتی چلی گئی اور بے اختیار مارے جاں کش درد سے بری طرح کراہنے لگا۔

آنکھوں کے ساتھ اندر سے دھند چھٹنے لگی تو میں نے خود کو کاک پٹ کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے درمیان بری طرح پھنسے ہوئے پایا۔ اس قدر کہ ہلنا بھی میرے لیے دوبھر ہو چکا تھا۔ اسی وقت، جیسے آہ و بکا کی دردناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تب ہی احساس ہوا تھا کہ ہم طیارہ کریشنگ کا شکار ہو چکے تھے۔

جو زندہ بچے تھے ان میں، میں خوش نصیب بھی شامل تھا، لیکن میں ہنوز قابلِ رحم کی سی حالت میں تھا۔ ہلنے جلنے سے قاصر، کوشش کرتا تو درد کی لہروں میں اضافہ ہونے لگتا، یوں بھی ہوتا جیسے اگر میں نے مزید ایسی کوئی کوشش جاری رکھی تو میرے جسم کی کوئی ہڈی ضرور تڑخ جائے گی یا پھر کھال پھٹ کر ادھڑ جائے گی۔

یوں زخمی ہونا بھی تو خطرے والی بات نہیں تھی۔ اب نجانے میرا وجود سالم تھا یا خدانخواستہ اپنے کسی جسمانی عضو سے محروم ہو چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے زندہ بچنے کی خوشی ذرا ماند پڑتی محسوس ہونے لگی۔

میں نے یہ دیکھنے کے لیے اپنے وجود کو ہلا جلا کر دیکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید کاک پٹ میں داخل ہونے اور پائلٹ کی سیٹوں کے درمیان پھنس جانے کی وجہ سے میری زندگی طیارے کے اس خوفناک حادثے میں بال بال بچ چکی تھی۔ یوں اب میری ساری توجہ خود کو اس جہاز کے بُری طرح چپکے ہوئے کاک پٹ سے باہر نکلنے پر مرکوز تھی۔

میں اس اذیت کو دانتوں تلے دبا کر بڑی تگ و دو کے بعد اپنے زخمی وجود کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر نکالنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور ایک طرف آڑا ترچھا ہو کر بُری طرح ہانپنے لگا۔

ذرا دیر بعد میں نے اپنے زخموں کا جائزہ لیا۔ میری پیشانی پھٹ چکی تھی۔ خون بہہ بہہ کر بالآخر قدرتی پروسس کے تحت جم چکا تھا۔ یہی حالت میرے دونوں کندھوں اور بازوؤں کی بھی تھی۔ اب بائیں ٹانگ کی پنڈلی کی ہڈی میں مجھے بُری طرح درد محسوس ہو رہا تھا۔ باقی سب سلامت تھا۔ تب ہی میں نے بے اختیار اللہ کا صد شکر ادا کیا کہ کوئی معذور کر دینے والی چوٹ مجھے نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد میں نے بقا کی کوشش کو مزید جاری رکھتے ہوئے بہ مشکل کھڑے ہونے کی کوشش چاہی۔

کاک پٹ کی آڑی ترچھی دیواروں کا سہارا لے کے عقب میں مڑا تو قیامت صغریٰ کا منظر دکھائی دیا۔

جہاز بہت بُری طرح کریش ہوا تھا۔ ایسے میں اگر چند لوگ میری طرح زندہ بچ گئے تھے تو یہ معجزہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ جہاز کریش ہونے کے بعد ٹکڑوں.... کی صورت میں اِدھر اُدھر بکھر چکا تھا۔

یہ لق و دق صحرا تھا۔ اجڑی پجڑی لاشیں، خون کی چھیٹریوں میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں صرف سر پڑے نظر آرہے تھے تو کہیں سر بریدہ جسم...... کہیں ہاتھ تو کہیں بازو۔ دیکھنے والوں کو یہ بے رحمانہ سا اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس خوف ناک حادثے میں کوئی زندہ نہ بچا ہوگا۔

میں لنگڑاتا ہوا کاک پٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ میرے چہار اطراف حدِ نگاہ تک گویا لق و دق ریگ زار کا ایک لاامتناہی صحرا پھیلا ہوا تھا۔ میں اٹھا اور ایک ایک مسافر کی لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ کوئی زندہ بچا تھا کہ اس کی مدد کرتا، کئی مسافر زخموں سے کراہ رہے تھے۔ چیخ بھی رہے تھے مگر رفتہ رفتہ یہ آوازیں بھی دم توڑ چکی تھیں۔ اب یا تو وہ مر چکے تھے یا پھر بے ہوش ہو چکے تھے۔ یہ سب مجھے ایک ڈراؤنا خواب کی طرح نظر آرہا تھا۔

دور مغرب کی سمت سورج غروب ہونے لگا تھا۔ صحرا میں شام اترتے ہی اس کی لق و دق فضا میں روایتی ٹھنڈک اترنے لگی تھی۔ بے سدھ پڑے مسافروں کے ایک ایک چہرے کو دیکھتا ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا، جو زندہ بچے تھے ان کی حالت بھی زندوں سے بدتر تھی۔

ایک شخص زندہ حالت میں گویا زندہ لاش کی مثل نظر آیا کہ میں اسے دیکھ کر ہی کانپ اٹھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ چکی تھیں مگر وہ زندہ تھا اور ریت پر اپنے ''بے سالم'' وجود کے ساتھ پڑا آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے گھر سے ہزاروں میلوں دور اس نامعلوم صحرا میں پڑا آسمان پر اپنے گھر کے پیارے مکینوں کو چشمِ تصور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اتنی ساری لاشوں کو دیکھ کر مجھے اپنے آپ کے بچ جانے پر حیرت ہوئی بلکہ یقین ہی نہیں آرہا تھا مگر نہیں، یہ شاید اس لیے تھا کہ حالات خواہ کتنے ہی خراب اور مخدوش کیوں نہ ہوں، میں اپنے اندر کی شمعِ امید کو بجھنے بھی نہیں دیتا

تھا۔

میں اس کے لیے کیا کرسکتا تھا، لہٰذا آگے بڑھ گیا۔

اچانک مجھے...... ولن نظر آیا، جسے میں ائرپورٹ پر فلم یونٹ کے ساتھ اکڑتے چلتا دیکھ چکا تھا، یہ اونچا لمبا ولن، مگر اب اس کا صرف وہاں سر پڑا ہوا تھا، جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایسے ہی اور بھی چند لوگ جو فلم یونٹ سے متعلق تھے، ان کی لاشیں بکھری نظر آئیں۔

اچانک ایک کراہ پر میں چونکا۔ اس طرف بڑھا، وہ معاون ہدایت کار تھا۔ اس کی حالت بھی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو کہنی سے کٹ چکا تھا۔ ایک... ٹانگ کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ پیٹ کٹ چکا تھا اور سینہ بھی بُری طرح پچکا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ میں نے اس کی گردن پر دو انگلیاں رکھیں تو معلوم ہوا وہ زندہ تھا۔ اس کے اندر زندگی کی رمق موجود تھی، مگر وہ مُردوں سے بدتر حالت میں تھا۔

اچانک مجھے قریب ہی کراہوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک عقب میں دیکھا۔ تین چار بدنصیب مسافر میری طرح ہمت کر کے لنگڑاتے لڑکھڑاتے اور گرتے پڑتے ادھر اُدھر چکرا رہے تھے۔ ان میں ایک جوان عورت تھی اور باقی تین مرد تھے۔ وہ بری طرح آہ و زاری کر رہے تھے۔ عورت کے کپڑے جگہ جگہ سے مسخ ہو چکے تھے۔ اسی طرح اپنے دائیں طرف تیز کراہ سنائی دی۔

ذرا فاصلے پر ریت پہ پڑے دو وجود جنبش کر رہے تھے۔ دونوں جوان لڑکیاں تھیں۔ میں ان کی طرف لپکا۔ وہ بھی زخمی تھیں مگر خوش قسمتی سے میری طرح انہیں بھی کچھ زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ ایک لڑکی کو تو میں پہچان گیا تھا۔ یہ طیارے کی خوبرو ائر ہوسٹس تھی جبکہ دوسری کا چہرہ میں نہیں دیکھ پارہا تھا۔ وہ اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ائر ہوسٹس کو سنبھالا پھر دوسری کراہتی ہوئی لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو چونک پڑا۔ وہ فلم یونٹ کی وہی نازک اندام اداکارہ تھی جس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ اس مزاحیہ فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہی تھی اور اس کا نام مجھے ”مالا“ معلوم ہوا تھا۔ اس کا دھیان آتے ہی مجھے اس فلم کے ہدایت کار راجے ورما کا بھی خیال آیا، جانے وہ کہاں ریت میں دبا ہوگا، بے چارہ زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔

بہرکیف...... میں نے ان دونوں خواتین کو باری باری سہارا دے کر لیٹے رہنے کا مشورہ دیا۔ ان دونوں کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔ شاید اجے ورما کی عمر بڑی تھی کہ ابھی میں نے اس کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ وہ بھی مجھے ایک طرف اوندھا پڑا دکھائی دے گیا۔ وہ سیدھا ہونے کی کوشش میں مزید ریت کے اندر دھنسا جارہا تھا، میں نے جھک کر اسے سنبھالا دیا۔ اس کی ہیئت کذائی بھی قدرے بہتر تھی، میرے چھوتے اور سنبھالا دیتے ہی وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اسے ہوش دلایا۔

”رام...... رام......“ وہ ہولے ہولے بڑبڑانے لگا۔

یوں ہم کُل ملا کر سات، آٹھ افراد اس خوف ناک حادثے میں زندہ بچے تھے۔ خواتین نے ہسٹریائی آوازوں میں کراہنا اور چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں پُرسکون رہنے کی تلقین کی لیکن وہ پھر بھی روتی چلاتی رہیں تو مجھے ناچار یہ کہہ کر انہیں چپ کرانا پڑا کہ ان کی چیخوں کی آوازیں سن کر صحرائی لٹیروں کے یہاں نازل ہونے کا خطرہ بڑھ جائے گا تو وہ ایک دم چپ ہوگئیں۔

جہاز کا ایک ٹوٹا ہوا ڈھانچا ہمارے قریب ہی ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ ہم نے چند زخمیوں کو جن میں معاون ہدایت کار بھی تھا، انھیں اس گوشے میں پہنچا دیا مگر ذرا ہی دیر بعد وہ دم توڑ گئے۔ ہمیں ان کی لاشیں دوبارہ باہر پھینکنا پڑیں۔

باقی ہم سے کچھ کم اور کچھ زیادہ زخمی تھے۔ یوں ہم نے مل جل کر کم و بیش گیارہ بارہ مزید زخمی مسافروں کو اٹھا کر ڈھانچے کے اندر لٹا دیا۔

صحرا میں رات اترنے لگی تھی۔ میں نے زندہ بچ جانے والے مسافروں سے کہا کہ وہ ادھر اُدھر بکھرے طیارے کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچوں کے اندر سے فرسٹ ایڈ وغیرہ تلاش کرنے کی کوشش کریں اور ممکن ہو تو کھانے پینے کا سامان (اگر بچا ہو) اسے تلاش اور اکٹھا کرنے کی کوشش کریں، کہ نجانے کتنا وقت یہاں صحرائی ویرانے میں ہمیں گزارنا پڑ جائے۔

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک صحرا میں ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس کے بعد دو دھماکے اور ہوئے۔ طیارے کے فیول والے ڈھانچوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑلی۔

یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا، آگ کی حدت کی وجہ سے سردی کچھ کم محسوس ہونے لگی، تاہم ہم نے تینوں خواتین کو وہیں مسافروں کے پاس چھوڑا اور طیارے کے باقی ڈھانچوں کی طرف بڑھ گئے۔

کافی تلاش بسیار کے باوجود کوئی ایسی شے ہمارے ہاتھ نہ لگ سکی جس سے مرہم پٹی کی جاسکتی۔ ہم مایوس ہوکر پلٹ آئے۔

میں ڈھانچے کے اندر پہنچا تو ائرہوسٹس جس کا نام شکنتلا تھا، روتے ہوئے بتایا کہ دو مزید زخمی دم توڑ چکے تھے۔ ان کی لاشیں بھی اٹھا کر ہمیں دور پھینکنا پڑیں۔

اسی طرح مزید چار... اور زخمی بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان کی بازی ہار گئے۔ ائرہوسٹس شکنتلا کے مقابلے میں مالا کم زوردل کی ثابت ہوئی، شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اب تک فلموں میں ایسے سین کرتی آئی ہوگی لیکن حقیقت میں یہ سب دیکھ کر وہ سخت اعصاب زدگی کا شکار ہو رہی تھی اور بار بار بچوں کی طرح روئے جا رہی تھی، اجے ورما ہی اسے ''باپ'' کی طرح پیار سے پچکارے جا رہا تھا۔

باقی زخمیوں کی حالت بھی کوئی خاص تسلی بخش نظر نہیں آتی تھی۔ ہم نے کسی طرح لٹے پٹے سامانوں سے گرم کمبل اور چادریں حاصل کرلی تھیں اور اسی طرح کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی ملبے سے تلاش کرکے ذخیرہ کرلی تھیں۔ اب ہم سب طیارے کے اس شکستہ اور ٹوٹے ہوئے کیبن نما ڈھانچے کے اندر سردی کے مارے سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ مالا اب جو رما اور ائرہوسٹس شکنتلا میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ طیارے کے باقی ڈھانچے جل کر خاکستر ہوچکے تھے جبکہ یہ ڈھانچا جس کے اندر ہم نے پناہ لے رکھی تھی اور ایک کاک پٹ والا حصہ سالم حالت میں تھے۔ ہم لوگ اداس اور پژمردہ بیٹھے بقائے حیات کا سوچ رہے تھے۔ ہم آپس میں موجودہ حالات پر تبادلۂ خیال بھی کرلیتے، مثلاً طیارے پر ہائی جیکرز کیسے قابض ہوئے؟ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ ان کا تعلق تامل ناڈو سے تھا، یا پھر کوئی اور خطرناک گروہ کے آدمی تھے۔ وہ تو شاید اب سب ہی اس حادثے میں ختم ہوچکے تھے، اہم سوال اب یہ پیدا ہوتا تھا کہ جہاں یہ بدنصیب جہاز کریش ہوا ہے، یہ کون سا علاقہ تھا؟ وغیرہ۔

اس بارے میں اجے ورما اور ائرہوسٹس شکنتلا کا خیال تھا کہ یہ بھارت کی ریاست راجستھان کا ہی علاقہ ہو سکتا تھا کیونکہ ہائی جیکرز... پائلٹ کو بھارتی فضائی پٹی سے سری لنکا یا نیپال لے جانے کا ہی زبردستی حکم دے رہے تھے۔ ائرہوسٹس کا خیال زیادہ معتبر ہوسکتا تھا کیونکہ وہ جہاز کے عملے سے تعلق رکھتی تھی۔

اب ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ یہاں بیٹھ کر کسی امدادی پارٹی یا متعلقہ ریسکیو ٹیم کا انتظار کرنا چاہیے یا پھر کسی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔

''ہمارا یہاں سے نکلنا موت کو گلے لگانے کے مترادف ہوگا۔'' ایک مسافر نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ جس کی توجیہہ اس نے یہ پیش کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''کیونکہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں کہ ہم آبادی سے کتنی دور ہیں؟ اس طرح ہم راستہ بھٹک کر بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں گے۔''

اس کی رائے سے سب کو اتفاق تھا لیکن میرا اور ائرہوسٹس کا خیال یہ تھا کہ ہمیں بہرحال جلد یا بہ دیر کسی طرف پیش قدمی کرنا ہی پڑے گی کیونکہ ہمارے پاس خوراک کا ذخیرہ بہت کم تھا۔

''ہوسکتا ہے اس دوران کوئی امدادی ٹیم یہاں پہنچ ہی جائے۔ ہمارا ادھر رہنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت نے بھی پہلے والے مسافر کی تائید میں کہا تو ایک تیسرے مسافر نے بھی اس کی حمایت کر ڈالی۔

''میرا خیال ہے یہی زیادہ بہتر ہے کیونکہ ہم ان زخمیوں کو کہاں کہاں اٹھائے پھریں گے؟''

ہم خاموشی سے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگے۔

☆☆☆

صحرا میں ٹھٹھرتی ہوئی رات اپنے جوبن پر تھی۔ چہار اطراف گہرا سناٹا طاری تھا۔ میں اور ورما ایک کمبل میں...... اسی طرح مالا اور شکنتلا دوسرے کمبل میں لپٹے ٹوٹی ہوئی سیٹوں کے درمیان سکڑے سمٹے بیٹھے اونگھ سے رہے تھے۔ اچانک میرے کان کچھ عجیب سی آوازوں پر یک دم کھڑے ہوگئے۔ یوں میں پہلے تو دم بہ خود بیٹھا خاموشی سے ان آوازوں کے آہنگ کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر وضاحت ہوتے ہی میں بُری طرح لرز اٹھا۔

یہ آوازیں خوں خوار غراہٹوں پر مشتمل تھیں۔ سب سے پہلا لرزہ خیز خیال جو میرے ذہن میں ابھرا تھا، وہ صحرائی گیدڑوں اور کتوں کا تھا۔ دیگر مسافروں نے بھی یہ آوازیں سن لی تھیں۔

ہم سب فوراً ہی حرکت میں آگئے اور کمبل اوڑھے ڈھانچے کے نکاسی والے حصے پر آکر باہر دیکھنے لگے۔

سامنے چاند کی ٹھٹھرتی ہوئی طلسماتی روشنی میں ایک خوف ناک منظر ہمارا منتظر تھا۔ اندازاً کوئی پندرہ سولہ کے قریب صحرائی بھیڑیے نما خوں خوار کتے ریت پر بے ترتیب پڑی بدنصیب مسافروں کی لاشوں کو اپنے خوفناک شکاری

دانتوں سے نوچنے اور بھنبھوڑنے میں مصروف تھے۔

”اندر آجاؤ...... جلدی کرو......“ میں نے سرسراتے لہجے میں سب سے کہا۔ ”اگر انہیں ہماری بھنک پڑ گئی تو یہ ہمیں بھی بھنبھوڑ ڈالیں گے۔“

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور واپس آکر اپنی اپنی جگہوں میں دبک کر پڑ گئے جبکہ میں ٹوٹی ہوئی کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر کا یہ وحشت ناک منظر دیکھنے لگا۔

خوں خوار صحرائی بھیڑیے ضیافت اُڑانے میں مصروف تھے۔ ان کی خون خوار تھوتھنیاں خون سے رنگین ہو رہی تھیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ راجستھان کے بعض صحرائی علاقوں میں ایسے خوں خوار کتے اور بھیڑیے بہ کثرت پائے جاتے تھے۔

مجھے اپنا اور ان بچے کھچے مسافروں کی جان کا خوف ستانے لگا۔ صحرائی بھیڑیے بدنصیب مسافروں کی لاشوں کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھے اور آپس میں بھی غراہٹ بھری اچھل کود کر رہے تھے۔ یہ بڑا عبرت ناک لرزہ خیز منظر تھا۔

یہ سارے بھیڑیے خاصی بڑی جسامت میں تھے۔ رنگ ان کا سرمئی اور بھورا مائل تھا۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ایک بھیڑیے نے اپنی خون آلودہ تھوتھنی فضا میں بلند کی۔ وہ کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی چند مزید بھیڑیوں نے بھی ایسا ہی کیا پھر اس کے بعد وہ اپنی سرخ انگارا آنکھوں سے طیارے کے اس ڈھانچے کی طرف گھورنے لگے جس میں ہم نے پناہ لے رکھی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک ٹولا غراتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

میں زخمی ہونے کے باوجود تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ دیگر مسافروں نے مجھے یوں اچانک اور تیزی سے اٹھتے دیکھا تو وہ بھی پریشان اور ہراساں نظر آنے لگے۔

”بھیڑیوں کا ایک غول اس طرف آرہا ہے...... دروازے کو بند کرو کسی طرح......“ میں زور سے چلّایا۔ تینوں خواتین مارے خوف کے چیخ اٹھیں۔ میرے ہمراہ چاروں مسافر اٹھے تھے۔ ہمیں جو سخت شے ملی، وہ ہم نے اٹھالی۔ گویا ہم ان شکاری اور خوں خوار بھیڑیوں کا بھی سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔

شکر تھا کہ باقی مسافروں نے بھی بہادری دکھائی تھی، ورنہ میں اکیلا کیا کرسکتا تھا۔

میں نے ٹوٹی سیٹ کا ایک آہنی ہتھا اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ کم وبیش اسی طرح کی چیزیں باقی مسافروں نے بھی اٹھالیں ہم ٹوٹے ہوئے دروازے کا بھاری بھرکم آہنی پٹ جو چوکھٹ میں بری طرح پھنسا ہوا تھا، اسے اکھیڑنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔ اسی وقت ایک بھیڑیے نے غراتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے سیٹ کا مضبوط آہنی ہتھا اس کی تھوتھنی پر جڑ دیا۔ وہ حلق کے بل چیخا اور اپنے ساتھیوں پر جا پڑا۔ اسی طرح باقی مسافروں نے بھی ایسا ہی کیا لیکن بدقسمتی سے اجے ورما ایک خون خوار بھیڑیے کی زد میں آگیا۔ وہ ہنوز ”رام...... رام......“ الاپتا رہ گیا اگر اس موقع پر بھی وہ ”اللہ“ کو پکارتا تو شاید بچ جاتا، بھیڑیے نے آنِ واحد میں اس کا نرخرہ بھنبھوڑ ڈالا۔ مجھے اس کی عبرت ناک موت کا بہر حال دکھ ہوا تھا۔ ادھر دوسرے اور تیسرے مسافر نے اس بھیڑیے کی کمر پر فولادی راڈوں سے تابڑتوڑ حملہ کردیا۔ وہ چیختا چلّاتا ہوا باہر کی جانب بھاگ گیا۔ اس اثنا میں دیگر بھیڑیے بھی ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔

ٹوٹا ہوا دروازہ ٹوٹ کر ریت میں دھنس چکا تھا۔ ہم چاروں مل کر بھی اسے اپنی جگہ سے ہلا نہ پائے تھے۔ ادھر بھیڑیوں کا پورا غول ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ ہماری اذیت ناک موت بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میں نے تینوں خواتین کو سمیٹا اور ڈھانچے کے بعید ترین گوشے میں لے گیا۔

یہاں اونچائی میں ایک برتھ سی بنی ہوئی تھی، اوپر ڈھانچے کی چھت ٹوٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے ان تینوں خواتین کو برتھ پر چڑھا کر اوپر چھت سے باہر نکلنے کو کہا پھر مڑ کر ان تینوں مسافروں سے بولا۔

”تم بھی چلے آؤ، ہم اتنے سارے بھیڑیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔“

انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ادھر میں نے پہلے مالا پھر شکنتلا کو آخر میں ادھیڑ عمر خاتون کو سہارا دے کر جلدی جلدی برتھ پر اچھالا۔ اس کے بعد خود بھی برتھ پر چڑھ کر سوراخ والی چھت سے اوپر آگیا۔

عقب میں دو مسافر بھی آگئے۔ تیسرا مسافر بھیڑیوں کی زد میں آگیا۔ یہ اس ادھیڑ عمر عورت کا شوہر تھا، وہ چلّانے لگا۔ میں اندر برتھ پر دوبارہ کود گیا۔ عورت کا شوہر نصف برتھ پر تھا اور نصف جھول رہا تھا اور اس کی ٹانگوں سے گویا بھیڑیوں کی پوری فوج چمٹ کر جھول گئی تھی۔ وہ بے چارہ مارے اذیت کے چیخنے چلّانے لگا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر گھسیٹ لیا۔ اب ہم دونوں برتھ پر

pklibrary.com

رنگارنگ کہانیوں اور دل فریب سلسلوں سے سجا فروری 2021ء کا مسحور کن شمارہ
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
سلسلے وار ناول افشاں آفریدی اور نایاب جیلانی کے مشاق قلم کے شاہکار
شیریں حیدر کی متاثر کن تحریر وہ ہجر جو ہم پر لازم تھا
طیبہ عنصر مغل اور سحر ساجد کی قلم آرائیاں
معروف صحافی، مصالحہ فوڈ میگزین سے وابستہ شازیہ انوار سے دلچسپ ملاقات
بانیِ ادارہ جناب
معراج رسول مرحوم کی برسی کے موقع
پر ان کے بہی خواہوں کے تاثرات
خاموشی...... وجدانِ الٰہی
کے موضوع پر روح پرور مقالہ پڑھیے
اختر شجاعت کے قلم سے
اس کے علاوہ
نئی و پرانی تحریر نگاروں کی دل پذیر کاوشیں جن میں سلمیٰ غزل، ہما علی،
عروج لبنیٰ قدیر، نزہت جبیں ضیا و دیگران شامل ہیں
آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعروشاعری، خوش ذائقہ، حسن نکھاریے،
معلومات سے پُر تراشے اور گوشۂ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے......

پڑے بُری طرح ہانپنے لگے۔ نیچے طیارے کا یہ ڈھانچا خون خوار بھیڑیوں کے ہجوم سے اٹا پڑا تھا۔ وہ ہماری طرف اپنی سرخ انگارا آنکھوں سے گھور گھور کر غرا رہے تھے۔

آدمی کی دونوں ٹانگیں بُری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ اس کی پتلون پھٹ چکی تھی۔ ٹانگوں کا سارا گوشت خون خوار بھیڑیوں نے نوچ ڈالا تھا، وہ بے چارہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس کی بیوی شوہر کی حالت دیکھ کر چھت سے برتھ پر آ گئی۔ ہم تینوں کے وزن سے برتھ جھولنے لگی۔ نیچے بھیڑیے ہم تک اوپر پہنچنے کے لیے غرغرا کر اچھل رہے تھے۔ برتھ کڑکڑانے لگی۔ میں چیخا۔ ”چھت پر چلو...... ورنہ ہم تینوں برتھ سمیت نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔“

ظاہر ہے نیچے خون آشام بھیڑیوں کی صورت میں جہنم ہی ہماری منتظر تھی۔

یوں میں نے پہلے تو روتی ہوئی عورت کو زبردستی چھت پر دھکیلا پھر اس کے زخمی شوہر کو اوپر چھت کے سوراخ پر کھڑے ان تینوں مسافروں کے حوالے کیا۔ اس کے بعد میں نے اچھل کر چھت کے سوراخ کے کناروں کو پکڑنے کی کوشش چاہی تھی کہ اچانک برتھ ٹوٹ کر نیچے بھیڑیوں کے غول پر جا گری۔ شکر تھا کہ میرا ایک ہاتھ خوش قسمتی سے چھت کے سوراخ کے کنارے پر جا پڑا تھا۔

اب میں ہوا میں جھول رہا تھا مگر مجھے ان دونوں مسافروں نے اوپر کھینچ لیا۔ نیچے بھیڑیوں نے ادھ موئے مگر زندہ بچ جانے والے باقی بے ہوش پڑے مسافروں کو اپنے نکیلے دانتوں سے ادھیڑنا اور بھنبھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ دردناک منظر ہم دیکھ نہ پائے اور منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

طیارے کا یہ تباہ حال ڈھانچا خاصا بلند تھا اور جہاز کا اگلا حصہ یعنی غالباً اکانومی کلاس کا تھا۔ باہر سے چھت گنبد نما تھی مگر خونی بھیڑیوں کے اس بدمست غول سے فی الحال بچ تو گئے تھے لیکن اب ہم کھلے آسمان تلے سردی سے بُری طرح ٹھٹھر رہے تھے۔

افراتفری میں گرم کمبل وغیرہ بھی ہم نہیں اٹھا سکے تھے۔ یوں بھی اس خطرناک اور ہولناک صورتِ حالات میں کسے اس کا ہوش رہا تھا؟ البتہ ادھیڑ عمر عورت کے شوہر کی حالت کافی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ وہ ٹانگوں کے زخموں کی وجہ سے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کی اس ہیئت کذائی پر روئے جا رہی تھی۔ ہم ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ ائر ہوسٹس شگفتہ اور مالا اسے تسلیاں دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس عورت کا بدنصیب شوہر معذور ہی ہو گیا تھا۔ بھوکے بھیڑیوں نے اس کی ٹانگوں کی پنڈلی اور رانوں کا سارا گوشت اس بری طرح نوچ ڈالا تھا کہ اب وہاں سرخ سرخ گوشت کے ادھڑے ہوئے ریشوں سے ہڈیاں تک جھانک رہی تھیں۔ اس کا خون کسی طور بند ہونے کا نام نہیں رہا تھا۔ البتہ میں نے ازراہِ ہمدردی اپنی قمیص اتار کر اس کی زخمی ٹانگوں کے گرد باندھنے کی کوشش کی کہ کسی طرح اس کی زخمی ٹانگوں کا خون بہنا بند ہو جائے، کسی حد تک جریانِ خون بند ہو چکا تھا لیکن بالکل بند نہیں تھا۔

قمیص سے محرومی کے ساتھ ہی سردی جیسے میری رگوں میں اتر کر خون کو برفاب بنانے لگی، وہ عورت ابھی تک اپنے شوہر کی ناگفتہ بہ حالت پر روئے جا رہی تھی۔ ہم سب ہی بہت کڑے وقت سے گزر رہے تھے۔ ہمارا خوراک کا ذخیرہ بھی مردار بھیڑیوں نے سارا تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ گویا اب ہمارے پاس کھانے پینے کے لیے ایک ذرا دانہ و آبِ گھونٹ تک نہ رہا تھا۔

خوں خوار بھیڑیے، تباہ حال طیارے کے اس ٹوٹے ہوئے ڈھانچے کے گرد بے چینی سے منڈلا رہے تھے۔ ابھی شاید ان مرداروں کی شکم سیری نہیں ہوئی تھی۔ وہ آزادانہ اندر باہر دندناتے اور غراتے پھر رہے تھے۔ پھر وہ ساری رات ہم نے طیارے کی ٹوٹی ہوئی چھت پر ٹھٹھرتے ہوئے گزار دی۔

صبح ہوئی، سورج نکلا تو دھوپ سے کچھ سکون ملا۔ یوں وہ ساری رات ہم نے آنکھوں میں ہی کاٹ دی تھی۔ صحرائی بھیڑیوں کا غول رفتہ رفتہ دور صحرا کی لامتناہی وسعتوں میں گم ہونے لگا تھا۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد سب سے پہلے ہم تینوں مسافر مرد سوراخ کے ذریعے نیچے، یعنی اندر اترے اور بچی کچھی خوراک کا جائزہ لیا لیکن افسوس کہ کچھ نہیں بچا تھا۔

اب دھوپ کی خوشگواریت تمازت میں بدلنے لگی تھی اور گرم ہونے لگی تو چھت نے تپنا شروع کر دیا۔ ہم نے پھر ان تینوں خواتین کو بھی نیچے اتار دیا، جبکہ ادھیڑ عمر عورت کے زخمی شوہر کو ہم تینوں مردوں نے بہ حفاظت نیچے اتار کر سیٹوں کے بچے کھچے گدے بچھا کر اس پر لٹا دیا مگر اندر مسافروں کی بیدردی سے ادھڑی ہوئی لاشوں سے سخت کراہیت آ رہی تھی، اس لیے ہم نے کاک پٹ والے ایک دوسرے ڈھانچے کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔

یہ پناہ گاہ پہلے والی کی بہ نسبت تنگ تھی اور ٹوٹی ہوئی

pklibrary.com

اسکرین سے بھی تیز دھوپ کسی برچھی کی طرح اندر پڑ رہی تھی۔ یہاں ہمیں ایک بار پھر ان بھیڑیوں کا خدشہ ستانے لگا، کیونکہ اگر وہ ادھر دوبارہ رخ کرتے تو ہمارے بچاؤ کے لیے اب یہاں کچھ بھی نہ تھا، کیونکہ ایک طرف سے تو یہ حصہ بالکل ٹوٹ کر علیحدہ ہونے کی وجہ سے کھلا ہوا تھا اور پھر اسکرین بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ بھیڑیئے بہ آسانی ہمارا شکار کر سکتے تھے۔

ان منحوس صحرائی بھیڑیوں کے خوف سے ہم نے تو اب پیش قدمی کا ارادہ بھی ترک کر ڈالا تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہم یہاں آخر کب تک اس طرح بھوکے پیاسے اور بے یار و مددگار پڑے رہیں گے؟ لہٰذا ایک بار پھر ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

کافی بحث و مباحثے کے بعد یہی طے پایا گیا کہ ہمارا یہاں سے نکلنا خودکشی کے مترادف ہی ہوگا۔ اس لیے ادھر ہی رک کر کسی امدادی ٹیم کا انتظار کیا جائے جس کے کم از کم مجھے تو ابھی تک کوئی ایسے امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ میرے موقف کی حمایت میں صرف مالا تھی، البتہ میں نے ان سے کہا۔

”ان تینوں خواتین کو ادھر ہی موجود رہنے دیا جائے۔ جبکہ میں اور [illegible] صحرا کی [illegible] سمتوں میں دو مختلف سمتوں میں آبادی یا نخلستان (پانی) وغیرہ کے آثار تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور پورے گن کر پانچ سو قدم چلنے کے بعد واپس لوٹ آئیں گے، اس کے بعد دوبارہ دو مختلف سمتوں پر اسی طرح یہی عمل دہرائیں گے، ہوسکتا ہے ہمیں کامیابی ہو۔“

بالآخر سب نے میری اس تجویز پر صاد کیا، یوں میں اور ٹام باہر نکلے اور ناک کی سیدھ میں دو مختلف سمتوں یعنی شمالاً اور جنوباً آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

میں اکیلا ریت پر چلتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ یوں میں تقریباً ساڑھے پانچ سو قدم آگے نکل چکا تھا۔ تب میں نے مڑ کر دیکھا تو چاروں طرف دل دہلا دینے والے صحرائی ویرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں جا پہنچا تھا۔ یہ تو ریت پر بننے والے میرے قدم تھے جو میری واپسی تک راہنمائی کر سکتے تھے۔ ورنہ تو میں اس بے رحم اور تپتے ہوئے صحرا میں بھٹک جاتا اور اذیت ناک موت میرا مقدر ہوتی۔ یوں بھی واپسی میں کیا رکھا تھا......؟ لیکن بہرحال کچھ آسرا اور امید تو تھی کہ کوئی قافلہ یا امدادی ٹیم اس تباہ حال طیارے کے ملبے کو دیکھ کر اس طرف کا رخ کر لیتی۔

سورج نصف النہار پر آ کے آگ برسانے لگا۔ میرا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ بادِ سموم کے گرم تھپیڑے چہرے اور میرے اوپری بدن کو جھلسائے دے رہے تھے۔ جوتوں کے اندر گھسی ہوئی ریت میں گرمی پیدا ہونے لگی تھی۔

میں نے گن کر مزید پچاس قدم آگے بڑھائے اور ناکام ہو کر واپسی کا راستہ اختیار کیا۔

میں اب تھک کر نڈھال ہونے لگا تھا۔ ریت پر ایک جگہ گر سا پڑا تو مجھے ناچار دوبارہ اٹھنا پڑا کیونکہ ریت بہت گرم تھی۔ میرا حلق بھی پیاس کی شدت سے سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ یوں جیسے گلے میں تھوہر اُگ آئے ہوں۔ ہونٹوں کے گرد پپڑیاں سی جمنے لگیں۔ میں اپنی رہی سہی ہمت مجتمع کر کے واپس چل پڑا۔

دفعتاً مجھے فضا میں ذرا دور بڑے بڑے مردار خور گدھ اُڑتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی یکلخت میرا دل ایک خوف ناک خیال سے لرز اٹھا اور میں قدرے پھر تیز رفتاری کے ساتھ تباہ حال طیارے کے ملبے کی طرف چلنے لگا۔ جب قریب پہنچا تو ایک لرزہ خیز منظر میرا منتظر تھا۔

☆☆☆

فضا میں گردش کرتے ہوئے مردار خور گدھوں کے جھنڈ کا جھنڈ...... لاشوں کے پنجر پر ٹوٹا پڑا تھا، وہ ان کے بچے کھچے سڑے گلے گوشت کو نوچ کر کھا رہے تھے۔ پھر معاً ہی مجھے تیز چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیں، جسے سن کر میرا دل یکبارگی دھک سے رہ گیا۔

یہ آوازیں یقیناً ان تینوں خواتین کی تھیں۔ میں نے طیارے کے تباہ حال کاک پٹ والے ڈھانچے کی طرف دیکھا اور بری طرح دہل گیا۔ وہاں بھی میں نے آس پاس لاتعداد گدھ منڈلاتے دیکھے۔ مالا اور ایئر ہوسٹس شگفتہ انہیں بھگانے کی کوشش میں چیخ چلا رہی تھیں۔ گدھ بھی شاید برسوں کے بھوکے نظر آتے تھے۔ انہوں نے شکم سیری کے لیے زندوں پر بھی حملہ کر دیا تھا۔ لہٰذا...... میں بھی ”ہشکارے“ دیتا ہوا پاگلوں کی طرح ان کی طرف دوڑا۔ اچانک میں نے ایک جسیم گدھ کو جہاز کے کاک پٹ کی اسکرین سے پھدک کر باہر آتے دیکھا۔ گویا وہ منحوس اندر بھی داخل ہو چکے تھے۔ اس کی گردن تک بالکل گنجی تھی۔

اس نے اپنی زرد سی مڑی ہوئی چونچ میں آنکھ کا ایک ڈیلا دبوچ رکھا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی کریہہ گردن کو جھٹکا دیا اور وہ انسانی آنکھ کا ڈیلا سنک لیا۔ مجھے یہ کریہہ ناک منظر دیکھتے ہی ابکائی آگئی۔ میرا جی الٹنے لگا۔ اندر اس ادھیڑ عمر عورت کے چیخنے چلّانے کی وحشیانہ آوازیں آرہی تھیں۔ میں دوڑ کر اندر گیا۔ ایک ہولناک منظر... دیکھا میں نے...... مردار خور گدھوں نے اس ادھیڑ عمر عورت اور اس کے زخمی معذور شوہر پر حملہ کر دیا تھا۔

دونوں کی آنکھیں پھوڑ ڈالی تھیں۔ مالا اور ائر ہوسٹس شگفتہ ہسٹریائی چیخ مارتی ہوئی صحرا کی طرف دوڑ پڑیں۔

''رک جاؤ، ڈرو مت...... ورنہ بھٹک جاؤ گی۔'' میں نے عقب سے چلّا کر کہا۔ لیکن وہ دوڑتی چلی گئیں، شاید وہ زیادہ ہی خوف و ہراس کا شکار ہو چکی تھیں۔ میں سب سے پہلے مالا کی جانب لپکا اور اسے جالیا۔

''ہوش کرو، کیا ہو گیا ہے تمہیں، ؟ اس طرح خود کو مزید موت کے منہ میں مت دھکیلو۔'' میں نے ہانپتے ہوئے اسے تقریباً جھنجوڑ کر کہا۔ وہ رونے لگی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس دوران ائر ہوسٹس شگفتہ بھی ہمارے پاس لوٹ آئی۔ میں گدھوں کو مار مار کے بھگانے لگا۔ اس کے بعد ہم تینوں تباہ حال کاک پٹ کی طرف دوڑے۔ اندر کا لرزہ خیز منظر مالا اور شگفتہ کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی دہلا دینے والا تھا۔

مردار خور گدھ ان دونوں بدنصیب میاں بیوی کا بُرا حشر کر چکے تھے۔ بھوک اور بدحال مسافروں کی بے بسی نے ان مرداروں کو بھی دلیر کر دیا تھا۔ ان دونوں مسافروں کے خون آلودہ اور بغیر ڈیلوں کے چہرے بڑا خوف ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ بے چارے تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ رات میں خوں خوار بھیڑیے اور اب دن میں یہ منحوس گدھ...... بڑے کڑے اور اعصاب زدہ حالات تھے ہمارے اردگرد......

میں نے بہرحال ہمت کی اور ان دونوں جوان لڑکیوں کو بھی اسی بات کی تلقین کرتے ہوئے ان دونوں بدنصیب میاں بیوی کی ادھڑی پچھڑی لاشوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور دور لے جا کر...... چھوڑ دیا اور واپس لوٹ آیا۔ پھر دوسرے تباہ حال ڈھانچے سے کمبل اور چادریں لا کر کاک پٹ میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد مالا اور شگفتہ کو بھی اندر بلا کے میں نے کاک پٹ کے اگلے ٹوٹے ہوئے حصے پر کمبل لٹکا دیے اور ایک بڑی سی چادر اسکرین پر لٹکا دی۔

اب ہم تینوں اندر چھاؤں میں تھے۔ باہر گدھوں کے غول آپس میں چیخ چیخ کر لڑ رہے تھے اور شور مچا مچا کر بدنصیب مسافروں کی لاشوں سے ضیافت اُڑا رہے تھے۔

''ثام ابھی تک نہیں لوٹا......؟'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

دونوں کے چہروں پر ابھی تک ہراس طاری تھا۔ ان خوف ناک اور عبرت اثر حالات نے ان کی جیسے قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ تاہم دونوں نے میرے سوال پر بیک وقت اپنے سر نفی میں ہلائے تھے۔ مجھے اب ثام کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ وہ اب تک کیوں نہیں واپس لوٹا تھا؟ کیا اسے کوئی آبادی یا نخلستان نظر آچکا تھا یا پھر وہ کسی مصیبت کا شکار ہو چکا تھا؟ یقین سے بہرحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مجھے اس کی جانب سے بھی تشویش لاحق ہونے لگی۔ میں زیرلب بڑبڑایا۔

''مجھے اس کی تلاش میں جانا ہوگا۔ لگتا ہے، وہ راستہ بھٹک گیا ہے۔''

میری بات پر مالا نے یک دم خوف زدہ ہو کر میرا بازو تھام لیا۔ ''نہیں، نہیں...... تم ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ، ہم پر پھر کوئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے۔'' یوں اس کی دیکھا دیکھی شگفتہ نے بھی مجھ سے یہی التجا کر ڈالی۔

''ہاں...... ! تم مت جاؤ، اگر تم بھی اس مسافر ثام کی طرح راستہ بھول گئے اور یہاں واپس نہ لوٹے تو ہمارا کیا بنے گا؟''

''دیکھو، وہ بھی ہمارا ساتھی ہے۔'' میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہ...... کسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہو۔ ہم جتنی تعداد میں ہوں گے، اتنا ہی ہمارے لیے یہ بہتر ہوگا۔''

وہ خاموش ہو گئیں۔ میں نے جاتے ہوئے ان دونوں کو اس بات کی تاکید کی کہ وہ یہاں سے بالکل بھی نہ نکلیں۔ انہیں یہ ہدایت دے کر میں باہر آ گیا۔

گدھ غائب ہو چکے تھے۔ اِکا دُکا نظر آئے، وہ بھی مجھے دیکھتے ہی کریہہ چیخ کے ساتھ اپنے غلیظ پر پھڑ پھڑاتے ہوئے فضا میں پرواز کر گئے۔

میں ثام کے قدموں کے نشانات پر چل پڑا۔ مجھے ایسا ہی سمجھ میں آرہا تھا کہ ثام کسی پانی کے سراب میں دور تک نہ بھٹک گیا ہو۔ حدِ نگاہ پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں ایسے پانی کے دھوکے ہوتے ہیں۔ یہ سب ریت کے ذرات کی Sequency کا شاخسانہ تھا۔ دور سے یہ ذرات سورج کی روشنی کے انعکاس میں چمکتے تو ریت پر اسی طرح لہریں

pklibrary.com

بناتے ہیں جیسا کہ پانی کی سطح میں لہریں بنتی ہیں۔

بہرکیف...... میں ثام کی تلاش میں اس کے قدموں کے نشانات کی رہنمائی میں کافی دور تک آ گیا۔ لٹا پٹا پڑاؤ بہت پیچھے رہ گیا۔ یہاں میں نے محسوس کیا کہ اس سمت پر کچھ ریتیلے ٹیلے بھی تھے ثام کے قدموں کے نشانات بل کھاتے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔ مجھے اچنبھا ہوا کہ ثام نے طے شدہ قدموں سے زیادہ کا فاصلہ طے کر لیا تھا اور دور نکل گیا تھا، کیوں؟ کیا اسے آگے کوئی نخلستان نظر آ گیا تھا، یا پانی کا سراب......

میں نے اپنے ایک ہاتھ کا...... چھجا بنا کر پیشانی پر رکھا اور سامنے دور تک دیکھنے کی کوشش کرنے لگا اور تب ہی میں چونک پڑا۔ ساتھ ہی مسرت کے بے پناہ احساس تلے میں خوشی سے جھوم اٹھا۔

بہت دور مجھے کھجی کے جھنڈ کا ایک مختصر سلسلہ نظر آیا۔ میں نے غیر یقینی کے سے عالم میں اپنی دونوں آنکھوں کو مسل کر دوبارہ غور سے دیکھا اور یقین ہو گیا کہ وہ ایک چھوٹا سا نخلستان ہی تھا۔

''ضرور اسی نخلستان کو دیکھ کر ہی ثام آگے بڑھ گیا ہو گا۔'' میں نے سوچا۔ لیکن پھر فوراً ہی ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی ابھرا تھا کہ وہ پھر واپس دوبارہ یہاں کیوں نہیں لوٹا؟ اسے تو بھاگ کر ہمیں یہ خوش خبری سنانی چاہیے تھی۔

تھکن کے باوجود میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ تیس، چالیس قدم آگے چلا تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی، وہ یہ کہ میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے میرے پاؤں ریتیلی زمین میں دھنسنا شروع ہو گئے۔ میں رک گیا، جانتا تھا کہ اب میں نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس ریتیلی دلدل میں غرق ہو جاؤں گا اور تب ہی مجھے لگا کہ ثام کے قدموں کے نشانات یہاں آ کر غائب ہو گئے تھے۔

میں جی جان سے لرز اٹھا۔ تو کیا ثام جوشِ مسرت تلے آگے بڑھتا ہوا، ریت کی دلدل میں دھنس کر ڈوب چکا تھا۔ وہ ریت میں زندہ دفن ہو گیا تھا۔ مجھے اس حقیقت کو تسلیم ہی کرنا پڑا اور اس روح فرسا تصور نے مجھے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

اب میں گھٹنوں تک ریت کے اس سمندر میں دھنس چکا تھا۔ یہی روح فرسا انکشاف مجھے کپکپا گیا۔ کیونکہ میں نے جیسے ہی واپسی کے قدم اٹھائے تو میں مزید ریت کے اندر دھنسنے لگا میرے پورے وجود میں موت کی لرزہ خیز دہشت طاری ہو گئی۔ ریت کے اس سمندری بھنور میں محاورتاً نہیں حقیقتاً زندہ درگور ہونے کے مترادف تھا۔ جہنم زار ریگ زار کی یہ دلدل میرے لیے جہنمی قبر ثابت ہو سکتی تھی اور یقینی طور پر جس کا شکار ثام بھی ہو چکا تھا۔

میں نکلنے کی کوشش میں اب گھٹنوں سے ذرا اوپر ہی دھنسا ہوا تھا، میرا پورا جسم مرتعش تھا۔ میں نے بہ مشکل اپنے مختل پڑتے حواسوں کو بحال کیا اور فوری طور پر کوئی تدبیر سوچنے لگا۔ آس پاس کوئی خاردار جھاڑیاں تھوہر (کیکٹس) بھی تو نہ تھا کہ جنہیں پکڑ کر میں آگے بڑھتا۔ دور تک بے آب و گیاہ ریگستان تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں......؟

تب ہی اچانک میرے ذہن میں ایک مبہم سی امید جاگی، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کام لینے کا سوچا۔ ذرا جھکا، اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے ریت پر گاڑے پھر جسم کو آگے حرکت دی، تو کچھ آگے کو سرکا۔ یہ تھیوری کامیاب گئی کیونکہ بالآخر یہ ریت کا ہی سمندر تھا پانی یا کیچڑ کا نہیں۔ تاہم یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ میں ابھی شاید پوری طرح دلدلی ریت کے اندر نہیں دھنسا تھا۔ گڑھا ابھی آگے تھا۔ اس لیے خاصی دیر تو لگی مگر اس طرح چوپایوں کی سی پیش قدمی سے بالآخر میں ریت کے ان اندھے گڑھوں سے نکل آیا۔

ذرا دیر تک میں نرم ریت پر پڑا ہانپتا رہا۔ اس کے بعد پھر کھڑا ہو کر حسرت زدہ نظروں سے نخلستان کو تکتا رہا۔ میری حالت ایسے بھوکے کی سی تھی جس کے آگے کھانے کو رکھا ہو مگر وہ کھانے سے لاچار ہو، لیکن میں مایوس نہ تھا۔

کوئی نہ کوئی راستہ ضرور اس نخلستان تک جاتا ہو گا۔ یہ بہت وسیع صحرا ہے جس کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا جانا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا اور اس راستے سے ہٹ کر دوسرا راستہ ناپا اور اس بار ذرا سنبھل سنبھل کر قدم آگے بڑھانے لگا۔ یوں میں نے آگے بڑھنے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ البتہ احتیاط کی جہاں میرے پاؤں ذرا بھی ریت میں دھنسنا شروع ہوتے میں فوراً پیچھے ہٹ کر راستہ بدل کر آگے بڑھ جاتا۔

بالآخر مجھے ایک محفوظ راستہ نخلستان تک لے گیا۔ اس نخلستان کو دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ نفسیاتی طور پر ہی دور ہو گئی اور میرا مورال سوا ہوا۔

ذرا ہی دور سے اب پیڑوں پر کھجوریں بھی لگی نظر آ رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ مجھے ایک برساتی ''ٹوبہ'' بھی نظر آ گیا، لیکن میں اسے ''شبنمی'' ٹوبہ کہوں گا، کیونکہ جتنی سردی رات میں اس صحرا میں پڑتی تھی اس حساب سے رات گئے

خاصی موتیوں جیسی بوندوں والی شبنم پڑتی رہتی ہوگی۔

میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ٹوبے کے کنارے آکر جھکتے ہوئے پانی کا پہلے جائزہ لیا۔ پانی صاف و شفاف نظر آیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی اوک میں پانی بھرا اور پی کر دیکھا تو وہ میٹھا تھا پھر تو میں نے جلدی جلدی اپنی اوک بھر بھر کے پانی پیا۔ اس کے بعد نسبتاً ایک چھوٹے پیڑ کے نزدیک پہنچا۔ پیڑ کا تنا کھردرا تھا اسی لیے میں بہ آسانی اوپر چڑھ گیا اور کھجوریں کھانے لگا۔

جب اچھی طرح شکم سیری کر چکا تو میں...... اپنے ہی قدموں کے نشانات پر واپس اپنے تباہ حال پڑاؤ کی طرف روانہ ہوگیا۔

بھارتی اداکارہ مالا اور ائر ہوسٹس شگفتہ...... بڑی بے چینی کے ساتھ میری منتظر تھیں۔

میں نے انہیں پہلے تو ٹام کے بارے میں افسوس ناک اطلاع دی پھر نخلستان نظر آنے کی خوش خبری سنائی۔ اس کے بعد ہم نے چادریں کمبل اٹھائے اور نخلستان کی طرف چل دیے جو آخرکار میری ہی دریافت تھی۔

☆☆☆

نخلستان پہنچ کر میں نڈھال سا ہو کر درختوں کے جھنڈ کے سائے تلے ... سا ہو کر پڑ رہا۔ مالا اور شگفتہ تو ... سے پانی پینے لگیں۔ اس کے بعد سر اٹھا کر کھجوروں کے درختوں کو حسرت سے تکنے لگیں۔ میں ان کی بھوک کا اندازہ کر کے اٹھا اور ایک درخت کے اوپر چڑھنے لگا۔

کھجوریں توڑ توڑ کر نیچے مالا اور شگفتہ کی طرف پھینکنے لگا، ایسے میں خود کو بندر ہی محسوس کرنے لگا جو ردِعمل کے طور پر نیچے والوں کو پھل توڑ کر مارا کرتا ہے۔ وہ بے چاری دونوں بھوک سے بے حال تھیں۔ بے تاب ہو کر کھجوریں چن چن کر کھانے لگیں۔ میں نے کچھ اضافی کھجوریں بھی توڑ لیں اور پھر نیچے اتر آیا۔ اب ہم تینوں درختوں کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ گئے۔

پانی پینے اور کھجوریں کھانے کے بعد ہمارے اندر نئی توانائی دوڑتی محسوس ہوئی۔ دور مغرب کی سمت اب سورج جھکنے لگا تھا۔ صحرا کی حدت بہ تدریج کم ہوتے ہوتے ٹھنڈک میں بدلنے لگی۔ ہم نے کمبل اوڑھ لیے۔ ایک بار پھر مجھے ان بھوکے صحرائی بھیڑیوں اور کتوں کے خوف نے آلیا۔ میں تو درخت پر بہ آسانی چڑھ کر اپنی جان بچا سکتا تھا، مگر مالا اور شگفتہ کے لیے شاید یہ مشکل ثابت ہوتا، لٰہذا میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ دونوں کو باری باری درخت پر چڑھنا سکھایا،

اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

رات سر پر آگئی...... چاند کا سنہری ارتھ...... صحرائی ماحول میں بیک وقت طلسماتی اور ہیبت ناک سا تاثر پیش کر رہا تھا۔ ٹھنڈک بھی بڑھنے لگی تھی۔ چہار اطراف ٹھنڈی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ مالا اور شگفتہ دونوں کمبل اوڑھے میرے قریب ہی سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مالا ذرا کمزور اور نازک دل کی ثابت ہوئی اور سسکنے لگی۔ شگفتہ شاید اس کے ناز اٹھانے کے موڈ میں نظر نہیں آرہی تھی، میرا خیال یہی تھا کہ وہی اسے تسلیاں دیتی تو بہتر تھا، اسے خاموش پا کر میں نے ازراہِ تشفی مالا سے کہا۔

''حوصلہ کرو مالا جی! تم تو ایک بڑی اداکارہ ہو۔ تمہیں......''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس خوف ناک صحرائی اجاڑ ویرانے میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہی ہوں؟'' اس نے یک دم اپنی سسکیوں کو بریک لگا کر مجھ سے گھور کر کہا۔ وہ روہانسی اب بھی ہو رہی تھی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا......'' میں نے تصحیح کرنی چاہی۔ ''تم سمجھ دار ہو، ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ایسے میں شگفتہ نے بھی کچھ کہا۔ ''ویسے بڑی حیرت اور افسوس کی بات ہے، اتنا بڑا طیارہ کریش ہوا اور آج دوسرا دن ہے، مگر ابھی تک کسی ملکی غیر ملکی یا مقامی امدادی ٹیم نے اِدھر کا رخ تک نہیں کیا؟'' اس نے انتہائی تلخ لہجے میں تبصرہ کیا۔

''ہاں! سوچنے کی بات تو ہے، میں خود حیران اور پریشان ہوں۔'' میں نے تائیداً کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کرتے کیا ہو؟'' معاً ہی شگفتہ نے موضوعِ سخن بدلا۔ میں نے ذرا یونہی دزدیدہ سی نظروں سے مالا کو دیکھا۔ وہ شگفتہ کو گھور رہی تھی۔ یوں جیسے کہہ رہی ہو کہ محترمہ کو ایسے حالات میں انٹرویو کی سوجھ رہی ہے۔

''میرا نام سیف ہے اور میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

''واؤ...... فنٹاسٹک......'' شگفتہ چہکی۔ مالا سے اب نہ رہا گیا۔ تڑ سے بولی۔

''ایکسکیوزمی...... اس میں بھلا کیا فنٹاسی ہے؟''

''یہی کہ ہم تینوں میں ایک اداکارہ، ایک ڈاکٹر اور ایک ائر ہوسٹس......'' شگفتہ اس کی بات کا بُرا منائے بغیر بولی۔ وہ واقعی زندہ دل ثابت ہوئی تھی۔ ممکن ہے اس میں اس کی پیشہ ورانہ تربیت کا بھی دخل ہو یا پھر اس کی فطرت ہی ایسی

ہو۔

''تیسری شے قضا ہی ہو سکتی ہے۔'' مالا منہ بنا کے بولی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''چلو یہی سہی، ہمیں حوصلہ، ہمت اور صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' شگفتہ مسکرائی۔ مالا نے پھر برہمی سے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے ہونٹ بھینچنے لگی۔ شگفتہ نے بھی شاید بہت اس کا لحاظ کر لیا تھا وہ بھی اسے تیکھے چتونوں سے گھورنے لگی۔ میں ڈر گیا۔ کہیں ان دونوں رتنا کماریوں کے درمیان مہابھارت نہ چھڑ جائے۔ بیچ بچاؤ کی غرض سے بولا۔

''ہم اس وقت سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور ہمیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔''

مالا چونکہ غلطی پر تھی اسی لیے میں نے سمجھانے کی ابتدا بھی اسی سے کی اور بولا۔

''دیکھو مالا! تم بھی ذرا سوچ سمجھ کے کام لو، ہم اس وقت بڑے خوف ناک اور غیر یقینی سے حالات کا شکار ہیں، ایسے میں ہمیں صبر اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''میں پہلے کبھی ایسے حالات سے نہیں گزری۔'' اس نے آہ بھرتے ہوئے ذرا سانس لے کر پھر کہا۔

''میں تو بڑی ناز برداریوں میں رہی ہوں۔ کسی فلم میں بھی اگر ایسے ڈرامائی حالات ہدایت کار پیدا کرتا تھا تو بھی میں گھبرا جاتی تھی اور اسے ور ما سمیت تمام لوگ میرے آگے پیچھے پھر کر میرا دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے تو تب کہیں جا کر میں اگلے شوٹ کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتی۔''

میں اس کی بات پر دانت پیس کر رہ گیا، شگفتہ نے زہریلے طنز سے کہا۔ ''محترمہ اداکارہ صاحبہ! یہاں کوئی شاٹ نہیں ہو رہا۔ سب حقیقت میں ہی ہو رہا ہے، باقی تمہاری ناز برداریوں اور موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اب ہدایت کار یا پروڈیوسر نہیں صحرائی بھیڑیے اور کتے ضرور آنے والے ہیں۔''

''تم کتیا! اپنی زبان بند رکھو، تمہاری میرے آگے اوقات ہی کیا ہے۔'' مالا نے اپنا سارا غبار اس پر نکالا، شگفتہ اس کے گالی دینے پر بری طرح بپھر گئی اور زخمی بلی کی طرح غراتی ہوئی اس پر جھپٹی۔

''تو نے مجھے کتیا کہا، تجھے ابھی بتاتی ہوں۔''

میں کمبل میں لپٹا بیٹھا تھا، شگفتہ کے تیور دیکھ کر یک دم گھبرا کر کمبل سمیت پیچھے کو سرک گیا کہیں مجھ پر ہی نہ چڑھ دوڑتی اور ہوا بھی ایسا ہی...... کیونکہ ان دونوں ناریوں کے بیچ میں جو تھا۔ پھر بھی شگفتہ کی ٹھوکر مجھے لگی اور میں تھوڑا ریت میں لڑھک گیا۔

ادھر شگفتہ میرے لڑھکنے کی پروا کیے بغیر مالا پر چڑھ دوڑی تھی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گتھم گتھا ہو گئیں۔ ایک ایسی جگہ پر جہاں ہم سب کی جان پر بنی ہوئی تھی، مجھے فری اسٹائل لیڈیز ریسلنگ دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ایسے میں کم بخت دل کو لطف بھی آ رہا تھا اور اللہ مارے شل ہوتے دماغ کو سامانِ تسکین بھی میسر آ رہا تھا۔

مالا ایک نازک اندام اور دبلی پتلی لڑکی تھی، رنگت اس کی سانولی مگر شراب کی سی تمتماہٹ لیے ہوئے تھی اور وہ درمیانے قدوقامت کی مالک تھی، عمر کا اندازہ بائیس تئیس سال سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا، جبکہ شگفتہ قدرے دراز قامت، مقابلتاً صحت مند اور گوری رنگت کی ایک دبنگ سی خاتون تھی، عمر بھی اس کی ستائیس اٹھائیس سے کم نہیں معلوم ہوتی تھی۔

اب ہوا یوں کہ شگفتہ کو کچھ مغالطہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ فلموں میں کام کرنے والی ایک بائیس تئیس سالہ نازک اندام اور ناز برداریاں برداشت کروانے والی لڑکی بھلا کیا مقابلے میں ٹھہر پائے گی۔ (آپس کی بات ہے میرا بھی مالا کے بارے میں پہلے یہی خیال تھا)، اور ابتدا میں ایسا ہوتا بھی نظر آیا جب شگفتہ کسی صحرائی بلی کی طرح مالا پر جھپٹ [illegible] اور اسے کمبل سمیت لیتی ریتیلی زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ مجھے ان دونوں سے زیادہ کمبل کی فکر لاحق ہوئی کہیں وہ اس دھما چوکڑی میں خراب اور پھٹ پھٹا نہ جائے لہٰذا وہ میں نے خطرہ بھانپتے ہی ان سے کھینچ کر سنبھال لیا۔

اسی وقت صحرا کے رومان پرور چاندنی ماحول میں ''چٹاخ، پٹاخ'' کی کریہہ ناک آوازیں ابھریں۔ امرِ واقع یہ تھا کہ شگفتہ نے مالا کو رگیدتے ہی اس کے پھول سے چہرے پر تھپڑوں کی تابڑ توڑ بارش کر دی تھی۔ تب ہی میں نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ مالا کو جانے کیسے موقع ملا اور اس نے ریت پر لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگوں کو جوڑ کر اپنے اوپر جھکی شگفتہ کے پیٹ پر جمایا اور اسے خود سے اوپر پیچھے سر کی جانب اچھال دیا۔ وہ ایک قلابازی کھاتی ریت پر گری تو اس کا شارٹ اسکرٹ جو پہلے ہی حوادثِ زمانہ تلے مسکا ہوا اور پھٹا ہوا تھا، وہ اوپر ہو گیا، شرٹ کوٹ کی بھی یہی حالت ہوئی، گری تو اس کی چیخ نکل گئی۔

''ذلیل، کتیا! تو کیا سمجھتی تھی کہ میں صرف مزاحیہ فلموں میں ہی کام کرتی ہوں، اس میں ایکشن بھی ہوتا ہے جو مجھے

سکھایا گیا ہے، ابھی تجھے بتاتی ہوں۔'' مالا نے اپنے بارے میں شگفتلا کو بڑے جوش و خروش سے آگاہ کیا اور پھر اس پر چڑھ دوڑی۔

میں نے یہ لیڈیز ریسلنگ جاری رہنے دی کہ اس سے ذرا خوف کی فضا ہی ختم ہو۔ تاہم سچی بات تھی کہ میری اس دھواں دھار جنگ میں کود پڑنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

مالا کو نیچے گری شگفتلا نے ''جیتنے'' کی ناکام کوشش چاہی تھی، کہ مالا کو ایک اور وار کرنے کا موقع ملا، اس نے شگفتلا پر چھلانگتے ہی اسے بالوں سے پکڑ لیا اور سر اس کا اِدھر اُدھر مارنے لگی، یہ اس کی کوشش ہلکی ثابت ہوئی کیونکہ اسی وقت شگفتلا کا بھی پارا ٹھنڈ کے باوصف ہائی ہو چلا تھا، یوں اس نے سنبھالا لینے میں چنداں دیر نہ لگائی اور مالا کی گردن اس کے دونوں ہاتھوں میں آ گئی، ایک چکر اس نے بھی دیا اور دونوں ہی چیختی غراتی ریت پر گر پڑیں۔ ان کے کپڑے تار تار ہونے کے ڈر سے مجھے اس مہابھارت میں کودنا ہی پڑا، کمبل میرے اوپر لدا ہوا تھا۔ میں اسے خود سے الگ کرنے کی ہمت نہ کر پایا تھا کیونکہ سردی بہت تھی۔

میں کمبل سمیت اُن پر جا پڑا۔ یہ میری غلطی تھی۔ ان دونوں لڑاکا بلیوں نے اپنا سارا ابال میرے اوپر لپٹے ہوئے کمبل پر کچھ یوں نکالا کہ اسے پکڑ کر کھینچا، کمبل مجھ سے الگ ہو گیا۔ میں نے جھٹ سے اپنے دونوں ہاتھ بازوؤں سمیت اگرچہ پیٹ اور سینے پر اس لیے باندھ لیے تھے کہ ٹھنڈ سے بچ سکوں، تاہم لگا ایسا ہی تھا جیسے میں کوئی عورت تھا اور برہنگی کے ڈر سے ہاتھ باندھ لیے ہوں۔

اُدھر وہ دونوں میرے کمبل کو بھی اپنی کشتی میں شمولیت کا اعزاز دے چکی تھیں اور...... اسی کھینچا تانی میں کمبل کی جیسے ہی میں نے مخصوص ''چرچراہٹ'' کی آواز سنی تو میرے اندر کا ٹھٹھرا ہوا ''مرد'' جاگ پڑا اور میں ان دونوں پر جا پڑا۔

سب سے پہلے تو میں نے کمبل کھینچ کر دونوں کو جھٹکے دے کر دور دھکا دیا۔ پھر ان کے درمیان آ گیا اور چلا کر بولا۔

''بند کرو یہ لڑائی...... یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم دونوں نے، تم دونوں کو ذرا بھی اس بات کا احساس نہیں ہے کہ ہم کن بُرے اور بدترین حالات کا شکار ہیں۔''

میری برہمی نے ان دونوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہانپنے لگیں۔ میں نے کمبل پھر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

''چلو، اپنی جگہوں پر آ کر بیٹھو اور آئندہ خیال رکھو۔''

''اسے سمجھا دو، ڈاکٹر سیف......!'' شگفتلا، مالا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''پلیز، کال می جسٹ سیف۔'' میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''او کے۔'' وہ بولی۔ ''یہ یہاں ناز نخرے مت دکھائے۔''

''اسے بھی سمجھا دو سیف!'' مالا بھی تڑ سے شگفتلا کو گھور کے بولی۔ ''آئندہ یہ میرے منہ نہ لگے خواہ میں نخرے کروں یا یہاں ڈانس کروں۔''

''بس، اب بحث ختم، اِدھر آ جاؤ، سردی پڑنے لگی ہے۔ اپنے کپڑوں کا حشر تو دیکھو ذرا...... اگر پھٹ گئے تو کیا پہنو گی؟'' میں نے کہا۔

میری بات پر وہ دونوں جھینپ سی گئیں۔ اب ہم پھر پہلی والی پوزیشن میں آ کر اپنی جگہ آن بیٹھے۔

تھوڑا وقت گزرا، مالا نے گویا پھر چٹکلا چھوڑا۔

''اف...... کافی یا چائے کی طلب ہو رہی ہے۔''

''میرا خیال ہے پاس ہی دو قدم پر ریسٹورنٹ ہے۔'' شگفتلا بھی باز نہیں آئی۔

''شٹ اپ۔'' میں جھلا کر چلایا۔ وہ دونوں ڈر کے چپ ہو رہیں۔ ''اگر تم دونوں اسی طرح لڑتی مرتی رہیں اور فالتو بحث میں وقت ضائع ہم کرتے رہے تو اس صحرائی ویرانے میں عبرت ناک موت ہمارا مقدر ہوگی۔''

''لیکن ہم کریں کیا؟'' مالا بولی۔

''کچھ تدبیر تو سوچ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' شگفتلا نے میری طرف منہ کر کے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کوئی بھی۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ...... ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟ یہ کھجوریں کھا کھا کر ہماری آنتوں کا مربہ بن جائے گا۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کریں؟'' مالا نے پوچھا۔

''ہمیں صبح ہوتے ہی ہمت کر کے آگے بڑھنا چاہیے، شاید کوئی آبادی نظر آ جائے۔''

''مجھے تمہاری اس تدبیر سے پورا اتفاق ہے۔'' شگفتلا نے فوراً کہا۔ مالا کے پاس بھی کوئی چارہ نہ تھا، اس نے بھی صاد کیا۔

pklibrary.com

ہم سو گئے۔ پو پھٹتے ہی ہم جاگے تو ہڑبڑا کر اٹھے۔ اس طرح کہ مالا اور شگفتا سوتے میں کمبل لپیٹے میرے ساتھ آن لگی تھیں۔ میں بدکا تو وہ دونوں بھی بھڑک کر اٹھ بیٹھیں۔ پھر اگلے ہی لمحے سامنے نظر پڑتے ہی میں بری طرح چونکا۔ یہی نہیں، مالا اور شگفتا کی بھی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ ہم تینوں کی ڈری سہمی سی نظریں سامنے جمی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ تعداد میں دس بارہ کے قریب تھے۔ بدن توانا اور سیاہ خاکستری سے...... قد کے گرانڈیل، اودے اور پیلے رنگوں کی کھلی ڈلی پوشاکوں میں ملبوس، سر پر گہرے سبز صافے بندھے ہوئے۔ بال کرلی، آنکھوں سے وحشتیں ٹپکتی ہوئیں۔ کانوں میں پیتل کے بالے جھول رہے تھے۔ یہ سب اچھے قماش کے نہیں نظر آتے تھے۔

وہ سب اونٹوں پر سوار تھے۔ پہلو سے ان کے بندوقیں اور ننگے لمبے پھل والے چھرے تھے۔

ان خوف ناک صورتوں والے انسانوں کا ٹولا دیکھ کر مالا اور شگفتا ہراساں ہوگئیں اور میرے ساتھ چمٹ کر ان کی طرف سراسیمہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ مجھے ان کے نازک بدن خزاں رسیدہ پتوں کی طرح کپکپاتے محسوس ہو رہے تھے۔ بلکہ حقیقت یہی تھی کہ خود میں بھی تشویش زدہ ہو گیا تھا۔

ان لوگوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا اور اونٹوں سے نیچے اتر آئے۔ ان میں ایک گرانڈیل شخص بھی تھا۔ اس کا سر بالکل گنجا تھا۔ ماسوائے..... بالوں کے اس گچھے کے جو اس نے گدی کی جانب سے ایک چٹیا نکال کر پیچھے چھوڑ رکھے تھے۔ نیچے اس نے گھیر دار پھول والی شلوار پہن رکھی تھی جبکہ اوپری بدن برہنہ تھا۔ وہ شاید صحرا کے بدلتے موسموں کے عادی تھے۔

ان سب کی آنکھوں میں گرسنہ چمک تھی۔ میرے ذہن میں ان لوگوں کی وضع قطع دیکھ کر سب سے پہلے یہی خدشہ ابھرا تھا کہ یہ لوگ صحرائی لٹیروں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔

ان لوگوں نے سات آٹھ مزید افراد کو بھی دبوچ رکھا تھا، جن کی گردنوں میں بیلٹ نما زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ جن کے سرے ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان میں ایک خوب صورت اور حسین و جمیل جوان لڑکی بھی تھی جس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا، مگر اس کی صراحی دار گردن میں بھی آہنی کڑا ڈال کر زنجیر منسلک کر رکھی تھی اور اس کا سرا اس گرانڈیل لٹیرے کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا جو مجھے اس گروہ کا سردار معلوم ہوتا تھا۔

''واہ رے...... آج تو بڑا اماں ہاتھ لگ رہا ہے۔'' معاً سردار ٹائپ آدمی نے ہم تینوں کو اپنی انگارا آنکھوں سے گھورتے ہوئے مکروہ لہجے میں کہا۔ اس کے موٹے موٹے بدہیت سیاہ ہونٹوں پر بڑی شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''ڈال دو انہیں بھی زنجیریں، اور لے چلو۔'' اسی نے تحکمانہ غراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھی لٹیروں سے کہا۔ میں بری طرح پریشان ہو گیا۔ مالا اور شگفتا کی پہلے ہی ان خوف ناک صورتوں کو دیکھ کر حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے چلانے لگیں۔

چند لٹیرے ہماری طرف لپکے۔ میں نے مزاحمت کرنی چاہی تو مجھے دبوچ لیا گیا۔ جبکہ مالا اور شگفتا مارے خوف کے غش کھا کر ان کے ہاتھوں میں جھول گئیں۔

ان خبیثوں نے ان کی گردنوں میں بھی آہنی کڑے ڈال دیے۔ میری گردن کو بھی اسی سے ناپا گیا۔ اس کے بعد صحرائی لٹیروں کا یہ قافلہ بدمست اور شیطانی قہقہے لگاتا اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

بہت خطرناک صورت حال تھی۔ یہ لوگ صحرائی لٹیروں سے بھی بڑھ کر خطرناک تھے۔ ان کا تعلق بردہ فروشوں کے گروہ سے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کا آخر ہمیں اس طرح یرغمال بنانے کا مقصد کیا تھا؟ یہ کیا ہمیں فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ یہ تو صدیوں پہلے کا کالا اور مکروہ دھندا تھا جس میں انسانوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔

ان کا ٹھکانا خاصا دور ثابت ہوا تھا۔ مسلسل بغیر رکے نصف گھنٹے تک اونٹ دوڑاتے رہنے کے بعد یہ لوگ ایک گنجان آبادی والے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ بڑا پُررونق علاقہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اگر یہ بردہ فروش تھے تو ان کا آبادی سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ کیونکہ مجھے تو اب تک یہی اندازہ ہو سکا تھا ان کے بارے میں کہ...... ان کا ٹھکانا آبادی سے بھی کوسوں دور.... کسی صحرائی ویرانے میں ہوگا۔

جب ہمیں ایک بلند و بالا اور وسیع و عریض، قلعہ نما مضبوط شہتیروں کی عمارت کے دیوہیکل گیٹ کے قریب لایا گیا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ گیٹ پر چار مسلح دربان موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر دربان نے فوراً گیٹ وا کر دیے۔ یہ سب اونٹوں سمیت اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا۔ یہاں روشنی کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ زیادہ تر مشعلیں روشن

pklibrary.com

تھیں اور کیروسین آئل کے ہنڈولے روشن تھے۔ قلعے کی اندرونی عمارت بہت خوب صورت اور قدیم طرزِ تعمیر کا اچھوتا نمونہ تھی۔ اس کا وسطی دروازہ بھی بلند و بالا اور خوب صورت محرابی طرز کا تھا۔ بیش قیمت لکڑی کے اس بھاری بھرکم دروازے کے دونوں چوبی پٹ، بند تھے۔

یہ لوگ سب اونٹوں سے اتر کر ایک قطار میں باادب کھڑے ہو گئے۔ سردار نے جس حسین و جمیل اور زرق برق لباس والی دوشیزہ کے گلے میں آہنی کڑے کے ساتھ زنجیر منسلک کر کے اس کا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، وہ اس بے چاری کو نہایت بے دردی کے ساتھ گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھی بردہ فروشوں کی قطار سے چند قدم آگے اس محرابی دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا جبکہ ہم اس کے عقب میں اس کے ساتھی بردہ فروشوں کے ساتھ کھڑے رہ گئے۔

قلعے کے وسطی دروازے کے آس پاس بھی مسلح محافظ نظر آئے۔ وہ سب باوردی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خم دار تلواریں اور کارتوسوں والی بندوقیں نظر آرہی تھیں۔ ان کے چہروں پر بھی ان بردہ فروشوں کی طرح بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ایک دربان سردار کی طرف بڑھا۔ سردار نے بھرائی آواز میں اس سے کہا۔

''مہاراجا رتنا سنگھ سے کہو کہ تمہارا مال حاضر ہے۔ ہمیں دام دے دو۔''

اس کی بات پر تلوار بہ دست دربان نے بہ غور پہلے اس حسین دوشیزہ کی طرف دیکھا پھر سردار سے بولا۔ ''اس کی زنجیر کھول دو، مہاراجا کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ میں اسے لے جا کر ان کے سامنے پیش کر دیتا ہوں اور دام بھی لے آتا ہوں۔''

سردار نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دوشیزہ کے گلے سے آہنی کڑا کھول دیا۔ دربان نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ مجھے ایک بات پر حیرت تھی کہ دوشیزہ کے چہرے پر ڈر خوف یا سراسیمگی کے بجائے، پریشانی کے آثار تو نظر آتے تھے، لیکن اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھی پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ آزاد ہوتے ہی اس نے شعلہ بار لہجے میں دربان سے کہا۔

''تمہارے مہاراجا رتنا سنگھ نے دلیار کے مہاراجا دلبیر سنگھ کی بہو کو اغوا کر کے بڑی سنگین غلطی کی ہے مگر کان کھول کر سن لو، میرا نام بھی پھولن بائی ہے اور مت بھولو کہ میں ایک غیرت مند بھائی ہیبت سنگھ کی لاڈلی بہن بھی ہوں جس کا ڈنکا دلیار سے لے گوالیار تک بجتا ہے۔''

اس نڈر دوشیزہ کے لہجے کی گھن گرج میں جانے کیا رعب تھا کہ اسے اغوا کر کے لانے والے بردہ فروش کے چہرے پر اس لمبے چوڑے تعارف نے ایسی دھاک بٹھائی کہ وہ خائف سا نظر آنے لگا۔ تاہم وہ چپ رہا البتہ دربان نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ پھولن بائی نامی اس دوشیزہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہم جانت ہیں اچھی طرح، ہمرے مہاراجا بھی کسی سے کیا کم ہیں، غلطی تو ہارے بھائی ہیبت سنگھ کی تھی۔ اس نے مہاراجا رتنا سنگھ سے وعدہ خلافی کیوں کی تھی، چلو اندر......'' یہ کہہ کر اس نے دو مزید دربانوں کو بھی اشارے سے بلا لیا۔ پھر وہ تینوں پھولن بائی کو اندر گھسیٹ کر لے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہی دربان دوبارہ نمودار ہوا۔ اس بار اس کے ہمراہ دو دربانوں کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بقچیاں تھمی ہوئی تھیں، وہ دونوں انہوں نے سردار کی طرف اچھال دیں۔ اس کے بعد وہ لوگ واپس پلٹ گئے۔

کافی مسافت کے بعد سنگلاخ اور بنجر پہاڑی دامن میں پہنچے تو یہاں مشعلوں اور کیروسین آئل کی روشنی میں گویا ایک نئی ہی دنیا آباد نظر آئی جسے دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔

یہاں صحرائی پہاڑیوں میں گھپائیں بنائی گئی تھیں۔ سرکنڈوں کے جھونپڑے بھی نظر آرہے تھے۔ ایک بلند و بالا پہاڑی میں سنگی ہال نما کمرا بنایا گیا تھا جس کے آگے لوہے کی سلاخیں ایستادہ تھیں۔ ایسے ہی دو سلاخ دار سنگلاخ قید خانے دو اور بھی تھے۔ یہ دو قید خانے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے مگر اندر سے چٹانی دیوار نے انہیں دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

ایک میں مرد قیدی نظر آرہے تھے اور جبکہ دوسرے میں جوان عورتوں اور لڑکیوں کو قید کر رکھا تھا۔ مجھے تو مردوں والے قید خانے بہ الفاظ دیگر جیل خانے میں ڈال دیا جبکہ مالا اور شکنتلا کو عورتوں والے قید خانے کے اندر دھکیل دیا گیا۔

مجھے جس قید خانے میں ڈالا گیا تھا وہاں سخت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کئی قیدی مجھے ننگ دھڑنگ نظر آئے، یوں جیسے ایک ہی حمام میں سب ننگے ہوں۔ فرش پر گھاس پھوس بکھری ہوئی تھی۔ اس مکدر اور تنگ و تاریک سے انتہائی ناگوار ماحول میں میرا دماغ پھٹنے لگا۔ یہاں بارہ تیرہ کے قریب اور بھی قیدی تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر نڈھال سے پڑے ہوئے تھے۔ چند مجھے دیکھ کر آنکھیں پھاڑے تکنے لگے۔

نہ جانے مالا اور شکنتلا کا دوسرے قید خانے میں کیا

pklibrary.com

حال ہو رہا ہوگا۔ میرے لیے یہ ایک ناقابلِ برداشت اور عجیب لیکن بہت ہی خطرناک صورتِ حال تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہاں سے نجات کیونکر مل سکتی ہے؟

یہاں بردہ فروشوں کی بڑی کثیر تعداد دیکھنے میں آتی تھی۔ قیدیوں سے باتوں کے دوران بڑے لرزہ خیز انکشافات سننے میں آئے۔ بقول ان کے بردہ فروشوں کے سردار کا نام جکوان سنگھ تھا۔ اس کا کام یہاں کے راجوں، مہاراجوں کو مہنگے داموں غلام سپلائی کرنا تھا۔ ذرا ذرا سی حکم عدولی پر سردار جکوان سنگھ جسے قیدیوں نے ظالم سنگھ کا نام دے رکھا تھا، بڑی اذیت ناک سزائیں دیتا تھا۔ مجھے یہ سب عجیب لگا، یوں جیسے قصے کہانیوں کا کردار بن گیا ہوں۔

''کیا فروخت ہونے کے بعد کسی غلام نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی؟''

''کی تھی۔'' ایک قیدی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر بھاگ کر کہاں جاسکتا تھا؟ اسے فوراً دھر لیا جاتا اور ظالم سنگھ کے حوالے کر دیا جاتا۔ ظالم سنگھ انہیں تین دنوں تک مسلسل اذیت سوز تشدد میں رکھتا اور پھر دوبارہ اسے انہی لوگوں کے حوالے کر دیتا تھا جنہیں اس نے فروخت کیا ہوتا تھا پھر کسی میں فرار ہونے کی جرأت نہ ہو پاتی تھی۔'' اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اکثر ان لوگوں سے سخت چٹانیں...... توڑنے کا مشقت طلب کام بھی لیا جاتا تھا۔

''اور عورتوں لڑکیوں کا یہ کیا کرتے ہیں؟'' میں لرزتے دل سے پوچھا۔

''ان بے چاریوں کا تو ہم سے بھی زیادہ برا حشر ہوتا ہے۔ ذرا سی غلطی پر اس بدنصیب عورت کو برہنہ کر دیا جاتا اور پھر انہیں بھی عیش پرست راجوں، مہاراجوں کی باندیاں بنا دیا جاتا تھا۔'' میں یہ سن کر لرز اٹھا۔

''کیا قانون کے رکھوالوں کو یہ سب نہیں معلوم؟''

''قانون؟'' ایک دوسرا قیدی استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''یہاں صرف انہی راجوں، مہاراجوں کا قانون چلتا ہے اور ظالم سنگھ بھی انہی لوگوں کی پیداوار ہے۔''

میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ مجھے اب مالا اور شکنتلا کی فکر ہوئی اور خدشہ ہوا کہ کہیں وہ دونوں بدحواسی میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھیں، اگر وہ یہاں ہوتیں تو میں انہیں سمجھا بجھا کر رکھنے کی کوشش کرتا۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ پانچ قیدی ہمارے قید خانے سے زنجیریں ڈال کر نکالے گئے۔ ان کی شاید قیمت لگ چکی تھی۔ اس طرح عورتوں کے قید خانے سے بھی تین چار عورتوں کو باہر نکالا گیا۔ کسی کو رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی بھی اجازت نہ تھی لیکن اچانک مجھے عورتوں والے قید خانے سے کسی کی نسوانی چیخیں بلند ہوتی سنائی دیں۔ میں ٹھٹک گیا۔ قیدیوں کو آنے والوں کے سپرد کرنے کے بعد اس چیختی چلاتی عورت کو چند بردہ فروشوں نے باہر گیٹ سے نکالا تو میں دھک سے رہ گیا۔

وہ ائر ہوسٹس شکنتلا تھی جو ابھی تک ہسٹریائی انداز میں چیخ چلا رہی تھی اور ہاتھ جوڑ کر سردار ظالم سنگھ سے دادفریاد کر رہی تھی۔ میں گم صم سا تھا۔

آن واحد میں شکنتلا کو بردہ فروشوں نے گھیر لیا۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے بولے۔ ''اور چیخو اور چلاؤ...... شور مچاؤ......'' ظالم سنگھ اسے بالوں سے پکڑ کر دائیں بائیں گھسیٹتا ہوا خوں خواری سے بولا۔ پھر اس کے چہرے پر زور سے تھپڑ جڑ دیا۔ شکنتلا کے حلق سے اذیت ناک چیخ نکل گئی اور وہ دوسرے موٹے سیاہ بردہ فروش کے ساتھ جا ٹکرائی۔ وہ خبیث اس کے کپڑے تار تار کرنے لگا۔ باقی سب نیم دائرے کی صورت میں کھڑے شیطانی قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی گرسنہ نظریں شکنتلا کے بدن پر چپکی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد شکنتلا کو جانے کی اجازت دی اور وہ اپنے کپڑے اٹھا کر دوبارہ قید خانے کی طرف دوڑ گئی۔

عورت ذات کی یہ بے حرمتی دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ میں ان مردوں پر لعنت ہی بھیج سکتا تھا، لیکن دل میں...... ورنہ یہ میرا بھی برا حشر کر سکتے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہوا یہ دو قید خانے ساتھ ساتھ ہی بنے ہوئے تھے۔ میں کیا کر سکتا تھا، خود پابہ زنجیر تھا میں...... ماسوائے سنگی دیواروں سے سر ٹکرانے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

انسانیت کی یہاں جس طرح تذلیل کی جارہی تھی اس کی مثال میں نے اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ طیش ان عیش پرست راجوں، مہاراجوں پر آرہا تھا جن کے یہ لوگ (بردہ فروش) پیداوار تھے۔ میں خدا سے دعا ہی کر سکتا تھا کہ وہی ہماری مدد کرتا۔

کھانے کے نام پر ہمیں سوکھی روٹیاں اور پتلی دال دی گئی۔ ان میں ابلے ہوئے چاول بھی کبھی کبھی شامل ہوتے تھے۔ اس طرح ہمیں ان کی قید میں رہتے ہوئے تین روز بیت گئے۔

یہ لوگ ہم سے بڑی کڑی مشقت بھی لے رہے تھے۔ ہمارے پیروں میں زنجیریں ڈال کر ہم سے چٹانی پتھر بھی

تڑوائے جاتے تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں کی حالت زیادہ دگرگوں تھی۔ انہیں جان بوجھ کر مختصر اور پھٹے ہوئے کپڑے پہننے کو دیے جاتے اور ان سے بھی یہ مشقت طلب کام لیا جانے لگا۔ ہماری نگرانی میں بردہ فروشوں کی پوری ٹیم ہوتی تھی جو ہاتھوں میں ہنٹر تھامے ہمارے سروں پر مسلط رہتے تھے۔ ذرا بھی کوئی مرد یا عورت سستی کا مظاہرہ کرتا، ان پر ہنٹروں کی بوچھاڑ کر دی جاتی۔ ایک موقع پر پتھر کوٹنے کے دوران میں نے مالا اور شکنتلا کو تسلی دیتے ہوئے یہ ہدایت بھی کہ صبر و برداشت کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کریں اور کوئی ایسی غلطی ہرگز نہ کریں جس سے ان کی بے حرمتی اور بے عزتی ہو، وغیرہ۔

اچانک مجھ پر ایک بردہ فروش کی نظر پڑ گئی۔ مجھے ان کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر اس نے مجھ پر تابڑ توڑ ہنٹر برسانے شروع کر دیے۔ میں تکلیف کے مارے چلّانے لگا۔ مالا اور شکنتلا اس ظالم کی منتیں سماجتیں کرنے لگیں تو اس بدبخت نے ان پر بھی دو چار ہنٹر برسا دیے۔ میرے پاؤں میں ایک آہنی کڑا پڑا ہوا تھا جس سے منسلکہ زنجیر دوسرے قیدی کے پاؤں میں لگے کڑے سے جڑی ہوئی تھی مگر میرے ہاتھ اور دوسرا پاؤں آزاد تھے۔ بردہ فروش تنومند تھا۔ ایک موقع پر میرا دماغ گھوم گیا اور میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اس کا ہنٹر پکڑ لیا اور ایک گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ ہنٹر کے دستے پر اس کی گرفت چھوٹ گئی تھی۔ وہ میں نے اپنے قبضے میں کرتے ہی بے تحاشا اس پر برسانا شروع کر دیا، ایک غبار تھا ایک اُبال تھا میرے اندر جو اتنے دن ان کی زیادتیاں برداشت کرتے کرتے بالآخر باہر امڈ پڑا تھا اور میں اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔

اسی اثنا میں دوسرے بردہ فروش غراتے ہوئے مجھ پر پل پڑے۔ میرا ایک پاؤں زنجیر میں بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، آن واحد میں مجھ پر ہنٹروں کی بارش کر دی گئی۔ مالا اور شکنتلا میری حالتِ زار پر رونے لگیں۔ ہنٹروں کی پے در پے ضربات میرے لیے ناقابل برداشت تھیں اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو تنہا زمین پر پڑے پایا۔ میں قید خانے میں نہیں تھا۔ یہ ایک کھلی جگہ والی کوٹھری تھی۔ سردار جکوان سنگھ میرے سر پر ملک الموت بنا کھڑا تھا۔ اس کی لال انگارا آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، باقی چند ساتھی بھی اریب قریب کھڑے مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔ میرا چہرہ اور جسم پانی سے شرابور تھا، شاید مجھے ہوش میں لانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

''تم نے ہمت کیسے کی میرے آدمی پر ہاتھ اٹھانے کی؟'' سردار ظالم سنگھ نے مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر کہا۔

''میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ تمہارے ساتھی نے مجھ پر بلاوجہ ہی ہنٹر برسانے شروع کر دیے تھے۔ مجھے اس کے ہاتھوں بے خطا مار کھانے پر طیش آ گیا تھا۔'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ بردہ فروش بھی وہیں موجود تھا۔ سردار نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے سردار کی استفساریہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہی بولا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے سردار! یہ وہاں دوسرے ساتھی قیدی لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا۔''

''ہاں! یہ سچ ہے؟'' میں نے پینترا بدلا۔ ''وہ بیمار ہے۔ میں اس کی دوا دارو کرنا چاہتا تھا، کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔'' میں نے دانستہ ڈاکٹر کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یوں میری توقع کے عین مطابق سردار ظالم سنگھ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور وہ مجھ سے استفساریہ بولا۔

''تم واقعی ڈاکٹر ہو؟''

''ہاں۔''

''یہ تو اور اچھی بات ہوگئی۔ ہم تمہیں... اپنے ہی پاس رکھیں گے، تمہیں فروخت نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہمیں ہمیشہ ایک ڈاکٹر کی ضرورت رہتی ہے۔'' سردار خوش ہو کر بولا۔

میرے بتانے کا بھی یہی مقصد تھا کہ میں علاج معالجے کے معاملے میں ان کے قریب رہوں، مشقت طلب کاموں سے بھی بچا رہوں اور کوئی تدبیر بھی کر سکوں۔ ورنہ اگر یہ مجھے کسی مہاراجے کے ہاں فروخت کر دیتے تو وہاں نہ جانے کیا حالات ہوتے؟ مگر درحقیقت میرا اصل مقصد یہی تھا کہ مالا اور شکنتلا کو بھی میں فروخت ہونے سے محفوظ رکھوں، وہ دونوں انڈین تھیں اور میں اس وقت حادثاتی طور پر بھارت کی سرزمین پر موجود تھا اور اچھے وقتوں میں یہ دونوں خواتین میرے لیے کچھ نہ کچھ مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔

''ہاں، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کسی اور کا غلام بننے کے بجائے تمہارا غلام بنا رہا ہوں۔ کیونکہ میرا دنیا میں کوئی نہ رہا، جہاز کی تباہی نے میرا سب کچھ ختم کر ڈالا۔''

میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ سے کام لیتے

pklibrary.com

ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”مگر میں اپنی دونوں ساتھیوں کے بغیر ادھورا ہوں۔ وہ میری اسسٹنٹ اور نرسیں ہیں۔“

میری توقع کے عین مطابق اس کی پھر آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”اچھا! یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہمیں اپنی تیمارداری کے لیے بھی ایسی ہی عورتیں درکار ہیں۔ تم اب سب سے پہلے ہمارا علاج کرو گے۔“

”مجھے تمہاری خدمت کر کے خوشی ہوگی۔“ میں نے تیر نشانے پر بیٹھتے ہی فوراً سردار سے مکارانہ فروتنی سے کہا۔

”میری بیوی روشنا کافی روز سے بیمار ہے، خود میرے سر میں اکثر اور بڑا شدید درد رہتا ہے۔ ہم شہر بھی نہیں جا سکتے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں مختلف امراض میں استعمال ہونے والی دواؤں اور انجکشنوں کی ایک فہرست بنائے دیتا ہوں۔ وہ تم شہر سے منگوا کر یہاں رکھ سکتے ہو۔“ اس نے فوراً سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔

سردار ظالم سنگھ نے ایک دن کے اندر ساری دوائیں اور کچھ میڈیکل اینڈ سرجیکل آلات اور بکس منگوا لیے تھے۔ ان سنگ دل اور بے رحم و بے حس لوگوں کو رام کرنا میری ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس میں اب پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتا تھا۔ مالا اور شکنتلا کو بھی میں نے سمجھا دیا تھا۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے بڑے صبر اور استقامت کی ضرورت تھی۔

ایک موقع پر میں مالا کو اپنی اس چالاکی سے آگاہ کر چکا تھا اور اس نے شکنتلا کو خبر دی کہ میں کس طرح ان سنگ دل شیطانوں کو رام کرنے میں مصروف تھا اور اب وہ دونوں (مالا اور شکنتلا) بھی میری ہدایت پر عمل کر رہی تھیں۔

یوں میں نے سب سے پہلے سردار جکو ان سنگھ کا طبی معائنہ کیا تھا۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ میں نے اسے بلڈ پریشر میں استعمال ہونے والی گولیاں کھانے کو دیں تو وہ خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس کا مستقل سر درد بھی ختم ہونے لگا تھا۔ وہ پہلے یقیناً درد کے مارے سر ادھر اُدھر مارتا تھا مگر اب آرام ملنے پر خوشی سے سر دھنتا۔ اب تو وہ اور خوش ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس کی بیوی کا بھی علاج کرنے لگا۔ اس کا نام روشنا تھا۔ اسے پرانا ملیریا تھا۔ یوں میرے علاج سے وہ بھی بھلی چنگی ہونے لگی۔

مجھے جہاں سردار کی خوشنودی حاصل ہوئی تھی وہاں ایک نقصان یہ بھی ہوا تھا کہ ہم تینوں کی نگرانی بھی سخت کر دی گئی تھی، وجہ ظاہر ہے یہی رہی ہوگی کہ ہمارا فرار ہونا اب ان مردودوں کے ان کے مال سے کئی گنا زیادہ ”طبی“ نقصان ہوتا۔ تاہم اس خدشے سے ہم بچ گئے تھے کہ ہمیں کہیں فروخت نہیں کیا جاتا تھا۔

بہرکیف...... ہم تینوں کے لیے سر دست یہی کیا کم تھا کہ اب ہمارے ساتھ دوسرے قیدیوں کی طرح بُرا اور ناقابلِ رحم سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ نہ ہی ہمیں مشقت کرنا پڑتی نہ کوڑے کھانا پڑتے، جگہ بھی نسبتاً بہتر رہنے کو دی گئی تھی۔

سردار کی بیوی روشنا ایک ادھیڑ عمر اور مردم مار عورت نظر آتی تھی۔ وہ صحت مند حد تک ہی فربہی مائل تھی۔ رنگت تو سانولی تھی مگر خاصی پُرکشش۔ عمر پینتیس، چالیس کے درمیان ہی رہی ہوگی۔ یوں اس کا جسم فربہی مائل ضرور تھا مگر کسا ہوا تھا ڈھلکا ہوا نہیں۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی جنسی کشش تھی۔ کپڑے بھی وہ بہت مختصر اور چست قسم کے پہنتی تھی۔ وہ میری بہت احسان مند تھی۔ وجہ یہی تھی کہ میں نے اسے ایک پرانی بیماری سے نجات دلائی تھی۔

ہمیں قید خانے کے بجائے اب ایک جھونپڑا دیا گیا تھا۔ اگرچہ باہر اب بھی سخت پہرا ہوتا۔ جھونپڑا خاصا کشادہ تھا اور اس میں مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی تھی، حالانکہ میں نے سردار سے گزارش کی تھی کہ مالا اور شکنتلا جب تک یہاں رہیں [illegible] مجھے ایک چھوٹا سا جھونپڑا دیا جائے مگر میری اس درخواست کو اس چنیا والے سردار نے بڑی نخوت سے رد کر دیا تھا۔

”مجھ سے ان وحشیوں کی نرس بن کر خدمتیں نہیں ہوتیں۔“ ایک روز مالا نے تنگ آکر کہا۔

”تو نرس نہ سہی نوکرانی بن کر خدمت کروا لو ان کی......“ شکنتلا جو اس کا نخرا سہنے کے بالکل بھی موڈ میں نہیں ہوتی، جل کر بولی۔ اس جواب پر مالا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ شکنتلا کی تب بھی بھڑاس نہ نکلی۔ اس بار مجھ سے مخاطب ہو کے دوبارہ اسے چوٹ کی۔

”ڈاکٹر صاحب! ان محترمہ سے کہو کہ یہاں کسی فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے، سب کچھ حقیقت ہے اور یہ بھی کہ ہم ان لوگوں کے اس وقت خدمت گار ہی ہیں۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔“ مالا پھٹ پڑی۔ ”میری جو حیثیت ہے وہ وہی رہے گی بدل نہیں سکتی۔“

”محترمہ! آپ نے پھر وہی بے کار کی بحث شروع کر دی۔“ میں نے پھر ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے کہا۔ تخاطب مالا ہی تھی۔ اس کے سر پر کچھ زیادہ ہی غرور سوار تھا۔ اسے سمجھاتے ہوئے میں آگے بولا۔

''اس وقت ہم سب کی جان پر بنی ہوئی ہے، شاید تمہیں ابھی تک اس کا اندازہ نہیں ہو پایا ہے۔''

''ہے مجھے اندازہ اچھی طرح۔'' مالا نے منہ پھلا کر کہا۔ ''لیکن میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیں اب یہاں سے فرار کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم انہیں خاصی حد تک رام کر چکے ہیں۔''

''خوب!'' شگفتلا باز آنے والی کہاں تھی۔ طنزیہ بولی۔ ''محترمہ ادکارہ صاحبہ کو کچھ زیادہ ہی خوش فہمیاں چڑھی ہوئی ہیں۔''

''تم چپ رہو یار ذرا......!'' میں نے شگفتلا کو ٹوکا پھر مالا سے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔

''مالا! تمہیں واقعی موجودہ حالات کی سنگینی کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہے۔ شکر کرو کہ میں نے جو چال چلی، وہ اس حد تک تو کامیاب رہی ہے کہ ہمیں کوئی مشقت طلب کام نہیں کرنا پڑ رہا اور نہ ہی ان کی بیہودگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس دوران تم نے دیکھا نہیں کہ کتنے مرد عورت قیدیوں کو یہ ہمارے سامنے ہی فروخت کے لیے لے جا چکے ہیں۔ تھوڑا صبر کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے، یہاں تک اس نے مدد فرمائی ہے وہ آگے بھی ہماری مدد کرے گا۔''

مالا چپ ہو رہی۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ ہمیں کھانے پینے کے لیے اب اچھی خوراکیں دی جاتی تھیں۔ شام ڈھلی تو ایک پہرے دار نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں یہی سمجھا کہ سردار یا اس کی بیوی یا پھر اس کے کسی ساتھی کی طبیعت خراب ہوگی۔

میں مالا اور شگفتلا کو آپس میں نہ الجھنے کی ہدایت کر کے، دواؤں کا تھیلا اٹھا کر جھونپڑے سے نکلا تو پہرے دار مجھے سردار کی بیوی روشنا کے جھونپڑے کے اندر جانے کا اشارہ کر کے خود وہیں باہر ہی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

میں اندر داخل ہو گیا۔

عجیب ہوشربا ماحول میرا منتظر تھا۔ اندر مشعل روشن تھی۔ جس سے جھونپڑے کی محدود فضا گرم تھی۔ روشنا اندر تنہا تھی۔ وہ زمین پر پھیلی گھاس پھوس پر بچھی موٹی چادر پر پہلو کے بل اپنی صحت مند کمر کا قیامت خیز خم نکالے نیم دراز تھی۔ اس کے بھرے بھرے سانولے بدن پر محض ایک مٹیالی اور باریک ململ کی ساڑی نما دھوتی بندھی ہوئی تھی۔ جس کا مختصر سا بلاؤز ''تکلفاً'' ہی اوپر تک تھا۔ اس کے ہونٹ غیر معمولی طور پر بھرے بھرے اور ادھ کھلے سے نظر آتے، مشعل کی روشنی میں اس کا نیم عریاں سانولا جسم چمک رہا تھا، نجانے اس نے کس جانور کی چربی کا تیل اس وقت مل رکھا تھا، جس کی عجیب حیوانی اور حواسوں پر چھا جانے والی بو بھی اس رنگین و سنگین ماحول میں رچی ہوئی تھی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر باوجود کوشش ضبط کے میرے سینے میں طوفانی ہلچل ہونے لگی۔ میں کوئی فرشتہ تو نہ تھا، عام انسان ہی تھا اور جوان بھی۔ وہ مجھ سے دس پندرہ سال بڑی ہی رہی ہوگی، جبکہ اس کا شوہر جکوان سنگھ البتہ عمر رسیدہ، جس کی عمر کا اندازہ مجھے پچاس، پچپن کے ہی پیٹے میں ہوا تھا۔

میں یک ٹک اسے اس قیامت خیز انداز میں تکتا رہ گیا۔ اگرچہ تیل اور تیل کی دھار کو میں بھی سمجھ چکا تھا اور یہی پینترا مجھے بدل کر غیر یقینی فضا کو اپنے اور اپنی دونوں ساتھیوں کے حق میں کرنے کا ایک ''رنگین'' موقع مل رہا تھا تو کیا قباحت تھی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔

روشنا نے بھی میری نگاہِ شوق بھانپ لی تھی، اس کے ہونٹ معنی خیز انداز میں کچھ اور وا ہوئے، وہ اسی طرح لیٹی مخمور نگاہوں سے مجھے تکے جا رہی تھی، اس کی آنکھوں کا نشہ بتا رہا تھا کہ معاملہ طبیعت کی خرابی سے ہٹ کر تھا۔ ادھیڑ عمری کے باوجود اس کے اندر جذبات کی ہلچل اس کے لبوں کے ارتعاش سے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ایک چھاگل نما بوتل اس نے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔

''آؤ...... ڈاکٹر! بیٹھو میرے قریب......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا تو میں خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟''

''ہاں، ڈاکٹر! آج میری طبیعت خراب ہی ہے۔ میرا معائنہ کرو...... بہت اچھی طرح...... اور ذرا...... کھل کر......'' اس نے کہا۔ اس کی آواز اور لہجہ اس کی ہوش مندی کا ساتھ دیتے...... محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ میں اندر سے کھٹک رہا تھا اور تشویش زدہ بھی ہو رہا تھا کہ نجانے...... اب کیا گل کھلنے والا تھا۔ وہ ایک وحشی سردار کی بیوی تھی۔ جکوان سنگھ کی دہشت کم نہ تھی۔ اسی وقت جب میں اپنے اعصاب پر قابو پاتا ہوا دواؤں کا تھیلا سنبھالے اس کے اور قریب آیا۔ پھر اس کے نزدیک بیٹھا تو...... اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہی وہ وقت تھا جب...... کوئی دَرانہ وار اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے چونک کر گردن موڑ کے دیکھا۔ وہاں سردار جکوان سنگھ کھڑا تھا۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

pklibrary.com

pklibrary.com

جواز

عمران قریشی

ازدواجی زندگی کے آغاز سے ہی نئی خواہشات جنم لیتی ہیں... اور رفاقت کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے... مگر خواب کے صلے میں عذاب پیچ و تاب کی صورت میں بیچے جاتے ہیں... ایسے ہی ایک شادی شدہ جوڑے کا دردناک قصّہ... طویل رفاقت کے بعد ان کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں...

بے جواز بات کو جواز بنا کے کھیل بگاڑنے والوں کا احوال......

میں دو دن قبل امریکا نئے سال کی تقریبات میں شرکت کی نیت سے آیا تھا۔ ان دو دنوں میں جمیل سے ملاقات کم ہی ہوسکی۔ وہ صبح نوکری پر جاتا اور رات کو ٹیکسی چلاتا تھا۔ فلیٹ میں شاذونادر ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے مختلف تقریبات میں شرکت کی۔ یہ سب موی کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ دو دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ آج میری واپسی تھی۔ وہ اپنی مصروفیات کو پسِ پشت رکھ کر مجھے چھوڑنے کے لیے ائرپورٹ آیا تھا۔ عمارت میں داخل

ہونے پر میں نے کچھ چبھتا ہوا سوال پوچھا۔
''تمہاری بیوی دکھائی نہیں دی۔ غالباً میرین نام تھا، کہاں ہے؟''
''میں نے طلاق دے دی۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور میرے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔ میں طلاق اور ازدواجی مسائل سے بھاگ کر امریکا آیا تھا اور یہاں بھی وہی طلاق، نفرتیں اور دوریوں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ امریکا آتے ہوئے میرے ساتھ پاکستان سے تعلق رکھنے والے بہن بھائی سفر کر رہے تھے۔ لڑکے نے امریکا آنے کے لیے اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دی تھی کہ وہ اس کے بیرونِ ملک جانے میں دخل اندازی کر رہی تھی اور اب جمیل بھی طلاق کی بات کر رہا تھا۔
''رک کیوں گئے؟'' اس نے میری طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی مسئلہ تو نہیں؟''
میں نے انکار میں سر ہلایا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا صوفوں کی طرف آ گیا۔
''تم نے اسے طلاق کیوں دی؟'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔
''وہ تنگ کر رہی تھی۔ آئے دن فلیٹ میں پارٹیاں، لڑکیوں سے تعلق، شور شرابا، مجھے یہ سب پسند نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی نوبت طلاق پر چلی آئی۔'' اس نے اٹیچی کیس کو صوفوں کے درمیان رکھتے ہوئے پوچھا۔
''ارشد بتا رہا تھا کہ تم میں اور تمہاری بیوی میں بھی کوئی اَن بن چل رہی ہے۔ شاید ناراض ہو کر ماں کے گھر بیٹھی ہوئی ہے؟''
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے گلے کو دبا کر سانس کی نالی کو بند کر دیا ہو۔ میں مومی کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک دن تھے۔ ان سے فرار ہو کر تو میں امریکا آیا تھا۔ جمیل نے میرے چہرے کے تاثرات سے دلی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے لگتا ہے کہ میری طرح تم بھی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہو۔ فکر نہ کرو، سب بہتر ہو جائے گا۔ مجھے دیکھ لو، دو شادیاں کر چکا ہوں۔ امریکا والی کو طلاق دے دی اور پاکستان والی خون نچوڑ رہی ہے۔ دن کو نوکری کر کے تمام آمدنی طلاق یافتہ بیوی کے حوالے کرتا ہوں اور رات کو ٹیکسی چلا کر ملک میں اپنی بیوی بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں۔''

میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے یار۔ میری بیوی بہت سمجھ دار اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ پندرہ سال کی رفاقت کے دوران ہمارے درمیان لڑائی جھگڑے کی نوبت کم ہی آئی۔ مجھے صحیح طرح یاد نہیں۔ شاید پہلا جھگڑا اماں اور بہن سے علیحدگی کے اصرار پر ہوا تھا۔ مومی ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔''
جمیل نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''اس نے علیحدگی کا تقاضا کیا اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ سمجھ دار ہے؟''
میں نے جواب دیا۔ ''عورتیں کبھی مل جل کر نہیں رہ سکتیں۔ انہیں علیحدہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ اس لیے میں نے الگ گھر لے لیا۔'' جمیل کے چہرے پر غصے کے تاثرات پیدا ہوئے۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ اس کا ہمارے گھر آنا جانا، کھانا پینا روزمرہ کے معمولات کا حصہ تھا۔ وہ میری ماں اور بہن کو اپنی ماں، بہن سمجھتا تھا اس لیے اسے غصہ آنا فطری عمل تھا۔
''امی اور عاشی کا کیا ہوا؟'' اس نے تاسف بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''ان کی ذریعۂ آمدن تمہاری کمائی کے علاوہ نہیں تھی؟''
''ایسی بات نہیں۔ عاشی پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہے۔ شام کو بچے ٹیوشن پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ میں بھی وقتاً فوقتاً مدد کرتا رہتا ہوں۔''
جمیل نے پوچھا۔ ''کیا مومی علیحدہ ہونے کے بعد مطمئن ہوئی یا پھر دوبارہ کوئی تقاضا کیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خوش نہیں ہوئی ہوگی؟''
میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''وہ دل کی بہت اچھی تھی۔ نئے گھر آنے کے بعد بہت خوش ہوئی۔ اس نے کبھی مجھ سے مزید کا تقاضا نہیں کیا۔ تاہم تنخواہ میں سے بچت کر کے مختصر رقم مجھے امی اور عاشی کے حوالے کرنا ہوتی تھی۔ اسے اکثر شک پڑ جاتا تھا، تب تلخ کلامی ہوتی تھی۔''
''تم اس کے لیے تھا کا صیغہ استعمال کر رہے ہو، کیا طلاق ہو چکی ہے یا پھر معاملہ زیرِ بحث ہے؟'' اس نے پوچھا۔
میں نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ ''شاید دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس رہنے کے لیے گئی تھی۔ جلد ہی مجھے اس کا فون موصول ہوا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ تب اس نے وجہ بتانے کے بجائے طلاق کا مطالبہ کیا۔ میرے ہوش و

حواس گم ہو گئے۔ طلاق کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ اس کے پاس نہیں تھا۔ بس وہ اصرار کیے جارہی تھی کہ اسے طلاق چاہیے۔ میں نے غصے میں فون بند کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دوبارہ فون کرے گی لیکن اس نے فون نہیں کیا۔ دوسرے دن میں نے اس کی ماں کو فون کیا۔ وہ میری آواز سنتے ہی آگ بگولا ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے بے نقط سنائیں اور چند الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا۔ میں وہ باتیں تمہیں بتاتا ہوں۔

''موی تمہارے ساتھ خوش نہیں، پندرہ سالوں کے دوران اس نے ایک دن بھی سکھ کا سانس نہیں لیا۔ اسے طلاق دے دو۔ ورنہ کورٹ سے رجوع کرے گی۔''

جمیل نے طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ''یقیناً اسے وہاں کوئی پسند آ گیا ہوگا۔ وہ تمہیں اس کے متعلق بتانا نہیں چاہتی ہوگی۔ اس لیے طلاق مانگ رہی ہوگی۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں نے اس سے دوسری شادی کے متعلق پوچھا تھا۔ اس نے غصے میں فون بند کر دیا۔ وہ ایسی عورت نہیں جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ معاملہ کچھ اور ہی تھا جس کے متعلق مجھے بتایا نہیں جا رہا تھا۔''

جمیل غصیلے لہجے میں بولا۔ ''معاملہ جو بھی تھا، وجہ ایک ہی ہو سکتی ہے دوسری شادی۔ طلاق سے قبل میری بیوی اور میرے درمیان بھی کچھ ایسی ہی بات چیت ہوئی تھی لیکن وہ اب تک دو شادیاں اور کر چکی ہے۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''مغرب اور مشرق کے ماحول میں فرق ہے۔ یہاں عورتوں کو آزادی حاصل ہے، وہاں نہیں ہے۔ اس کی ماں سے بات چیت کے بعد میں نے موی کے گھر جا کر تفصیلی بات چیت کا فیصلہ کیا لیکن مجھے آفس سے چھٹی نہیں مل سکی۔ آڈٹ ہونے والے تھے۔ اس لیے اسٹاف کا سیٹوں پر ہونا ضروری تھا۔ میں نے دوبارہ موی کو فون کیا لیکن اس نے موبائل آف کر دیا۔ میں الجھ کر رہ گیا۔ اگر مجھے سزا دی جارہی تھی تب مجھے وجہ بھی معلوم ہونی چاہیے تھی۔''

جمیل بولا۔ ''مجھے ارشد نے بتایا تھا کہ اس کی پہلے بھی کہیں بات چیت ہو چکی تھی، معاملہ وہیں سے خراب ہوا ہوگا۔''

میں نے بتایا۔ ''مجھ سے شادی سے قبل اس کی منگنی خالہ زاد کزن سے ہوئی تھی لیکن جلد ہی ختم ہو گئی۔ مجھے موی نے اس کے متعلق شادی سے پہلے ہی بتا دیا تھا۔''

جمیل بولا۔ ''اس کے باوجود بھی اگر وہ تم سے طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی تو پھر کوئی نہ کوئی وجہ پسِ پردہ ضرور ہو گی۔ تمہارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ تم مصروفیت کی بنا پر اس سے ملنے جا نہیں سکتے تھے، اگر مل بیٹھ کر بات چیت کر لیتے تو بات کھل جاتی۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہاں، میں ایک مہینے کے لیے آفس میں پھنس گیا تھا اور میرا اس سے جلد از جلد بالمشافہ بات کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اس کی خالہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے دن انہیں فون کیا۔ انہیں ہمارے مسئلے کے متعلق معلوم تھا۔ تاہم طلاق کے جواز سے وہ بھی لاعلم تھیں۔ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ جلد ہی بات چیت کرنے کے لیے موی کے گھر جائیں گی۔ انہوں نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔ یہ سب کیا دھرا موی کی ماں کا ہے۔ موی اسے پوجنے کی حد تک چاہتی ہے۔ وہ وہی کرے گی جو اس کی ماں کہے گی۔''

جمیل بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں خالہ کی باتوں پر اعتبار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ موی کو بہو نہ بنا سکنے کا غصہ اتارنے کے لیے تمہیں اس سے بدظن کر رہی ہوں گی۔ خیر آگے کیا ہوا؟''

''انہوں نے بھی ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔ لیکن دو ہفتے گزر جانے کے باوجود بھی وہ بات چیت نہ کر سکیں۔ ان کے پاس وجہ معقول تھی۔ ان کی بہو پریگننٹ تھی اور تمام گھر کی ذمّے داری ان کے کندھوں پر منتقل ہو گئی تھی۔ اس لیے دوسرے ہفتے کے آخر میں انہوں نے مجھے جواب دے دیا۔

''کیا اس عرصے کے دوران موی نے تم سے رابطہ کیا؟'' جمیل نے پوچھا۔ ''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ طلاق مانگنے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھی رہے۔''

''بات تو مجھے ہی آگے بڑھانی تھی۔ وہ تو تقریباً ختم کر چکی تھی۔ میں نے ساس کو دوبارہ فون کیا اور موی سے بات کرنے کی درخواست کی۔ اس دفعہ خلافِ توقع انہوں نے موبائل موی کو تھما دیا۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی روادار نہیں تھی۔ میں نے منت سماجت کی۔ تب اس نے جلد از جلد مقصد بیان کرنے کے لیے کہا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے طلاق لینے کی وجہ بتاؤ اگر وجہ معقول ہوئی تو طلاق دے دوں گا۔ بصورتِ دیگر واپس چلی آؤ۔ میں معاملے کو درگزر کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ دوسری

طرف سے سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ اپنی ماں سے مشورہ کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ اس سب معاملے میں اس کی ماں کا ہاتھ تھا۔''

جمیل نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ تم سے نفرت کرتی ہیں۔ اتنے بڑے اقدام کے پیچھے نفرت کی وجہ بھی بڑی ہونی چاہیے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''تم صحیح نتیجے پر پہنچے ہو۔ فون کال کے بعد ہونے والی ملاقات کے دوران مجھے طلاق کا جواز بھی معلوم ہو گیا۔ درحقیقت دونوں ماں بیٹیاں مجھے اپنی سالی کا قاتل گردان رہی تھیں۔ اب میں تمہیں اپنی سالی کے متعلق بتاتا ہوں۔ وہ دونوں ٹانگوں سے محروم خودغرض اور منافق عورت تھی۔ درپردہ لوگوں کے سامنے میری تعریف کرتی لیکن دل میں بغض رکھتی تھی۔ تم یقین کرو گے۔ وہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ہمارے درمیان پھوٹ ڈال دیا کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سردیوں کے دنوں میں وہ ہمارے پاس رہنے کے لیے آئی تو خریداری کے لیے شاپنگ مال کا پروگرام بنا۔ مجھے شور شرابا پسند نہیں۔ اس لیے میں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا لیکن دونوں [illegible] مجھے زبردستی شاپنگ مال لے آئیں۔ یہاں عورتوں کی بھرمار تھی۔ مرد کم ہی دکھائی دے رہے تھے۔ چند دکانوں میں گھومنے پھرنے کے بعد ہم کافی پینے کے لیے ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ تب میری سالی نے موی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کچھ کہا۔ میرے حساس کانوں نے ان شیطانی الفاظ کو سن لیا۔ مطلب واضح ہونے کے بعد میں نے نگاہوں کو جھکانے کی کوشش کی لیکن موی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

''آپ سامنے موجود لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ مجھ سے اکھڑ گئی۔ ''اگر بیوی کا لحاظ نہیں تو کم از کم سالی کا ہی کر لیا ہوتا۔'' میں نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایسی خرافات میں پڑنے والا انسان نہیں ہوں۔ مجھے تو مال میں آنا بھی پسند نہیں۔ تم دونوں زبردستی لے آئیں۔ اس لیے چلا آیا۔ ورنہ آنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ شاپنگ کا پروگرام عجلت میں کینسل کر دیا گیا اور ہم بغیر خریداری کے گھر واپس آ گئے۔ گھر آنے کے بعد ہمارے درمیان بہت تلخ کلامی ہوئی۔ میں نے سالی کو برا بھلا کہا۔

وہ ناراض ہو گئی۔ بیوی منہ پھلا کر بیٹھ گئی اور میں جھنجلائے ہوئے انداز میں گھر سے نکل کر اپنے قریبی دوست کے پاس چلا آیا۔ تقریباً گھنٹے بھر کے بعد مجھے موی کا فون موصول ہوا۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ میری سالی سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہو گئی ہے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے تو اسے ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آیا تھا۔ اور اب یہ کہہ رہی تھی کہ وہ ہلاک ہو گئی ہے۔''

جمیل نے پوچھا۔ ''اسے سیڑھیوں سے اوپر کون لے کر گیا؟ کیا گھر میں تمہاری بیوی کے علاوہ اور بھی کوئی موجود تھا؟''

''ہاں ملازم تھے لیکن صاف مکر گئے۔ میری ساس نے میرے خلاف مقدمہ کر دیا۔ پولیس نے پوچھ گچھ کی۔ چند گھنٹوں کے لیے مجھے حوالات میں رکھا۔ پھر ضمانت پر رہا کر دیا۔ جس دوست کے گھر میں حادثے والے دن گیا تھا اس نے میری موجودگی کی گواہی دی۔ اس حادثے کو سال بھر کا عرصہ ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ میری ساس نے چند عرصہ منہ بنائے رکھا پھر بیٹی کی موت کو بھلا کر مجھ سے بات چیت کرنے لگی۔ تاہم یہ معما حل نہیں ہو سکا کہ مقتولہ کو سیڑھیوں سے اوپر کون لے کر گیا تھا۔''

جمیل نے پوچھا۔ ''تو تمہاری ساس نے تمہاری بات چیت موی سے کروائی۔ کیا وہ تم سے ملاقات کرنے کے لیے آمادہ ہوئی؟''

''ہاں، میں نے بالآخر اسے راضی کر لیا۔ چونکہ آفس کی مصروفیات زیادہ تھیں۔ اس لیے اگلے مہینے کا وقت رکھا گیا پھر اگلا مہینا بھی آ گیا۔ میں نے چند دنوں کی چھٹی لی اور ملاقات کے لیے سسرال چلا آیا۔ یہاں ماحول نہایت سرد تھا۔ ساس نے بے رخی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ موی مجھے سٹنگ روم میں لے آئی اور صوفے پر بیٹھنے کے بعد اس نے آنے کی وجہ سے دریافت کی۔ میں نے بتایا۔ میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔''

وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ آپ اپنا اور میرا وقت برباد کر رہے ہیں، واپس چلے جائیے۔''

میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے بغیر واپس نہیں جاؤں گا اور اگر چاہتی ہو کہ واپس چلا جاؤں تو طلاق کی وجہ بتاؤ، لوگ پوچھیں گے تو میں انہیں کیا جواب دوں

گا۔''

''آپ میری بہن کے قاتل ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کے حوالات جانے کے بعد مجھے اپنی والدہ کے دہ ام پر افسوس ہوا تھا۔ میں اپنی بہن کا قاتل گھر میں کام کرنے والے نوکروں کو گردان رہی تھی لیکن چند دن قبل آپ کی غیر موجودگی میں امی نے تمام نوکروں کو تفتیش کے لیے پولیس اسٹیشن بھجوایا۔ تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد ان میں سے ایک نے اقرار کرلیا کہ اس نے آپ کے کہنے پر میری بہن کو سیڑھیوں سے نیچے دھکیلا تھا۔ آپ نے اسے اس کام کے لیے تگڑا معاوضہ دیا تھا۔''

میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب جھوٹ ہے۔ پولیس پتھر سے بھی اقرارِ جرم کروانے کے لیے بدنام ہے۔ تم نے کیسے ان کی بات پر اعتبار کرلیا۔ مجھے نوکر کا نام بتاؤ، میں اس سے سب کچھ اگلوانے کی کوششیں کروں گا۔''

موی نے بتایا۔ ''وہ بشیر احمد خان ہے۔ اس کے بیان کے مطابق میری بہن سے لڑائی کے بعد آپ نے اپنے دوست کے گھر سے اسے فون کیا اور تگڑی رقم کے عوض قتل کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ [illegible] خارج ہوئی۔ بشیر احمد خان میرا ڈرائیور تھا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ میرے خلاف بیان دے سکتا ہے۔ وہ نہایت شریف اور دین دار قسم کا انسان تھا۔ میں نے موی سے اگلے دن ملاقات کا وقت لیا اور واپس بنگلے میں آ گیا۔''

جمیل نے پوچھا۔ ''بشیر احمد کی گواہی کے بعد پولیس نے تمہیں گرفتار کیوں نہیں کیا؟''

''میری ساس نے بات کو آگے بڑھانے سے بہتر علیحدہ ہو جانے کو جانا۔ کچھ عرصہ دونوں ماں بیٹی کے درمیان بات چیت چلتی رہی۔ بالآخر انہوں نے طلاق لینے کا فیصلہ کرلیا۔''

''تو یہ معاملہ ہے۔'' جمیل بولا۔ ''کیا تم دوسرے دن بشیر احمد کو اپنی بیوی کے پاس لے گئے؟''

''ہاں، یہ معاملے کو صاف کرنے کے لیے ضروری تھا۔ بشیر احمد پولیس کی تفتیش کے بعد نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مجھے اسے ڈھونڈنے میں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن چونکہ یہ میری عزت پر حرف آنے کا مسئلہ تھا۔ اس لیے میں نے جان توڑ کوشش کے بعد اسے قریبی آبادی سے برآمد کرلیا اور اگلے دن اسے لے کر سسرال آ گیا۔ میری ساس اور بیوی میرے منتظر تھے۔ میں نے بشیر کو دونوں

سیکرٹ ایجنٹ

سی آئی اے میں ایک قاتل کی اسامی خالی ہوئی۔ خفیہ ای میل پر بڑی تعداد میں درخواستیں آئیں۔ ایجنٹوں نے بہت چھان بین کے بعد صرف تین امیدواروں کا انتخاب کیا۔ دو مرد اور ایک عورت!

ان تینوں کو بلا کر ان کے بہت سے امتحان لیے گئے اور انہیں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ انہیں جذبات سے یکسر عاری ہو کر کسی روبوٹ کی طرح احکام پر عمل کرنا ہوگا۔ اس میں کیوں اور کیسے کی گنجائش نہیں ہو گی۔

آخری امتحان کے لیے انہیں اپنے اپنے شریکِ حیات کے ساتھ طلب کیا گیا جنہیں الگ کمرے میں کسی افسر کے حوالے کر دیا گیا۔

پہلے مرد امیدوار کو ممتحن ایک بند آہنی دروازے کے پاس لے گیا اور اسے بڑے بور کا ایک پستول تھماتے ہوئے بولا۔ ''کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لینا۔ وہاں ایک کرسی پر تمہاری بیوی بیٹھی ہوئی ہے۔ تمہیں اس کو ہلاک کرنا ہے۔''

امیدوار نے کہا۔ ''یہ کس قسم کا احمقانہ مذاق ہے۔ میں اپنی بیوی کو کیسے مار سکتا ہوں؟''

''سوال جواب کی گنجائش نہیں تھی۔ تم ناموزوں ہو، جا سکتے ہو۔'' ممتحن کا لہجہ سرد اور سخت تھا۔

پھر دوسرے امیدوار کو بلا کر وہی ہدایت کی گئی۔ وہ پستول لے کر کمرے میں گیا۔ پانچ منٹ تک گہرا سکوت رہا پھر وہ میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، نمناک آنکھوں کے ساتھ باہر آ گئے۔ مرد نے کہا۔ ''میں نے اپنا دل بہت مضبوط کیا مگر میں اپنی بیوی کو نہیں مار سکتا۔''

اب عورت کی باری تھی۔ وہ مسلح ہو کر اندر گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی فائرنگ کی ہلکی آوازیں آئیں پھر دھما چوکڑی اور چیخ و پکار کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ چند منٹ بعد اندر سناٹا چھا گیا اور وہ عورت بکھرے بالوں اور زخمی چہرے کے ساتھ باہر آئی اور غصیلے لہجے میں بولی۔ ''پستول میں تو سب گولیاں نقلی تھیں۔ میں نے کرسی مار مار کر بہت مشکل سے اسے ٹھکانے لگایا ہے۔''

کراچی سے نہال خرم کی بے بسی

pklibrary.com

کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے سچ بولنے کے لیے کہا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اس نے رو دینے والے لہجے میں بتایا کہ پولیس نے جب اس پر تشدد کی انتہا کی۔ تب مجبوراً اسے جان چھڑانے کے لیے میرے خلاف بیان دینا پڑا۔''

جمیل نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر بشیر قاتل نہیں تھا تو پھر قاتل کون تھا؟ وہ خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر نہیں جا سکتی۔ اسے اوپر لے جایا گیا تھا اور ایسا کوئی تیسرا شخص ہی کر سکتا تھا۔''

میں نے بتایا۔ ''تیسرا شخص بشیر ہی تھا۔ تم اسے گمبھیر حادثہ کہہ سکتے ہو۔ میرے گھر سے جانے کے بعد موی دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری سالی نچلے پورشن میں اکیلی رہ گئی۔ وہاں باتھ روم میں کموڈ نہیں تھا۔ اسے رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو بشیر احمد اسے وہیل چیئر کے ہمراہ اوپر لے گیا۔ دراس کی بے پروائی کی وجہ سے وہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک کر ہلاک ہو گئی۔ بشیر احمد پولیس کو حادثے کے متعلق بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن جب انہوں نے تشدد کیا تب مجبوراً اس نے مجھ پر الزام لگا دیا اور جان خلاصی کے بعد نوکری چھوڑ کر فرار ہو گیا۔''

جمیل بولا۔ ''تو بشیر احمد کے بیان کے بعد موی تمہارے گھر واپس آ گئی۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں، میری ساس اسے گھر بھجوانے کے لیے رضامند نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے معافیاں مانگوں۔ منت سماجت کروں۔ ان کے پاؤں پڑ کر روؤں اور آئندہ ان کی لڑکی کو خوش رکھنے کا یقین دلاؤں۔ میں نے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ان کے چہرے سے لگا لیا۔ اس لیے فوراً پاؤں پڑتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ آئندہ میں ان دونوں کی مرضی کے بغیر کوئی بھی قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ وہ پگھلنے لگیں۔ تاہم انہوں نے اب بھی موی کو میرے ہمراہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ چند دن اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اسے دوبارہ میرے خلاف کرنے کی کوشش کریں گی لیکن موی میرے ساتھ جانے کے لیے آمادہ تھی۔ تاہم ماں کی ناراضی کو مدِنظر رکھتے ہوئے چند دنوں کے لیے رک گئی۔''

جمیل غصیلے لہجے میں بولا۔ ''تمہیں اپنے آپ کو اتنا گرانا نہیں چاہیے تھا۔ اگر چند دن اور انتظار کر لیتے تو وہ خود ہی کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی۔ تم نے ساس کے پاؤں پڑ کر نہ صرف اپنی حیثیت کو ان کی نگاہوں میں کم کر لیا بلکہ تمام زندگی کے لیے غلامی کا طوق بھی گلے میں پہن لیا۔''

میں نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''ایک مرد کے لیے اس سے بڑھ کر اور بے عزتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو۔ میں اسے گھر بلا کر طلاق دینا چاہتا تھا۔''

جمیل اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اسی وقت فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ وہ بے چین لہجے میں بولا۔ ''کیا تم نے اسے گھر بلا کر طلاق دے دی؟''

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے صوفے سے کھڑے ہو کر اٹیچی کیس کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''اس کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔ نہ ہمارے درمیان طلاق ہوئی اور نہ ہی وہ گھر واپس آ سکی۔ اس کے باوجود سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا۔'' میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ میں نے انہیں چھپانے کے لیے جمیل کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ مسافروں نے گیٹ کی طرف جانا شروع کر دیا۔

جمیل نے جھٹکے کے ساتھ مجھے خود سے علیحدہ کیا اور میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اندازہ لگانے میں مشکل پیش آ رہی ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو یا پھر نفرت......؟''

میں نے آہ بھرتے ہوئے بتایا۔ ''نفرت یا محبت زندہ وجود سے کی جاتی ہے۔ مر جانے کے بعد تمام احساسات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ صرف افسوس اور تاسف باقی رہ جاتا ہے۔'' میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا اور مسافروں کے ہجوم میں آگے بڑھنے لگا۔

وہ میری پشت کے پیچھے چلایا۔ ''اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟ کیا تم نے اسے قتل کیا یا پھر طبعی موت مر گئی؟''

میں نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا۔ ''گھر آنے سے قبل اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ مجھے اس سے بدلہ لینے کا موقع نہیں مل سکا۔''

جمیل دم بخود ہو کر جہاں کھڑا تھا وہیں بت بن کر کھڑا رہ گیا۔ میری طرح اس کی بولتی بھی بند ہو گئی تھی۔

❖❖❖

pklibrary.com

میں بُری طرح ہانپ رہا تھا اور پیر کانپ رہے تھے۔ آوارہ کُتوں کے بھونکنے کی آواز چاردیواری سے دور سنائی دے رہی تھی۔ چاردیواری کے اندر دیوانہ وار کودنے کے فوراً بعد مجھے تحفظ اور طمانیت کا احساس ہوا تھا لیکن خوف ہنوز مجھ پر طاری تھا۔

میں ایک پرائمری اسکول ٹیچر ہوں۔ حال ہی میں میری تعیناتی اس قصبے کے اسکول میں ہوئی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ قصبے کے واحد اسکول میں صرف دو استاد متعین

پُراسرار بنگلا

محمد سلیم کرد

مقصد حاصل کرنے کے لیے لوگ ایسا جال پھیلاتے ہیں... جس میں چال پوشیدہ ہوتی ہے... ایک دیہات سے شروع ہونے والی سیدھی سادی کہانی... جو بڑھتے بڑھتے خونی رنگ اختیار کرتی چلی گئی...

پُراسرار بنگلے کے گرد گھومتی ڈرامائی کہانی کے دلچسپ موڑ

pklibrary.com

ہیں۔ ایک میں اور دوسرا لال بخش۔ لال بخش اس قصبے کا ہی رہنے والا ہے جبکہ میرا تبادلہ شہر سے ہوا ہے۔ میں نے چار دن پہلے قصبے کے اسکول میں ڈیوٹی سنبھالی ہے۔ میرے ساتھ ہی یہاں آدم بھی ہے۔ وہ کوئی باقاعدہ ٹیچر نہیں ہے، اسے صرف پڑھنے پڑھانے اور ٹیچروں کی خدمات کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

میں تنہا انسان ہوں۔ چند ضروری سامان کے ساتھ اکیلا آیا تھا اور اسکول کے ایک کمرے میں میری رہائش تھی۔ جبکہ لال بخش قصبے کا رہنے والا تھا اور اس کا گھر اسکول سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ایک بجے چھٹی کے بعد وہ گھر چلا جاتا اور دوسری صبح آٹھ بجے اسکول میں حاضر ہوجاتا جبکہ آدم خان کا معاملہ مختلف تھا، اس کا گھر اسکول سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس کا بیشتر وقت اسکول میں گزرتا تھا۔ وہ سادہ لوح باتونی مزاج بھی تھا۔ اسے تعلیم اور نصاب کے موضوع پر گفتگو کرنے میں بڑی دلچسپی تھی۔ وہ شام کے وقت بھی میرے پاس چکر لگانے کے لیے اسکول آتا اور رات نو بجے کے وقت واپس چلا جاتا۔

آج اتوار کا دن تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے ایک مسٹری ناول اٹھایا اور اس کا مطالعہ کرنے بیٹھ گیا۔ ناول کے سحر میں وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا۔ جب آدم خان نے کمرے میں قدم رکھا تو میں چونک کر ناول کے سحر سے نکلا۔ پہلے آدم خان کے چہرے پر پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے فوراً ناول میز پر رکھا اور کھانا تیار کرنے کی غرض سے کرسی سے اٹھا۔ اس وقت آدم خان بھی میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس طرح کھانا جلدی تیار ہوگیا۔ وہ کھانا گھر سے کھا کر آیا تھا۔ میرے اصرار کرنے پر اس نے صرف چند لقمے لیے۔

''ماسٹر صاحب، اگر میں بال بچے والا ہوتا تو آپ کو کھانا بنانے کی زحمت نہ ہوتی...... تیار کھانا آپ کے لیے گھر سے لاتا۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

''شکریہ، آپ کھانا تیار کرنے میں میرا ہاتھ بٹاتے ہو، یوں سمجھ لو کہ مجھے تیار کھانا مل رہا ہے۔'' میں نے اس کے جذبے پر مروت سے کہا۔ آدم خان کی عمر چھتیس سال تھی مگر ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا جو آدم خان سے پانچ سال بڑا تھا۔ ''آدم خان، آپ کتنے برسوں سے فری لانس ٹیچنگ کے فرائض سرانجام دے رہے ہو؟''

''بارہ سال سے۔'' وہ مختصراً بولا۔

''آپ تو مجھ سے چار سال سینئر نکلے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ایسا ہی سمجھو۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''آپ نے باقاعدہ سروس کیوں جوائن نہیں کی؟''

''صرف چار جماعت تک پڑھا لکھا ہوں ماسٹر صاحب۔'' آدم خان نے بتایا۔

''تعلیم آگے جاری نہ رکھنے کی وجہ؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس زمانے میں قصبے میں کسی اسکول کا نام ونشان تک نہ تھا۔ قریب کے گاؤں میں ایک پرائمری اسکول تھا جو اب بھی ہے۔ وہیں سے چار جماعتیں پاس کیں۔ پورے اسکول میں ایک استاد تعینات تھا۔ استاد اگر کسی ذاتی کام میں پھنس جاتا یا بیمار ہوجاتا تو ہفتوں ہفتوں کلاسیں نہیں لگتیں...... بڑی مشکل سے چار جماعتیں پاس کیں۔'' آدم خان نے بیزاری سے بتایا۔

دو بجے کے وقت آدم خان واپس چلا گیا۔ میں نے ناول اٹھایا اور جہاں سے چھوڑا تھا دوبارہ وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ناول کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا اور کھانا کھانے کی وجہ سے کچھ اونگھ بھی آ رہی تھی۔ میں نے صفحہ فولڈ کیا اور تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ تقریباً تیس منٹ کے قیلولے کے بعد میری طبیعت سنبھلی تو میں کھلی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

دسمبر کی نرم دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور وقفے وقفے سے چلنے والی ہوا کے جھونکے سے قطار میں کھڑے کھجور کے درخت جھول رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر دل میں چہل قدمی کا شوق اٹھا۔ سہ پہر کا سمے تھا، میں تیار ہوکر اسکول سے نکلا۔ میرا رخ ہوا کے دوش پر جھومتے ہوئے کھجور کے درخت کی قطاروں کی طرف تھا جو مٹی اور گارے کے کچے مکانات کے عقب میں جنوب کی طرف لگے تھے۔ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا۔ مکانات کے سامنے اِکا دُکا بچے کھیلتے نظر آرہے تھے۔ میں کھجور کے درختوں سے قریب ہوتا جارہا تھا پھر میں ان کی ٹھنڈی چھاؤں تلے پہنچ گیا۔ چند ثانیے سائے تلے کھڑے رہنے کے بعد میں آگے بڑھ گیا اب نظروں کے سامنے ایک پہاڑ تھا۔ میں آگے بڑھتا گیا اور پہاڑ کے عین قریب پہنچ گیا تو دفعتاً میری سماعتوں سے پُرسکوت فضا میں غراہٹ کی ایک آواز ٹکرائی۔ میری آنکھیں غراہٹ کی آواز کی طرف اٹھ

گئیں۔ یہ دیکھ کر خوف کے مارے ایک لمحے کے لیے میری سانس رک گئی کہ پہاڑ کے سائے تلے کتوں کا ایک غول آرام کر رہا تھا۔ ان کا ایک ساتھی مجھے دیکھ کر غرایا تھا تو سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ غراہٹ کی آواز سن کر میں اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ کتے نے ایک بار پھر غراہٹ کی آواز خارج کی اور اپنی جگہ سے خطرناک انداز میں اٹھا۔ اس کی دیکھا دیکھی پورا غول اٹھ گیا۔ غول کا فاصلہ مجھ سے کافی تھا لیکن میں بپھرے ہوئے غول کی دسترس سے کہاں تک محفوظ رہ سکتا تھا۔ آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک پتھر چند قدموں کے فاصلے پر پڑا تھا جو بطور ہتھیار دفاع کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا اور فوراً ہاتھ پتھر کی طرف بڑھایا۔ پورا غول بھیانک انداز میں بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں نے برق رفتاری سے پتھر اٹھایا اور دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے گھوم کر، پتھر غول کی طرف پھینکا اور رکا نہیں سرپٹ دوڑتا رہا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ لمحہ بھر کے لیے غول ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ پتھر کسی کتے پر پڑا تھا یا نہیں یہ میں اندازہ نہیں کر سکا تھا لیکن میرے حملے کی وجہ سے غول کی خونخوار رفتار میں ایک دم بریک لگ گئے اور اس دوران میں مجھے غول سے کچھ مزید فاصلہ بڑھانے کا موقع مل گیا مگر کب تک میں غول کی پکڑ سے محفوظ رہتا۔ لمحہ بھر بریک کے بعد ایک دفعہ پھر بھونکتے اور منہ سے کف اڑاتے کتوں کا غول برق رفتاری سے میرے پیچھے تھا۔ میں آگے اور غول پیچھے...... کب ہم پہاڑ کے پیچھے آنکلے تھے یہ ہوش مجھے کہاں تھا پھر اچانک مجھے اپنے سامنے ایک بنگلا نظر آگیا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ امید جب سامنے کھڑی نظر آئی تو شل ہوتی ٹانگوں میں جیسے جان لوٹ آئی۔ میں بڑی مشکلوں سے بنگلے کے عین سامنے پہنچ گیا۔ گیٹ پر ایک موٹا اور زنگ آلود تالا دیکھ کر ایک پل کے لیے میری تمام امیدیں خاک ہو گئیں لیکن بقا کی فطری خواہش فوراً جاگ اٹھی۔ چار دیواری تقریباً آٹھ دس فٹ بلند نظر آرہی تھی۔ ایک ایک پل میرے لیے قیمتی تھا۔ سوچنے اور تاخیر سے کام لینے کی قطعاً گنجائش نہیں تھی۔ میں نے دیوار کی طرف زقند بھری اور خوش قسمتی سے پہلی کوشش میں منڈیر پر ہاتھ آگیا اور دوسرے لمحے میں ہاتھوں کے سہارے لٹک کر دیوار پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں کتوں کا بھونکتا ہوا غضب ناک غول بھی دیوار کے قریب پہنچ گیا تھا اور بعض کتوں نے چھلانگیں مار کر قمیص کے دامن کو پکڑ کر مجھے نیچے گرانے کی ناکام کوشش بھی کی مگر میں ان کی دسترس سے اب محفوظ تھا۔ کالج کے زمانے میں، میں نے این سی سی کی ٹریننگ لی تھی۔ دوڑنا، دیواروں پر چڑھنا وہ تجربہ اب اس وقت یہاں میرے کام آرہا تھا۔

میں بڑے آرام کے ساتھ احاطے میں اتر گیا لیکن میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ باہر کتے بدستور بھونک رہے تھے۔ میں نے ایک پتھر اٹھایا اور دیوار سے باہر اچھال دیا۔ ایک کراہنے کی آواز باہر سے سنائی دی۔ پتھر وزنی تھا جو یقیناً کسی کتے پر پڑا ہوگا میں نے صرف ایک پتھر پھینکنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تین چار پتھر اور دیوار سے باہر اچھال دیے۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور کتے ڈر کے...... پسپا ہونے لگے اور ان کے بھونکنے کی آوازیں چار دیواری سے دور سنائی دینے لگیں پھر مکمل طور پر فضا میں سکوت طاری ہو گیا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد میرے اعصاب اعتدال پر آئے اور مجھ پر خوف و ڈر کی کیفیت دور ہو گئی تو میں اپنے آس پاس متوجہ ہوا۔ چار دیواری کے اندر میرے سامنے ایک خوب صورت بنگلا تھا۔ ایک پرانا بنگلا تھا لیکن اس کی ویرانی بھی فلموں والے بنگلوں سے کم نہیں تھی۔ چار دیواری کے اندر ہر طرف اجاڑپن اور ویرانی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ خوب صورت بنگلا کئی سالوں سے خالی پڑا ہے۔ بنگلے کے در و دیواروں پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ احاطے کے اندر کی حالت ابتر تھی، ہر طرف خودرو جھاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ میں بنگلے کی عمارت کی طرف سست روی سے قدم اٹھانے لگا جس کا کوئی مرکزی دروازہ نہیں تھا جیسا کہ عموماً سرکاری دفاتر کے مرکزی دروازے نہیں ہوتے۔ چنانچہ راہداری میں داخل ہونے کے لیے کوئی رکاوٹ میرے سامنے نہیں تھی۔ چند قدمچے چڑھنے کے بعد میں راہداری میں قدم رکھ چکا تھا۔ راہداری کا فرش گرد و غبار کی تہ سے اٹا ہوا تھا اور چھت پر جابجا مکڑیوں نے جالے بنا رکھے تھے۔

ستونوں کی قطار کے سامنے راہداری میں دو طرف دو، دو کمرے واقع تھے۔ کمروں کے درمیان ایک گزرگاہ نظر آرہی تھی جو بنگلے کے عقب میں جا رہی تھی۔ میں ایک کمرے کے سامنے ٹھہر گیا۔ فرش پر بچھی ہوئی گرد کی چادر پر میرے جوتوں کے نشان پڑ رہے تھے۔ میں نے دروازے کی گرد آلود ناب گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ لاک تھا، میں نے کوشش ترک کی۔ راہداری میں بائیں

طرف زینے نظر آئے جو ایک مختصر دائرے میں گھوم کر بالائی منزل پر جا رہے تھے۔ علاقہ میدانی اور پُرفضا تھا۔ خوشگوار ہوائیں بنا کسی رکاوٹ کے بڑی۔۔ آزادی کے ساتھ چل رہی تھیں۔

میں ایک ہنگامی صورتِ حال کے نتیجے میں بنگلے میں گھس آیا تھا۔ اس میں میرا کسی شعوری ارادے کا عمل دخل نہیں تھا لیکن نہ جانے یہ خوب صورت مگر ویران بنگلا مجھے اپنی طرف کیوں متوجہ کر رہا تھا۔ خوفناک کتوں کے غول سے جان بچانے کی جدوجہد میں، میں کافی تھک چکا تھا اور ایک طرف آرام سے بیٹھ کر تھکاوٹ دور کرنا چاہتا تھا لیکن جیسے تھکاوٹ پر تجسس غالب آرہا تھا اور ویران بنگلے کے در و دیوار مجھے اپنی طرف ایسے کھینچ رہے تھے جیسے مجھے کسی شے کی تلاش ہو۔ شاید یہ سب ان پُراسرار ناول اور کہانیوں کا اثر تھا جن کا میں شائق تھا۔ ویران اور اجڑے ہوئے بنگلے میں قدم رکھتے ہی میرے اندر کا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ میں زینے کی طرف بڑھا جو اوپر جا رہا تھا جہاں خاصی تاریکی بھی تھی۔ جب میں سیڑھیوں کے سامنے پہنچ گیا۔ پُرسکوت فضا میں ۔۔۔ ''میاؤں'' کی مہیب آواز نے اچانک سکوت میں ارتعاش بھر دیا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلے بنا نہیں رہ سکا۔ ایک کالی بلی جس کی نیلی کانچوں کی طرح تیز آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں، تیزی کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتر کر میرے پیروں کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔

''نہ جانے اور کون کون سی مخلوق یہاں چھپی بیٹھی ہو گی۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دراصل میاؤں کی اچانک آواز سے میرے اندر کا دبا ہوا خوف یک دم جاگ اٹھا تھا اور کتوں کی طرح کسی اور جانور کے حملے کا اندیشہ دل میں ابھرا تھا۔ جیسے سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے لیکن میرے فطری تجسس نے جلد خوف کی کیفیت پر قابو پالیا۔ میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں کی حالت بھی ابتر تھی۔ بہرحال نچلی منزل کی نسبت یہاں تاریکی کم تھی اور ہوا کی رفتار تیز تھی۔ اچانک مجھے اپنے بائیں پیر کے پنجے پر ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ میں ٹھہر گیا اور پائنچہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ خون کی دھار ۔۔۔ جو ٹخنے سے پنجے تک نظر آرہی تھی۔ خون کا اخراج ایک خراش سے ہو رہا تھا جو شاید دیوار پر چڑھتے ہوئے آئی تھی اور افراتفری کے عالم میں مجھے چوٹ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں نے خون کی دھار ۔۔۔۔ پر پائنچہ پھیرا، زخم صاف کیا۔ بالائی منزل کا نظارہ بھی نچلی منزل کی طرح کا تھا۔

دونوں طرف دو، دو کمرے نظر آرہے تھے اور درمیان میں راستہ اور ایک طرف سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں جو بنگلے کی چھت پر جا رہی تھیں۔ میں ایک کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ناب گھما کر دھکیلا مگر دروازہ نہ کھلا مگر میں نے کوشش ترک نہ کی اور زور آزماتا اور مزید کندھے کا دباؤ ڈالتا رہا۔ دروازے کا پٹ مضبوط لکڑی کا تھا جس کی آسانی کے ساتھ ٹوٹنے کی کسی طرح امید نظر نہیں آرہی تھی مگر میں دیوانہ وار دروازے پر برابر زور لگاتا چلا گیا۔ بالآخر ایک کڑک دار آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا اور میں اپنی جھونک میں کمرے کے اندر گرتے، گرتے بچا۔ کمرے کے اندر تاریکی تھی۔ مجھے اپنے ہاتھوں پر دھول کا ناگوار لمس محسوس ہو رہا تھا جو دروازہ کھولنے بلکہ توڑنے کی سرتوڑ کوشش میں ہاتھوں پر جم گئی تھی۔ کھلے ہوئے دروازے سے باہر کی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور میری آنکھیں بھی لحہ لحہ تاریکی سے مانوس ہو رہی تھیں۔ کمرے میں حبس تھا۔ مجھے دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرا کافی لمبا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک دیدہ زیب مسہری بچھی تھی اور دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک خوب صورت چوبی الماری نظر آرہی تھی جس کے برابر قدِ آدم آئینے میں مجھے اپنا دھندلا عکس نظر آرہا تھا۔ کمرے کی چھت کے عین وسط میں ایک چار پروں والا فینسی پنکھا لٹک رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک فریم نظر آرہا تھا مگر ملگجی تاریکی اور شیشے پر جمی گرد کی تہ کی وجہ سے تصویر صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ فریم کے نیچے ایک بڑی سی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ میں قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔

اس زمانے میں سیل فون اتنا عام اور سستا نہیں تھا کہ مجھ جیسا پرائمری سطح کا ٹیچر بھی خرید کر اپنے ساتھ رکھتا۔ آج کا زمانہ ہوتا تو میں کمرے میں قدم رکھتے ہی سیل فون کی ٹارچ روشن کرتا۔ مجھے روشنی سے زیادہ تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ لفظ کوشش استعمال کرنے کا میرا مطلب ہے کہ سالوں سے بند پڑی کھڑکی کی چٹخنیاں، فریم، پٹ وغیرہ مٹی اور زنگ سے اس قدر آلودہ ہو کر اکڑ گئے تھے کہ کھڑکی کا آسانی سے کھلنا مشکل تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد میں نے کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کھلتے ہی تازہ ہوا کا ایک جھونکا پسینے سے شرابور میرے جسم سے ٹکرایا اور کمرا بھی روشن ہو گیا۔ روشنی میں کمرا ایک بیڈ روم کا مکمل منظر پیش کر رہا تھا۔ مجھے بے پناہ تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ فوراً مسہری

pklibrary.com

پر لیٹ جاؤں مگر مسہری پر جمی گرد کی تہ مجھے اپنے ارادے سے باز رکھ رہی تھی۔ دراصل مسہری پر ایک دبیز ملائم اور پھول دار شیٹ بچھی ہوئی تھی جو گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ میں نے گرد آلود شیٹ کو آہستگی سے مسہری پر سے سرکانا شروع کیا تاکہ دھول کے مرغولے فضا میں نہ اُڑیں۔ جب شیٹ پوری طرح ایک گٹھڑی کی صورت میں نیچے فرش پر آ گئی، میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے مسہری کے نیچے دھکیل دیا۔ شیٹ کے نیچے بستر دھول سے پاک تھا۔ میں اپنی خواہش کے مطابق نرم و گداز اور صاف گدے والی مسہری پر لیٹا تو نہیں البتہ بیٹھ ضرور گیا۔ مسہری کے سرہانے دو تکیے ایک دوسرے کے برابر رکھے تھے۔ میرا دل بار، بار چاہ رہا تھا کہ پاؤں فرش سے اٹھا کر مسہری پر لمبا لیٹ جاؤں مگر میں اپنی خواہش دبا رہا تھا کیونکہ اگر میں نرم و گداز مسہری پر لمبا لیٹ جاتا تو یقینی طور پر میری آنکھ لگنے میں دیر نہ لگتی۔ خطرناک کتّوں کے غول سے بچنے کے لیے بنگلا میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا تھا لیکن میں اس بات کے لیے شعوری طور پر ہرگز آمادہ نہیں تھا کہ ایک غیر آباد اور اَن جانے بنگلے میں بے سدھ سویا پڑا رہوں۔

میں بادلِ ناخواستہ مسہری سے اٹھا، نرم و گداز مسہری پر بیٹھنے سے بہتر تھا کہ میں کمرے میں ٹہل کر جائزہ لوں۔ میں جب اٹھا تو میری نظریں دیوار پر لگے فریم سے ٹکرا گئیں۔ فریم پر گرد کی تہ تھی اور تصویر غیر واضح اور دھندلی نظر آ رہی تھی۔ میں دیوار کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ فریم زیادہ بلندی پر نصب نہیں تھا۔ میرے جیسا لمبے قد کا انسان بغیر کسی سہارے کے اتار سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں فریم دیوار سے اتار چکا تھا۔ یہ ایک عام قسم کا درمیانے سائز کا فریم تھا جس کے گلاس پر مٹی کی تہ تھی۔ میں نے مسہری کے نیچے سے بیڈ شیٹ اٹھائی اور اس کے گلاس پر پھیرنے لگا۔ فریم میں تصویر واضح اور صاف نظر آنے لگی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک بدصورت بوڑھا جس کی عمر ستر سال کے قریب نظر آ رہی تھی ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی کے ساتھ تصویر میں کھڑا تھا جس نے نیلے رنگ کی خوب صورت ساڑی زیب تن کی ہوئی تھی۔

بوڑھے شخص کے بدنما چہرے پر فخر اور تمکنت کے آثار واضح نظر آ رہے تھے جبکہ نوجوان لڑکی کے خوب صورت چہرے پر بیزاری اور اداسی کے تاثرات تھے مگر اس کے باوجود بھی اس کے حُسن میں ذرہ بھر کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں کے درمیان باپ بیٹی، دادا پوتی، نانا نواسی جیسا کوئی خونی رشتہ ہوگا۔ ان کے چہروں کے خدوخال میں بھی نمایاں فرق نظر آ رہا تھا۔ تصویر کے پس منظر میں بنگلا نظر آ رہا تھا جس میں اس وقت میں موجود تھا۔ تصویر بنگلے کے گیٹ پر بنائی ہوئی نظر آ رہی تھی اور چار دیواری کے اندر سبزہ ہی سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنے اوپر جوانی کا بھرپور رنگ چڑھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے سر کے مختصر بال، ہیئر کلر سے سیاہ تھے اور چپٹی ناک کے واضح کھلے ہوئے نتھنوں تلے قدرے مڑی ہوئی مونچھیں بھی سیاہ تھیں مگر گلے کی لٹکتی ہوئی کھال اور چہرے کی جھریاں مصنوعی جوانی کا پردہ چاک کر رہی تھیں جبکہ نوجوان لڑکی سرتاپا حسن و جمال کا پیکر تھی۔ تصویر دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سرو کے قدآور درخت کے پاس ایک پستہ قامت جھاڑی کھڑی ہو۔

میں دیر تک تصویر کو دیکھ کر غور کرتا رہا پھر میں نے فریم کو دیوار پر لٹکا دیا اور الماری کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ لاک تھی۔ مزید چھیڑ خانی میں نے ترک کی۔ میں کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ دور، دور تک کھلا میدان نظر آ رہا تھا۔ میدان کے خاتمے پر دور تین پہاڑی ٹیلے کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ میں باہر کا نظارہ کر رہا تھا لیکن ذہن بار، بار تصویر کی طرف بھٹک رہا تھا پھر مجھے یوں گمان ہوا کہ جیسے میرے عقب میں کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہو۔ میں اس احساس کے زیرِ اثر فوراً پیچھے کی طرف گھوما اور کمرے سے باہر نکلا۔ راہداری میں ایک طرف ایک کالی بلی جاتی ہوئی نظر آئی۔ یقیناً وہی ہوگی جو مجھے سیڑھیوں پر نظر آئی تھی اور جب وہ کمرے کے سامنے سے گزری ہوگی تب شاید میں نے اس کی موجودگی اپنے عقب میں محسوس کی ہوگی۔ ایسا سوچ کر میں مطمئن ہو کر دوبارہ کمرے میں آ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مسہری پر بیٹھ گیا پھر یوں ہی کافی دیر بیٹھا رہا۔ دیہات میں بجلی کی سہولت نہیں تھی لیکن بنگلے میں نصب برقی آلات دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ جب بنگلا زیرِ استعمال ہوگا اس وقت یقیناً جنریٹر سے بجلی پیدا کرنے کا انتظام ہوتا ہوگا۔

اچانک مجھے وقت کا خیال آیا۔ میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ چھ بجنے والے تھے۔ سنسان بنگلے میں تیزی سے وقت گزرنے پر مجھے حیرت ہوئی اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ لاک ٹوٹنے کی وجہ سے بند نہیں ہو رہا

pklibrary.com

تھا۔ کسی طرح دروازے کو بند کیا اور نچلی منزل تک آیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ خاموش سناٹے میں واضح آواز گونج رہی تھی ۔ جیسے کوئی خراٹے لے رہا ہو۔ خراٹوں کی آوازیں آخری کمرے سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں ۔ عجیب انداز کے خراٹوں کی آوازیں تھیں جو کبھی بلند ہوتیں تو کبھی یک دم سے دھیمی ۔خوف کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑنے لگی لیکن فوراً میں نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور قدم آگے کی طرف اٹھانے لگا۔ میں جیسے ہی دروازے کے پاس پہنچا خراٹوں کی آوازیں یک دم تھم گئیں ۔جیسے کمرے کے اندر موجود فرد کو باہر دروازے کے سامنے میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہو۔ میں کمرے کے سامنے چند ثانیے موجود رہا لیکن اندر خراٹوں کی آوازیں دوبارہ سنائی نہیں دیں۔ کمرا مکمل طور پر بند تھا۔ ایک جیتا جاگتا انسان ایسے بند کمرے میں کیسے سانس لے سکتا ہے۔ سردیوں کے دن ہوتے تو بات اچنبھے کی نہ ہوتی۔ میں اس علاقے میں نیا آیا تھا لیکن علاقے کے بارے میں سن چکا تھا کہ یہ ایک گرم اور مرطوب علاقہ ہے۔ نومبر کے اوائل سے لے کر جنوری کے آخر تک سردی پڑتی تھی۔

ستمبر کے تین دنوں کے قیام کے دوران اب تک خود مجھے بھی یہ تجربہ حاصل ہو چکا تھا کہ علاقہ گرم اور مرطوب ہے۔ کھلی اور سایہ دار جگہوں پر گرمی محسوس نہیں ہوتی تھی جبکہ دھوپ اور بند جگہوں پر زیادہ دیر ٹھہرنا کسی انسان کے لیے مشکل تھا۔

مجھے جانے کی بھی جلدی تھی اور خراٹوں کا معما جاننے کے لیے بھی بے چین تھا۔ آدم خان اسکول میں میری غیر موجودگی سے ضرور پریشان ہوگا۔ پُراسرار اور سنسان بنگلے کو مزید کھوجنے سے بہتر تھا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ مجھے امید تھی کہ آدم خان بنگلے کے بارے میں مجھے بہتر معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں زنگ آلود آہنی گیٹ کی طرف قدم اٹھانے لگا جو بند تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں دیوار پر موجود تھا اور ہر طرف نگاہ دوڑا رہا تھا۔ خوفناک کتوں کا غول کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ تسلی کرنے کے بعد میں نے نیچے زمین پر اسٹک پھینکی جو میں نے کتوں کے خوف کے پیشِ نظر احاطے کے اندر سے حاصل کی تھی پھر خود بڑے آرام کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ کپڑے جھاڑنے کے بعد میں نے اپنی راہ لی۔

☆☆☆

آدم خان اسکول کے سامنے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فلاسک اس کے قریب رکھا ہوا تھا۔ وہ بے چارہ میرے لیے گھر سے چائے لے آیا تھا اور میرا کمرا بند دیکھ کر پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ راستے میں کتوں سے میرا سامنا نہیں ہوا تھا مگر اسٹک ابھی تک میرے ہاتھ میں موجود تھی۔ آدم خان کی نظریں جب مجھ پر پڑیں تو وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے انداز سے لگا، وہ بڑی بے چینی سے میرا منتظر تھا۔

''اوہ عادل صاحب! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے تین بار اسکول کا چکر لگایا لیکن آپ یہاں نہیں تھے۔ میں آپ کو ڈھونڈنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' آدم خان سرتاپا ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا اور پھر فرش سے فلاسک اٹھایا۔ کپڑوں سے میں نے گرد و غبار جھاڑا لیکن تھکاوٹ اور ہاتھ میں اسٹک نے میرا حلیہ و انداز بدل ڈالا تھا۔

''چہل قدمی کے لیے ایک طرف نکل گیا تھا، چلو کچھ دیر کے لیے سستا لوں تو آپ کو بتاؤں گا۔'' میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔

''خیریت سے ہو نا ماسٹر صاحب؟'' اس نے پریشان کن انداز میں پوچھا۔

''جی بالکل خیریت سے ہوں۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کمرے میں موجود تھے۔ میں پانی پی چکا تھا اور آدم خان میرے لیے فلاسک سے کپ میں چائے انڈیل رہا تھا۔

''آج دل نے چاہا کہ چہل قدمی کر لوں۔ کھجوروں کے درخت پار جہاں پہاڑی ہے جب میں وہاں پہنچا تو وہاں پہلے سے موجود کتوں کا ایک غول پہاڑی کے سائے تلے آرام کر رہا تھا۔ کتوں نے مجھے دیکھا تو حملہ کر دیا۔ غول پیچھے اور میں آگے۔ دوڑ لگ گئی۔ میں پہاڑی کے گرد گھومتا ہوا دوڑ رہا تھا ۔ دوڑتے دوڑتے اچانک میری نظریں سامنے ایک بنگلے پر پڑیں۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہاں کوئی بنگلا بھی ہو سکتا ہے۔ میں بڑی کوششوں کے بعد چار دیواری کے سامنے پہنچ گیا۔ آہنی گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوا۔''

''آپ اس بنگلے میں داخل ہو گئے تھے ماسٹر صاحب......؟'' میری بات پر آدم خان نے حیرت سے پوچھا۔

pklibrary.com

"میں داخل نہ ہوتا تو کتے میری بکا بوٹی ایک کر دیتے...... میں نہ صرف بنگلے کی چار دیواری میں داخل ہوا بلکہ بنگلے کے ایک کمرے تک بھی گیا تھا۔" آدم خان کی حیرت مزید دوچند ہوگئی پھر میں نے تمام باتیں تفصیل سے بیان کر دیں۔

"وہ بہت خوفناک بنگلا ہے عادل صاحب۔" وہ بولا۔ "بڑے بڑے جگر والے بھی اس کے آس پاس پھٹکنے سے کانپ جاتے ہیں...... مجھے یاد نہیں رہا کہ میں بنگلے کے متعلق آپ کو بتاتا۔"

"آپ اگر بتا دیتے تب بھی میں بنگلے کی چار دیواری میں داخل ہوتا کیونکہ پوزیشن ایسی تھی کہ کتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اور کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"کم سے کم چار دیواری تک ہی محدود رہتے...... پورا بنگلا تو نہیں کھنگالتے......" آدم خان نے کہا۔

"شاید......" میں بولا۔

"جب آپ بنگلے کے متعلق پوری طرح سن لو گے تو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کرو گے جو صحیح وسلامت واپس لوٹ آیا ہے۔ وہاں ایک روح کا بسیرا ہے۔ آسیب زدہ بنگلے نے اب تک دو انسانوں کی جان لی ہے۔ دونوں عجیب طریقے سے موت کا شکار ہوئے تھے۔ آصف اور پھر خلیل، دونوں کی سر کٹی لاشیں باہر بنگلے کے پاس سے ملی تھیں۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پندرہ سولہ سال پہلے کا...... پہلے آصف نام کا نوجوان آسیبی بنگلے کا شکار ہوا پھر ایک سال بعد خلیل...... بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب آصف اور خلیل کی روحیں بھی بنگلے میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ آپ نے بنگلے کے کمرے میں جو تصویر دیکھی ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے جس طرح ان کی عمروں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق تھا اسی طرح ان کے خاندانی پس منظر میں بھی فرق تھا۔ ایک دولت مند بڈھا اور دوسری خطِ غربت کے نیچے زندگی گزارنے والی ایک خوبرو حسینہ۔ دولت مند بوڑھے کی نظر نوعمر حسینہ پر پڑی، رشتہ مانگا۔ غریب والدین خوشی سے نہال ہو گئے۔ بیٹی کا ہاتھ بڈھے کے ہاتھ میں دے دیا۔ دراصل والدین کو زر کی ضرورت تھی اور دولت مند بڈھے کو زن کی طلب تھی۔ دونوں کی ضرورتیں ان کی توقع سے بڑھ کر پوری ہوگئیں۔ رابعہ جھونپڑی سے محل تک تو آ گئی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ ایک طرح سے اس نے شادی نہیں کی تھی بلکہ ایک سودا کرلیا تھا تا کہ اس کے بوڑھے والدین اور اکلوتے بھائی کی زند[گی] میں انقلاب آجائے۔ چنانچہ رابعہ نے اس بے جوڑ شادی [پر] رضامندی ظاہر کی تھی۔ رابعہ اور اس کا خاندان معا[شی] حوالے سے آسودہ حال ہوگیا مگر فطری حوالے سے راب[عہ] کے اندر بے چینی اور بیزاری کا سمندر موجزن تھا۔" آد[م] خان سانس لینے کے لیے رکا۔

"آپ کو معلومات کن ذرائع سے ملیں؟" میں [نے] استفسار کیا۔

"نہ صرف مجھے بلکہ پورے گاؤں کو ماسی حلیمہ کے توسط سے تمام معلومات ملی تھیں جو دیہات کی رہنے وال[ی] ہے اور بنگلے میں ملازمہ رہ چکی ہے۔ رابعہ نے معاملات سے اسے آگاہ کیا تھا۔" آدم خان گویا ہوا۔ "بڈھے محبت خان کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ محبت خان کے دو بیٹے ہیں اکبر اور انور۔ دونوں بیٹے اپنے والد کی شادی سے...... ناخوش تھے۔ اس لیے نہیں کہ ان کے والد نے بڑھاپے میں اپنی اولادوں سے بھی کم عمر لڑکی سے شادی رچالی تھی بلکہ ان کا خیال تھا کہ ابو نے عمر کے آخری [illegible] میں شادی رچا کر [illegible] قانونی طور پر جائداد میں اپنا حصہ [illegible] محبت خان نے بیٹوں سے چھپ کر شادی کی تھی۔ [illegible] تھا کہ اکبر اور انور کو ذرا سی بھنک پڑ گئی تو شادی کرنا اس کے لیے ناممکن بات ہوگی۔ اکبر اور انور کو اس بات کا علم بھی ہو گیا تھا کہ ان کی جواں سال سوتیلی ماں رابعہ دلی طور پر اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ صرف ایک مصلحت کے تحت عمر رسیدہ محبت خان کے ساتھ خاموشی سے شادی پر رضامند ہوئی ہے۔ محبت خان کو بھی رابعہ کی کیفیت کا اندازہ تھا لیکن دولت مند خبطی بوڑھے کے ذہن پر انا کا آسیب مسلط تھا۔ محبت خان کے آبا واجداد کا تعلق دیہات سے تھا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا تھا۔ دیہات کے سادہ لوح لوگوں کی زمینیں مختلف حیلے وحربوں سے اپنے نام پر چڑھاتا رہا اس طرح وہ کئی ایکڑ اراضی کا بلاشرکتِ غیرے مالک بن گیا۔ وہ اچھا انسان نہیں تھا۔ پھر شہر جا کر منشیات کا دھندا شروع کر دیا اور ناجائز مال و دولت کماتا رہا۔ وہ اتنا بااثر اور طاقتور ہوگیا کہ بڑے بڑے وزیر کبیر لوگ بھی اس کے دست نگر ہو گئے تھے۔ اس کا جو جی چاہتا حاصل کر کے رہتا تھا۔ دیہات میں یہ بنگلا اس نے رابعہ سے شادی سے پہلے تعمیر کرایا تھا۔ رابعہ سے شادی کے بعد وہ زیادہ تر یہیں رہنے لگا تھا۔ بنگلے کے اندر کی باتیں ماسی حلیمہ سے معلوم ہوئیں وہ رابعہ کے قریب تھی۔

pklibrary.com

باقی باتوں سے پورا دیہات بھی واقف ہے۔'' ایک دفعہ پھر آدم خان ٹھہر گیا۔

''میں نے بنگلے سے نکلتے وقت باہر دیکھا تھا کہ ایسا کوئی بورڈ آویزاں نہیں تھا جو بنگلے کی شناخت ظاہر کرتا......''

''ایک صبح محبت خان ہمیشہ کی طرح نہیں اٹھا...... جس کمرے میں ماسٹر صاحب آپ گئے تھے، وہ بیڈ روم تھا۔ رابعہ صبح بیدار ہوئی تو اسے بوڑھا محبت خان ساکت محسوس ہوا۔ رابعہ نے جب اسے اٹھانے کے لیے جھنجوڑا تو وہ بدستور بے حس وحرکت پڑا رہا۔ وہ نیند میں ہی چل بسا تھا۔ انور اور اکبر اپنے والد کی اچانک موت سے رابعہ پر شک کرنے لگے۔ بقول گھریلو ملازمہ ماسی حلیمہ کے انور اور اکبر دونوں کا کہنا تھا کہ ان کا والد عمر رسیدہ انسان ضرور تھا لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے ابو کی موت کے پیچھے رابعہ کی سازش ہے تاکہ وہ بوڑھے اور دولت مند شوہر سے جلد جان چھڑا کر دولت وجائیداد میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے بعد کسی نوجوان سے شادی رچا سکے مگر ان کا یہ صرف قیاس تھا جس کا اظہار انہوں نے ایک دن ماسی حلیمہ کے سامنے کیا۔ رابعہ کے خلاف ان کے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا کہ وہ اسے والد کی موت کا ذمے دار ثابت کرتے۔ انہوں نے والد کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں کرایا۔ بقول ماسی حلیمہ کے ان کا اس بارے میں یہ کہنا تھا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا ہم لاش کی بے حرمتی تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شک کا اظہار صرف ماسی حلیمہ کے سامنے کیا تھا جو محبت خان کی پرانی ملازمہ تھی۔ محبت خان کی ناگہانی موت کے پیچھے رابعہ ملوث تھی یا نہیں مگر یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ وہ اپنے بوڑھے شوہر سے عاجز تھی اور محبت خان کی موت پر رابعہ کے چہرے پر مصنوعی سوگواری کے پیچھے چھپی ہوئی خوشی کی ایک ہلکی سی جھلک ہر کسی نے محسوس کی تھی۔ نوخیز پنچھی آزاد ہو گیا تھا مگر اس کی آزادی، زندگی کی قید سے آزاد ہونے پر منتج ٹھہری۔

محبت خان کی موت کے ساتویں روز جب وہ شہر سے واپس لوٹ آئی تو دوسری صبح اس کی سرکٹی لاش بنگلے کے بیڈ روم میں پائی گئی۔ بنگلے میں رابعہ اور ماسی حلیمہ کے سوا تیسرا کوئی فرد نہیں تھا۔ ماسی حلیمہ جب اسے صبح جگانے کے ارادے سے بیڈ روم تک آئی تو بیڈ روم کا دروازہ نیم وا پایا۔ ماسی حلیمہ نے اسے پکارا۔ مگر بار بار آواز دینے پر اندر سے جواب نہ پا کر وہ نیم کھلے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو اس کی فلک شگاف چیخوں سے بنگلے کے در و دیوار لرز اٹھے۔ بیڈ پر لہو میں لت پت رابعہ کی سرکٹی لاش پڑی تھی۔ ہر ایک کا شک انور اور اکبر پر گیا۔ چوری اور ڈکیتی کی واردات کا ذرا گمان نہیں تھا۔ بنگلے سے کوئی چیز غائب نہیں تھی۔

ماسی حلیمہ والا کمرا گراؤنڈ فلور پر تھا اور اس نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی جس سے وہ چونک جاتی۔ ڈرائیور دوپہر کے وقت رابعہ کو بنگلے پر چھوڑنے کے بعد گاڑی لے کر دوبارہ شہر کی طرف چلا گیا تھا۔ اکبر اور انور شہر میں تھے۔ صرف ماسی حلیمہ تھی جو بنگلے میں موجود تھی۔ ایک چالیس بیالیس کی عمر کی پستہ قامت عورت ایک سرو قد اور مضبوط قد کاٹھ کی جواں سال لڑکی کو ایسے بھیانک انداز میں کیسے قتل کر سکتی ہے۔ انور اور اکبر کو کون پوچھنے والا تھا۔ بس پولیس نے روایتی انداز میں تفتیش کی جس میں گھریلو ملازمہ ماسی حلیمہ سے پوچھ گچھ شامل تھی۔ کسی نامعلوم دشمن کی کارروائی قرار دے کر فائل بند کر دی۔'' محبت خان ایک ٹھگ اور چاپلوس قسم کا بندہ تھا اسے بڑے لوگوں کو خوش کر کے اپنے کام نکالنے کا گر خوب آتا تھا۔ اس کا کالا دھندا کسی رکاوٹ و دقت کے بغیر خوب پھل پھول رہا تھا۔ جن کے انتظامات کا سارا خرچہ وہ خود اٹھاتا تھا لیکن اس کے بیٹے بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ وہ کام منسوب [illegible] لیے بڑے بڑے بااختیار لوگوں کے سامنے بچھ جاتا تھا۔''
آدم خان نے کہا اور پھر کمرے کی فضا میں سکوت طاری ہو گیا۔ پُراسرار بنگلے کے بارے میں معلومات سننے کے بعد میں تانے بانے بُننے میں مصروف ہو گیا کہ معاملے کی جڑیں کہاں پیوست ہیں۔ میں خیالوں میں سرا ڈھونڈ نکالنے میں کوشاں تھا جو اصل معاملے پُراسرار کا پردہ اٹھانے میں رہنمائی کر سکے۔ بنگلے کی مالکن رابعہ اور پھر دو لڑکوں کا قتل...... اور تینوں قتل کیوں مماثلت رکھتے ہیں؟ پھر میں نے سکوت کو توڑا۔

''رابعہ کے بہیمانہ قتل کے بعد بنگلا کتنے عرصے تک استعمال میں رہا؟''

''تقریباً ڈیڑھ دو سال تک مگر اس عرصے میں بھی باقاعدہ زیر استعمال نہیں رہا۔ کبھی انور اپنے بچوں کو لے کر آ جاتا تو کبھی اکبر اور درمیان میں ایک دو مہینے کے لیے بنگلا خالی رہتا۔ اس دوران ماسی حلیمہ کا بھانجا چوکیداری پر مقرر ہو جاتا تھا۔ برائے نام چوکیداری کے...... کیونکہ یہاں کے لوگ سادہ لوح اور ایمان دار ہیں، چوری اور ڈکیتی کا سوال پیدا نہیں ہوتا پھر ان لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ بنگلا غیر آباد اور ویران ہو گیا اور طرح طرح کی عجیب وغریب

pklibrary.com

باتیں بنگلے سے منسوب ہو گئیں۔ بنگلے کے اندر سے آتی ہوئی آوازوں اور رات کو نظر آنے والی روشنیوں کی وجہ سے لوگ بنگلے سے خوف زدہ ہو گئے اور رہی سہی کسر آصف اور خلیل کے قتل نے پوری کر دی۔'' آدم خان نے کہا۔

''میرا پُراسرار بنگلے میں جانا ایک اتفاق تھا، بنگلے سے متعلق آپ کی باتیں سننے کے بعد بنگلے کا ایک اور چکر لگانا ہوگا۔'' چند ثانیے غور کے بعد میں بولا۔

''ماسٹر صاحب۔'' شکر کرو کہ آپ سلامت واپس لوٹ آئے ہو...... دوبارہ بنگلے میں جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔'' آدم خان میری بات پر چند سیکنڈ مجھے یوں گھورتا رہا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

''صرف اکیلا میں نہیں، اس دفعہ آپ بھی میرے ساتھ چلو گے۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''نہ بابا نہ...... نہ میں خود جاؤں گا اور نہ آپ کو جانے دوں گا۔'' آدم خان خوف زدہ انداز میں بولا۔

''ایک دفعہ ہمیں ضرور جانا ہوگا۔'' میں بدستور اڑا رہا۔

''عادل صاحب! آپ کیوں بچوں کی طرح ضد کر رہے ہو۔ بنگلے کا ہماری زندگیوں سے کیا تعلق ہے؟ یہ ہمارا دردِ سر بھی نہیں ہے۔'' آدم خان برہم انداز میں بولا۔

واقعی یہ ہمارا دردِ سر نہیں تھا۔ میں یہاں اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے آیا تھا اور صرف ڈیوٹی جوائن کر کے اپنا کام کر رہا تھا۔ غیر ضروری اور غیر متعلقہ کاموں میں مجھے دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ بنگلے میں جانا ایک حادثے کا نتیجہ تھا مگر اپنی متجسس طبیعت کے آگے بے بس تھا۔ بنگلے کے متعلق اتنا سب کچھ معلوم ہونے کے بعد مجھے خوف زدہ ہو جانا چاہیے تھا۔

پھر ہمارے درمیان ایک بحث چل پڑی۔

''آپ آؤ گے میرے ساتھ یا نہیں......'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''جب بھی جاؤ گے مجھے پہلے سے اطلاع کرنا۔'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد آدم خان شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

''اگلے اتوار کو سورج طلوع ہونے سے پہلے۔'' میں نے بتایا۔ وہ صرف اثبات میں سر ہلاتا رہ گیا۔

☆☆☆

سب سے نظریں بچا کر ہم چوری چھپے انداز میں سورج نکلنے سے چند منٹ قبل بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ ایسا احتیاط کے پیشِ نظر کیا گیا تھا تا کہ کوئی ہمیں بنگلے کی طرف جاتا دیکھ کر چونک نہ جائے۔

''یہ لو ماسٹر صاحب لوڈڈ ریوالور...... اسے اپنے پاس رکھو۔'' آدم خان نے ایک ریوالور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور چھ عدد فالتو گولیاں بھی مجھے تھما دیں۔ میرے پاس سبزی کاٹنے والی ایک عام سی چھری تھی۔ جسے میں اسکول سے اپنے ساتھ اٹھا لایا تھا۔ آدم خان نے مجھے بتایا تھا کہ اسلحہ کے بندوبست کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک ریوالور آدم خان کا تھا۔ اور دوسرا اس کے بھائی کا تھا... جو آدم کے ہاتھ میں تھا۔ سورج کی کرنیں لمحہ بہ لمحہ زمین پر پھیل رہی تھیں۔ آدم خان قدرے خوف زدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

''چلیں۔'' میں نے مختصراً کہا اور ہم دونوں دیوار کی طرف بڑھے۔ آدم خان مضبوط اور چوڑے کندھے والا بھاری جسامت کا...... انسان تھا جبکہ میں اس کے برعکس ایک دراز قامت اور پتلے جسم کا تھا۔ میں اچک کر بڑی آسانی کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا اور پھر احاطے میں اتر گیا۔ آدم خان چوکھٹ کا سہارا لے کر بڑی مشکلوں سے دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوا اور پھر ٹھنکنے کے انداز میں چار دیواری کے اندر اتر گیا۔ چڑھنے اور اترنے سے آدم خان کی سانسیں بھی بے ربط ہو گئی تھیں اور وہ ہانپتے ہوئے احاطے کے حصار میں کھڑی عمارت کو خوف زدہ نگاہوں سے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ چار دیواری کے اندر نہیں، کسی موت کی وادی میں اترا ہو۔ بنگلے کے اندر قدم رکھنا تو درکنار اس کا بس چلتا تو وہ آس پاس پھٹکنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا اور وہ میری وجہ سے کہ میں اس کا دوست اور ایک طرح سے اس کا مہمان بھی تھا۔ وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی مجبوریوں کی بنا پر اب بنگلے میں اکٹھے تھے۔

''وہ سامنے کمرا ہے جس میں، میں نے انسانی کراہوں کی آوازیں سنی تھیں۔'' برآمدے کے آخری کمرے کی طرف میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آدم خان اپنی بے ربط سانسوں پر قابو پا چکا تھا۔

''پہلے بیڈ روم کو چیک کرتے ہیں...... بعد میں اسے بھی دیکھ لیں گے۔'' آدم خان نے کہا پھر ہم عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہم بالائی منزل پر بیڈ روم کے سامنے کھڑے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیڈ روم کا دروازہ بند تھا جبکہ پچھلے اتوار کو لاک ناکارہ ہو جانے

سے دروازہ میں نے کھلا چھوڑا تھا۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار آدم خان سے کیا تو وہ بولا۔

''روحوں اور بھوتوں کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' میری نگاہیں گرد سے ڈھکے ہوئے فرش پر ٹھہر گئیں، بوٹوں کے غیر نمایاں نشان گرد کی تہ کے نیچے نظر آ رہے تھے جن کا بادی النظر میں نظر آنا مشکل تھا۔

''بھوتوں اور روحوں کے پیروں کے نشانات بھی کبھی پڑتے ہیں؟ دیکھو یہاں فرش پر۔'' میں نے آدم خان کو مخاطب کرتے ہوئے نیچے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ مشرق کی طرف آسمان پر روشنی پھیل رہی تھی اور بالائی منزل پر اچھی خاصی روشنی تھی۔ بوٹوں کے نشانات آدم خان کو نظر آنے میں دیر نہ لگی۔

''ماسٹر صاحب..... ہوسکتا ہے کہ یہ آپ کے پیروں کے نشانات ہوں؟'' آدم خان نے کہا۔

''ارے بھئی...... یہ میرے پیروں کے نشانات کیسے ہو گئے؟ میں تو ہفتہ بھر پہلے یہاں آیا تھا۔ ہوا اور مٹی کی وجہ سے میرے پیروں کے نشانات پوری طرح مٹ گئے ہوں گے۔ میں اس وقت چپل پہنے ہوئے تھا جو آج بھی پہن کر آیا ہوں اور نشانات بوٹوں کے ہیں۔ آپ تسلی کے لیے موازنہ کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا اور تھوڑی دیر جائزہ لینے کے بعد آدم خان میری بات سے متفق ہو گیا۔ پاؤں کے نشانات نہ صرف بیڈ روم کے سامنے نظر آ رہے تھے بلکہ فرش پر کافی جگہ دکھائی دے رہے تھے جو دو دن سے زیادہ پرانے نہیں لگ رہے تھے اور سارے نشانات ایک ہی قسم کے جوتے کے تھے۔

''آدم خان، آپ مستعد رہیں، میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

آدم خان اپنا ریوالور سنبھال کر مستعد ہو گیا اور میں دروازہ کھولنے میں جُت گیا۔ اب کی بار دروازہ خاصا مضبوط تھا اور دروازے کا ناب بھی مجھے نیا اور مختلف محسوس ہو رہا تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ایک نیا اور مضبوط لاک دروازے میں نصب کیا گیا ہے۔ میں نے کندھے کا پورا زور دروازے پر ڈالا مگر دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''آج مجھ سے یہ نہیں کھل رہا ہے...... آپ اسے آزمائیں۔'' میں آدم خان سے مخاطب ہوا۔

''رہنے دیں ماسٹر صاحب! آپ ویسے بھی یہ کمرا دیکھ چکے ہیں۔ گراؤنڈ فلور والے کمرے کا حال معلوم کریں گے جس کے اندر سے انسانی خراٹوں جیسی آوازیں آپ نے سنی تھیں۔''

میں نے آدم خان کی بات پر اتفاق کیا اور ہم دونوں نیچے گراؤنڈ فلور پر آ گئے۔ زینے پر اور گراؤنڈ فلور کے فرش پر بھی جا بجا غیر نمایاں نقشِ پا نظر آ رہے تھے۔ ہم مطلوبہ کمرے کے سامنے موجود تھے۔ آدم خان ہر طرف سے چوکس ہو گیا اور میں کمرے کا بند دروازہ کھولنے میں مصروف تھا۔ دروازے پر مٹی اور دھول کی تہ جمی ہوئی تھی۔ بیڈ روم کے دروازے پر نئے لاک کے علاوہ جو تبدیلی میں نے محسوس کی تھی، وہ دروازے کا گرد و غبار سے صاف ہونا بھی تھا۔ مطلوبہ کمرے کے گرد آلود دروازے پر مجھے کندھے کا زور ڈالنا پڑا۔ کیونکہ ناب گھما کر عام انداز میں دروازہ نہیں کھل سکا تھا۔ تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد ایک تڑاخ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دروازے کا لاک ٹوٹ گیا تھا۔ کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آدم خان نے ٹارچ جیب سے نکال کر روشن کی۔ تاریکی یک دم چھٹ گئی۔ کمرا خالی تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ نہ کوئی فرنیچر، قالین سے بے نیاز فرش پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی اور اس پر نقشِ پا مختلف نظر آ رہے تھے جو باہر کے نشانات کی نسبت قدرے واضح تھے۔ چھت پر ایک گرد آلود پنکھا لٹک رہا تھا۔

مستطیل طرز کا یہ کمرا بیڈ روم سے قدرے لمبا اور چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ایک کونے پر ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا، جو ضرور اٹیچ باتھ روم کا دروازہ تھا جو بند تھا۔

''اسے بھی کھول کر دیکھنا ہو گا۔'' میں نے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ یہ دروازہ بھی لاک تھا۔ میں نے اسے بھی دیوانہ وار کھولنے کی کوشش شروع کر دی مگر دروازہ کافی مضبوط ثابت ہوا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر اپنی تمام قوت دروازے پر صرف کر دی، تب جا کر ایک تڑاخ نما آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ آدم خان نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو اندر کا منظر واضح ہو گیا۔ شاور نہ ٹونٹی، نہ آئینہ وغیرہ ایسی کوئی شے اندر نظر نہیں آ رہی تھی جو ایک باتھ روم کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ رنگ و روغن سے بے نیاز مگر پلستر صاف اور نیا محسوس ہو رہا تھا اور اس کا فرش بھی مٹی دھول سے صاف تھا۔ یہ ایک بڑا اور کشادہ باتھ روم نما کمرا تھا۔

''ماسٹر اُدھر نیچے دیکھو۔'' آدم خان نے ٹارچ کی روشنی کا دائرہ فرش پر ایک جگہ ڈالتے ہوئے مجھے متوجہ کیا۔

''کیا ہے؟'' میں نے وہاں کچھ محسوس نہیں کیا تو

pklibrary.com

پوچھا۔

’’یہاں کچھ مختلف نظر آرہا ہے۔‘‘ آدم خان یہ کہتے ہی اندر داخل ہوا اور فرش پر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ..... بولا۔ ’’یہ دیکھ رہے ہو نا ماسٹر! کچھ ابھار ابھار سا...... دراصل یہ دونوں قبضے ہیں اور یہ رہا ڈھکنے کا...... کی ہول۔‘‘

میری حیرت بھری نگاہیں آدم خان کی حرکت کرتی ہوئی انگلی کا طواف کررہی تھیں۔

’’اور یہ فرش کی سطح پر باریک لکیریں جو آپس میں مل کر مربع شکل کا نشان بنا رہی ہیں دراصل ایک ڈھکنا ہے...... اور اب اسے بھی کھولنا پڑے گا۔‘‘ آدم خان نے کہا اور پھر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ واقعی وہاں دو قبضے تھے جو ایک دوسرے سے فاصلے پر معمولی ابھار کی صورت میں نظر آرہے تھے۔ ان سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر فرش پر کی ہول نما چھوٹا سا ایک سوراخ نظر آرہا تھا جو دراصل کی ہول تھا۔ بادی النظر میں ڈھکنے کا نظر آنا محال تھا اور فرش کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔

’’سسپنس اور سراغ رسانی پر مبنی ناول اور کہانیاں میں پڑھتا ہوں اور تہ خانے کو آپ نے دریافت کرلیا...... آپ نے تو کمال کردیا آدم خان......‘‘ میں نے ازراہِ مذاق کہا لیکن میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آخر میں کیوں تہ خانے کو دریافت نہ کرسکا۔

’’جو شوق آپ پالتے ہیں ماسٹر صاحب، اس کا چسکا مجھے بھی ہے۔‘‘ آدم خان نے آہستگی سے کہا۔

’’واقعی؟‘‘ میں نے کہا۔

’’بالکل صاحب۔‘‘ وہ بولا۔

’’اس موضوع پر کسی اور وقت بات کریں گے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میرے خیال سے ڈھکنا اندر سے کھلتا ہے۔‘‘ آدم خان بولا۔

پھر ہم دونوں فرش کے ساتھ پریس ڈھکنے کا معائنہ کرنے لگے۔ واقعی ڈھکنا اندر سے یعنی نیچے کی طرف کھلتا نظر آرہا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ڈھکنے کو کیسے کھولا جائے۔ ہمارے پاس ایسے اوزار نہیں تھے کہ جس سے لاک یا قبضے توڑے جاتے۔ ہم دونوں باہر صحن میں آگئے اور ایسے پتھر ڈھونڈنے لگے جو ڈھکنا توڑنے کے لیے کارآمد ہوں۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد ہمیں کچھ ایسے وزنی اور نوک دار پتھر ملے جو ہمارے مطلب کے تھے۔ بنگلے پر سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔

آدم خان نکیلے پتھر سے ڈھکنے کے لاک کے مقام پر ضربیں لگانے لگا۔ سناٹے کا راج ضربات کی گونج سے تار تار ہونے لگا۔ میں ریوالور سنبھالے باتھ روم نما کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آدم خان اپنے مضبوط ہاتھوں سے پتھر کا استعمال مہارت سے کررہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ کھلنے میں تاخیر نہیں ہوگی۔ حبس اور مسلسل جدوجہد کی وجہ سے آدم خان کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ بالآخر میری باری آنے سے پہلے آدم خان نے پٹ کھلنے کا اعلان کردیا۔ ایک مخصوص آواز کے ساتھ چوبی تختہ قبضوں کے سہارے نیچے جھول گیا۔ فرش پر اب ایک چوکور نما تاریک دہانہ نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ چوبی زینے نیچے کی طرف جاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ زمین کی سطح کئی فٹ نیچے دکھائی دے رہی تھی۔ کسی گہرے اور تاریک کنوئیں کی طرح کا تہ خانہ تھا جس کی دیواروں کا درمیانی فاصلہ بھی مختصر تھا۔

’’آدم خان آپ یہاں اوپر ٹھہریں...... میں نیچے جا کر جائزہ لیتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور ریوالور سنبھالتا ہوا دہانے کے اندر اترنے لگا۔ روشنی کی مدد مجھے اوپر موجود آدم خان سے مل رہی تھی۔ اندر حبس اور گرمی باہر کی نسبت خاصی تھی۔ میں دھیرے دھیرے اتر کر فرش کی سطح پر آگیا۔ اب میرے سامنے ایک اور دہانہ ظاہر ہوگیا جو اوپر سے خلا کی صورت میں نظر آیا تھا۔ میں نے ٹارچ آن کی اور روشنی دہانے کے اندر ڈالی۔ سامنے ایک سیدھی سی سرنگ پھیلی ہوئی تھی جس کی لمبائی کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

’’نیچے آجاؤ۔‘‘ میں نے آدم خان کو آواز دی اور وہ بھی کنواں نما سرنگ میں اترتا نظر آیا۔

’’یہ دیکھو...... ایک اور سرنگ۔‘‘ جب آدم خان میرے پاس پہنچا تو میں نے ٹارچ کی روشنی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’بڑا عجیب وغریب بنگلا ہے...... نہ جانے یہ سب کس مقصد کے لیے ہیں۔‘‘ وہ سرنگ کے دہانے پر نظریں جماتے ہوئے متوحش انداز میں بولا۔

ہمارے سروں پر دہانے کا کھلا پٹ لٹک رہا تھا اور اس کے راستے سے تازہ ہوا سرنگ کے اندر داخل... ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم جھکے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے تنگ دہانے میں داخل ہوئے۔ اندر داخل ہونے کے بعد ہم نے ٹارچ کی روشنیوں میں دیکھا کہ اندر سے سرنگ اس قدر کھلی، چوڑی اور اونچی تھی کہ ہم دونوں

جھکے بنا آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کے برابر چل سکتے تھے۔ چھت، فرش اور دیواروں پر صاف اور ہموار پلستر تھا۔ سرنگ کسی راہداری سے مشابہ نظر آرہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے برابر چل رہے تھے۔

''ماسٹر صاحب! لگتا ہے کہ اب ہم زمین کے نیچے سے بنگلے کے احاطے سے نکل گئے ہیں۔'' تھوڑی دیر آگے بڑھنے کے بعد آدم خان بولا۔

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' میں مختصراً بولا۔ ہماری رفتار دھیمی تھی مگر اس بات میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ ہم زیرِزمین چلتے ہوئے اب تک احاطے سے نکل گئے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ تاحال ہمیں سرنگ کا اختتام نظر نہیں آرہا تھا۔ آدم خان اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔

''ماسٹر صاحب! کوئی آواز آپ کو سنائی دے رہی ہے؟'' وہ بولا۔

میں آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مدھم سی آواز میرے کانوں میں پڑی جیسے کوئی انجن چلنے کی آواز ہو جو دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ آدم خان کے ساتھ میں بھی رک گیا۔

''لگتا ہے کہ کسی بند جگہ پر جنریٹر جیسی کوئی مشین چل رہی ہو۔'' آدم خان نے خیال ظاہر کیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں تائیدی انداز میں بولا۔

ایک دفعہ پھر ہم قدم بڑھانے لگے۔ ہمارے آگے اٹھتے قدموں کے ساتھ، ساتھ سرنگ میں انجن کے شور کا بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یعنی ہم لحہ بہ لحہ شور کے مرکز کے قریب ہوتے جارہے تھے پھر ہمیں ٹارچ کی روشنی میں سامنے ایک دیوار نظر آنے لگی جو سرنگ کا اختتام تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ سرنگ کے کونے پر دونوں طرف دو، دو کمرے نظر آرہے تھے جو ایک دوسرے کے بالمقابل واقع تھے۔ یہاں آواز صاف تھی جو کسی آن جنریٹر سے خارج ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بائیں طرف کے پہلے...... والے بند کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ جنریٹر کا شور بھی اسی کمرے سے سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دروازے کی ناب گھما کر اندر دھکیلا، دروازہ آسانی سے کھلتا چلا گیا۔

☆☆☆

کمرے کے اندر بھی تاریکی تھی، صرف روشنی کی ایک لکیر سامنے فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی سامنے پڑنے پر روشنی کی لکیر کی وجہ واضح ہوگئی۔ دراصل کمرے سے متصل ایک اور کمرا تھا جس کے دروازے کی جھری سے نیچے روشنی باہر آرہی تھی۔ ایک طرف دیوار پر سوئچ بورڈ نظر آرہا تھا۔ میں نے سوئچ بورڈ کے بٹن آن کیے تو پورا کمرا یک دم روشنی سے منور ہوگیا۔ ہر چیز اپنی جگہ صاف نظر آنے لگی اور چھت پر پنکھا بڑی تیزی کے ساتھ گھومنے لگا اور ہوا پورے کمرے میں پھیل گئی۔ ہمیں بھی یک دم سے طمانیت کا ایک خوشگوار احساس ہوا۔ گرم ہوا کی نکاسی کے لیے سامنے والی دیوار پر دو چھوٹے چھوٹے جالی دار روشن دان آویزاں تھے۔ اب ہم ایک روشن، صاف ستھرے...... اور مستطیل نما کمرے میں موجود تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ کالے رنگ کے لیدر کے کیس ایک دوسرے پر سلیقے سے رکھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ درمیانے صندوق کے برابر لیدر کیس جن کی تعداد بیس کے قریب نظر آرہی تھی، دوسری طرف دو عام قسم کے لوہے کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر صاف ستھرے بستر اور تکیے رکھے ہوئے تھے۔ چارپائیوں سے ذرا فاصلے پر ایک ٹیبل تھی جس کے گرد چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''میرے خیال میں یہ کمرا ذی نفس سے خالی نہیں ہوگا۔'' آدم خان نے متصل کمرے کی طرف دیکھ کر آہستگی سے کہا۔

''قوی امکان ہے۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔

ہم دونوں نے اپنی اپنی ٹارچ جیب میں رکھی اور ریوالور سنبھال کر پوری طرح چوکس ہوکر متصل کمرے کی طرف قدم اٹھانے لگے جس کے بند دروازے کے پیچھے جنریٹر کی آواز سنائی آرہی تھی۔ ہم دونوں ہم قدم تھے لیکن ہمارے درمیان احتیاط کے پیشِ نظر فاصلہ تھا۔

''آتے ہیں یہاں سرفروش سر کٹانے کے لیے
ہم حاضر ہیں جناب سر کاٹنے کے لیے''

اچانک ہمارے عقب میں ایک شاعرانہ آواز سرسرائی۔ ہم دونوں یکدم اچھل کر پیچھے گھومے۔

☆☆☆

سامنے دروازے پر ایک کلہاڑا بردار کھڑا ہوا تھا۔ جو بلیو جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے سے گردن تک مفلر نما سیاہ رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں اور پیشانی کا آدھا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بے حد چستی تھی اور اس نے چمکتے ہوئے پھل والے کلہاڑے کو دونوں ہاتھوں سے سینے کے برابر کسی رائفل کی طرح سنبھالا ہوا تھا۔

pklibrary.com

''نہیں، نہیں، کسی غلطی کی کوشش مت کرنا۔ یہ مت سمجھنا کہ میرے پاس کلہاڑا ہے اور میں تم لوگوں کے مقابلے میں کمزور ہوں اور تم لوگ اپنی جگہ پر کھڑے مجھے گولیوں سے بھون کر آسانی سے نکل جاؤ گے۔ ایسی غلطی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ یہ پورا بنگلا موت کا ایک پنجرہ ہے۔'' ڈھاٹا باندھے کلہاڑا بردار نے میرے ارادے کو بھانپتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی درشت لہجے میں خبردار کیا۔

اس دوران میں ہمارے عقب سے متصل کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ساتھ جنریٹر کی گونج میں بھی اضافہ ہوا۔ میں نے سر ذرا پیچھے کی طرف گھمایا۔ متصل کمرے کے دروازے کے سامنے ایک اور سیاہ ڈھاٹا پوش شخص کی جھلک نظر آئی جو کلہاڑے سے نہیں بلکہ آٹومیٹک رائفل سے مسلح تھا اور رائفل کا رخ ہماری طرف تھا اور ہمارے ریوالور کا رخ کلہاڑا بردار کی سمت تھا۔ کمرے میں انتہائی نازک اور غیر یقینی صورتِ حال تھی۔ میرے برابر کھڑا آدم خان بھی پیچھے کھڑی موت کو ایک نظر دیکھ چکا تھا۔

''ہتھیار نیچے ڈال دو...... ورنہ میں تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔'' عقب سے غراہٹ ابھری۔

آدم خان کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش پیدا ہوئی اور وہ ..... ایک سوالیہ نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد دوبارہ کلہاڑا بردار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میری حالت بھی مختلف نہ تھی، خوف کے مارے میرا دل سینے کے پنجرے سے لگاتار سر ٹکرا رہا تھا مگر میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے مختل ہوتے حواسوں کو مجتمع کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا بہتر طور پر کر سکوں۔

''سنا نہیں، میں نے تم لوگوں سے کیا کہا۔'' ایک دفعہ پھر غراہٹ نما آواز عقب سے سنائی دی۔ آدم خان نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا لیکن میں کیا بولتا۔ میں جو سوچ رہا تھا وہ نہ میں لفظوں میں بتا سکتا تھا نہ اشارے کنایوں سے۔ میری بس یہ کوشش تھی کہ جو میں کروں آدم خان فوراً میری تقلید کرے۔ یہ مجھے اندازہ تھا کہ عقب والا ڈھاٹا پوش ہم دونوں کو بیک وقت رائفل کی زد میں بے بس نہیں کر سکتا کیونکہ آدم خان اور میرے درمیان فاصلہ خاصا تھا۔ اگر وہ میری طرف لپکتا یا مجھے گولی سے اُڑا دیتا تو اتنی دیر میں آدم خان کوئی جوابی قدم اٹھانے میں تاخیر نہ کرتا۔

اسی طرح وہ آدم خان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا تو مجھے اس کے کلہاڑا بردار ساتھی کو شوٹ کرنے کا موقع ضرور ملتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگر وہ ہم پر فائر کھول دیتا تو اس کے ساتھی کا گولیوں کی زد میں آنا یقینی تھا۔ کیونکہ میں عین دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور کلہاڑا بردار دروازے پر ایستادہ تھا۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح رسک لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے ایک نگاہ آدم خان پر ڈالی اور پھر اپنا ریوالور دھیرے دھیرے نیچے ڈالنا شروع کیا۔ آدم خان میری نگاہوں کا مطلب سمجھ چکا تھا یا نہیں مگر وہ ہو بہو میری تقلید کر رہا تھا۔

''دو لڑکوں کی سرکٹی لاشیں گاؤں کے لیے کافی نہیں تھیں کہ تم دونوں اپنا منہ لے کر یہاں دوڑے چلے آئے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا لبو...... کہ تم کسی دن پھر بنگلا کھوجنے کے لیے ضرور آؤ گے۔ ہم نے جان بوجھ کر تمہارے راستوں کے آگے رکاوٹ نہیں ڈالی تاکہ تم لوگ یہاں آ کر پھنس جاؤ...... انسان تو کیا اگر بنگلے میں پرندہ بھی پر مارے تو ہمیں فوراً خبر ہو جاتی ہے۔ اس دن تو میں نے خراٹوں سے ڈرا کر تمہیں بنگلے سے بھگانے کی کوشش کی مگر تم نہیں ڈرے لبو۔ پھر تم خود ہی اپنی مرضی سے بنگلے سے نکل گئے۔'' ریوالور نیچے ڈالنے کے دوران کلہاڑا بردار نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے تیزی سے کہا۔ اس کی آواز قدرے مناسبت سے وہ مجھے لبو کہہ رہا تھا مگر میری توجہ موت کے فرشتے کی طرح سر پر کھڑے سیاہ ڈھاٹا پوش پر مرکوز تھی جو آتشیں اسلحہ سے لیس تھا۔ کلہاڑا بردار سے نمٹنے کا معاملے آدم خان کے سپرد کرنا تھا۔ ہمارے ہاتھ میں موجود ریوالور نیچے فرش پر ذرا برابر فاصلے پر تھے کہ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ ''آدم خان! کلہاڑا بردار کو شوٹ کرو۔'' میں چیختا ہوا تیزی سے پیچھے کی طرف گھوما اور پہلی فرصت میں رائفل بردار پر فائر کھول دیا جو اَب میرے سامنے موجود تھا۔

☆☆☆

سرنگ فائرنگ کی گونج سے لرز اٹھی۔ دونوں ڈھاٹا پوشوں کو ہم سے ایسے جارحانہ اقدام کی توقع نہیں تھی مگر پھر بھی رائفل بردار کی نسبت کلہاڑا بردار ... چوکس نکلا...... میرے ریوالور سے نکلی ہوئی گولیوں نے رائفل بردار کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ گولیاں کھا کر رائفل سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر زخمی تھا اور اس کی رائفل میں نے فوراً حاصل کر لی۔ آدم خان میرے ارادے کو بھانپ چکا تھا اور اس نے میرے حکم پر فوراً کلہاڑا بردار پر فائر کھول

دیا تھا مگر کلہاڑا بردار پیچھے کی طرف قلابازی کھاتا ہوا دروازے سے نکل کر غائب ہوگیا۔ آدم خان کا کہنا تھا کہ وہ گولیوں کی زد سے بچ گیا تھا۔ یہ سب ایک آدھ منٹ میں رونما ہوا تھا۔ زخمی ڈھاٹا پوش کمرے میں ہمارے سامنے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے زخم جان لیوا نہیں تھے۔ گولیوں نے زیادہ اس کے ہاتھوں کو زخمی کر دیا تھا صرف ایک گولی گردن کو ذرا چھو کر گزری تھی۔ میری یہ کوشش تھی کہ اسے مجھ پر جوابی فائر کا ایک لمحہ بھی نہ ملے، میں نے پہلی فرصت میں اس کے ہاتھوں کو نشانہ بنایا جس میں رائفل موجود تھی۔ میں نے اپنا ریوالور قمیص کے نیچے اڑس لیا۔ اب میرے ہاتھوں میں رائفل تھی جو تھوڑی دیر قبل ڈھاٹا پوش کے ہاتھوں میں موجود تھی۔

''اٹھو......'' میں نے ڈھاٹا پوش زخمی کی طرف رائفل لہراتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ وہ کراہتا ہوا فرش سے اٹھا۔

''جلدی سے اس کی جامہ تلاشی لو اور اس کے چہرے پر سے ڈھاٹا کھینچ لو۔'' میں نے زخمی کو رائفل کی زد میں لیتے ہوئے آدم خان سے کہا اور خود کمرے کے دروازے پر آ کے کھڑا ہوگیا۔ کیونکہ مجھے کلہاڑا بردار کے حملے کا خدشہ بھی تھا۔ ٹارچ کی روشنی کے دائرے سے باہر تاریک سرنگ میں نظریں دوڑانے کے بعد وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ زخمی ڈھاٹا پوش سے ایک خطرناک قسم کا چاقو برآمد ہوا۔ باقی چیزیں جو برآمد ہوئیں وہ بے ضرر اور عام قسم کی تھیں۔ جامہ تلاشی کے بعد آدم خان نے چہرے سے ڈھاٹا کھینچ لیا۔ اب ہمارے سامنے تیس بتیس سال کا...... کھردرے چہرے والا ایک نوجوان کھڑا تھا جس کے ہلکی داڑھی اور مونچھوں والے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار واضح نظر آ رہے تھے۔

''پہچانتے ہو اِسے؟'' میں نے آدم خان سے استفسار کیا۔

''نہیں ماسٹر صاحب جس طرح یہ آپ کے لیے اجنبی ہے ویسا میرے لیے بھی ہے۔'' آدم خان نے جواباً کہا۔

''ان چرمی کیسوں میں کیا ہے؟'' میں نے دیوار کے برابر چرمی کیس کے ڈھیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خیال کے تحت زخمی نوجوان سے پوچھا۔

''تم لوگ بڑی غلطی کر رہے ہو۔ یہ مت سمجھنا کہ مجھے یرغمال بنا کر تم لوگ یہاں سے زندہ سلامت بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ بہتری ابھی بھی اسی میں ہے کہ تم لوگ ہتھیار ڈال دو۔'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ انتہائی دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''باندھ دو اس کے ہاتھ۔'' میں نے بھی اس کی دھمکی کی پروا کیے بغیر آدم خان سے کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دونوں ہاتھ سیاہ کپڑے سے اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے جسے کچھ دیر پہلے آدم خان نے اس کے چہرے سے اتارا تھا۔ ہم اسے بندوق کی نوک پر لیے کمرے سے باہر آ گئے۔ آدم خان نے ٹارچ کی روشنی تسلی کے لیے سرنگ میں ہر طرف پھینکی۔ ہمارے اچانک حملے سے کلہاڑا بردار کس طرف نکل گیا تھا، یہ ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سرنگ میں اس کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم آگے بڑھنے لگے لیکن بے حد احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ زخمی نوجوان ہمارے آگے رائفل کی نوک پر بے بسی سے چل رہا تھا۔

اب زینے پر چڑھنے کا مرحلہ سامنے تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ زخمی شخص کے ہاتھ کھول دیے جائیں۔ ہاتھوں کے سہارے کے بغیر سیڑھیاں چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے زخمی ہاتھوں سے قطرہ قطرہ لہو ٹپک رہا تھا لیکن وہ زخموں کی تکلیف ضبط کر رہا تھا۔ زینے چڑھنے کے دوران وہ آزاد ہاتھوں کے بل پر کوئی بھی جارحانہ قدم اٹھا سکتا تھا لیکن ہمارے پاس رسک لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور ہم اب تک رسک لیتے ہی آ رہے تھے۔ مزید ایک اور رسک لینے میں حرج ہی کیا تھا۔ میرے اشارے پر آدم خان اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے لگا۔

زخمی کے ہاتھ کھلتے ہی میں نے آدم خان کو زینے چڑھنے کا اشارہ کیا۔ آدم خان اوپر چڑھنے لگا اور میں زخمی شخص کو رائفل کی زد میں لیے نیچے ٹھہرا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آدم خان دہانے کے پاس نظر آیا اور پھر دہانے سے نکل کر اوپر غائب ہوگیا۔ شاید وہ پوری طرح جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ جلد نمودار ہوگا اور مجھے اوپر آنے کا اشارہ کرے گا۔ میں اس امید پر زخمی شخص کو گن سے قابو کیے کھڑا رہا لیکن آدم خان کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ بے حد اہم تھا۔ ایسے حالات میں آدم خان کی تاخیر تشویش ناک بات تھی۔

''اب تم چڑھو اوپر......'' میں نے زخمی شخص کو حکم دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے گھورا پھر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دہانے سے ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ چنانچہ ٹارچ کی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں کسی مشکل کے بغیر دیکھ سکتا تھا جب زخمی شخص نے چند زینے

ملے کیے تو میں نے آدم خان کو پکارا، مگر ہر طرف پُراسرار خاموشی چھائی رہی۔ ایک دفعہ پھر میں نے اور زور سے پکارا مگر جواب ندارد۔ کیا آدم خان کسی مشکل میں پڑ گیا تھا؟ یہ سوچ کر خوف اور بے چینی کی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی لیکن جلد میں نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

''ٹھہر جاؤ۔'' تھوڑی دیر بعد زخمی شخص دہانے کے ذرا نیچے پہنچا تو میں نے اسے رکنے کا حکم دیا۔ وہ ٹھہر گیا اور میں رائفل سنبھال کر تیزی سے زینے چڑھنے لگا۔

''باہر نکلو۔'' اور ایک دفعہ پھر میں تحکمانہ انداز میں بولا۔ وہ دہانے سے باہر نکلا اور میں بھی اس کے پیچھے بڑی پھرتی کے ساتھ دہانے سے نکل کر اوپر آ گیا۔ اٹیچ باتھ روم نما کمرا خالی تھا۔ آدم خان نظر نہیں آرہا تھا۔

''آدم خان......!'' میں نے زور سے پکارا۔ میری آواز کی بازگشت چند لمحے کے لیے پُراسرار بنگلے میں گونجتی رہی پھر ہر سو خاموشی طاری ہو گئی۔ میں خطرے کی بُو سونگھ رہا تھا جس کا کسی بھی لمحہ سامنے آنے کا امکان تھا۔ ''چلو آگے بڑھو اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' میں نے زخمی شخص کی پیٹھ پر رائفل کی نال چبھوتے ہوئے درشت لہجے میں کہنے کی کوشش کی مگر میرے انداز میں بوکھلاہٹ کا تاثر زیادہ تھا۔ شاید میرے لیے پریشانی کا احساس کا تھا۔

''حوصلہ رکھو...... تمہارا ساتھی آس پاس ہو گا لیکن میرے ساتھیوں کے قابو میں ہو گا۔'' گھائل آدمی جس کے ہاتھ اب آزاد تھے، طنزیہ انداز میں بولا۔

''یاد رکھو تم پوری طرح میرے قابو میں ہو۔'' میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا اور وہ خاموشی کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل میں کھلے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ میں اسے لے کر کمرے میں پہنچا کمرا بھی خالی تھا۔ اسی طرح میں گھائل آدمی سمیت باہر راہداری میں آیا۔ کہیں بھی کسی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پورا بنگلا سائیں سائیں کر رہا تھا۔

''میرا ساتھی کہاں ہو سکتا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''میرے ساتھیوں کے قبضے میں۔'' وہ برجستہ انداز میں بولا۔

''وہ کہاں ہو سکتے ہیں؟'' میں نے زور دے کر پوچھا۔

''بنگلے میں کہیں بھی۔'' وہ بڑے پُرسکون انداز میں بولا۔

''چلو صحن کی طرف۔'' مجھے بنگلے سے نکلنے کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ آدم خان کو سفاک دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن وہ بنگلے میں کہاں ہے اور کس حالت سے گزر رہا ہے، یہ مجھے علم نہیں تھا۔ میرا یہاں مزید ایسی حالت میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کسی بھی وقت میں ان کے قابو میں آسکتا تھا اور پھر ہماری سرکٹی لاشیں بنگلے کے آس پاس سے برآمد ہو جاتیں اور گاؤں کے سادہ لوح لوگ ہماری موت کی وجہ بھوت، پریت اور روحوں کو قرار دیتے جبکہ یہاں معاملہ مختلف نظر آرہا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے..... اس طرح مجھے یرغمال رکھ کر آسانی کے ساتھ بنگلے سے نکل سکتے ہو؟'' اس نے چلتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''میں جو کروں، میری مرضی ہے۔ تم صرف اپنا منہ بند رکھو۔'' میں نے غضبناک انداز میں اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا اور رائفل کی نال اس کی گدی پر زور سے چبھو دی۔ وہ سہم گیا اور خاموشی کے ساتھ میرے آگے چلنے لگا۔ میں اسے لے کر پھاٹک تک آیا اور اب دیوار پار کرنے کا مرحلہ سامنے تھا۔ پہلے مجھے دیوار پر چڑھنا تھا اس کے بعد زخمی کو۔ پھر زخمی کو باہر کودنا تھا اور اس کے بعد مجھے تاکہ وہ ہر طرح سے میری رائفل کی زد میں رہے۔ اس سمے اس کے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے۔ میں نے اسے دیوار کے قریب کھڑا رہنے کا حکم دیا اور پھر خود چند قدم کے فاصلے پر جا کر رائفل سنبھالتے ہوئے پھرتی سے دیوار پر چڑھ گیا اور پھر اسے دیوار پر چڑھنے کا حکم دیا۔ زخمی سے فاصلے پر رہ کر دیوار پر چڑھنے کا فیصلہ میں نے احتیاط کے پیش نظر کیا تھا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ دیوار پر چڑھنے کے دوران لمحہ بھر کی غفلت کی وجہ سے وہ کہیں موقع سے فائدہ نہ اٹھائے...... پہلے اس نے اپنے سر سے بلند ہاتھ نیچے کیے، پھر وہ بڑی تیزی کے ساتھ دیوار پر چڑھ آیا۔

''اب نیچے کود جاؤ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

عین اسی وقت فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ سنسناتی ہوئی ایک گولی میرے ہاتھ میں موجود رائفل سے آٹکرائی۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے باہر گر پڑی۔ اسی دوران میں زخمی شخص بھی باہر کود چکا تھا اور بجلی کی تیزی سے رائفل اٹھا کر میری طرف تانتے ہوئے بولا۔

''ہینڈز اَپ..... ورنہ بھیجا اُڑا دوں گا۔'' کایا پلٹ گئی تھی۔ میری جیب میں ریوالور موجود تھا لیکن میں دونوں طرف سے ایسا گھر چکا تھا کہ سوائے سر سے ہاتھ بلند کرنے

کے خفیف سی حرکت بھی مجھے موت کی وادی میں دھکیلنے کا موجب بن سکتی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کیے۔

"اب چھپا چھپی کا کھیل خلاص۔ شاباش اب اچھے بچوں کی طرح نیچے اتر جاؤ۔" بنگلے کی طرف سے تمسخرانہ آواز آئی۔ بالائی منزل پر مجھے ڈھاٹا پوش کلہاڑا بردار اپنے مخصوص انداز میں کھڑا نظر آیا اور اس کے دونوں طرف دو مسلح ڈھاٹا پوش چوکس کھڑے تھے جن کی گنز کا رخ میری طرف تھا۔

"اسے آسان مت لو بلیک وولف...... تم نے دیکھا نہیں اس نے کس طرح خطرناک انداز میں بازی پلٹ دی تھی۔ یہ اب بھی مسلح ہے۔" باہر کھڑے ہوئے زخمی نے گرج دار آواز میں اپنے ساتھی کو خبردار کیا۔ زخمی کے تیور انتہائی خطرناک نظر آرہے تھے۔

"پہلے ریوالور نیچے پھینکو پھر خود نیچے کود جاؤ۔" کلہاڑا بردار بولا۔ میں اگرچہ بُری طرح پھنس چکا تھا لیکن پھر بھی جارحانہ اقدام اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں ایک اسکول ٹیچر تھا اور میرے مخالف تربیت یافتہ مجرم تھے اور میں صرف این سی سی کی معمولی تربیت لے چکا تھا۔ شاید ہی میرا پختہ نہیں تھا۔ مزید دو مسلح سیاہ پوشوں کے اضافے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بنگلے میں مزید سیاہ پوش موجود ہوں گے۔ سارا دارومدار قسمت پر تھا اور یہ بھی امر نہیں تھا کہ قسمت کی دیوی اس دفعہ بھی مجھ پر مہربان ہو گی مگر میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ میں نے ریوالور جیب سے نکال کر زمین پر پھینک دیا جس میں تین گولیاں باقی تھیں۔ بالکونی میں کھڑے تینوں سیاہ پوش آسانی کے ساتھ ریوالور کی رینج میں آسکتے تھے۔ جہاں زمین پر ریوالور پڑا ہوا تھا، میں نے وہاں جست لگائی اور پلک جھپکتے زمین سے ریوالور اٹھا کر بالکونی میں کھڑے تینوں مسلح سیاہ پوشوں کی طرف فائر جھونکا۔ بنگلے کی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے لرز اٹھی۔ دھول کا ایک بادل سا اٹھا۔ میں گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے تئیں قلابازیاں کھاتا ہوا عمارت کے عقب میں نکل آیا۔ لمحہ بھر فائرنگ تھمنے کے بعد ایک دفعہ پھر میرے اردگرد زمین پر گولیاں برسنی شروع ہو گئیں۔ اب کی بار بالائی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے مجھ پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں بدحواسی کے عالم میں آگے کی سمت دوڑنے لگا۔ زمین پر پڑنے والی گولیوں کی بوچھاڑ سے اٹھنے والی دھول میرے تعاقب میں تھی۔ میرا ارادہ سامنے کھڑی دیوار کو پھلانگ کر احاطے سے نکلنے کا تھا۔ جب میں سرپٹ بھاگتا ہوا چار دیواری کے گوشے کے قریب پہنچا تو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً میرے بھاگتے ہوئے قدموں تلے اچانک زمین نکل گئی اور میں نیچے گرتا چلا گیا۔

☆☆☆

نرم ریت نے میرے جسم کو چھوا۔ چند ثانیے میں خالی ذہن کے ساتھ نرم ریت پر پڑا رہا۔ خلا کافی گہرا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اوپر دور خلا کے کھلے ہوئے دہانے کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔ نرم ریت پر گرنے کی وجہ سے مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ فائرنگ کے دوران قلابازیاں کھانے کی وجہ سے کلائیوں پر خراشیں ضرور آئی تھیں جو معمولی نوعیت کی تھیں۔

"ماسٹر صاحب!" اچانک ایک طرف سے مجھے آدم خان کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً اٹھا۔ اس دوران میری آنکھیں تاریکی سے قدرے مانوس ہو گئی تھیں اور کھلے دہانے سے اندر کسی قدر ہوا اور روشنی بھی داخل ہو رہی تھی۔ میں اس طرف متوجہ ہوا جہاں سے آدم خان کی مریل پکار سنائی دی تھی۔ آدم خان رسیوں کے ساتھ.. ایک کرسی کے ساتھ بندھا ہوا نظر آیا جو پسینے سے شرابور تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہاں کرسی پر آدم خان موجود تھا۔ دونوں طرف دیوار پر دو دروازے بھی نظر آرہے تھے جو اس وقت بند تھے۔ میں چاروں طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ گڑھے کی دیواروں کو چند لمحے قبل میں کچی مٹی کی دیواریں سمجھ رہا تھا، وہ سیمنٹ کی پکی دیواریں نظر آرہی تھیں۔ صرف فرش نرم ریت کا تھا۔

'یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟' میں نے دل میں سوچا۔

میرا ریوالور اب بھی میرے ہاتھوں میں تھا۔ فالتو گولیاں بھی میرے پاس تھیں۔ میں جیب سے گولیاں نکالنے کے بعد ریوالور کو پوری طرح لوڈ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"اس سے آپ ان لوگوں کا کیا بگاڑ و گے؟" آدم خان کی مایوس کن آواز آئی۔

"کوشش...... شاید کوشش سے کوئی راستہ نکلے۔" میں نے کہا۔

"ایسی خوامخواہ کی کوششوں نے ہمیں یہاں پھنسا دیا...... یہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور ان کی تعداد بھی کافی ہے۔" آدم خان یاسیت بھرے لہجے میں بولا۔ اسی دوران میں دونوں دروازے اچانک بیک وقت دھڑام سے کھلے اور ان سے مسلح سیاہ پوش نمودار ہوئے۔ جن کی گنز کا رخ میری طرف تھا۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ میں اس وقت ریوالور

pklibrary.com

پوری طرح لوڈ کر چکا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازوں سے مزید سیاہ پوش مکوڑوں کی طرح نکل آئے جو مختلف قسم کے خطرناک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ گڑھا سیاہ پوشوں سے بھر گیا تھا اور میں ان کے گھیرے میں تھا۔ مزاحمت صریحاً موت تھی۔ میں نے ریوالور نیچے پھینک دیا اور ہینڈز اَپ ہو گیا۔

☆☆☆

''تم نے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ ہمارے ایک جونیئر ساتھی کو زخمی کر کے خود کو بڑا توپچی .... سمجھ رکھا ہے؟ ہم چاہتے تو تمہیں اس وقت گولیوں سے بھون ڈالتے جب تم نے احاطے میں چھلانگ لگانے کے بعد ریوالور اٹھا کر ہم پر فائر کیا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ تم ضرور کوئی حرکت کر بیٹھو گے چنانچہ ہم تیار تھے۔ ہمارا مقصد تمہیں زندہ پکڑنے کا تھا۔ ہم تمہیں فائرنگ کے ذریعے بھگا کر اس مقام تک لانے میں کامیاب ہوئے جہاں گڑھے کا بند دہانہ موجود ہے جس کے کھلنے میں صرف پاؤں پڑنے کی دیر تھی۔ اس طرح تمہیں علم بھی نہ ہوا اور تم کسی بھاگتے ہوئے چوہے کی طرح آخر پھنس گئے اور ہمارے اس جونیئر ساتھی کو بھی علم نہیں تھا کہ ہم نے تمہیں زندہ پکڑنے کے لیے کیا جال پھیلا رکھا ہے۔ جبھی تو وہ تمہیں آسان نہ لینے کا مشورہ دے رہا تھا۔'' کلہاڑا بردار نے نخوت سے کہا جس کے زخمی جونیئر ساتھی نے اسے بلیک وولف کے نام سے پکارا تھا۔

میں اور آدم خان اس وقت ایک کمرے کے ننگے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے ہاتھ پشت پر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ بلیک وولف سمیت کئی سیاہ پوش ہمارے سروں پر کھڑے تھے مگر نارمل حالت میں۔ یعنی ان کی خطرناک رائفلز کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہمیں گڑھے سے اس کمرے تک آتے ہوئے اندازاً پانچ منٹ کا وقت لگا تھا۔ ان لوگوں نے ہمیں گڑھے سے متصل ایک دروازے میں دھکیلا تھا۔ راستے روشنی سے مفقود اور تاریک تھے۔ ٹارچ کی روشنیوں میں بل کھاتی اور گھومتی ہوئی راہوں پر چلتے ہوئے کمرے تک پہنچ گئے تھے۔ واقعی راستہ اتنا لمبا تھا یا پھر وہ لوگ ہمیں مرعوب کرنے کے لیے قصداً گھما پھرا کر کمرے تک لائے تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ چھوٹا سا بنگلا بڑا پُراسرار تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

''میرے خیال میں ہم بنگلے کے گراؤنڈ فلور کے کسی کمرے میں قید ہیں؟'' میں نے اوپر روشن دان سے آسمان کو دیکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

''بنگلے میں قید ہیں یا بنگلے سے دور، کچھ فرق پڑنے والا نہیں...... بھیانک موت کے منتظر قیدی ہم ضرور ہیں۔'' آدم خان انتہائی مایوس کن لہجے میں بولا۔

''اس قدر مایوسی بھی اچھی بات نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم لوگ بری طرح پھنس چکے ہیں مگر امید کو دل میں جگانا اچھی بات ہے۔ گاؤں کی آبادی بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ احاطے کے اندر ہونے والی فائرنگ کی گونج ضرور آبادی تک پہنچی ہو گی۔ امید ہے کہ وہاں سے ہمارے لیے کوئی مدد آ جائے۔'' میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

''ان دیہاتیوں کی نفسیات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ گولیوں کی آوازوں کو بھی بھوتوں کی حرکت سمجھیں گے بلکہ سمجھ چکے ہوں گے۔ ان دیہاتیوں کے آسرے میں مت رہنا۔ یہ کبھی بھی بنگلے کا رخ نہیں کریں گے۔'' آدم خان قدرے تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''شاید دیہات میں ایک آدھ ایسے لوگ ہوں جو گولیوں کی آواز کے پیچھے [illegible] حقائق پر نگاہ ڈالیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا اور اس دوران میں کال کوٹھری کا بھاری دروازہ بھی کھل گیا۔

☆☆☆

''جس مقصد کے لیے تم لوگ بنگلے میں آئے ہو، اس سے جڑے ہوئے سوالات کا جواب میں دینا چاہتا ہوں تاکہ تم لوگوں کی...... روحوں کو شانتی نصیب ہو۔'' بلیک وولف نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ یہ سن کر ہماری حالت غیر ہونے لگی۔ اس کی تیز نگاہیں باری باری ہم پر ٹھہر رہی تھیں۔

''ڈر گئے کیا ہیرو؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمسخرانہ انداز میں کہا۔ اس کی نگاہیں اور اس کا لہجہ ڈھاٹے کے پیچھے چھپے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کی عکاسی کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں کہا۔ اس نے کلہاڑا ایک ہاتھ سے پکڑا اور عین میرے سامنے ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔

''یہ پسینے مفت میں تو نہیں چھوٹ رہے ہیں؟'' اس نے میری پیشانی پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا جو پسینے سے تر

pklibrary.com

تھی۔

"حبس کی وجہ سے......" میں نے بتایا۔

"کافی اڑیل انسان نظر آتے ہو۔ اپنی کمزوریوں کو کسی بھی حالت میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔" بلیک وولف نے آخر میں طنزیہ انداز میں کہا۔

"رابعہ کا سر میں نے دھڑ سے الگ کیا تھا۔ اپنے باس کے حکم پر۔ انور ہمارا باس ہے اور اکبر کو سیکنڈ باس کا درجہ حاصل ہے۔ ان دو بھائیوں میں کافی حد تک اتفاق قائم ہے۔ میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ اکبر نے انور کے کسی حکم کو رد کیا اور انور نے اکبر کے کسی مشورے پر اتفاق نہ کیا ہو۔" بلیک وولف نے انتہائی سرد لہجے میں انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ انور اور اکبر دونوں بھائیوں کے درمیان مثالی اتفاق کے بارے میں، میں آدم خان کی زبانی پہلے بھی سن چکا تھا اور اب بلیک وولف کی زبانی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔

"ماسی حلیمہ بے وقوف قسم کی عورت نہیں ہے۔ رابعہ کے قتل کے معاملے میں اسے انور نے پہلے سے اعتماد میں لیا تھا۔ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ بوڑھے محبت خان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اب سیاہ وسفید کے مالک انور اور اکبر ہیں۔ بوڑھا محبت خان اپنی طبعی موت مرا یا اس کی موت اس کی جوان سالہ بیوی رابعہ کی سازش کا نتیجہ تھی۔ اس حوالے سے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا لیکن انور اور اکبر اپنے بوڑھے والد کی اچانک موت کو رابعہ کی کارستانی سمجھنے لگے۔ ہم تو اپنے باس کے حکم کے غلام ہیں۔ محبت خان کے بعد انور نے جان نشینی کا منصب سنبھالا۔ مجھے حکم ملا، رابعہ کو ختم کرنے کے لیے۔ بنگلے میں رابعہ کے ساتھ ماسی حلیمہ تھی جسے رابعہ کے قتل میں میرے لیے سہولت کار کا کردار ادا کرنا تھا۔ اس وقت یہ بنگلا تو کیا میں نے یہ دیہات بھی دیکھا نہیں تھا۔ کسی طرح بنگلے تک مجھے پہنچایا گیا۔ ماسی حلیمہ جیسے میری آمد کی منتظر تھی۔ فوراً دروازہ کھل گیا۔ میرے چہرے پر.... سیاہ ڈھاٹا لپٹا ہوا تھا۔ میں نے شہر میں ماسی حلیمہ کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ میرے لیے شناسا تھا۔ وہ بھی مجھے پہچانتی تھی لیکن اس وقت اسے علم نہیں تھا کہ سیاہ ڈھاٹے کے پیچھے ایک شناسا چہرہ چھپا ہوا ہے اور میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ ماسی حلیمہ مجھے پہچان لے۔ آدھی رات کے سمے ایک کلہاڑا بردار کو دروازے پر پا کر ایک لمحے کے لیے وہ گھبرا سی گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ گھبراؤ مت۔ رابعہ تک میری رہنمائی کرو۔ تو وہ سنبھل گئی۔

بالائی منزل پر واقع بیڈروم کے سامنے پہنچ کر ماسی حلیمہ نے دروازہ بجانا شروع کیا اور ساتھ ساتھ رابعہ کو بھی پکارنے لگی کہ اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے اور اسے فوری مدد کی ضرورت ہے۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ ماسی حلیمہ فوراً اڑن چھو ہوگئی اور میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ بے چاری رابعہ ماسی حلیمہ کے بجائے ایک سیاہ پوش کلہاڑا بردار کو اچانک کمرے میں پا کر چکرا کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ آخر سب کیا ہے۔ کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ دوسرے لمحے میں نے کلہاڑا گھمایا۔ اور وہ بے چاری حیرت کے عالم میں دنیا سے کوچ کر گئی۔" بلیک وولف چند لمحے کے لیے خاموش رہا اور بڑے عجیب انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا۔ جیسے اس کی عقاب جیسی تیز آنکھیں میرے ذہن کا ایکسرے کر رہی ہوں۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے سیاہ کارناموں کا اعتراف کرتا جارہا تھا۔

"انور اور اکبر کے لیے رابعہ کو مارنا بڑا آسان تھا۔ یعنی وہ ماسی حلیمہ کے ہاتھوں بھی مروا سکتے تھے۔ کھانے پینے کی اشیا میں زہر ملانے کی صورت میں۔ لیکن یہ دونوں شاطر بھائی اپنا تھوک بھی اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر تھوکتے ہیں۔" بلیک وولف ایک دفعہ پھر گویا ہوا۔

"میرے ہاتھوں رابعہ کو بھیانک انداز میں قتل کرانے کا مقصد دیہات میں بنگلے کی دہشت بٹھانا تھا۔ تاکہ دیہات اور آس پاس کے لوگ بنگلے کے قریب پھٹکنے کی جرأت بھی نہ کرسکیں۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دیہات کے دو نوجوان کی سرکٹی لاشوں اور دیگر حربوں نے خوف و دہشت کی گویا مہر ثبت کردی۔ دن کی روشنی ہو یا رات کی تاریکی لوگ بنگلے کے قریب تک آنے سے بھی خوف زدہ رہے اور بنگلے کو آسیبی بنگلا سمجھنے پر مجبور ہوگئے۔ رابعہ کے قتل اور دونوں نوجوانوں کے قتل میں یکسانیت تھی، تینوں قتل میں نے اس کلہاڑے سے کیے تھے۔" بلیک وولف نے کلہاڑے کے چمک دار پھل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اکبر اور انور کو علم تھا کہ محبت خان کے بعد ڈرگ کا غیر قانونی دھندا شہر میں مکمل طور پر آسانی کے ساتھ جاری رکھنا مشکل ہوگا۔ محبت خان کی موت اور پھر رابعہ کے قتل کے بعد یہ بنگلا انور اور اکبر کی غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ سرنگ والے جس کمرے میں تم لوگ گھس آئے تھے، اس میں لیدر ساخت کے کیس ضرور دیکھے ہوں گے اس وقت ان میں کروڑوں ڈالرز مالیت کی ڈرگز موجود ہیں۔ محبت خان کی نوجوان بیوی رابعہ نہ صرف مال و دولت میں

اپنا حصہ چاہتی تھی بلکہ تنازعہ اٹھنے کی صورت میں انور اور اکبر دونوں کو قانون کے شکنجے میں پھنسنے کا اندیشہ بھی لاحق تھا۔ ڈرگز کے کاروبار سے متعلق رابعہ نے اہم راز بوڑھے محبت خان سے حاصل کیے تھے۔ بوڑھا محبت خان تو اب دنیا میں نہیں رہا لیکن یہ راز انور اور اکبر کو جیل کی کال کوٹھریوں میں دھکیلنے کے لیے کافی تھے۔ ویسے بھی محبت خان کے بعد انور اور اکبر کے بدخواہوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ المختصر رابعہ کو بھیانک انداز میں موت کے گھاٹ اتارنے میں انور اور اکبر کے بڑے مفادات وابستہ تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر ویران اور غیر آباد نظر آنے والا یہ بنگلا ڈرگ مافیا کا ایک اہم مرکز ہے۔'' بلیک وولف کلہاڑے کا دستہ فرش پر ٹکا کر اس کی مدد سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''جیمز بانڈ...... میرے انکشافات سے ضرور تم لوگوں کی روحوں کو سکون ملے گا۔'' کمرے سے باہر نکلتے وقت بلیک وولف بولا اور پھر تھوڑی دیر بعد دروازہ بند ہوگیا۔

ہم خطرناک مجرموں کے چنگل میں تھے۔ کسی بھی وقت ہماری موت کا پروانہ آسکتا تھا۔ ہمارے ہاتھ پشت پر بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ ہم انہیں معمولی طور پر بھی ہلانے جلانے سے معذور تھے۔ تھوڑی بہت کوشش کے بعد ہم تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ ایک کال کوٹھری میں وقت کی رفتار کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کال کوٹھری میں ہلکی سی روشنی بھی معدوم ہونے لگی اور روشن دان پر گویا تاریکی کی دبیز چادر چڑھنے لگی۔

''رات اتر رہی ہے۔ اتنی دیر آپ کے غائب ہونے پر شاید آپ کے گھر والے پریشان ہوں۔'' میرے دل میں ایک موہوم سی امید جاگ اٹھی۔

''میں اطلاع دیے بغیر اتنی دیر پہلے کبھی غائب نہیں رہا۔ میرے بھائی ضرور پریشان ہوں گے لیکن انہیں کیا معلوم کہ میں یہاں آپ کے ساتھ قید ہوں۔'' آدم خان نے آخر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کے بھائی کو میرے غائب ہونے کا بھی علم ہوگا۔ وہ آپ کو دیکھنے اسکول کی طرف نکلا ہوگا یا آئندہ نکل جائے گا اور وہاں ہم دونوں موجود نہ ہوں۔ دوسری بات یہ کہ بنگلے کی طرف سے ہونے والی فائرنگ سے وہ یقیناً آگاہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کا دھیان ہماری طرف چلا جائے۔'' میں نے خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے کہا۔ عین اسی وقت کال کوٹھری کا دروازہ کھل گیا۔ بتدریج بڑھتی ہوئی تاریکی میں دو سیاہ ہیولے اندر داخل ہوتے نظر آئے۔ ایک نے گن سنبھالی ہوئی تھی جبکہ دوسرے کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا جگ نظر آرہا تھا۔

''پانی پی لو۔'' یہ کہتے ہی وہ میری جانب بڑھا اور جگ کو میرے ہونٹوں سے لگایا۔ غضب کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں فرش پر بیٹھے بیٹھے سیاہ پوش کے ہاتھوں گھونٹ گھونٹ پانی حلق سے اتارنے لگا۔ ابھی پیاس کی شدت باقی تھی کہ اس نے جگ میرے ہونٹوں سے ہٹالیا اور آدم خان کو پانی پلانے لگا۔ یقیناً آدم خان کی پیاس بھی پوری طرح نہیں بجھی ہوگی کہ اس نے جگ میں بچا ہوا پانی ایک طرف اچھال دیا اور پھر دونوں کال کوٹھری سے باہر نکل گئے۔

''پوری طرح پیاس نہیں بجھی تھی کہ کمینے نے پانی گرا دیا۔'' آدم خان نے کہا۔

''ہاں اتنی مقدار میں دیا ہے کہ انسان کا سانس بحال رہے۔'' میں نے کہا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے اردگرد دیواریں گھوم رہی ہوں۔ میں نے آدم خان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو دنگ رہ گیا۔ چار چار آدم خان میرے سامنے دائرے میں گھومتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میرے اعصاب بڑی تیزی کے ساتھ کمزور ہورہے تھے۔

''یہ مجھے کیا ہورہا ہے؟'' آدم خان کی آواز مجھے کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ دیکھتے دیکھتے میرا ذہن تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

گویا میرے کانوں میں بم پھٹ پڑا ہو۔ دھماکے کی آواز سے کسمسا کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور خالی خالی نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس حالت میں ہوں۔ مجھے اپنے بدن میں درد کا احساس ہونے لگا۔ جیسے میرا جسم کسی چیز کے بوجھ تلے دبا ہو۔ میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو ناکام ہوا تو...... پھر یکایک یاد آیا کہ میرے ہاتھ تو پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے تمام ناخوشگوار واقعات نگاہوں کے سامنے تیزی سے گھومنے لگے۔ آدم خان کہاں ہے؟ میں سوچنے لگا، پھر مجھے اپنے جسم سے چھوتی کسی نرم چیز کا احساس ہوا جس کے نیچے میں دبا ہوا تھا۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی، میں نے تاریکی میں دیکھنے کی سعی کی۔ وہ کوئی انسان تھا جو میرے اوپر پڑا ہوا تھا۔ پھر مجھے

pklibrary.com

کراہنے کی دردناک آواز اپنے قریب سنائی دینے لگی۔ یہ سب کیا ہے؟ میں سوچنے لگا۔ کراہنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

''آدم خان!'' میں نے آدم خان کو پکارنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ بوجھ تلے دبے پیروں کو بھی حرکت دینا شروع کی۔ اس دوران کراہنے کی صدائیں بھی معدوم ہوگئیں۔

''ہم...... ہوں۔'' میرے اوپر پڑے ہوئے بے حس وحرکت جسم سے نہ صرف غنودگی سے لبریز آواز آئی بلکہ اس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا ہونے لگی۔ میں بدستور آدم خان کو پکارتا رہا تاکہ وہ جلد سے جلد ہوش کے عالم میں لوٹ آئے۔

''کیا ہوا...... ماسٹر......؟'' آخر وہ غنودگی بھرے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

''مجھے کیا معلوم؟ پہلے اپنا سارا بوجھ مجھ پر سے اٹھاؤ، میرا تو دم گھٹتا جارہا ہے۔'' میں نے چڑچڑے انداز میں کہا کیونکہ آدم خان کے بوجھ تلے نہ صرف میرا دم گھٹ رہا تھا بلکہ ساتھ ساتھ ہڈی پسلیوں میں درد کی ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔

''لیکن میں کیسے اٹھوں...... میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور پاؤں رکھنے کے لیے جگہ بھی نہیں مل رہی۔'' تھوڑی سی جدوجہد کے بعد آدم خان نے کہا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ سب کیا چکر ہے؟ سیاہ پوش مجرموں نے ہمیں کہاں قید کر رکھا ہے؟ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے جائزہ لینے لگا اور اس دوران آدم خان نے بھی قدرے ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اب مجھ پر اس کا بوجھ کم ہوگیا تھا۔ حالات میرے سامنے واضح ہونا شروع ہوگئے۔ دراصل ہم کسی گاڑی میں موجود تھے۔ جو حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والی آواز یقیناً حادثے کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے ہوش آگیا تھا۔ اب مجھے اوپر گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ تاریکی میں نظر آرہا تھا اور یہ بات واضح تھی کہ گاڑی الٹی پڑی تھی۔ زبان زدِعام میں خالی سائڈ پر گاڑی کے الٹنے سے میرے دائیں طرف نشست پر بے سدھ پڑا ہوا آدم خان مجھ پر آن گرا تھا اور کراہنے کی آوازیں اگلی نشستوں سے آئی تھیں جو تھوڑی دیر پہلے میں سن چکا تھا۔

''آدم خان! ہم لوگ کسی گاڑی میں ہیں اور گاڑی کو حادثہ پیش آگیا ہے۔'' میں نے آدم خان کو آگاہ کیا۔

''ہاں، واقعی ایسا لگ رہا ہے۔'' تھوڑی دیر بعد آدم خان اثبات میں بولا۔ اب وہ بھی سنبھل گیا تھا۔ ''ہوسکتا ہے کہ ہم لوگ زخمی ہوں۔'' ایک دفعہ پھر اس کی آواز لہرائی۔

''مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہورہا ہے، کیا آپ ٹھیک ہو؟'' آخر میں، میں نے استفسار کیا۔

''پاؤں میں درد کا احساس ہورہا ہے لیکن پھر بھی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' آدم خان نے بتایا۔

''بہرحال فوری طور پر نکلنے کی کوشش بہتر ہے۔'' میں نے بڑی مشکلوں سے اپنا سر آدم خان کی پیٹھ پر لگا کر اسے اوپر اٹھنے کے لیے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ مشترکہ کوششوں سے آدم خان کسی طرح اٹھنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے پیر اوپر دروازے کی سیدھ میں تھے۔ پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں سے گاڑی سے باہر نکلنا آسان نہ تھا۔

''خود کو پوری طرح سنبھالنا...... میں نکل رہا ہوں۔'' میں نے آدم خان کو خبردار کیا۔

''اوکے...... اب آپ نکل سکتے ہو ماسٹر۔'' وہ بولا۔

آدم خان کا بوجھ ہٹنے کے بعد میں نے ایک لمبی سانس خارج کی اور گاڑی سے باہر نکلنے کے لیے جائزہ لینا شروع کیا۔ تاریکی سے ہماری آنکھیں مانوس ہوگئی تھیں۔ میں اگلی نشستوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ گاڑی کا اگلا حصہ بالکل تباہ نظر آرہا تھا۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ اور فرنٹ سیٹ پر دو آدمی بے حس وحرکت نظر آئے۔ جو ڈیش بورڈ اور نشستوں کے درمیان بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ دراصل ڈرائیونگ سیٹ والا آدمی ڈیش بورڈ سمیت اسٹیئرنگ وہیل اور نشست کے درمیان پھنس کر ٹکا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے ونڈ اسکرین کے راستے ہمیں باہر نکلنا تھا۔ میں تباہ حال ونڈ اسکرین کی طرف سرکنے لگا۔ پہلے میں اور پھر میرے بعد آدم خان تباہ شدہ گاڑی سے باہر نکل آنے میں کامیاب ہوئے۔ ونڈ اسکرین کے ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیوں نے باہر نکلنے کے دوران ہمارے جسموں کا حال اچھی طرح پوچھ لیا تھا۔

☆☆☆

نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے تھے۔ حبس تھا اور ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ پشت پر بندھے ہاتھوں سے گاڑی سے نکلنے کی جدوجہد میں ہم دونوں پسینے میں شرابور ہوگئے تھے۔ میری کوشش تھی کہ جتنا جلد ہوسکے، گاڑی سے دور نکل جائیں۔ چنانچہ ہم تاریکی میں انجانی راہوں پر چلتے چلے جارہے تھے مگر آدم خان کو چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ حادثے کے دوران

اس کے بائیں پاؤں پر موچ آئی تھی۔ ہم کہاں تھے، اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا اور دن کب طلوع ہوگا ہمارے پاس وقت بتانے کے لیے گھڑی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اور چلتے ہوئے ہم نے تقریباً دو گھنٹے سے زائد وقت کا فاصلہ طے کیا۔ اس وقت افق پر کالے بادلوں نے اپنا گھیرا ختم کیا تھا اور سرد ہوا کے جھونکے بھی چلنا شروع ہوگئے تھے۔ آسمان پر چمکتے تاروں کی مدھم روشنی زمین پر پڑ رہی تھی۔ یہ ایک چٹیل میدانی علاقہ نظر آرہا تھا جس میں ہم اس وقت موجود تھے۔ جہاں گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا وہاں ہمیں آس پاس بڑی، بڑی چٹان اور ایک طرف دور کھڑے بلند پہاڑوں کے ہیولے بھی نظر آئے تھے۔ شاید تیز رفتار گاڑی بے قابو ہوکر قریب کی کسی چٹان سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہوگئی تھی۔ کیونکہ ہم نے گاڑی کے پاس بھی ایک سنگی چٹان دیکھی تھی جو گاڑی کے پیچھے دائیں سائڈ پر واقع تھی۔ وہ دونوں زندہ تھے یا راہِ عدم ہو چلے تھے۔ ہمارے پاس کسی غیر ضروری جائزے کے لیے فالتو وقت نہیں تھا۔ ہم فوراً گاڑی سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ عام حالات اور دن کی روشنی میں بھی میرے لیے یہ سارا علاقہ انجان اور اجنبی تھا۔ دگرگوں حالات اور تاریک رات میں آدم خان کے لیے بھی اندازہ لگانا مشکل ہورہا تھا کہ ہم کہاں موجود ہیں۔ تھکاوٹ سے ہمارے جسم چور چور تھے اور پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نیچے زمین پر ڈھیر ہوگئے۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے وقفے وقفے سے چل رہے تھے۔ ہم دونوں جلد نیند کی وادیوں میں اتر گئے۔

☆☆☆

''ماسٹر...... ماسٹر...... مبارک ہو۔'' میری آنکھ آدم خان کے شور پر کھلی۔ وہ میرے سرہانے کھڑا تھا اور اس کا رخ جنوب کی سمت تھا۔ چمکتی ہوئی روشنی میں، میں اسے واضح دیکھ رہا تھا۔

''ماسٹر اٹھو، اتفاقاً ہم درست رخ پر نکل آئے ہیں۔'' وہ میری طرف دیکھ کر ایک دفعہ پھر مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''وہ دیکھ رہے ہو نا، سامنے چھوٹی سی پہاڑی، اس کے پیچھے پولیس کی ایک چوکی ہے۔'' آدم خان نے جنوب کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر میں بھی خوشی سے نہال ہوگیا۔

''چوکی سے دیہات کا فاصلہ لگ بھگ پندرہ کلومیٹر پر محیط ہے اور پولیس اسٹیشن، چوکی سے تقریباً پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یعنی پولیس چوکی دیہات اور پولیس اسٹیشن کے درمیان واقع ہے۔ ہم جہاں اس وقت موجود ہیں یہاں سے ایک دیہات مشرق کی طرف پڑتا ہے، پولیس اسٹیشن اس میں واقع ہے۔'' آخر میں آدم خان نے مشرق کی طرف رخ موڑتے ہوئے کہا جہاں سے لمحہ بہ لمحہ صبح نمودار ہورہی تھی۔

''دن کی روشنی میں چوکی تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا فاصلہ ہوگا۔'' ایک دفعہ پھر آدم خان نے کہا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ دن کے آغاز ہونے پر پرندے پیڑوں پر قائم گھونسلوں سے چہچہاتے ہوئے نکل رہے تھے۔ ہم جلد ہی پہاڑی کے نزدیک آپہنچے۔ یکلخت آدم خان ٹھٹک کر رک گیا اور چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں بھی آدم خان کی تقلید میں اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''کوئی آواز سنی آپ نے ماسٹر؟'' الٹا آدم خان نے مجھ سے پوچھا۔

''کیسی آواز؟'' میں نے بھی اردگرد کا جائزہ لینا شروع کیا۔

''جیسے کسی موٹر سائیکل کی آواز ہو۔'' آدم خان نے بتایا۔

''نہیں، میں نے تو نہیں سنی۔ شاید پولیس چوکی کے اہلکار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پولیس والوں کا اس طرف کیا کام؟'' وہ غیر متفق انداز میں بولا اور پھر قدم بڑھانے لگا۔ یہاں جابجا دیوہیکل پتھر پڑے ہوئے نظر آرہے تھے اور ان کے آس پاس مختلف اقسام کے درخت ایستادہ تھے۔ ہر سُو گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی آہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔ کسی انجن کی گونج تو دور کی بات اگر واقعی کسی موٹر سائیکل کی آواز آدم خان کے کانوں میں پڑی تھی تو یقیناً اس کا فاصلہ یہاں سے کافی دور ہوگا اور اب تک وہ کسی جگہ ٹھہر گئی ہوگی۔

''ماسٹر...... اب ہاتھوں کو کھولنا لازمی ہے۔ میں خطرے کی بُو سونگھ رہا ہوں۔ پولیس چوکی تک پہنچنے کی امید میں ہم پر راستے میں کوئی اور مصیبت نازل نہ ہوجائے۔'' آدم خان لنگڑا کر ایک جگہ ٹھہر گیا اور پُرتشویش لہجے میں گویا ہوا۔ دور دور تک کسی ذی نفس کے آثار تک نظر نہیں آرہے تھے اور نہ کوئی ایسی آواز سنائی دے رہی تھی جس سے کسی انسان کی موجودگی کا اندازہ لگایا جاسکتا۔

pklibrary.com

’’ہاتھوں کو ہر حال میں شکنجوں سے آزاد کرنا ضروری ہے۔‘‘ ایک دفعہ پھر وہ زور دے کر بولا اور پھر ہم نے جلد ایک نکیلا پتھر حاصل کرلیا۔ آدم خان نے دانتوں کے ذریعے میرے جوتوں کے بند کھول دیے اور پھر میں اپنے ننگے پیروں کے سہارے تیز دھار پتھر سے آدم خان کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کے شکنجے کاٹنے لگا۔ ڈوریاں کافی مضبوط ثابت ہورہی تھیں اور پیروں کی مدد سے اسے کاٹنے میں مجھے بے حد وقت محسوس ہورہی تھی پھر بھی میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور شکنجوں کی ایک جگہ پر توجہ مرکوز رکھ کر مسلسل کاٹتا رہا۔ محنت آخر رنگ لاتی ہے۔ ڈوری کٹ کر کھل گئی اور آدم خان خوشی کے مارے مجھے داد دیتے ہوئے چومنے لگا۔ پھر آدم خان نے میری مشکیں بھی کھول دیں۔ آدم خان ہاتھوں کو سہلاتا ہوا ایک بڑے پتھر پر چڑھنے لگا جو قدرے بلند تھا تاکہ اردگرد کا جائزہ بہتر طریقے سے لے سکے۔ عین اسی لمحے مجھے دائیں طرف کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے نگاہیں اس طرف گھمائیں تو دنگ رہ گیا۔ وہ ایک دیوہیکل پتھر پر کھڑا ہوا تھا جو خاصا بلندی والا تھا۔ اس کا سارا دھیان آدم خان پر مرکوز تھا اور وہ بالکل تیار نظر آرہا تھا۔

’’آدم خان......‘‘ میں گلا پھاڑ کر چیخا۔

آدم خان ذرا کر پتھر پر چڑھا، اس کے بائیں پاؤں میں موچ تھی اور پھر اچانک میری فلک شگاف آواز گونجی تو وہ فوراً میری طرف گھوما لیکن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے دھپ سے آگرا۔ اگر وہ اس طرح نیچے نہ گرتا تو یقیناً اس کی سر کٹی لاش نیچے آگرتی۔ مہارت سے اچھالا ہوا کلہاڑا ایک مخصوص آواز کے ساتھ فضا میں مشینی انداز میں گھومتا ہوا دور جاگرا۔

’’ارے میں گر پڑا۔‘‘ آدم خان ابھی تک حالات کی نزاکت سے بے خبر تھا اور گرنے پر نالاں تھا۔

’’اٹھو، آدم خان، بلیک وولف موت بن کے ہمارے سروں پر کھڑا ہے۔ گرنے میں اگر پل بھر کی تاخیر ہوتی تو اب تک تمہاری سر کٹی لاش نیچے پڑی ہوتی۔‘‘ میں نے ایک ہی سانس میں آدم خان کو بتایا اور اس طرف لپکا جہاں بلیک وولف کا آدم خان پر پھینکا ہوا کلہاڑا گرا تھا۔ یقینی اور کارگر وار کو ناکام ہوتا دیکھ کر بلیک وولف چٹان سے اتر کر غائب ہوگیا تھا۔ اس کے کندھوں پر کلہاڑیوں کے دستے نظر آئے تھے جو پیٹھ پر لٹکائے ہوئے ایک مخصوص قسم کے بیگ سے جھانک رہے تھے۔ گرنے سے آدم خان کو شاید چوٹیں بھی آئی تھیں مگر میری بات سن کر وہ تیزی سے اٹھا اور میرے پیچھے دوڑ لگادی۔

’’کوئی بڑا سا پتھر اٹھاؤ اور سامنے والی چٹان کی اوٹ لو۔‘‘ میں نے دوڑتے ہوئے آدم خان سے کہا اور دوسرے لمحے میں نے کلہاڑا زمین سے اٹھالیا جو میرے اندازے کے برعکس خاصا وزنی تھا۔ آدم خان نے عجلت میں ایک پتھر اٹھایا اور چٹان کی اوٹ میں چھپ گیا۔ چند ثانیوں بعد میں بھی چٹان کی اوٹ میں موجود تھا۔ میں اور آدم خان چٹان کی دو مختلف سمتوں میں کھڑے ہوگئے تاکہ اگر کسی بھی طرف سے بلیک وولف حملہ کرنے نکل آئے تو ہم میں سے کسی ایک کی نظروں میں آسکے۔ اس کے انداز سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ چھپ کر کلہاڑے سے دوبارہ حملہ آور ہوگا۔ پھر وہ اچانک نمودار ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں کلہاڑا تھا اور پستول کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے آدم خان کو آواز دے کر باخبر کیا کہ بلیک وولف چٹان کی طرف آرہا ہے اور اس نے مجھے پستول کے نشانے پر لیا ہوا ہے۔

’’ذرا سی حرکت بھی تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے...... کلہاڑا نیچے ڈال دو اور بت کی طرح اپنی جگہ پر استادہ رہو۔‘‘ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا چند گز کے فاصلے پر رکنے کے بعد بولا۔ بلیک وولف کی آنکھیں نفرت اور غصے سے سرخ ہورہی تھیں۔

’’کیا معرکہ سرانجام دے گا تمہارا وہ چھچھوندر نما ساتھی۔ جسے تم میرے بارے میں باخبر کررہے ہو؟‘‘ وہ انتہائی نفرت آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ اس کا اشارہ آدم خان کی طرف تھا۔ میں نے کلہاڑا نیچے ڈال دیا۔

’’ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔‘‘ وہ غرایا اور میں نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے۔

’’اب تم بھی فوراً سامنے آجاؤ...... ورنہ میں تمہارے ساتھی کی کھوپڑی میں سوراخ ڈال دوں گا۔‘‘ بلیک وولف نے چٹان کے دونوں طرف نظریں گھماتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

آدم خان چٹان کی دوسری طرف چھپا ہوا تھا، وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن بلیک وولف کی باتوں سے وہ صورت حال کا اندازہ ضرور کررہا تھا۔ چند ثانیے بعد وہ چاروناچار چٹان کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا۔

’’ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔‘‘ جب وہ میرے برابر آکھڑا ہوا

تو بلیک وولف نے غراتے ہوئے اسے حکم دیا۔

''اب تم دونوں چند قدم پیچھے چلے جاؤ۔'' ایک دفعہ پھر بلیک وولف تحکمانہ انداز میں بولا اور ہم دونوں ہینڈز اَپ کی پوزیشن میں چند قدم پیچھے ہوگئے۔ بلیک وولف کے پستول کا رخ بدستور میری طرف تھا۔ ہمیں چند قدم پیچھے رکھنے کا مقصد واضح تھا۔ جو کلہاڑا تھوڑی دیر قبل میں نے بلیک وولف کے حکم پر نیچے ڈالا تھا، اس کا فاصلہ اب ہم سے دور ہوگیا تھا۔ یعنی کلہاڑا ہماری دسترس سے خاصا دور ہوگیا تھا مگر ہمارے پیروں کے پاس زمین پر پتھر خاصے پڑے ہوئے تھے۔ بلیک وولف ہماری طرف قدم اٹھانے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جب وہ زمین پر پڑے ہوئے کلہاڑے کے پاس پہنچا تو جھک کر اسے اٹھانے کے بجائے کھڑے کھڑے پاؤں کی ایک ٹھوکر رسید کی۔ کلہاڑا ایک طرف دور جاگرا۔ مجھے تو یہ آس تھی کہ وہ جیسے ہی جھک کر کلہاڑا اٹھائے گا تو میں تاخیر کیے بغیر نیچے پڑا ایک پتھر اٹھا کر عین موقع پر اس کے ہاتھ پر دے ماروں گا جس ہاتھ میں پستول موجود ہے۔ شاید وہ میرا ارادہ بھانپ گیا تھا اور ویسے بھی بلیک وولف کو میرے حوالے سے اب تک کافی تجربہ بھی ہوچکا تھا۔ وہ ایک فاصلے پر آکر ہمارے روبرو کھڑا ہوگیا۔ ایک مخصوص فاصلے پر...... جیسے بازو اور کلہاڑے کے دستے کا باہم فاصلہ ہو۔ زندگی سے موت کا مختصر فاصلہ جو لمحہ بھر میں بیک وقت ہمارے سر کو تن سے جدا کرنے کے لیے کافی ہو۔

''تم لوگوں کی وجہ سے نہ صرف ہمارے دو ساتھی ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئے بلکہ پولیس نے بھی بنگلے پر چھاپا مار کر کروڑوں ڈالر مالیت کی ڈرگز برآمد کر کے ہمارے کئی ساتھیوں کو گرفتار کرلیا ہے۔ میں تم لوگوں کو کتّے کی موت ماروں گا۔'' بلیک وولف بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے بولا اور اس کا وہ ہاتھ حرکت میں آتا جس میں کلہاڑا موجود تھا، دفعتاً ایک وارننگ بھری آواز گونج اٹھی۔

''خبردار...... ہتھیار پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھالو۔''

☆☆☆

بلیک وولف اس آواز پر ٹھٹکا گیا اور اس کا حرکت میں آتا ہوا ہاتھ اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔ وہ پولیس کے چار مسلح جوان تھے۔ ایک حوالدار اور تین سپاہی۔ ان کی بندوقوں کا رخ بلیک وولف کی طرف تھا۔

''ہتھیار پھینک دو...... نہیں تو......'' ایک دفعہ پھر حوالدار کی آواز گونج اٹھی۔ وہ چاروں ایک طرف ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ بلیک وولف نے پہلے پستول اور پھر کلہاڑا نیچے پھینک دیا اور ہاتھ اوپر اٹھالیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ پولیس کی حراست میں تھا اور اس کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے اور پھر بلیک وولف کے چہرے پر سے سیاہ ڈھاٹا کھینچ لیا۔ ایک سانولی رنگت والا کلین شیو آدمی ہمارے درمیان کھڑا تھا جس کی عمر چالیس کے اریب قریب معلوم ہورہی تھی۔ ہم سب کے لیے وہ ایک اجنبی چہرہ تھا۔

ہمارے گمشدگی کی اطلاع پولیس کو مل چکی تھی۔ حوالدار سے معلوم ہوا جو پولیس چوکی کا انچارج بھی تھا۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا تھا۔ آدم خان کے معمول سے ہٹ کر تا دیر غائب ہونے پر اس کا بھائی اسے دیکھنے اسکول کی طرف نکلا مگر وہاں توقع کے برعکس میرا کمرا بند پا کر وہ پریشان ہوگیا اور ہمیں گھر گھر تلاش کرنا شروع کیا۔ ہم پورے دیہات میں اسے نہیں ملے اور نہ کسی نے ہمارے متعلق کسی قسم کی خبر دی۔ کوئی خبر دیتا بھی کس طرح، کسی نے ہمیں بنگلے کی طرف جاتا دیکھا ہی نہیں تھا۔ صبح کے وقت پُراسرار بنگلے کی طرف پورے دیہات نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ آدم خان کے بھائی کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں فائرنگ کا تعلق ہماری گمشدگی سے نہ ہو...... لیکن بنگلے کی طرف قدم اٹھانے کی ہمت کس میں تھی۔ پورا دیہات ہماری گمشدگی سے نہ صرف پریشان تھا بلکہ خوف زدہ بھی تھا، وہ ہماری گمشدگی کو پُراسرار بنگلے سے جوڑ رہے تھے۔ آدم خان کے بھائی نے یہ ہمت دکھائی کہ شام کے وقت ایک لڑکے کو ساتھ لے کر دوسرے دیہات میں جاکر پولیس اسٹیشن میں ہماری گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی اور ہماری گمشدگی کا شک پُراسرار بنگلے پر ظاہر کیا جہاں سے فائرنگ کی آواز دیہات کے بچے بچے نے سنی تھی۔

ہماری گمشدگی کی رپورٹ درج ہونے پر پولیس فوراً حرکت میں آگئی تھی۔ بنگلے پر چھاپا مارا گیا۔ پہلے پہل پولیس کو ویران بنگلے میں کچھ نظر نہیں آیا مگر جب بنگلے کے ہر کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لینا شروع کیا تو بنگلے کے نیچے زیرزمین چھپے ہوئے سیاہ پوشوں نے پولیس پر حملہ کیا کیونکہ پولیس اس وقت تہ خانے کا سراغ لگا چکی تھی اور سیاہ پوشوں کے پاس پولیس کو تہ خانے در اصل سرنگ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے فائرنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس طرح پُراسرار بنگلے میں گھمسان کی ایک لڑائی شروع ہوگئی۔ پولیس فورس نے پوری قوت سے مقابلہ کیا اور کئی سیاہ

pklibrary.com

پوش زخمی ہو کر پکڑے گئے۔ کئی نکل کر فرار ہو گئے۔ اس طرح پولیس فورس سرنگ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ کروڑوں مالیت کی ڈرگز برآمد ہوئی۔ لیکن ہم لوگوں کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ گرفتار سیاہ پوش ہمارے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ لیکن جب ان پر تشدد کا حربہ آزمایا گیا تو ان میں سے ایک نے جلد ہی سب کچھ اگل دیا۔ شام ڈھلنے کے وقت دوا ملا پانی پلا کر ہمیں بے ہوش کیا گیا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہمیں اٹھا کر ایک ڈبل کیبن پک اپ کی پچھلی نشستوں پر ڈالا گیا اور پک اپ بنگلے کے زیر زمین واقع خفیہ گیراج سے نکل گئی۔ وہ ہمیں شہر لے جانا چاہتے تھے لیکن شہر میں کہاں لے جانا چاہتے تھے، اس بارے میں اسے علم نہیں تھا۔ چوکیوں پر اس حوالے سے وائرلیس سیٹ کے ذریعے پیغام بھیجا گیا مگر پولیس فورس کے بنگلے تک پہنچنے سے کافی پہلے وہ ہمیں اٹھا کر لے گئے تھے۔ تب تک گاڑی کو جو دو راستوں میں سے کسی ایک بھی راستے پر سفر کر رہا ہو، چوکیوں سے گزر کر نکل جانا تھا لیکن دونوں چوکیوں میں سے کسی ایسی گاڑی کے گزرنے کے بارے میں نفی میں جواب ملا۔ پولیس کی ٹیم ڈبل کیبن پک اپ کی تلاش میں فوراً بنگلے سے روانہ ہو گئی۔ پولیس کو یقین ہو گیا کہ وہ عام راستے کے بجائے کوئی متبادل راستہ استعمال کر رہے ہوں گے۔ پولیس ٹیم کو کافی کوششوں کے بعد ڈبل کیبن پک اپ نظر آگئی۔ جو تباہ شدہ حالت میں تھی۔ اگلی نشستوں پر دو افراد مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے مگر پچھلی نشستوں پر ہمارے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

مجرموں نے جو چور راستہ استعمال کیا تھا، وہ کافی پُرپیچ اور دشوار گزار تھا۔ چنانچہ جلد از جلد نکلنے کی کوشش میں تیز رفتار گاڑی بے قابو ہو کر ایک چٹان سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ پولیس نے صورتِ حال سے اندازہ لگایا کہ ہم حادثے سے معجزانہ طور پر محفوظ رہے ہیں اور تباہ شدہ گاڑی سے نکل کر کسی طرف چل پڑے ہیں۔ جائے حادثہ کا مقام کسی حد تک اس پولیس چوکی سے قریب پڑتا تھا جس کے اہلکاروں نے ہمیں بلیک وولف کے ہاتھوں ایک یقینی موت مرنے سے موقع پر بچایا تھا۔ پولیس ٹیم کی ہدایت پر چوکی کے اہلکار ہمیں ڈھونڈنے نکلے اور انہیں کافی دیر کی تگ و دو کے بعد آخر صبح کے وقت ہم ایک چٹان کے پاس ایک مسلح سیاہ پوش کے سامنے بے بس کھڑے نظر آئے۔

بنگلے سے فرار بلیک وولف نے بھی چوکیوں سے بچ کر نکلنے کے لیے وہ متبادل راستہ استعمال کیا تھا، جس پر ڈبل کیبن پک اپ ہمیں لے کر نکلی تھی۔ جب بلیک وولف جائے حادثہ کے مقام پر پہنچا تو تباہ شدہ گاڑی دیکھ کر اپنی بائیک روک دی۔ گاڑی ایک طرف الٹی پڑی تھی اور اس کے دونوں ساتھی اندر مردہ حالت میں پڑے تھے اور ہمارا نام و نشان تک نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر جائے حادثہ کے پاس ٹہل کر ہمیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر ہیوی بائیک پر ہمیں تلاش کرنے ایک طرف نکلا۔ قسمت کی دیوی پل پل ہم پر مہربان تھی۔ یہ بھی ہماری ایک بڑی خوش قسمتی تھی کہ ہم جائے حادثہ سے جس رخ پر نکلے تھے، بلیک وولف نے اس کے مخالف رخ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ کسی خونخوار بھیڑیے کی طرح ساری رات شکار کی امید میں جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا مگر ہم کہیں نہیں ملے۔ جب اس نے رخ بدلا تو سورج بھی مشرق کی طرف سر اٹھانے میں کوشاں تھا اور جب ہم اسے ملے اور پھر ہم پوری طرح اس کے سامنے بے بس ہوئے تو ہمارے لیے آنے والی مدد نے پہنچنے میں تاخیر نہیں کی۔

خوفناک کتوں کے غول سے لے کر بلیک وولف جیسے انسان نما بھیڑیے کے خونی پنجے تک تمام حادثات و واقعات ایک ڈراؤنے خواب کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ہماری گمشدگی پر پولیس کی بروقت کارروائی دراصل ایک رنجش کا شاخسانہ تھی۔ یہ بھی قسمت کی یاوری تھی کہ ایس ایچ او بھی اکبر اور انور دونوں بھائیوں کا مخالف نکلا تھا اور وہ جیسے کسی ایسے سنہری موقع کی تاک میں پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ اسے پہلے سے ہی شبہ تھا کہ بنگلا جو ایک آسیبی بنگلے سے مشہور ہے، ضرور اس میں کوئی کھچڑی پک رہی ہو گی اور جب ایس ایچ او کو ہماری گمشدگی کی رپورٹ ملی تو اسے فوراً ایکشن لینے کا جواز ہاتھ آ گیا۔

پولیس نے ہمارے بیان ریکارڈ کیے۔ رابعہ کے قتل سے لے کر دو بے گناہ دیہاتی نوجوانوں کے قتل کا احوال جو ہم نے بلیک وولف کی زبانی سنا تھا۔ تمام تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

اب سوال یہ کھڑا تھا کہ پولیس ٹھوس ثبوت اور گواہان کی بنیاد پر اکبر اور انور جیسے خودسر اور طاقتور مجرموں کو گرفتار کر کے سزا دلوانے میں کامیاب ہو سکے گی یا انصاف کے تقاضے دولت کی طاقت کے سامنے دھرے رہ جائیں گے۔ بہرحال ہمارے لیے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ہم نے پُراسرار بنگلے کا آسیب پورے گاؤں کے سر سے اتار ڈالا تھا۔

❖❖❖

pklibrary.com

کہانی اگرچہ پرانی ہے لیکن اس کو موجودہ پیرائے اور حالات میں بیان کیا گیا ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ کسی زمانے میں ایک جنگل تھا۔ اس جنگل میں بہت سے جانور بھی تھے۔ ظاہر ہے جانور جنگلوں ہی میں ہوا کرتے تھے۔

سارے جانور بہت سکون سے اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ اس جنگل میں اتفاق سے کوئی درندہ نہیں تھا۔ سب سبزی خور جانور تھے اسی لیے کسی جانور کو کوئی خوف نہیں تھا۔

آج کی کہانی

سرور اکرام

چلو جنگل کو ٹھکانا کر لیں
مجھ کو انسان سے ڈر لگتا ہے

کوئی ایسا گھر بھی ہے شہر میں... جہاں کا مکین مطمئن ہو... کوئی دن ایسا ہے جسے خوفِ آمدِ شب نہ ہو... زمانے میں کوئی ایسا نہیں جسے کوئی پریشانی نہ ہو... اس گرد باد میں خار ہیں... اور چلنے والے زخموں سے چُور... انسان اور جانوروں کی عادات کا موازنہ... ایک حساس تحریر...

بچے ہوئے جنگل اور گزرے دنوں کے روز و شب کا احتساب.....

pklibrary.com
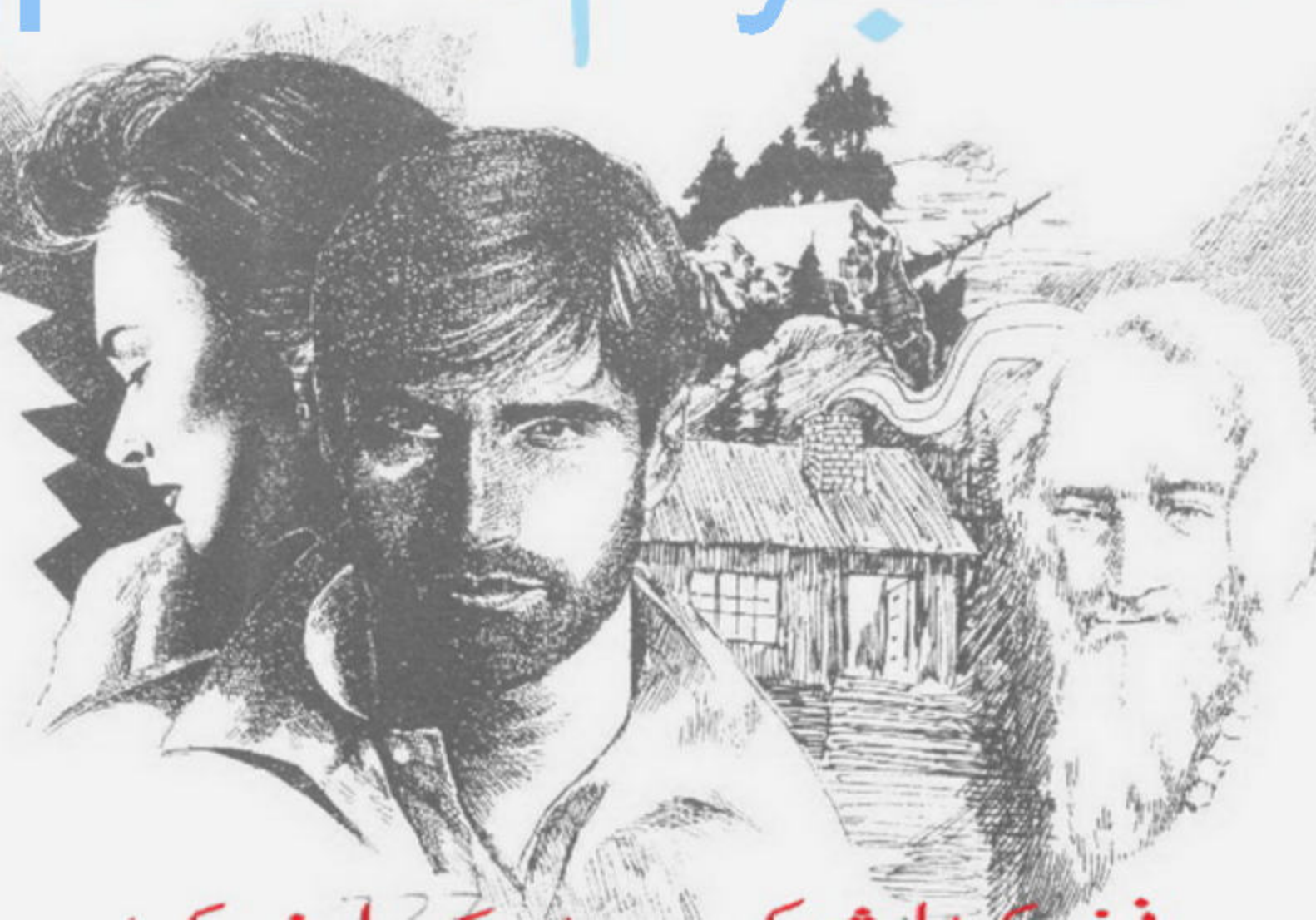
ہرنوں کی کھیپ کی کھیپ تھی۔ خرگوشوں سے پورا جنگل بھرا ہوا تھا۔

جنگل سے کچھ ہٹ کر ایک جھونپڑی تھی۔ اس میں ایک ایسا انسان رہا کرتا جس کو جانوروں کے ستانے میں بہت مزہ آتا تھا۔

وہ خاص طور پر خرگوشوں کا دشمن تھا۔ اسے خرگوشوں کا گوشت بہت پسند تھا۔ نرم نرم گوشت۔ وہ دن بھر میں ایک خرگوش پکڑ کر لاتا... اور اسے پکا کر کھا جاتا۔ جانور اس سے بہت خوف زدہ رہا کرتے تھے۔

ایک بار ایک سادھو کا اس طرف سے گزر ہوا۔ اس وقت وہ آدمی کسی خرگوش کے شکار کی تیاری کر رہا تھا۔ ''سادھو نے اس سے پوچھا۔'' تم یہ کیا کر رہے ہو؟''

''مہاراج۔ رات کے کھانے کا انتظام کر رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''دو دنوں سے کسی خرگوش کو نہیں کھایا ہے لیکن آج میں ہر حال میں پکڑ کر لاؤں گا۔''

''دیکھو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' سادھو نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ان معصوم جانوروں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ خاص طور پر خرگوش تو بالکل بے ضرر ہوتے ہیں۔''

''اس سے کیا ہوا۔ جنگل میں بہت خرگوش ہیں۔ دو چار سو کم بھی ہو گئے تو کیا فرق پڑے گا۔ وہ اپنی نسل پھر بڑھا لیں گے۔''

سادھو نے پھر کچھ نہیں کہا اور ایک درخت کے نیچے دھونی لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی ہنستا اور سادھو کا مذاق اڑاتا ہوا شکار پر روانہ ہو گیا۔

بہت دیر بعد شکاری واپس آیا تو اس نے ایک خرگوش کو اس کے کان سے اٹھا رکھا تھا۔ سادھو کو دیکھ کر وہ قہقہہ لگانے لگا۔ ''یہ دیکھو سادھو مہاراج۔ رات کے کھانے کا بندوبست ہو گیا۔ بہت اچھا خرگوش ہے۔ اس کا گوشت بھی بہت خستہ ہو گا۔''

سادھو نے اپنی گردن جھکا لی۔ شاید وہ دل ہی دل میں کوئی جاپ کر رہا تھا۔

شکاری نے پھر سادھو کو مخاطب کیا۔ ''یہ دیکھو، سادھو مہاراج۔ میرے پاس ایک خنجر ہے۔ ابھی میں تمہارے سامنے ... خنجر سے اس خرگوش کی گردن کاٹوں گا۔''

سادھو اس بار بھی کچھ نہیں بولا۔

شکاری نے خرگوش کو باندھ کر لٹا دیا۔ پھر اس کی گردن پر خنجر چلانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا تھا کہ نہ جانے کس طرح وہ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سیدھا شکاری کے پیر میں اتر گیا۔ اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور درد سے تڑپنے لگا۔

اس کے پیر سے خون بہہ رہا تھا۔

سادھو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنے تھیلے سے کوئی مرہم نکال کر شکاری کے زخمی پیر پر لگا دیا۔

ذرا سی دیر میں شکاری کو آرام آ گیا۔

''کیوں اب کیسا لگا؟'' سادھو نے پوچھا۔

''بہت تکلیف ہوئی مہاراج۔'' شکاری نے کہا۔

''اب خود ہی بتاؤ۔ تم کو خنجر سے ذرا سا زخم آیا ہے اور تمہاری یہ حالت ہوئی ہے۔ اب تم اسی خنجر کو جانوروں کی گردنوں پر چلاتے ہو تو ان کو کتنی تکلیف ہوتی ہو گی؟ کیا کبھی اس کا اندازہ کیا ہے تم نے؟''

شکاری نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ اس کے بعد سے اس نے کبھی معصوم جانوروں کا خون نہیں بہایا۔

☆☆☆

تو یہ تھی پرانے زمانے کی کہانی۔

آج بھی پوزیشن وہی ہے لیکن واقعات اور کردار بدل چکے ہیں۔ سب کچھ اسی طرح ہوا کرتا ہے۔

ایک جنگل ہے۔ انسانوں کا جنگل۔ ہر طرح کے انسان۔ بوڑھے جوان۔ مزدور کسان۔ محنت کرتے ہوئے بچے۔ در در کی ٹھوکریں کھانے والے لوگ۔ جن کو آپ عوام کہتے ہیں۔ اور ان کا شکار کرنے والے لوگ۔ سب اسی جنگل میں ہیں۔ منافع خور۔ ظالم حکمران۔ خیانت کرنے والے۔ غبن کرنے والے۔ سیاست داں۔ تاجر ادیب۔ بے رحم قاتل سب ہی اس معاشرے کا حصہ ہیں۔

تو یہ کہانی بھی اسی معاشرے کی ہے۔

ساون بہت بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل کر فرار ہو گیا ہو۔

وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کی بے رحمی کی داستانیں دور دور تک مشہور تھیں۔ وہ آس پاس کی بستیوں سے لڑکیاں اٹھا کر لاتا تھا... اور انہیں اپنی قید میں رکھ لیتا تھا۔ وہ بے حس تھا۔ ان لڑکیوں کی صدائیں اس کے کانوں کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔

اس نے کبھی کسی پر رحم نہیں کیا تھا۔

سال چھ مہینوں کے بعد یا تو کسی لڑکی کو مار کر دریا میں پھینک دیا جاتا یا پھر وہ بے چاری خود ہی کسی نہ کسی طرح

pklibrary.com

بھاگ کر دریا میں کود کر اپنی جان دے دیتی۔ اس کا نام دہشت کی علامت تھا۔

ساون کے لیے یہ سب ایک کھیل کی طرح تھا۔

ایک دن وہ اپنے اڈے پر بیٹھا تھا کہ اس کے ایک ساتھی نے اطلاع دی۔ ”سردار ایک زبردست شکار دکھائی دیا ہے۔“

”کہاں ہے؟“

”محراب پور کے بند کے پاس۔“ اس نے بتایا۔ ”تم نے میری ڈیوٹی وہیں لگائی ہے نا؟“

”ہاں تو پھر۔“

”سردار تم تو جانتے ہو کہ محراب پور والی سڑک بارش کی وجہ سے ٹوٹ چکی ہے۔ اب اُدھر سے کوئی نہیں گزرتا لیکن نہ جانے کس طرف سے ایک جیپ اس راستے پر آنکلی۔ میں اپنی مچان پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔“

”تو پھر کیا دیکھا تو نے؟“

”سردار جیپ والوں کو شاید علم نہیں ہوگا کہ راستہ ٹوٹا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ جیپ اس طرف لے آئے۔ اس ڈاکو کو باتیں تفصیل سے بتانے کی عادت تھی۔ وہ اسی طرح بتایا کرتا۔ اس دوران ساون دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہتا۔ اس وقت بھی وہ اسی طرح بتا رہا تھا۔

”سردار، میں نے دیکھا کہ اس جیپ سے دو آدمی اترے۔ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ دوسرا جوان تھا۔ بہت صحت مند قسم کا۔ اس کے بعد ایک لڑکی اتری۔ کیا بتاؤں سردار کیا لڑکی تھی۔ اب تک تم نے ایسی لڑکی دیکھی نہیں ہوگی۔“

”آگے تو بتا کیا ہوا؟“ ساون جھلا کر بولا۔

”ہونا کیا ہے سردار۔ دونوں بندے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائیں۔ کس طرف جائیں۔ پھر وہ دونوں اس لڑکی کو وہیں جیپ کے پاس چھوڑ کر شاید راستہ تلاش کرنے چلے جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں سردار کہ آپ انمول تحفوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔“

”تو نے پھر بکواس شروع کر دی۔“ ساون غصے سے بولا۔

”سردار مختصر یہ کہ وہ دونوں تو کسی طرف چلے گئے تھے۔ میں اس لڑکی کو اٹھا کر یہاں لے آیا۔“

”پاگل انسان اتنی دیر بعد کام کی بات بتائی ہے۔ کہاں ہے وہ لڑکی؟“

”ریسٹ ہاؤس میں ہے سردار۔“ اس نے بتایا۔

”میں خود دیکھتا ہوں۔“ ساون ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔

یہ ریسٹ ہاؤس بھی ایک بڑی جھونپڑی ہی تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس میں بستر وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ ساون کے اشارے پر جس لڑکی کو اٹھا کر لایا جاتا۔ اس کو اسی جھونپڑی میں رکھا جاتا تھا۔

اس کی چیخیں اسی ریسٹ ہاؤس کی دیواروں کے درمیان گھٹ کر رہ جاتیں۔

ساون جب ریسٹ ہاؤس پہنچا تو اس کے دو آدمی پہرا دینے کے لیے کھڑے تھے۔ ساون کو دیکھ کر دونوں نے سلام کرتے ہوئے بتایا۔ ”سردار وہ تو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ہے۔ اس نے تو ہم دونوں کا نوچ نوچ کر بُرا حال کر دیا ہے۔“

”یہ دیکھو سردار۔“ دوسرے نے اپنی کلائی آگے کر دی۔ ”اس نے دانت کاٹ کر پورا گوشت ادھیڑ دیا ہے۔“

ساون نے دیکھا۔ اس کی کلائی اچھی خاصی زخمی ہو گئی تھی۔ ”چل ٹھیک ہے۔ اس پر مرہم پٹی کر۔ میں دیکھتا ہوں اس شیرنی کو۔“

اس شیرنی کو دیکھنے ساون جھونپڑی میں داخل ہوا اور اس لڑکی کو دیکھتے ہی خود بھی ڈھیر ہو گیا۔

بہت دیکھی صورت کی لڑکی تھی۔ خوبصورت طرح دار۔ شیرنی ہی کی طرح تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساون کو دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ”کون ہو تم؟“

”اوہو، اتنا غصہ؟“ ساون مسکرا کر بولا۔

”بکواس مت کرو۔ تمہارے آدمی مجھے کیوں لائے ہیں؟“

”میرے حکم سے۔“ ساون نے بتایا۔

”کیوں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”تم نے سب بگاڑ دیا ہے۔“ ساون نے کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس لڑکی کے سامنے آتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی ہو۔

”جانے دو مجھے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”تم مجھے یہاں رکھ نہیں سکتے۔“

”لڑکی۔ میں دو چار دن تمہیں یہیں رکھوں گا۔“ ساون نے کہا۔ ”اور ضد مت کرنا۔ تمہیں اپنی قسمت پر فخر کرنا چاہیے۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس کا ابھی میرے پاس جواب نہیں ہے۔“ ساون

نے کہا۔

ساون جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی تھی کہ لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا پوری طرح خیال رکھا جائے۔

پہلی بار اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے من میں ہلچل ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کہاں سے نرم سے جذبات اس کے سینے میں امڈ آئے تھے۔ ایسا تو پہلی بار ہو رہا تھا۔ ورنہ تو اس نے کبھی کسی کی ہچکیوں کی پروا نہیں کی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا تھا۔

لیکن آج وہ پتھر موم ہونے لگا تھا۔

وہ اپنی جھونپڑی میں آ کر لیٹ گیا۔ رہ رہ کر اس لڑکی کی یاد آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا...

اس نے اپنے ایک آدمی کو آواز دے کر بلا لیا۔ ''جی سردار'' وہ آدمی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''اس لڑکی نے کچھ کھایا ہے؟'' ساون نے پوچھا۔

''نہیں سردار۔ وہ تو کچھ نہیں کھا رہی ہے۔''

''سب ہی ایسا کرتی ہیں۔'' ساون نے کہا۔ ''لیکن اس پر کوئی سختی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ریشماں کہاں ہے؟'' ساون نے پوچھا۔ ریشماں ان ہی لوگوں کے درمیان رہنے والی ایک لڑکی تھی جس کو یہ ڈاکو آٹھ سال پہلے اٹھا کر لائے تھے۔ اس نے اب ساری امیدیں ترک کر دی تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ یہاں سے نکل نہیں سکتی۔ ریشماں کو ان نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ جو کسی طرح قابو میں نہیں آتی تھیں۔

وہ ان لڑکیوں کو سمجھایا کرتی تھی۔ وہ انہیں احساس دلاتی کہ کب تک بھوک ہڑتال کرتی رہو گی۔ بھول جاؤ پچھلی زندگی۔

''ریشماں کو بھیج دو اُس کے پاس۔'' ساون نے کہا۔ ''اس سے کہو کہ کچھ کھلا پلا دے۔''

ریشماں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد رپورٹ ملی کہ ریشماں نے کسی طرح اسے سمجھا بجھا کر کچھ کھانے کے لیے راضی کر لیا ہے۔

نہ جانے کیوں ساون کو کچھ اطمینان سا ہوا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کسی طرح اس لڑکی کو ہمیشہ کے لیے اپنا ساتھی بننے پر راضی کر لے گا۔ بہت ہو گئی۔ اب زندگی کو کسی ایک ڈھرے پر آ جانا چاہیے۔ کوئی تو ہو جس کو وہ اپنا کہہ سکے۔

لڑکیاں تو اس کے اڈے پر پہنچا ہی دی جاتی تھیں لیکن وہ صرف ایک جسم ہوتی تھیں۔ روح نہیں ہوتی تھی۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس نے اس کے دل پر دستک دی تھی۔

وہ ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی۔ ''سردار، بابا بے نشان کا گزر ہو رہا ہے۔''

ساون تڑپ کر اٹھ گیا۔ ''کہاں؟''

''اس جنگل سے گزر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بندے بھی ہیں۔ پرانے کنویں کے پاس پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔''

بابا بے نشان ایک پہنچے ہوئے فقیر منش انسان تھے۔ ساون اور اس کے ساتھی ڈاکو بابا بے نشان کے مرید تھے۔ ان کا بہت احترام کرتے۔ ان کے ایک اشارے پر جانیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے۔

ساون نے اپنی جھونپڑی سے باہر آ کر اپنی جیپ سنبھال لی۔ اس جنگل میں وہ جیپ ہی استعمال کرتا تھا۔

اس کا رخ اس پرانے کنویں کی طرف تھا جہاں بابا بے نشان نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

اس کے ساتھ دوسری گاڑیوں پر اس کے کچھ ساتھی بھی بابا کے دیدار کے لیے چلے آئے تھے۔

بابا ساون اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر حیران ہو گئے تھے۔

''ساون، تم یہاں کہاں؟''

''سرکار یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اس طرف سے گزریں اور ساون کو پتا نہ چلے۔''

بابا مسکرا دیے۔ ''اسی لیے تو چپکے سے نکل رہا تھا۔ ہمیں محبت نگر جانا ہے۔ محبت پیا کے عرس میں شریک ہونا ہے۔''

''سرکار، محبت پیا کے عرس میں تو ابھی ایک ہفتہ ہے۔'' ساون نے کہا۔

''ہاں ہے تو۔ لیکن ہم ایک ہفتہ پہلے وہاں پڑاؤ ڈال کر اپنی عبادت کریں گے۔ مراقبہ کریں گے۔'' بابا نے بتایا۔

''سرکار، آپ ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں۔'' ساون نے کہا۔

''ساون تمہارے اڈے پر ہر طرف چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ مظلوم لڑکیوں کی چیخیں۔ جن کو تمہارے آدمی اٹھا کر لے آتے ہیں۔''

''سرکار، میں بہت شرمندہ ہوں۔'' ساون نے گردن جھکا دی۔ ''لیکن میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ دو تین دن .... تو خدمت کا موقع دینا ہوگا۔''

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	فون	شہر	فون	شہر	فون
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈگلہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والا	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یارخان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

"اور جو کام تم کرتے رہے ہو۔ اس کا کیا کرو گے؟"

"سرکار، میں ڈاکے ڈالنے چھوڑ دوں گا۔" ساون نے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ دوں گا۔"

بابا نے آنکھیں بند کرلیں۔ ساون کے لہجے میں ایسی کوئی بات ضرور تھی جس نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ آج اس ڈاکو کے اندر کا انسان جاگ اٹھا ہے... اور اس کی بیداری میں ایک لڑکی کا ہاتھ ہے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ساون اسی طرح مؤدب سا بیٹھا ہوا تھا۔

"چلو۔ اگر ایسا ہی ارادہ ہے تو تمہیں مبارک ہو۔ میں تمہارے لیے دعائیں کروں گا۔"

"لیکن ایک پریشانی ہے سرکار۔" ساون نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟"

"سرکار وہ لڑکی اپنی ضد پر ہے۔ اس نے رو رو کر اپنا حال خراب کرلیا ہے۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تم یا تمہارے آدمی جس کو زبردستی اٹھا کر لائیں گے، وہ خوش ہوگی۔ شکرانے کی نماز پڑھے گی۔"

بابا بے نشان نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ "چلو ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔"

ساون کے ساتھی... بابا کا سامان سمیٹنے میں مصروف ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ اڈے پر پہنچ گیا۔

بابا اور ان کے ساتھیوں کے لیے جھونپڑی اور کھانے کا بندوبست کر دیا گیا۔ ساون کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ لڑکی ابھی تک قابو میں نہیں آسکی ہے۔ اس نے ایک دو بار بھاگنے کی بھی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے روک دیا گیا۔ اس پر سختی اس لیے نہیں ہوئی کہ ساون نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ساون بابا کے پاس پہنچ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" بابا نے کہا۔

ساون ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ "ہاں اب بتاؤ۔ کیسے حالات چل رہے ہیں؟" بابا نے پوچھا۔

"آپ کی دعا ہے سرکار۔" ساون نے کہا۔ "اس وقت آپ کی دعا کی ضرورت ہے۔"

"ایک تو تم نے اور تمہارے آدمیوں نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ پھر مجھ سے دعا کی امید بھی رکھتے ہو؟"

"ہم شرمندہ ہیں سرکار لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔" ساون دھیرے سے بولا۔

"کیوں؟ اب کیوں توبہ کر رہے ہو؟"

"سرکار کیا بتاؤں۔"

"بتاؤ، کیا بات ہے؟ کس طرح تمہیں نیکی کی توفیق ملی ہے۔" بابا نے پوچھا۔

"سرکار، میرے آدمی ایک لڑکی کو اٹھا کر لائے تھے۔" ساون نے بتایا۔

بابا کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ "تم اور کتنی بددعائیں لوگے ساون؟ لڑکیاں کمزور اور مظلوم ہوتی ہیں۔ تم ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہو۔"

"سرکار اس لڑکی کی وجہ سے میں نے اب توبہ کرلی ہے۔"

"لیکن کیوں؟ کیا خاص بات ہے اس لڑکی میں؟"

"سرکار میں اس لڑکی کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" ساون نے کہا۔

بابا چونک گئے۔ "کیا کہا تم نے؟ تم اس لڑکی کو اپنا لوگے؟"

"جی سرکار، وہ میری آخری منزل ہوگی۔ میں اسے خوش رکھوں گا۔ ہر طرح اس کا خیال رکھوں گا۔ وہ جو کہے گی۔ وہی کروں گا۔"

"میں جانتا ہوں سرکار کہ اس کے لیے یہ بہت صدمے کی بات ہوگی لیکن میں کیا کروں؟ میرا دل ہی نہیں مانتا۔"

بابا نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کچھ سوچنے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر انہوں نے ساون کی طرف دیکھا۔ "بے وقوف انسان یہ معاملات ایسے نہیں ہوتے کہ دھونس اور دھمکی سے حل ہو جائیں۔"

"پھر کیا کروں سرکار؟"

"کہاں ہے وہ لڑکی؟ میرے پاس لاؤ۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

ساون خوش ہوگیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس لڑکی کے راستے اب اس کے لیے آسان ہونے والے ہیں۔ ایک بار کی بات ہے کہ ساون اسی طرح ایک مشکل میں پھنس گیا تھا۔

اس وقت ایک سخت مزاج پولیس آفیسر اس علاقے میں تعینات تھا۔ اس نے وہ جرائم بھی ساون کے سر منڈھ دیے تھے جن کے بارے میں ساون کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ اس وقت بابا ہی نے اس کی مدد کی تھی۔ انہوں نے اس آفیسر سے ملاقات کی تھی اور وہ آفیسر موم ہوگیا تھا۔

اس نے ساون کو ان الزامات سے بری قرار دے دیا

تھا۔ اس نے ساون کے خلاف جو رپورٹ تیار کر رکھی تھی، وہ بھی پھاڑ کر پھینک دی تھی۔ ساون کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ بابا اس لڑکی سے ملنے کو تیار ہو گئے تھے۔

بابا کو اس لڑکی کی جھونپڑی میں پہنچا دیا گیا۔

اس لڑکی نے صرف چائے پی تھی۔ اس کے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ بابا کو دیکھ کر اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ بابا نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ اور میز پر رکھی ہوئی ٹرے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ لو کچھ کھا لو۔ یہ خدا کی نعمت ہے۔''

لڑکی نے بابا کے کہنے پر ٹرے ہاتھ میں لے لی۔ بابا نے ساون کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ ساون باہر چلا گیا۔

بابا بہت دیر بعد اس جھونپڑی سے باہر آئے تھے۔ ساون باہر ہی کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ بابا کو دیکھتے ہی وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا بابا؟'' اس نے پوچھا۔

''لڑکی زندگی کی طرف واپس آ گئی ہے۔'' بابا نے بتایا۔ ''اس نے کھانا پینا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کو احساس ہو [illegible] ایک بڑی بات ہے۔ اس کے بعد ہی نجات کے راستے کھلتے ہیں۔''

ساون نے سرشار ہو کر بابا کے ہاتھوں کو بوسہ دے دیا۔ ''بابا آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کر دیا ہے۔''

''احسان نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔'' بابا نے کہا۔ ''قدرت نے مجھے جو ذمے داریاں دی ہیں، ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔''

''بابا اب وہ کیا کہتی ہے؟''

''کہنا کیا ہے۔ شادی کی تیاری کرو۔'' بابا نے کہا۔ ''میرا تو خیال تھا کہ شہر جا کر شادی کریں گے لیکن اس نے کہا نہیں۔ شادی اسی جگہ ہوگی۔ کیوں کہ یہیں سے اسے نئی زندگی ملی ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ ہماری شادی اسی جگہ ہو گی۔ ارے میں تو پورے جنگل کو سجا دوں گا بابا۔''

''ارے نہیں اب اتنا جھنجٹ بھی مت کرنا۔'' بابا نے کہا۔ ''میرے والد کی شادی بھی بہت سادگی سے ہوئی تھی۔ میں بھی اسی سادگی سے شادی کروں گا۔''

''شادی کروں گا۔ اس بات کا کیا مطلب ہوا بابا؟''

ساون بری طرح چونک گیا۔

''ارے بھائی۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کو راضی ہوئی ہے نا۔''

''آپ سے؟''

''ہاں بھئی۔ میں بھی بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کب تک دربدر بھٹکتا رہوں گا۔ اب شادی کر لینی چاہیے۔ سو تمہاری وجہ سے قدرت نے مجھے ایک بیوی دلا دی ہے۔ اب شادی کے بعد میں اپنے والد کی دکان سنبھال لوں گا۔ اور ہاں۔ تم اپنی طرف سے کوئی انتظام مت کرنا۔ تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کھانا بنوا سکتے ہو تو بنوا لینا۔''

ساون سر پکڑ کر رہ گیا۔

دیکھ لیا سب کچھ وہی تھا۔ پرانی حکایت جیسا۔ ایک سادھو (یعنی بابا) ایک خرگوش (یعنی وہ لڑکی) ایک شکاری (یعنی ساون) پورا ماحول۔ اس کہانی میں یہ ہوا تھا کہ سادھو نے خرگوش کو شکاری سے رہائی دلوا دی تھی۔ اور خرگوش جنگل کی طرف بھاگ لیا تھا لیکن اس ماڈرن کہانی میں شکار کہیں بھاگا نہیں بلکہ سادھو یعنی بابا کے ساتھ ہو لیا۔ اس کہانی سے عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے ایک نصیحت ضرور ہے کہ کبھی اپنی گرل فرینڈ یا دوست کو کسی اور سے نہ ملوائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ساون کی طرح سر پکڑ کر رونا پڑ جائے۔

شادی شدہ

سردار جی نینا سنگھ کے ساتھ سمندر کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھے اس پر فدا ہوئے جا رہے تھے۔ ایک سپاہی کو وہ حرکتیں ناگوار گزریں تو وہ ان دونوں کے سر پر آ پہنچا اور کچھ یوں مکالمے ہوئے۔

''اوئے! یہ دن دیہاڑے کیا ہو رہا ہے؟''

''باتیں کر رہے ہیں... تجھے کیا تکلیف ہے؟''

''شرم نہیں آتی... باتیں ایسے ہوتی ہیں؟''

''چلا جا یہاں سے... میں پولیس کمشنر سے شکایت کروں گا کہ تم شادی شدہ لوگوں کو بلاوجہ تنگ کرتے ہو۔''

''تم شادی شدہ ہو؟''

''ہاں... ہم شادی شدہ ہیں۔''

''تو یہ راز و نیاز تم گھر پر کیوں نہیں کرتے... یہاں سیکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں۔''

سردار جی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔ ''یہی تو مشکل ہے بھایا جی...! میری پتنی بڑی ظالم ہے اور اس کا آدمی غصے کا بہت تیز ہے۔ ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتا ہے... مجبوراً یہاں آ گئے ہیں۔''

حسن ابدال سے عرفان سنگھ کا چٹکلہ

عشقِ جدید

غلام قادر

کچھ لوگ ایسے ماحول میں بستے تھے جہاں کوئی دشمن تھا اور نہ ہی کوئی دوست ان سے خوش تھا... اس فضا میں رومانوی کردار بھی تشکیل پاتے تھے... اس حیرت زدہ ماحول میں ہر روز گویا طلسمی دروازہ کھلتا... جہاں اُداس منظر میں ہنستی کھلکھلاتی دوشیزائیں خراماں خراماں محو رقص ہوتی ہیں... خوفزدہ کردینے والی دنیا میں آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری رہتا... ایسے ہی ماحول میں پروان چڑھتے محبت گزیدہ کا معاملہ... جو قدامت پرستوں کے درمیان رہتے ہوئے جدید رنگ و آہنگ میں ڈھل چکا تھا...

مثالی وفاداروں کی گھائل اور نڈھال کردینے والی عاشقانہ جدوجہد

میرا نام حماد ہے۔ میں اس علاقے میں پیدا ہوا جہاں شرفا دن کی روشنی میں آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ہاں سورج کے غروب ہوتے ہی وہ بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے اور صبح کی روشنی پھیلنے تک وہیں رہتے۔ میری اس کہانی کی ہیروئن میری نانی ہیں۔ وہ آٹھویں تک پڑھی تھیں لیکن انہوں نے اس محلے کی روایات تبدیل کرنے میں بنیادی رول ادا کیا تھا۔ اب سے پہلے محلے میں لڑکی کی پیدائش پر جشن منایا جاتا تھا جبکہ لڑکے کی پیدائش پر ماتم کی فضا ہوتی تھی۔

محلے کا وہ بدمعاش جو پولیس سمیت ہر طرح کے معاملات ڈیل کرنے والا ہوتا تھا، اس کا تعلق کبھی محلے کے گھر سے نہیں ہوتا تھا اور اس کی وجہ تھی کہ محلے کے کسی کوٹھے سے اس کا تعلق ہوتا تو اس کی تمام تر توجہ اپنے گھر والوں کی فلاح پر ہوتی تھی۔ وہ پہلا لڑکا جس کی پیدائش پر سوگوار فضا نہ قائم ہوئی، وہ میرا ماموں یعنی نانی کا بڑا تھا۔ محلے کی روایات سے ہٹ کر نانی نے اپنے بیٹے کو اچھے انگریزی اسکول میں داخل کروایا۔ نہ صرف اسکول میں داخل کروایا بلکہ ہر معاملے میں اسے مشورے میں شریک بھی کرتی تھیں۔ محلے کے دیگر گھروں نے اس پر اعتراض بھی کیا لیکن نانی اپنے طے شدہ منصوبے پر چلتی رہیں۔ اس وقت بہت اعتراض ہوا... جب نانی نے ماموں کو اس سینٹر میں داخل کروایا جہاں کراٹے کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

میری پیدائش تک محلے میں ماموں کی بدمعاشی پوری طرح قائم ہوچکی تھی۔ میں اس خاندان میں پیدا ہونے والا دوسرا مرد تھا۔ ماموں مجھ پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ انہوں

pklibrary.com

نے مجھے اسکول میں داخل کروانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے اس شخص کے حوالے کر دیا جو اپنے وقت کا مشہور جیب کترا تھا: لیکن اب اس کی انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں اور وہ عرصے سے سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں رہتا تھا۔ ابراہیم نامی یہ شخص انگلیاں نہ ہونے کی وجہ سے کسی کام کا نہیں رہا مگر اس نے اپنا فن منتقل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بچپن میں، میں ایک خوب صورت بچہ تھا۔ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا گول مٹول سا بچہ جس پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ بچہ جیب کترا بھی ہو سکتا ہے۔

آٹھویں سالگرہ تک میں اپنے فن میں طاق ہو چکا تھا۔ ابراہیم مجھے ابتدا میں بسوں میں لے کر جاتا اور میں مسافروں کی جیب صاف کر دیتا۔

جب میں کسی موقع پر نہیں پکڑا گیا تو ابراہیم کا حوصلہ بڑھا اب وہ مجھے بڑے ہوٹلوں میں لے جانے لگا۔ وہاں بھی میرا کام وہی ہوتا تھا جو بسوں میں ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بس میں چند سو سے زیادہ رقم نہیں آتی تھی جبکہ ہوٹلوں میں ہزاروں کے نوٹ بٹوں سے نکلتے تھے۔

میں حاصل ہونے والی تمام رقم ابراہیم کو دے... دیتا تھا

pklibrary.com

اور وہ اس میں سے اپنا حصہ رکھ کر باقی رقم میرے حوالے کر دیتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا پھر ایک دن ابراہیم کا ایک دوست اس سے ملنے آیا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور کار چور تھا۔ خلیل نامی اس شخص کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ جس کار کے پاس سے گزر جائے اس کے لاک خودبخود کھل جاتے ہیں۔ خلیل جس روز ابراہیم کے پاس آیا تھا اسی روز جیل سے رہا ہوا تھا۔

اپنی کہانی اس نے کچھ یوں بیان کی کہ ''میری بدقسمتی کہ میں نے ڈی آئی جی کی بیوی کی کار چوری کی اور اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہوئی کہ میں نے وہ کار کوئٹہ کے ایس ایس پی کو فروخت کر دی۔ ان سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ ایس ایس پی اگلے ہی ہفتے کراچی آیا اور ڈی آئی جی سے ملنے چلا گیا۔ ڈی آئی جی جب ایس ایس پی کو رخصت کرنے دفتر سے باہر نکلا تو اس نے اپنی بیوی کی گاڑی پہچان لی۔ ایس ایس پی پولیس لے کر میرے گھر آیا اور میں گرفتار ہو گیا۔ ڈی آئی جی اور ایس ایس پی کا دباؤ تھا اور پولیس نے سب کچھ اگلوا لیا۔ دس برس کی سزا ہوئی جو کسی نہ کسی طرح کاٹ لی۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟'' ابراہیم نے پوری کہانی سننے کے بعد سوال کیا۔

''ایک کام کے علاوہ مجھے آتا کیا ہے۔'' خلیل کا جواب تھا۔

''اس بچے کو اپنی شاگردی میں لے لے۔'' ابراہیم نے میری طرف اشارہ کیا اور یوں میں ایک استاد سے دوسرے استاد کو منتقل ہو گیا۔

خلیل نے اگلے ہی روز سے میری تربیت شروع کر دی۔ پہلے پندرہ دن وہ مجھے ڈرائیونگ سکھاتا رہا۔

نانی کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ڈرائیور بن چکا ہوں تو اس نے میرے ذمے ایک اور کام لگا دیا۔ جو کام پہلے ماموں اور اس کے چیلے کرتے تھے اب میرے ذمے آ گیا تھا۔

دونوں خالاؤں کو ان کے گاہکوں تک پہنچانا اور واپس لانا اب میری ذمے داری تھی۔ ساتھ ہی کاروں کے لاک کھولنے اور ڈائریکٹ کرنے کی تربیت بھی جاری تھی۔

خلیل کا ابتدائی سبق یہ تھا کہ نئی کار پر ہاتھ نہ آزمایا جائے۔ پرانی کار کا لاک بھی پرانا ہوتا ہے اس لیے اس پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی اور نہ ہی انجن کو ڈائریکٹ کرنے میں کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

میں خلیل کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا کہ ایک روز میں ایف ٹی سی کی پارکنگ لاٹ میں گھوم رہا تھا اور ساتھ ہی نظروں میں اس کار کو تلاش کر رہا تھا جسے چوری کرنا تھا کہ میری نظریں جین اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک لڑکی پر پڑیں جو ایک نئی کار پر زور آزمائی کر رہی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اس کی مدد کی۔ اگلے دو منٹ میں لاک کھل گیا اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن کو ڈائریکٹ کیا۔

''اب بیٹھ بھی جاؤ کس کا انتظار ہے۔'' میں نے اس فیشن ایبل لڑکی کو مخاطب کیا اور وہ بغیر کچھ کہے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''ڈونا۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔

''کرسچن ہو؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس کا جواب اس بار بھی مختصر تھا۔

''کب سے گاڑیاں چوری کر رہی ہو۔'' میں نے سوال کیا لیکن اس نے جواب دینے میں دیر کی۔

''میں مجبوری میں یہ کام کر رہی ہوں۔'' ڈونا کا جواب تھا۔

''ایسی بھی کیا مجبوری ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''شوہر خرچ نہیں دیتا۔'' اس نے جواب دینا شروع کیا۔

''شادی شدہ ہو؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میں ایک پارلر میں نوکری کر رہی تھی وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی۔'' ڈونا بول رہی تھی اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔

''پارلر تو خواتین کا ہو گا۔ وہاں مرد کیسے آ گیا؟'' میرا سوال تھا۔

''اس کی بہن پارلر میں آتی تھی۔ ہم میں سے کچھ لڑکیاں پرائیویٹ طور پر اپنے کسٹمر کے گھر چلی جاتی تھیں اور کم پیسوں میں وہی کام کر دیتی تھیں جو پارلر میں زیادہ رقم میں ہوتا تھا۔''

''وہیں تمہاری ملاقات اس شخص سے ہوئی جس سے تم نے بعد میں شادی کر لی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس نے مجھے بڑے خواب دکھائے تھے۔'' ڈونا نے کہا۔

pklibrary.com

’’کیا خواب دکھائے تھے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’اس نے کہا تھا کہ اس کے پاس کینیڈا کا پاسپورٹ ہے اور وہ جب چاہے کینیڈا جاسکتا ہے۔‘‘ ڈونا نے کہا۔

’’تم نے اس کا پاسپورٹ دیکھے بغیر اس سے شادی کرلی؟‘‘

’’آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔‘‘

’’وہ جب بھی مجھے ڈیٹ پر لے جاتا، نئی گاڑی لاتا تھا۔‘‘ ڈونا نے کہا۔

’’کہاں لے جاتا تھا ڈیٹ پر۔‘‘ میں نے ایک اور سوال کردیا۔

’’فائیو اسٹار ہوٹل کی ہائی ٹی پر یا کبھی اسی طرح ہوٹل میں ڈنر پر۔‘‘ ڈونا کا جواب تھا۔

’’وہ تمہیں خواب دکھاتا رہا اور تم دیکھتی رہیں۔‘‘ میں نے کہا: ’’اس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟‘‘ میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

’’میں انٹر میں تھی یہی ہوگی سولہ یا سترہ برس۔‘‘ ڈونا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

’’شادی تم نے کس عمر میں کی؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’میں بیس سال کی تھی جب ہم نے کورٹ میرج کی تھی۔‘‘ ڈونا کا جواب تھا۔

’’اور بچے کتنے ہیں؟‘‘ میں نے ایک اور سوال کیا۔

’’تین ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔‘‘ اس کا جواب تھا۔

’’چار برس میں تین بچے۔‘‘ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

’’پہلی بیٹی شادی سے پہلے ہوئی تھی۔‘‘ اس کا جواب تھا۔

’’یہ کار چوری تم نے کس سے سیکھی۔‘‘ یہ وہ سوال تھا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں تھا۔

’’ذیشان کے ساتھ میں نے اس کام کی ابتدا کی تھی۔‘‘ اس کا جواب تھا۔

’’ذیشان یعنی تمہارا شوہر؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’وہ مجھے ساتھ لے جاتا تھا۔ کار کا لاک وہ کھولتا تھا اور مجھے ساتھ بٹھالیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خاتون ساتھ ہو تو پولیس کو شک نہیں ہوتا۔‘‘ اس نے تفصیل سے بتایا۔

’’میں نے تو سنا تھا کہ پولیس اگر خوب صورت لڑکی دیکھ لے تو اس کو شک نہیں ہوتا۔‘‘ میں نے کہا اور اس کا منہ بن گیا۔

’’تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں خوب صورت نہیں ہوں۔‘‘ اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

’’اگر تم آئینے کی بات پر یقین کرلیتی ہو تو یہ بتادوں کہ آئینہ صرف جھوٹ بولتا ہے۔‘‘ میں نے کہا اور اس کی تیوریوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

’’تم ماڈرن ہو، جین اور کرتی تمہارے ماڈ ہونے کا ثبوت ہے لیکن خوب صورتی کچھ اور چیز ہوتی ہے۔‘‘ میں نے کہا اور وہ مجھے گھورتی رہی۔

’’دیکھ لوں گی کہ تمہارا معیار کیا ہے۔‘‘ اس نے ناراض لہجے میں کہا۔

’’میں سمجھا نہیں۔‘‘ میں نے وہی کہا جو فوری طور پر میرے دماغ میں آیا تھا اور ڈونا مسکرادی۔

’’میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں دیکھوں گی... تم کس سے شادی کروگے اور وہ کتنی خوب صورت ہوگی۔‘‘ ڈونا نے کہا اور میں ہنس دیا۔

’’تمہیں میری بات بُری لگی؟‘‘ میں نے کہا اور اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

’’کیا مجھے بُری نہیں لگنی چاہیے تھی؟‘‘ ڈونا نے عجیب سا سوال کیا۔

’’میرا تعلق جہاں سے ہے وہاں صبح شام یہ بات ہوتی ہے۔ مرد، عورت کو خوب صورت کہہ رہا ہوتا ہے اور خواتین اس پر یقین کرلیتی ہیں اور پھر باقی عمر آنسو بہانے میں گزار دیتی ہیں۔‘‘

’’بائی دی وے تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟‘‘ ڈونا نے کہا۔

’’وہاں سے ہے جہاں شُرفا سورج کی روشنی میں جاتے ہوئے شرماتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا اور ڈونا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں کار سڑکوں پر دوڑا رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک فائیو اسٹار ہوٹل پر پڑی جس کی ہائی ٹی بہت مشہور تھی۔ میں نے کار اس ہوٹل کی جانب موڑنی چاہی تو ڈونا نے مجھے روک دیا۔

’’میں ذیشان کے ساتھ سب سے زیادہ اسی ہوٹل میں آتی رہی ہوں۔‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے کہ دو چار بار آنے سے یہاں کا ہر ملازم تمہیں پہچانتا ہے۔‘‘ میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

pklibrary.com

''یہ بات نہیں ہے۔'' ڈونا نے کہا اور خاموش ہوگئی۔

اس کی بات کاٹتے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے ہوٹل پہنچے۔ وہاں ہائی ٹی لی اور واپس ہوئے۔ ''تمہیں کہاں ڈراپ کرنا ہے؟'' میں نے ہوٹل سے نکلتے ہی سوال کیا۔

''کلفٹن۔'' اس کا جواب تھا۔

''تو تمہارا اسسرال سے کوئی رابطہ نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''پہلے دن سے نہیں تھا۔'' ڈونا نے کہا اور اب تو شوہر جیل میں ہے اس لیے بھی رابطہ نہیں ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے کہہ دیا۔

''ہم نے ایک گاڑی اٹھائی۔ ذیشان اسے ڈرائیو کررہا تھا اور میں اس کے ساتھ تھی۔ میٹروپول سے آگے پولیس کا ناکا تھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔ ''تم یہاں اتر جاؤ۔'' اور میں تیزی سے اتر گئی۔ ولیج ریسٹورنٹ کے باہر موٹر سائیکلز کھڑی تھیں۔ ایک موٹر سائیکل پر چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور رانگ سائڈ چلاتی ہوئی ایمپریس مارکیٹ آگئی اور وہاں موٹر سائیکل چھوڑ کر نکل گئی۔''

''پولیس نے پیچھا نہیں کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''رانگ سائڈ پر [illegible] وہ پیچھا نہیں کرسکتے۔''

''مگر تمہارا شوہر پکڑا گیا۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''کتنے سال کی سزا ہوئی ہے اُسے؟''

''چار سال کی سزا ہوئی ہے۔'' ڈونا نے جواب میں کہا۔ ''وہ بھی اس کے گھر والوں کی کوششوں کی وجہ سے۔'' ڈونا بولتی رہی۔

''اور کتنے سال گزر گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''مریم تین سال کی ہوگئی ہے، وہ باپ کے جیل جانے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔''

''یعنی ابھی ذیشان کی جیل میں سال بھر باقی ہے۔'' میں نے کہا اور ڈونا کی گردن اثبات میں ہلنے لگی۔

ڈونا مجھے راستہ بتاتی رہی اور ہم اس کے فلیٹ پہنچ گئے۔ اس بلڈنگ کے نیچے ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی جیسے کسی کا انتظار کررہی ہو۔

''کہاں رہ گئی تھیں؟'' اس نے ڈونا کو دیکھتے ہی کہا۔

وہ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔

''یہ میری بڑی بہن ہے سستھیا۔'' ڈونا نے تعارف کروایا۔

''کار کہاں پارک کروں؟'' میں نے ڈونا سے سوال کیا۔

''نیچے بیسمنٹ میں پارکنگ ہے۔'' ڈونا نے کہا اور میں کار بیسمنٹ میں لے گیا اور وہاں کار پارک کرکے اوپر آگیا۔

''تم نے ان کا تعارف نہیں کروایا۔'' سستھیا نے بہن سے سوال کیا۔

''میں حماد ہوں۔'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''یہ تو نام ہوا۔'' سستھیا نے کہا۔

''باقی کا تعارف میں کروادوں گی۔'' ڈونا نے کہا اور میں پلٹ گیا۔

میں وہاں سے آگے بڑھ کر روڈ تک پہنچا۔ وہاں سے رکشا لیا اور گھر کی طرف چلنے کو کہا۔

گھر پہنچا تو سب سے پہلے ابراہیم سے ملاقات ہوئی۔

''کل میرے ساتھ چلنا بینک میں اکاؤنٹس کھلوانا ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔

''مجھے بینک سے زیادہ آپ پر بھروسا ہے۔'' میں نے کہا اور ابراہیم کے چہرے پر خوشی کا... تاثر ابھرا۔

میں ابھی ابراہیم کے ساتھ بیٹھا ہی تھا کہ پولیس آگئی۔

''سرفراز کہاں ہے؟'' پولیس پارٹی کو لیڈ کرنے والے نے ابراہیم سے ماموں کے بارے میں پوچھا۔

''خیریت تو ہے حوالدار صاحب؟'' ابراہیم نے پولیس والے سے سوال کیا۔

پولیس کا ہمارے محلے میں آنا کوئی انہونی بات نہیں تھی اور یہی سوچ کر ابراہیم نے سوال کیا تھا۔

''سرفراز نے بینک ڈکیتی کی ہے۔'' اسی پولیس والے نے جواب دیا جو پولیس پارٹی کو لیڈ کررہا تھا۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' ابراہیم نے ایک اور سوال کیا۔

''اب سے ایک گھنٹے پہلے کا واقعہ ہے۔'' پولیس والے نے کہا۔

''بینک ڈکیتی کے دوران سرفراز نے فائرنگ بھی کی جس سے ایک گارڈ ہلاک ہوگیا۔''

''پھر تو یہ بینک ڈکیتی کا نہیں بلکہ قتل کا کیس ہوگیا۔'' میں نے کہا۔ شاید مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا کیونکہ پولیس والوں کی نظریں اب مجھ پر جم گئی تھیں۔

pklibrary.com

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

pklibrary.com

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

”تو کون ہے بھئی؟“ اس پولیس والے نے جو اب تک ابراہیم سے ہم کلام تھا، مجھے مخاطب کیا۔

”یہ حماد ہے۔“ میرے بجائے ابراہیم نے جواب دیا۔ ”سرفراز کا بھانجا ہے یہ۔“ ابراہیم نے مکمل تعارف کروا دیا تھا۔

”چلو پھر اسی کو اٹھالو۔“ پولیس والے نے کہا اور دو سپاہی میری جانب بڑھے۔

”میرا قصور کیا ہے؟“ میں نے پولیس کے سپاہیوں کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”تیرا قصور یہ ہے کہ تو سرفراز کا بھانجا ہے اب وہ ہاتھ نہیں آیا تو تجھے ہی لے جاتے ہیں تا کہ اسے معلوم ہو تو وہ گرفتاری دے دے۔“ اب تک وہ انسپکٹر جو خاموش تھا اس نے پہلی دفعہ لب کھولے تھے۔

ابراہیم اور خلیل نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن پولیس والوں نے مجھے اٹھا کر موبائل میں پھینک دیا۔ موبائل ابھی آگے بڑھی بھی نہیں تھی کہ مجھے نانی اور اماں کی شکلیں نظر آئیں۔

”کہاں لے جا رہے ہو میرے بچے کو؟“ نانی نے فریادی لہجے میں کہا۔

”سرفراز نے بینک میں ڈکیتی کی ہے۔“ ایس ایچ او نما شخص نے کہا۔

”ڈکیتی اس نے کی ہے اور گرفتار آپ اس بچے کو کر رہے ہیں؟“ نانی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا تھا لیکن ان میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ مسٹنڈے پولیس والوں سے چھڑا سکتیں۔

”اسے چھوڑ دو اور مجھے لے جاؤ۔“ اماں نے پیشکش کی۔

”اسے کیوں چھوڑ دوں؟“ ایس ایچ او نے کہا، اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔

”اس کے پرسوں سے امتحان ہیں۔“ اماں کا لہجہ فریادی تھا۔

”اچھا اب طوائفوں کے بیٹے بھی پڑھنے لگے؟“ ایس ایچ او نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تعلیم کسی کی میراث نہیں ہے۔“ میرے منہ سے نکل پڑا لیکن اس کا جواب ایک زوردار تھپڑ تھا جو میرے ساتھ کھڑے لمبے چوڑے سپاہی نے مارا تھا اور ساتھ ہی بولا۔

”فلسفہ بولتا ہے۔“

میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ میں نے کون سا فلسفہ بول دیا جس پر یہ اتنا ناراض ہو رہا ہے۔

میں ابھی تک پولیس موبائل میں ہی تھا کہ نانی کو موقع مل گیا انہوں نے چیخ چیخ کر پورا محلہ جمع کر لیا۔

پولیس کی نفری زیادہ نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو پولیس سے الجھنے کے لیے تیار تھے ان میں ماموں سرفراز کے چند لوگ بھی شامل تھے۔

”ہمارا کھاتے ہیں اور ہم پر ہی غراتے ہیں۔“ نانی نے کہا اور ان کا ساتھ دینے والوں میں محلے کی تمام عورتیں تھیں۔ ایس ایچ او کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا تو اس نے تازہ نفری منگوائی جب تک ڈی ایس پی پہنچتا، صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ ماموں سرفراز کے دو ساتھیوں نے مجھے پولیس موبائل سے اتار لیا مگر میں ڈی ایس پی کو دیکھ کر آگے بڑھ گیا اب میری گفتگو ڈی ایس پی سے شروع ہوئی۔ یہ گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی تھی۔ ”دیکھیں ڈی ایس پی صاحب میرا اس کے علاوہ اور کوئی قصور نہیں کہ میں ڈکیتی کرنے والے کا بھانجا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کس کلاس میں ہو؟“

”پرسوں سے میرے میٹرک کے امتحان ہیں۔“ میں نے اسکول کے نام کے ساتھ بتایا۔

”کیوں لے جا رہے ہو اسے تھانے؟“ ڈی ایس پی نے ایس ایچ او سے سوال کیا۔

”سر جی یہ معصوم نہیں ہے۔“ ایس ایچ او نے جواب میں کہا۔

”تمہارے پاس اس کا کوئی پرانا ریکارڈ ہے، کوئی ایف آئی آر وغیرہ۔“ ڈی ایس پی نے ایک اور سوال کیا۔

”نہیں سر... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ ایس ایچ او نے جواب دیا۔

”کوئی گواہ جس نے اسے بینک ڈکیتی میں دیکھا ہو؟“ ڈی ایس پی سوال پر سوال کر رہا تھا۔

”سر جی جب یہ پولیس پارٹی آئی ہے، اس سے پانچ منٹ پہلے حماد آیا تھا۔“ ابراہیم نے گواہی دی۔

”تم اسے اس لیے گرفتار کر رہے ہو کہ ملزم کو جب معلوم ہوگا تو وہ گرفتاری دے دے گا؟“ ڈی ایس پی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اب ایس ایچ او کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”سر، میں تھانے چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن انہیں بتا دیں کہ میرے ساتھ زیادتی نہ کریں۔“ میں نے ڈی ایس پی سے کہا۔

pklibrary.com

''سن لیا تم نے۔'' ڈی ایس پی نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔

''جی سر۔'' ایس ایچ او نے جھکی گردن کے ساتھ کہا۔

''اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ایس ایچ او نے کہا اور ڈی ایس پی کے اشارے پر پولیس لوٹ گئی اور میں ابراہیم کے پاس آ گیا جہاں خلیل پہلے سے موجود تھا۔ میں کچھ دیر وہاں رکا پھر نانی نے بلا بھیجا تو میں ان کے پاس چلا گیا۔

''یہ تمہاری چھوٹی خالہ کو کہیں جانا ہے۔'' نانی نے کہنا شروع کیا۔ ''اسے وہاں چھوڑ کر وہیں رکنا جب یہ فارغ ہو جائیں تو ساتھ لے آنا۔'' نانی کا حکم تھا اس لیے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ چھوٹی خالہ تھیں تو تیس برس کی لیکن اپنی عمر انیس ہی بتاتی تھیں۔

چھوٹی خالہ کار میں آ کر بیٹھیں تو میں نے پوچھا۔ ''کس طرف چلنا ہے؟'' جس کا جواب فوری طور پر نہ ملا۔

''تین تلوار کی طرف چلو۔'' کچھ دیر بعد ان کی آواز آئی اور میں نے کار آگے بڑھا دی۔ ہم تقریباً اسی جگہ پہنچ گئے جہاں میں نے کچھ دیر قبل ڈونا کو ڈراپ کیا تھا۔

جب ہم تین تلوار کے قریب پہنچ گئے تو چھوٹی خالہ نے موبائل پر نمبر ڈائل کیا۔ ''تین تلوار پر ہوں اب کہاں آنا ہے؟''

'' آگے نیشنل بینک ہے، میں اس کے باہر کھڑا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور میں کار آگے لیتا چلا گیا۔ آگے واقعی نیشنل بینک کی شاخ تھی اور اس کے باہر ایک کالا بھجنگ بندہ ٹہل رہا تھا۔ چھوٹی خالہ کار سے اتریں اور اس کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

''تم بھی آ جاؤ۔'' چھوٹی خالہ نے مجھ سے کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔

''میرا ایک دوست یہاں قریب ہی رہتا ہے میں وہاں چلا جاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ان دونوں نے اعتراض نہیں کیا۔ میں پلٹنے ہی والا تھا کہ اس کالے بھجنگ آدمی نے مجھے آواز دی اور ہزار ہزار کے چند نوٹ میری جانب بڑھائے جسے میں نے جیب میں رکھ لیا۔

جس دوست کا میں نے ذکر کیا تھا، وہ ڈونا تھی۔ میں نے اس کے نمبر پر ڈائل کیا تو دوسری گھنٹی پر اس نے اٹھا لیا۔

''بہت بے چین ہو رہے ہو؟'' رابطہ ہوتے ہی ڈونا کی آواز آئی۔

''نہ میں بے چین ہو رہا ہوں اور نہ تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تو پھر فون کیوں کیا ہے؟'' ڈونا نے ایک اور سوال کیا۔

''میں یہاں قریب ہی آیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''واپسی میں مجھے کسی کو پک کرنا ہے اس لیے کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ڈونا کی ہنسی کی آواز آئی۔

''جہاں تم نے گاڑی پارک کی، اس سے پہلے ایک گیٹ ہے اس میں داخل ہو گے تو سامنے ہی لفٹ ہے اس میں داخل ہو جاؤ۔ تیسرے فلور پر آؤ گے تو میں اپنے فلیٹ کے باہر ملوں گی۔'' ڈونا نے تفصیل بتائی۔

میں جیسے ہی تیسرے فلور پر آیا تو ڈونا کو وہاں موجود پایا۔ اس کے پیچھے چلتا ہوا میں فلیٹ میں داخل ہوا۔ ڈونا نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ چلتا ہوا اس چھوٹے سے ٹیرس پر آ گیا جہاں دو فولڈنگ کرسیاں رکھی تھیں جن کے ساتھ کچھ گملے پڑے تھے اور سامنے سمندر تھا۔ ٹیرس پر ہلکی ہوا آ رہی تھی۔ ڈونا میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تم نے تو میں نے چابی والے کو بلایا اور کار کی چابیاں بنوائیں اور کار فروخت کر دی۔''

''میں اپنے حصے کی رقم لینے نہیں آیا۔'' میں نے کہا اور ڈونا کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔

''کار دو لاکھ میں فروخت ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ تمہارا حصہ پچاس فیصد دوں گی۔'' ڈونا نے کہا۔

''وہ حصہ بھی تم رکھ لو۔'' میں نے کہا اور ڈونا کے چہرے کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''اس کے جواب میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' ڈونا نے سوال کیا۔

''کیا کر سکتی ہو؟'' میں نے سوال کیا اور ڈونا کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ آ گئی جسے میں پوری طرح سمجھ گیا۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور ڈونا نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرے دماغ میں کوئی خلل ہو۔

''تم نے اپنی قیمت خود ہی لگا لی۔'' میں نے کہا اور ڈونا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''کیا زیادہ لگا لی؟'' ڈونا کا سوال تھا۔

''زیادہ نہیں بہت زیادہ۔'' میں نے کہا اور ڈونا کا

چہرہ لال ہوگیا جو یقیناً شرم سے نہیں تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ نارمل ہوتی چلی گئی۔ میں اس دوران خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

''ایک سنجیدہ بات کروں۔'' ڈونا کچھ دیر بعد بولی۔

''یعنی اب تک تم غیر سنجیدہ تھیں؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''میں ایک سنجیدہ آفر کررہی ہوں۔'' ڈونا نے کہا اور میں غور سے اسے دیکھنے لگا۔

''الگ الگ کام کرنے کے بجائے ہم مل کر کام نہیں کرسکتے؟'' اس نے آفر کی۔

''تمہارا رول کیا ہوگا اور میرا رول کیا ہوگا؟'' میں نے بنیادی سوال کیا۔

''وہی رول ہوگا جو آج تھا۔'' ڈونا کا جواب تھا۔

''یعنی دودھ میں لاؤں اور بالائی تم کھاؤ؟'' میں نے کہا۔

''مجھے تو بچے پالنے ہیں تمہیں کیا کرنا ہے؟'' ڈونا کا سوال تھا۔

''مجھے کینیڈا جانا ہے۔ امیگریشن لینا ہے۔ وہاں۔'' میں نے کہا اور بیک وقت دو لڑکیوں کی ہنسی کی آواز آئی۔ ان میں سے ایک ہنسی کی آواز میری پشت کی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ڈونا کی بڑی بہن تھی جو پہلی نظر میں مجھے قبول صورت نظر آئی تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ اور زیادہ ہنسنے لگی۔

''ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''یہ جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے یہ بھی چند برس پہلے اسی طرح کے خواب دیکھ رہی تھی۔'' اس نے کہا اور مسکرانے لگی۔

''اس نے جو غلطی کی، میں وہ کرنے والا نہیں۔'' میں نے کہا اور ان دونوں کے چہروں پر سنجیدگی چھا گئی۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ امیگریشن حاصل کرنے کے لیے کتنی رقم درکار ہوگی؟'' اس نے سوال کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہوں؟'' میں نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''اگر دس کروڑ روپے کی بھی ضرورت ہوئی تو میں ایک سال سے کم عرصے میں جمع کرلوں گا۔'' میں نے کہا اور ڈونا کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔

''ذیشان نے تو مجھے دھوکا دیا لیکن تم سے امید ہے کہ تم مجھے ساتھ لے جاؤ گے۔'' ڈونا نے کہا اور اب ہنسنے کی میری باری تھی۔

''تم کہہ رہی ہو کہ میں ماؤنٹ ایورسٹ پر جاتے ہوئے ایک تھرماس میں برف ساتھ لے جاؤں۔'' میں نے کہا اور سنتھیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''تم کیوں ہنسی تھیں؟'' ڈونا نے بہن سے سوال کیا۔

''تم نے بات ہی ایسی کی تھی۔'' ڈونا کی بہن کا جواب تھا۔

ہم فجر کی اذانوں تک اسی طرح وقت گزاری کرتے رہے کہ اچانک میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا۔ چھوٹی خالہ فون کررہی تھیں۔ میں نے ان بہنوں سے رخصت لینے میں دیر نہیں کی اور وہاں پہنچ گیا جہاں چھوٹی خالہ کو ڈراپ کیا تھا۔ وہ انتظار میں ہی تھیں۔ میں نے کار روکی تو وہ پسنجر سیٹ پر آکر بیٹھ گئیں اور بیٹھتے ہی کہا۔ ''بھائی سرفراز نے گرفتاری دے دی۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' میں نے سوال کردیا۔

''جس کے پاس سے آرہی ہوں، جانتے ہو وہ کون تھا؟'' خالہ نے سوال کیا۔

''میں کیا جانوں؟'' میں نے کہا۔

''وہ تمہارے خالو کے [illegible] ڈی آئی جی ہے۔''

''تو یہ معاملہ ہے۔'' میں نے کہا لیکن میرا لہجہ طنزیہ ہوتا چلا گیا۔

''یوں ہی سمجھ لو۔'' چھوٹی خالہ نے جواب میں کہا۔

''اب اس میں بُری خبر یہ ہے کہ بینک کا منیجر جو زخمی ہوا تھا وہ بھی اب نہیں رہا۔'' چھوٹی خالہ نے کہا۔

''یہ تو بُرا ہوگیا۔'' مجھے کہنا پڑا۔ ایک قتل اب دہرے قتل کا مقدمہ ہوگیا تھا۔

''اب یہ بتائیں کہ گھر جانا ہے یا تھانے جانا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''گھر چلو۔'' چھوٹی خالہ نے جواب میں کہا۔ ''میری والدہ اور تمہاری نانی تھانے میں ہیں اور وہی معاملات طے کررہی ہیں۔'' چھوٹی خالہ نے تفصیل بتائی اور میں نے کار آگے بڑھادی۔

ہم گھر پہنچے تو نانی گھر پر ہی تھیں، ان کے ساتھ محلے کی چند خواتین موجود تھیں۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ نانی کو واپس آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ استاد ابراہیم ان کے ساتھ ان کے دائیں ہاتھ پر موجود تھے۔

''آگئے واپس؟'' نانی نے مجھے اور چھوٹی خالہ کو

دیکھتے ہی کہا۔

''حماد کل صبح کہیں نہ جانا۔'' میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ نانی نے مجھے مخاطب کیا اور میں کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا اور جا کر سو گیا۔

میں دیر تک سوتا رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو موبائل کی بیل بج رہی تھی لیکن موبائل نانی کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے آنکھ کھولتا دیکھ کر نانی مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''سب لوگ جمع ہیں، تم بھی ہاتھ منہ دھو کر آجاؤ۔ تمہارے ماموں بھی آئے ہوئے ہیں۔'' نانی نے اطلاع دی۔

مجھے ہال میں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ وہاں واقعی تمام لوگ جمع تھے۔ ماموں سرفراز حسبِ معمول درمیان میں چودھری بنے بیٹھے تھے۔ ان کے چاروں طرف، ان کے پنٹرز موجود تھے۔

''آؤ بھانجے۔'' ماموں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تم سب کان کھول کر سن لو۔'' ماموں نے اپنے پنٹرز کو مخاطب کیا۔

''جب تک میں واپس نہیں آجاتا تم سب حماد کا حکم اسی طرح مانو گے جیسے آج تک میرا حکم مانتے رہے ہو۔'' ماموں نے کہا اور تمام پنٹرز نے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

''استاد آپ حماد کی رہنمائی کریں گے۔'' ماموں سرفراز نے ابراہیم سے کہا۔

ابراہیم نے ماموں سرفراز کی ہدایت پر فوراً ہی عمل شروع کر دیا اور مجھے ماموں سرفراز کے ڈیرے پر لے گئے اور ایک ایک پنٹر سے تعارف کروایا۔ اب میں باس بن چکا تھا۔ اس عمر میں باس بن جانا معمولی بات نہیں تھی۔ ابراہیم نے تفصیل سے مجھے ذمے داریاں بتائیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ماموں سرفراز اتنی ذمے داریاں سنبھال رہے ہیں۔

ہمارے محلے میں منشیات کا کاروبار بھی ہو رہا تھا اور یہ کاروبار پولیس کی سرپرستی میں ماموں سرفراز کر رہے تھے۔ ابراہیم میرے اور پولیس کے درمیان رابطہ تھا۔ میری تقریباً روزانہ ڈی آئی جی سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان کا حصہ پہنچانے کا کام میں نے اپنے ذمے لیا ہوا تھا۔ نانی میرے کام سے خوش تھیں پھر ایک دن انہوں نے مجھے بلوایا کہ مجھے ایک نتھ اترائی کے فنکشن کا انتظام کرنا ہے جس کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی شاید سترہ برس ہوگی۔ ہم

دونوں ساتھ پلے تھے اور ساتھ اسکول جاتے تھے۔ اس کے بارے میں سن کر میں افسردہ ہو گیا۔ ابراہیم سے مشورہ کیا تو اس نے خبردار کیا، نانی معاف نہیں کریں گی۔

میری روز ملاقات ماموں سرفراز سے تھانے میں ہوتی تھی۔ ابراہیم کے کہنے پر میں نے ماموں سرفراز سے بھی اس سلسلے میں بات کی۔

''کرنا کیا چاہتا ہے؟'' ماموں نے میری فریاد سننے کے بعد کہا۔

''میں اُس بندے کا قتل کر دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' ماموں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

''جو بھی ہو، مجھے اس کی پروا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں بچپن سے اس کے خواب دیکھتا رہا ہوں اب اسے کسی اور کا ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔'' میرا جواب تھا۔

''یہاں تک تو صحیح ہے لیکن اسے رکھے گا کہاں؟'' ماموں نے سوال کیا۔

''میں اسے لے کر کینیڈا نکل جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور ماموں ہنس دیے۔

''یہ سب کیا اتنا آسان ہے؟'' ماموں نے سوال کیا۔

''اگر آسان ہوتا تو آپ سے مشورہ کیوں کرتا؟'' میں نے کہا۔

''مجھے سوچنے دے۔'' ماموں نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ماموں جان چھڑا رہے ہوں۔

مگر ان کے اگلے فقرے نے مجھے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر دیا۔

''صبح استاد ابراہیم کو بھیج دینا۔'' میں تھانے سے نکل رہا تھا کہ مجھے پشت سے ماموں کی آواز آئی۔

میں نے استاد ابراہیم کو ماموں کا پیغام پہنچایا تو وہ حیران ہوئے لیکن انہیں اندازہ ہو گیا کہ میں نے ماموں سرفراز سے کوئی بات کی ہوگی۔

''تم نے سائرہ کی کوئی بات کی ہوگی؟'' انہوں نے سوال کیا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی۔

''میں نے تم سے کہا تھا......'' استاد ابراہیم نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں کچھ کہنے سے روک دیا۔

''اس محلے سے کوئی لڑکی اغوا ہوتی ہے تو پولیس اغوا ہونے والی اور اغوا کرنے والے کا پاتال تک پیچھا کرتی

ہے۔'' استاد ابراہیم نے سمجھانا چاہا۔
''یہ سب جانتا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔
''دن بھی تو صرف تین ہیں۔'' استاد نے خبردار کیا۔
''وہ تاریخ تو آگے بڑھ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔
''نائی بھی تیار نہیں ہوگی۔'' استاد نے کہا۔
''اگر سائرہ یہ کہہ دے کہ اسے ڈائیریا ہوگیا ہے تب بھی؟'' میں نے سوال کیا۔
''خواتین کے پاس سو بہانے ہوتے ہیں۔'' استاد نے کہا اور میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ استاد صحیح کہہ رہے تھے۔
''مگر جاؤ گے کہاں اسے لے کر؟'' استاد ابراہیم نے ایک اور سوال کر دیا۔
''پہلی فرصت میں کینیڈا نکل جاؤں گا اسے لے کر۔'' میں نے کہا اور استاد ابراہیم نے قہقہہ لگایا۔
''تم کیا سمجھتے ہو کینیڈا جانا جوڑیا بازار جانے کی طرح ہے کہ رکشا روکا اور کینیڈا پہنچ گئے؟'' استاد نے کہا۔
''میں کچھ نہیں جانتا، میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سائرہ نہ ملی تو یا تو میں مرجاؤں گا یا پھر خودکشی کرلوں گا۔'' میں نے ضدی انداز میں کہا۔
''جذباتی نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ تو حل نکل ہی آئے گا۔'' استاد ابراہیم نے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن میں مطمئن نہ ہو سکا۔

اُس رات میں سائرہ سے ملا مگر اسے میں نے مطمئن پایا۔ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ اس محلے کے لیے کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ سائرہ بھی اسی محلے میں پیدا ہوئی تھی۔ بچپن سے وہ یہی دیکھتی آئی تھی کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی، اسے ایک نتھنی پہنا کر مجروں میں بٹھایا جاتا تھا اور جیسے ہی اس کے اچھے دام لگتے اسے دام لگانے والے کے حوالے کر دیا جاتا۔ وہ ہفتہ دس دن اپنے پاس رکھتا اور پھر واپس آجاتی اور اس سے باقاعدہ پیشہ شروع کروایا جاتا۔
''تمہیں معلوم ہے تمہارے دام لگ رہے ہیں؟'' میں نے جونہی سائرہ کو اکیلے پایا، اس سے سرگوشی کی۔
''جانتی ہوں۔'' سائرہ نے اس طرح کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ مجھے خود پر حیرت ہوئی تھی کہ جس کے لیے میں آگ کا دریا عبور کرنے کے لیے تیار تھا، اسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔
''اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟'' سائرہ کا انداز بھی سرگوشی والا تھا۔ ''صدیوں سے یہاں یہی دستور ہے۔'' سائرہ سپاٹ لہجے میں بول رہی تھی۔
''اور تمہیں کس بات پر حیرت ہے؟'' اس کی آواز میں تلخی تھی۔ ''کیا تمہاری ماں کے ساتھ یہ نہیں ہوا تھا یا تمہاری نانی اس دور سے نہیں گزری۔'' سائرہ نے چبھتے چبھتے سوال کیے تھے۔
''وہ اس زندگی سے خوش نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔
''تو میں کون سا خوشی خوشی اس کے لیے تیار ہوں۔'' سائرہ کا جواب تھا۔
''ایک باعزت زندگی کا راستہ اب بھی تمہارے پاس ہے۔'' میں نے اتنی ہلکی آواز میں کہا تھا کہ بمشکل اپنی آواز سن سکا تھا۔
''تمہاری ماں بھی اس دھوکے کا شکار ہو چکی ہے۔'' سائرہ نے کہا۔
''میں جانتا ہوں۔'' میرا جواب تھا۔
''کیا جانتے ہو؟'' سائرہ نے پلٹ کر سوال کیا۔
''یہی کہ میرے باپ نے میری ماں سے نکاح کیا تھا مگر اس کے گھر والوں نے اس نکاح کو قبول نہیں کیا۔'' میرا جواب تھا۔
''جب تمہارے والد کا قتل ہوا تو اس کے بھائیوں نے تمہاری ماں کو گھر سے نکال دیا تھا۔'' سائرہ نے کہا۔
''وہ قتل بھی میرے چچاؤں نے کیا تھا لیکن پولیس فائل میں وہ اتفاقی حادثہ درج ہوا۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''تمہاری نانی نے بہت شور مچایا لیکن ایک ایم این اے کے آگے ایک طوائف کی کیا چلتی، پولیس نے وہی لکھا جو میرے دادا نے لکھوایا کہ ان کا بیٹا رائفل صاف کر رہا تھا کہ اچانک گولی چل پڑی اور اس کا دوسرا بیٹا مارا گیا۔'' سائرہ نے کہا۔
''اب تم مجھے اسی راستے پر چلنے کی ترغیب دے رہے ہو جس پر تمہاری والدہ دھوکا کھا چکی ہے۔'' سائرہ نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔
''میں تمہیں اس مستقبل سے بچانا چاہ رہا ہوں جو اس محلے کی صدیوں کی روایت رہی ہے۔''
''کون کرے گا مجھ سے شادی؟'' اس نے عجیب سا سوال کیا۔ ''کوئی ہے بندہ تمہاری نظر میں؟'' سائرہ کا سوال ایسا تھا کہ میں فوری طور پر جواب نہیں دے سکا۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم اس محلے کو ہی نہیں بلکہ اس ملک

کو ہی چھوڑ دو۔‘‘ میں نے کہا۔
’’تم اپنے لیے تو بات نہیں کر رہے؟‘‘ سائرہ نے سوال کیا اور میں اسے دیکھتا رہا لیکن کہا کچھ نہیں صرف گردن ہلا دی۔
’’وہ ڈی آئی جی جو میرا سودا کر رہا ہے، وہ بھی مجھے ملک سے باہر لے جانا چاہتا ہے۔‘‘ سائرہ نے اطلاع دی۔
’’کتنے دن کے لیے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔
’’دس روز کے لیے لندن کی آفر ہے اس کی۔‘‘ سائرہ کا جواب تھا۔
’’تمہیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’تم بھی اسی محلے کے ہو اور جانتے ہو کہ ایسی باتیں لڑکیوں سے چھپائی نہیں جاتیں شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ لڑکی ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہو جائے۔‘‘ سائرہ نے کہا۔
میں اس سے واقف تو تھا لیکن جس طرح سائرہ تجزیہ کر رہی تھی، میں نے اس طرح اس پر غور نہیں کیا تھا۔
میں ابھی سائرہ سے بات کر ہی رہا تھا کہ استاد ابراہیم وہاں آگئے۔ ’’آپ کی نانی آپ کو بلا رہی ہیں۔‘‘ انہوں نے آتے ہی کہا اور میں فوراً واپسی کے لیے مڑ گیا۔
’’وہ ڈی آئی جی بھی وہاں موجود ہے جو... سائرہ کا خریدار ہے۔‘‘ استاد نے اس وقت کہا جب میں اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔
’’مجھے کیوں بلوایا ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔
’’سودا فائنل تو آپ نے ہی کرانا ہے۔‘‘ استاد ابراہیم نے کہا۔
’’یعنی اب مجھے اپنی محبت کا سودا بھی کرنا ہوگا۔‘‘ میں نے سوچا۔
’’اچھا موقع ہے اس کام میں رخنہ ڈالنے کا۔‘‘ ذہن نے سرگوشی کی۔
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نانی سے بات کیسے کروں گا لیکن جب میں اوپر پہنچا تو وہاں وہی ڈی آئی جی موجود تھا جو چھوٹی خالہ کے ساتھ رات گزار چکا تھا۔ وہ کالا موٹا اور گنجا ڈی آئی جی نانی کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھا۔
نانی نے میرا تعارف کروایا۔ ’’یہ میرا نواسہ ہے حماد جو اب سرفراز کی جگہ کام کر رہا ہے۔‘‘ ڈی آئی جی نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں نانی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔
’’تین دن بعد میں اپنے آدمی بھیج دوں گا۔‘‘ ڈی آئی جی نے بات شروع کرنے والے انداز میں کہا۔
’’تین دن بعد نہیں کم از کم ایک ہفتے بعد۔‘‘ میں نے کہا اور نانی نے چونک کر مجھے دیکھا۔
’’میں سائرہ کے گھر سے ہی آرہا ہوں۔‘‘ میں نے نانی سے کہا۔
’’مگر یہ تو طے ہو چکا ہے۔‘‘ نانی نے کہا۔
’’آپ کی بات صحیح ہے۔‘‘ میں اتنا کہہ کر رک گیا۔
’’لیکن کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جو ناگزیر ہوتی ہیں۔‘‘ میں نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔
’’ایسی کیا مجبوری ہوگئی؟‘‘ نانی نے سوال کیا۔
’’وہی مجبوری جو ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔‘‘ میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا تھا۔
’’کل تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔‘‘ ڈی آئی جی نے کہا۔
’’وینیشن سے بہت کچھ بے وقت بھی ہو جاتا ہے۔‘‘ نانی نے کہا اور ڈی آئی جی کو ان کی بات ماننی پڑی۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدہ تاثرات ابھرے لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔
’’میں تو آج رقم ساتھ لایا تھا۔‘‘ ڈی آئی جی نے کہا۔
’’رقم آپ اس کے حوالے کر دیں۔‘‘ نانی نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
’’جب معاملہ ہفتے بھر کے لیے ملتوی ہو گیا تو رقم بھی تب ہی دوں گا۔‘‘ ڈی آئی جی نے کہا۔
’’دے دیجیے گا لیکن رقم میں ردوبدل ہو تو اعتراض مت کیجیے گا۔‘‘ میں نے کہا۔
’’مجبوری میری نہیں ہے۔‘‘ ڈی آئی جی نے اعتراض کرنے والے انداز میں کہا۔
’’بعض مجبوریاں ناگزیر ہوتی ہیں۔‘‘ میں نے کہا اور نانی نے حمایت میں گردن ہلا دی۔
’’میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ ڈی آئی جی نے کہا۔
’’خواہش آپ کی ہوگی تو دام ہمارے ہوں گے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’مجھے کوئی اعتراض نہیں۔‘‘ ڈی آئی جی نے ہتھیار ڈالے۔
’’اس کا مطلب ہے کہ پورا معاہدہ دوبارہ سے ہوگا۔‘‘ نانی نے کہا۔

pklibrary.com

"میں تیار ہوں۔" ڈی آئی جی نے کہا اور میں مطمئن ہو گیا۔

میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ مجھ سے پہلے ڈی آئی جی وہاں سے رخصت ہوا۔ نیچے آیا تو استاد ابراہیم نے کہا۔

"مجھے ابھی پیغام ملا ہے کہ صبح میں اکیلا نہ آؤں آپ کو ساتھ لاؤں۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پیغام کس نے بھیجا ہو گا۔ میرا ارادہ تھا کہ استاد ابراہیم سے اس پر بات کروں لیکن انہوں نے میرے کچھ کہنے سے قبل کہا۔

"سائرہ کا فون آیا تھا، اس نے آپ کو بلوایا ہے۔"

"کیوں، خیریت تو ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس نے بس اتنا کہا کہ حماد سے کہنا کہ جتنی جلدی ہو سکے مجھ سے مل لے۔"

"ابھی تو مل کر آیا ہوں اب ایسی کیا ایمرجنسی ہو گئی؟" میں نے کہہ تو دیا لیکن اس کے گھر کی جانب چل پڑا۔

"میں وہاں پہنچا تو سائرہ کی بڑی بہن کا مجرا چل رہا تھا اور سائرہ ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ وہیں ڈی آئی جی بھی بیٹھا تھا۔ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ڈی آئی جی نے ہی مجھے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سائرہ کے پاس سے اٹھا اور میں اس کی خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

"یہ تم نے اس سے کیا کہہ دیا؟" میرے بیٹھتے ہی سائرہ نے سرگوشی کی۔

"کچھ دن کا وقفہ چاہیے تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے تو بتا دیتے۔" سائرہ کے لہجے میں احتجاج کی رمق تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں اماں سے بات کر رہا تھا۔" سائرہ نے جواب میں کہا۔

"تمہیں بتایا نہیں تمہاری ماں نے؟" میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے صرف اتنا بتایا کہ اس نے رقم دگنی کرنے کے لیے کہا ہے۔" سائرہ نے جواب دیا۔

"پہلے کتنے میں سودا کیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"پہلے سودا پچیس لاکھ میں ہوا تھا جس پر میں نے اعتراض کیا تھا۔" سائرہ نے کہا۔

"تمہیں اعتراض کس پر تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"رقم اماں کے پاس جانی تھی اور اماں کا وعدہ تھا کہ مجھے پانچ لاکھ دیں گی باقی میں جتنا اس سے بٹور سکتی ہوں بٹور لوں۔" سائرہ کا جواب تھا۔

"پانچ لاکھ تو ذہنی کوفت کے بھی کم ہیں۔" میں نے اپنی رائے دی۔

"اماں سے میں نے یہی کہا تھا مگر ان کا جواب تھا لندن بھی تو لے جا رہا ہے وہاں شاپنگ بھی تو کروائے گا۔" سائرہ کا جواب تھا۔

"یعنی اب سودا پچاس لاکھ میں ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم کیسے مرد ہو ایک جانب محبت کا دعویٰ کر رہے ہو مجھے بھگانے کی بات کر رہے ہو اور دوسری جانب میرا سودا ہونے پر خوش ہو رہے ہو؟" سائرہ نے طنز کیا۔

"خوش نہیں ہو رہا۔" میں نے جواب میں کہا۔

"میں سمجھ رہی ہوں۔" سائرہ نے کہا۔

"یہ ذہن میں رکھنا کہ پکڑے گئے تو تمہاری نانی تمہارے ساتھ مجھے بھی قتل کروا دے گی۔" سائرہ نے کہا اور مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ نانی مجھے کسی صورت میں معاف نہیں کرے گی۔

ذہن نے سرگوشی کی کہ میں اپنی ماں یا چھوٹی خالہ کو بھی پلاننگ میں شریک کر لوں لیکن پھر اس خیال کو مسترد کر دیا۔ دونوں ہی قابلِ اعتماد نہیں تھیں۔ ماموں سرفراز والے کیس میں بھی دونوں نے ماموں سرفراز کے خلاف گواہی دی تھی ..... رات یہی سوچتے ہوئے گزاری کہ کس طرح پہلے محلے اور پھر پاکستان سے نکلنے کا راستہ اختیار کیا جائے۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے ڈونا کا بھی خیال آیا لیکن اس پر زیادہ غور نہیں کیا اور ماموں سرفراز سے مشورے کے بعد ہی کسی فیصلے پر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

میں رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ فجر کی اذان ہوئی تو میں نے بستر چھوڑ دیا۔ استاد ابراہیم ہمیشہ سے صبح خیز تھے۔ میں نے ان کے ساتھ فجر کے لیے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ ہنس دیے۔ "بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے رب سے رجوع کرنے کا فیصلہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن قصداً میں نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ مسجد سے واپس آ کر میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ رات بھر جاگنے سے مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میرے کچھ کہنے سے قبل استاد ابراہیم ناشتا لے آئے۔

"میں نے سوچا کہ اوپر سے ناشتا پتا نہیں کب آئے، میں ہی تمہارے لیے ناشتا لے آتا ہوں۔" استاد ابراہیم نے

کیا مست آئیڈیا ہے

ناشتا میز پر سجاتے ہوئے کہا۔
”ناشتا کرلیں پھر ہمیں آپ کے ماموں سے ملنے تھانے بھی جانا ہے۔“ استاد ابراہیم نے مجھ سے کہا اور میں نے ناشتے سے انصاف کرنا شروع کردیا۔

میں، استاد ابراہیم کے ساتھ تھانے پہنچا تو تھانے کے باہر ہی مجھے ڈی آئی جی کی کار نظر آگئی۔ یہ تو ہم سے بھی پہلے پہنچا ہوا ہے۔ اندر پہنچا تو ایس ایچ او کے کمرے میں ماموں سرفراز کے آگے میز لگی ہوئی تھی اور میز پر پائے کا ناشتا سجا ہوا تھا۔ ماموں سرفراز نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”آؤ تم بھی شریک ہوجاؤ۔“ لیکن میں نے معذرت کرلی۔

”میں حلوہ پوری کا ناشتا کر کے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”حماد صاحب رات بھر جاگتے رہے تھے پھر فجر کی نماز انہوں نے میرے ساتھ ہی پڑھی تھی۔“ استاد ابراہیم نے درمیان سے بات اچک لی تھی۔

میری جانب سے معذرت ہوئی تو ڈی آئی جی نے ماموں سرفراز کا ساتھ دینا شروع کردیا۔ کیا عجیب نظارہ تھا۔ قانون کا محافظ ایک قاتل کے ساتھ ناشتا کررہا تھا۔ ناشتے کے بعد انہوں نے چائے پی جس میں استاد ابراہیم اور میں بھی شریک ہوئے — اس کے بعد ڈی آئی جی چلا گیا کہ مجھے عدالت میں حاضر ہونا ہے۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ ماموں سرفراز نے مجھ سے سوال کیا لیکن اس سے پہلے وہ مجھے اور استاد ابراہیم کو لے کر ایس ایچ او کے ریسٹ روم میں آچکے تھے۔

”میں سائرہ سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سلیس زبان میں کہا۔

”تو پریشانی کیا ہے؟“ ماموں سرفراز نے سوال کیا۔

”پریشانی یہ کالا موٹا ہے جس نے سائرہ کا سودا کرلیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو اس کو اوپر بھیج دیتے ہیں۔“ ماموں نے اس طرح کہا تھا جیسے کوئی مچھر مارنے کی بات کررہے ہوں۔

”میں سائرہ سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنا فقرہ دہرایا لیکن اس بار میں نے شادی پر زور دیا تھا۔

”ایک طوائف زادی سے شادی کے لیے اتنی بے چینی اپنی سمجھ میں تو نہیں آرہی۔“ ماموں سرفراز کے فقرے

نے میری امیدوں پر ایک طرح سے پانی پھیر دیا تھا۔
''دوسری صورت یہ ہوگی کہ میں سائرہ کو قتل کر کے خودکشی کرلوں۔'' میں نے کہا۔
''تو معاملات یہاں تک بڑھ چکے ہیں۔'' ماموں سرفراز نے سوال کیا۔
''جی ہاں۔''
''مگر تم جاؤ گے کہاں؟'' ماموں نے سوال کیا۔
''میرا ارادہ سائرہ کو لے کر کینیڈا جانے کا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''ویزا ہے تمہارے پاس؟'' ماموں نے سوال کیا اور میری گردن نفی میں ہل گئی۔
''ویزا... نہیں ہے پاسپورٹ تو ہوگا؟'' ماموں سرفراز کا سوال تھا اور میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔
''تمہارے پاس تو ہے سائرہ کے پاس بھی ہوگا۔'' ماموں کا ایک اور سوال تھا۔
''آج مل جائے گا اس کا پاسپورٹ بھی۔'' میں نے کہا۔
''یہ بات تو ڈی آئی جی بھی بتا چکا ہے۔'' ماموں نے کہا۔
''اس نے پاسپورٹ بنوایا ہے تو وہ تو جانتا ہی ہوگا۔'' میں نے کہا اور ماموں مسکرا دیے۔
''وہ آیا تھا کہ اس کا اور سائرہ کا ویزا لگوا دوں۔'' ماموں نے کہا۔
''اتنے بڑے عہدے پر ہو کر وہ برطانیہ کا ویزا نہیں لگوا سکتا۔'' میں نے کہا۔
''وہ جو بھی کام کرتا ہے، قانونی طریقے سے کرتا ہے۔'' ماموں کا جواب تھا۔
''تو آپ کینیڈا کا ویزا ابھی لگوا سکتے ہیں؟'' میں نے کہا اور ماموں کی گردن ہاں میں ہل گئی۔
''کتنے دن میں؟'' میں نے سوال کیا اور ماموں نے چٹکی بجائی۔ ''ایسے۔'' ماموں نے چٹکی بجاتے ہی کہا تھا۔
''بات یوں ہے کہ کینیڈا کا امیگریشن کا وزیر ایک سابق منشیات فروش ہے۔ اس کا تعلق زمبابوے سے ہے اور میری اس سے دوستی ہے۔'' ماموں نے فخریہ انداز میں کہا۔
''پھر ڈائل کریں اس کا نمبر۔'' میں نے فرمائش کی۔
''ابھی تو وہاں رات ہوگی۔ دس گھنٹوں کا فرق ہے ہمارے اور ان کے وقت میں۔'' ماموں نے کہا۔ ''لیکن فکر

نہ کرو تم دونوں کے ویزے آج ہی لگ جائیں گے۔'' ماموں سرفراز اطمینان سے بول رہے تھے۔
''ویزا فیس؟'' میں نے سوال کر دیا۔
''وہی دے گا جس کے پاس حرام کا پیسا ہے۔'' ماموں سرفراز نے کہا۔
''فیس بھی وہی دے گا اور ٹکٹ بھی وہی دے گا۔'' ماموں سرفراز نے اپنی بات مکمل کی۔
''اب جو بات میں کہنے والا ہوں اسے غور سے سننا۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' ماموں سرفراز نے کہا اور میں پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔
''جانتا ہوں کہ غلطی ہوئی تو گولی میرا مقدر ہوگی۔'' میں نے کہا۔
''اور گولی مارنے کا حکم دینے والی میری ماں اور تمہاری نانی ہوگی۔''
''اور گولی مارنے والے آپ ہوں گے۔'' استاد ابراہیم نے کہا۔
''ڈی آئی جی اپنے بندے بھیجے گا جو سائرہ کو لے کر اس کی کوٹھی پر جائیں گے۔'' ماموں نے کہنا شروع کیا۔ ''تم سائرہ کے ساتھ نہیں جاؤ گے۔'' ماموں نے مجھ سے کہا۔ ''جب وہ اس کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچیں گے تو وہاں میرے آدمی پہلے سے موجود ہوں گے۔'' ماموں کہہ رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔
''میرے آدمی سائرہ کو اُن سے چھین کر فرار ہو جائیں گے اور ایک مقررہ مقام پر وہ سائرہ کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔''
''ڈی آئی جی تو پورے شہر کی پولیس کو الرٹ کر دے گا۔'' استاد ابراہیم بولے۔
''پہلی بات تو یہ کہ وہ کیا کہہ کر پولیس کو الرٹ کرے گا؟'' ماموں سرفراز نے کہا۔
''کچھ بھی کہہ کر الرٹ کر سکتا ہے۔ اس نے یہ تو نہیں بتانا کہ جسے وہ داشتہ بنانے لایا تھا، اسے کچھ بدمعاش اغوا کر کے لے گئے ہیں۔'' میں نے کہا اور ماموں سرفراز نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا۔
''وہ کوئی بھی بہانہ بنا کر ایف آئی آر کٹوا سکتا ہے، پولیس کی جیب میں ہر وقت سو پچاس جعلی مدعی ہوتے ہیں۔'' ماموں نے کہا۔
''میں سائرہ کو لے کر کہاں جاؤں گا؟'' میں نے کہا۔
''گاڑی چوری کی ہوگی اور خلیل اسے چلائے گا۔''

ماموں سرفراز نے ہدایات آگے بڑھائیں اور میں نے یوں گردن ہلائی جیسے سب سمجھ رہا ہوں۔

''ہفتہ بھر بعد بھی تم اور سائرہ کراچی ائرپورٹ سے سوار نہیں ہوسکتے۔'' ماموں نے کہا۔

''پھر کہاں سے نکلیں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسلام آباد ائرپورٹ سے میں تمہیں سوار کروا سکتا ہوں، وہاں میرا ایک دوست ایف آئی اے میں ہے، وہ یہ کام کرے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ سائرہ کے ساتھ کوئی لڑکی اور ہو۔'' ماموں نے کہا۔

''ہوجائے گی۔'' میں نے کہا اور استاد ابراہیم حیرت سے مجھے دیکھنے لگے لیکن میں نے ڈونا کا نام انہیں کیا ماموں کو بھی نہیں بتایا۔

''اسلام آباد تک وہ بائی روڈ جائیں گے۔'' ماموں سرفراز نے کہا۔

تھانے سے نکل کر میں سیدھا ڈونا کے گھر پہنچا تھا۔ تھرڈ فلور کے اس کے فلیٹ کی بیل بجائی تو سنتھیا نے دروازہ کھولا۔ ''آپ!'' اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی تھی۔

''کیوں میں نہیں آسکتا؟'' میں نے سوال کر دیا۔

''تم میں سے کس کی مجال کہ آپ کو آنے سے روکے۔'' سنتھیا کا جواب تھا۔

''ڈونا کہاں ہے؟'' میں نے اسی کے بارے میں پوچھا جس سے کام تھا مگر اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

''ڈونا اس وقت سکھر میں ہوگی۔'' سنتھیا کا جواب تھا۔

''کب تک واپسی ہوگی؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''پانچ دن کا کہہ کر گئی تھی بلکہ آج صبح ہی نکلی ہے۔'' سنتھیا نے کہا اور مجھے خاموش ہوجانا پڑا۔

''کوئی کام تھا؟'' سنتھیا نے سوال کیا۔

''بہت ضروری کام تھا۔'' میں نے کہا اور اب خاموش ہونے کی باری سنتھیا کی تھی۔

''کوئی ایسا کام جو صرف ڈونا ہی کرسکتی ہے؟'' اس نے عجیب سا سوال کیا۔

''کرتو تم بھی سکتی ہو لیکن اس میں خطرات بہت ہیں اس لیے ڈونا ہی بہتر رہے گی۔'' میں نے کہا۔

''جو کچھ کہنا ہے وہ اندر آکر کہو۔'' سنتھیا نے کہا اور میں اس کے پیچھے چلتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوگیا۔ ٹیرس پر دھوپ تھی اس لیے وہ مجھے بیڈروم میں لے گئی۔

روم میں ایک ڈبل بیڈ تھا جس پر اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔ ''میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔''

مجھے زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا وہ ایک ٹرے میں دو کپ چائے لائی تھی اور اس کے ساتھ ہی کچھ لوازمات بھی تھے مگر میں نے چائے اٹھالی جبکہ وہ بیڈ کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی۔

''اب بتاؤ کہ کیا کام ہے؟'' سنتھیا نے کہا۔

''کینیڈا جانا ہے۔'' میں نے بغیر تمہید کے بات شروع کی۔

''اس کے جواب میں کیا دینا ہوگا؟'' سنتھیا کا سوال تھا۔

''نہ تم ڈونا ہو اور نہ میں ذیشان۔'' میں نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کینیڈا میرے لیے اتنا اہم نہیں ہے کہ اس کے لیے میں سب کچھ داؤ پر لگادوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا اور واقعی میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

''میرے پاس چار برس سے کینیڈا کا ویزا ہے جو اب تو ختم ہی ہونے والا ہے مگر میں اب تک نہیں گئی۔''

''کوئی خاص وجہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرا ویزا لاٹری میں نکلا تھا مگر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ وہاں جاکر رہوں گی کہاں، کروں گی کیا؟'' اس نے کہا اور میں ان دونوں بہنوں کے تضاد پر غور کرنے لگا۔

''تم نے اپنا ویزا ڈونا کو کیوں نہیں دیا۔'' میں نے سوال کیا۔

''نان ٹرانسفر ویزا ہے بلکہ امیگریشن ہے جسے میں کسی دوسرے کے نام پر منتقل نہیں کرسکتی۔'' ''اب تم بتاؤ تمہاری کیا کہانی ہے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''میری کہانی لمبی ہے۔'' میں نے کہا اور رک گیا۔

''ڈونا کے آنے تک تو مکمل ہوجائے گی۔'' اس کا سوال تھا۔

''بالکل ہوجائے گی مگر شرط یہ ہے کہ تم ادھوری کہانی میں بور ہوکر نہ چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''نہیں جاؤں گی، تم شروع تو کرو۔''

کہانی شروع کرنے سے پہلے میں نے اپنا اور اپنے

pklibrary.com

محلے کا تعارف کروایا اور پھر سائرہ کا تعارف کروایا۔ ''یعنی وہ بھی تمہاری طرح طوائف زادی ہی ہے۔'' سنتھیا نے دخل دیا لیکن میں صرف منہ بنا کر رہ گیا۔

میں اپنی داستان سناتا رہا اور سنتھیا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس دوران اس نے کوئی سوال نہیں کیا لیکن جب میں اپنی کہانی مکمل کر چکا تو وہ بولی۔

''تم اس طرح کے لگتے تو نہیں ہو لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ تم ایک نیک کام کرنے جا رہے ہو۔'' سنتھیا نے کہا۔

''اس نیک کام میں تم بھی اپنا حصہ ڈال سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میرا کام تو مجھے صرف اتنا سمجھ میں آیا ہے کہ میں اس کے ساتھ بائی روڈ اسلام آباد جاؤں اور وہاں سے کینیڈا پہنچ جاؤں۔''

''کینیڈا پہنچنے کے بعد تمہاری ذمے داری میری ہو گی۔'' میں نے کہا مگر اس نے کندھے اچکا دیے۔

''میں نے ہمیشہ اپنے اخراجات خود برداشت کیے ہیں۔ میں کبھی کسی کی محتاج نہیں رہی۔''

''اپنے اخراجات تم خود ہی اٹھاؤ گی۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے کچھ نہ سمجھی ہو۔

''میں وہاں کاروبار شروع کروں گا، تم اس میں میری شریک ہو گی۔'' میں نے وضاحت کی اور وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔

''کاروبار کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟'' اس نے سوال کیا۔

''ماموں سرفراز کا ایک دوست وہاں وزیر ہے، وہ رقم مہیا کرے گا۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں کوئی چھوٹی سی نوکری کر کے اپنا گزارہ کر لوں۔'' اس نے بات آگے بڑھائی۔

''کسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے کاؤنٹر پر یا کیش کاؤنٹر پر۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''یہاں میں بینک میں ہوں، یہ تجربہ بھی کام تو آئے گا؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے ''ہاں'' میں گردن ہلا دی۔

''میں شام کے قریب ڈونا کے گھر سے نکل آیا لیکن ابھی میں راستے میں ہی تھا کہ چھوٹی خالہ سے نانی نے فون کروایا۔

''کہاں ہے صبح سے تو؟'' نانی نے فون ہاتھ میں لیتے ہی کہا تھا۔

''صبح ماموں سرفراز سے ملنے گیا تھا۔ وہاں سے اس وکیل کے پاس گیا جو ڈی آئی جی نے بتایا تھا۔'' میں نے سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہوئے کہا اور نانی مطمئن ہو گئیں۔

''تو ہی یہ بھاگ دوڑ کر سکتا ہے۔'' نانی نے کہا۔

''تھانے والوں کا رویّہ کیسا ہے سرفراز کے ساتھ؟'' نانی نے ایک اور سوال کر دیا۔

''چھوٹی خالہ کی وجہ سے ڈی آئی جی ان پر مہربان ہے تو ایس ایچ او کی کیا مجال کہ وہ کوئی بدتمیزی کرے۔'' میں نے کہا۔

''کب تک پہنچ رہے ہو؟'' نانی نے سوال کیا۔

''راستے میں ہوں بس پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''ڈی آئی جی صاحب آئے ہوئے ہیں۔'' نانی نے اطلاع دی۔

''بہتر ہے میں کچھ دیر سے پہنچوں۔'' میں نے سوچا۔ میرا ڈی آئی جی کا سامنا کرنے کا موڈ نہیں تھا مبادا کسی سوال کا جواب غلط نہ نکل جائے اور میرا جھوٹ پکڑا جائے۔

میں نے پہلے سوچا کہ استاد ابراہیم سے کہوں کہ اوپر جا کر نانی اور ڈی آئی جی کی باتیں سن کر مجھے بتائے لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ جو خطرہ میرے لیے تھا وہی استاد کے لیے بھی تھا بلکہ اگر استاد ابراہیم کا جھوٹ پکڑا جاتا تو نتیجہ مجھے بھگتنا پڑتا۔ میں گھر پہنچا تو ڈی آئی جی جا چکا تھا لیکن وہیں مجھے پیغام ملا کہ سائرہ مجھے بلا رہی ہے۔ پیغام دینے والے استاد ابراہیم تھے۔

''کیا کام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈی آئی جی اسے رقم دے گیا ہے تاکہ وہ رسم والے دن کے کپڑے بنوا لے۔'' استاد ابراہیم نے کہا۔

''بہتر ہوتا کہ وہ اپنی ماں اور بہن کو لے جاتی۔'' میں نے کہا اور استاد ابراہیم ہنس دیے۔

''ہر بیوی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس موقع کے لیے اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ شاپنگ کرے۔'' استاد ابراہیم نے تصحیح کی۔

میں سائرہ کے گھر پہنچا تو وہ تیار تھی۔

''کب سے انتظار کر رہی ہوں۔'' سائرہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''کیا میں نے آنے کا وعدہ کیا تھا؟'' میں نے کار کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''ابھی سے تمہارا یہ حال ہے تو غیر ملک میں کیا کرو گے؟'' سائرہ نے کہا۔

''ابھی سے بیوی بن رہی ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور سائرہ بھی ہنس دی۔

''یہ خواب بھی تم نے ہی دکھائے ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

''مجھے وہاں انگریزی میں مشکل پیش آئے گی۔'' سائرہ نے کہا۔

''مجھے شاید نہ آئے۔'' میں نے کہا۔

ہم یہ باتیں کرتے ہوئے شاپنگ مال میں گھس گئے اور سائرہ شاپنگ میں مصروف ہو گئی۔

شاپنگ کے دوران میں نے اسے پورا پلان بتایا۔ وہی پروگرام جو صبح پہلے ماموں سرفراز اور پھر ڈونا کی بہن کے ساتھ بنایا تھا۔

''یعنی تم نے ایک ساتھ دو شادیاں کرنے کا پروگرام بنالیا ہے۔'' میں نے اپنی بات ختم کی تو سائرہ نے تبصرہ کیا۔

''میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں۔'' میں نے کہا۔

''بہتر ہے کہ نہ ہو ورنہ میں اپنے آپ کو خود بیوہ کر لوں گی۔'' سائرہ کا جواب تھا۔

''اپنے سرٹیفکیٹ کل صبح ہی استاد ابراہیم کو پہنچا دینا۔'' میں نے کہا۔

''اور پاسپورٹ؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہ بھی پہنچا دینا تاکہ میں ماموں سرفراز کو پہنچا دوں۔'' میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو ایسی جلدی کر رہے ہو جیسے کل ہی روانہ ہونا ہے۔''

''ابھی کچھ دن ہیں لیکن کوئی بھی سرٹیفکیٹ وقت پر بھول گئے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''ہم شاپنگ کے بعد گھر آئے اور سائرہ نے نانی کے سامنے کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا۔ نانی نے پہلے سے درزی بلوا لیا تھا۔ نانی نے قیمتیں معلوم کیں اور میں نے ڈیڑھ گنی زیادہ رقم بتائی اور نانی کا منہ بنتا رہا۔ ''بہت مہنگی شاپنگ کی ہے۔'' انہوں نے تبصرہ کیا۔

''کون سا اس نے اپنی جیب سے خرچ کیا ہے۔'' میں نے ان کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس کی کمائی رشوت کی کمائی ہے؟'' نانی نے کہا۔

''تو اس میں غلط کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''صاحب جی دوسروں پر الزام لگانے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تمہاری اپنی آمدنی کون سی حلال کی ہے؟'' نانی نے کہا اور میں بغیر کسی وجہ کے شرمندہ ہونے لگا۔

اس کے بعد کا ایک گھنٹا سائرہ درزی کو ڈیزائن سمجھاتی رہی۔

''دو دن میں تیار ہو جانے چاہئیں۔'' نانی نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

''رسم ہے کب؟'' درزی نے سوال کیا۔

''چار دن بعد ہے رسم۔'' نانی نے کہا۔

رسم میں سو سے کم گھنٹے رہ گئے تھے۔ درزی نے سائرہ کے جوڑے تیار کر لیے تھے۔ سرخ جوڑا ان سب میں بہتر سلا تھا۔ رسم سے ایک دن پہلے ڈی آئی جی آیا اور اس نے نانی کو طے شدہ پچیس لاکھ روپے دیے اور نانی نے وہ میرے حوالے کر دیے۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کینیڈا سے ویزا کے ساتھ ٹکٹ بھی آ گئے تھے۔ بھیجنے والا کینیڈا کا منسٹر عمر تھا۔

رسم والے دن سائرہ نے سرخ جوڑا ہی پہنا تھا، اس میں وہ حور سے کم نہیں لگ رہی تھی پھر رسم کا موقع آیا ڈی آئی جی نہیں آیا تھا لیکن ایک ڈبل کیبن جیپ میں اس کے لوگ آ چکے تھے پھر وہ موقع بھی آیا کہ ڈی آئی جی کے لوگوں نے سائرہ کو گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا لیکن میں منتظر تھا اس فون کا جو سنتھیا نے کرنا تھا جب سائرہ اس کے پاس پہنچ جاتی۔ خلیل پہلے ہی ڈونا کے گھر پہنچ چکا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں۔ وقت گزاری کے لیے میں نانی کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ میری سب سے مضبوط گواہ بن سکتی تھیں کہ جب سائرہ کو ڈی آئی جی کے گیٹ سے اغوا کیا گیا تو میں وہیں موجود تھا۔ میں سنتھیا کے فون کا منتظر تھا لیکن فون خلیل نے کیا۔ ''سب ٹھیک ہے۔'' اس نے صرف اتنا کہا اور فون بند کر دیا۔

ابھی مجھے وہیں رکنا تھا کیونکہ توقع یہی تھی کہ تھوڑی دیر میں پولیس وہاں پہنچ جائے گی۔ ''میں استاد ابراہیم کے پاس بیٹھا وقت گزار رہا تھا بلکہ پولیس کا انتظار کر رہا تھا کہ ڈی آئی جی کا چہرہ نظر آیا، اس کے پیچھے پولیس کی ایک بڑی

نفری تھی؛ ڈی آئی جی ہماری سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی نفری سائرہ کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

میں اس کے پیچھے اوپر پہنچا تو نانی کی آواز کانوں میں آئی۔ ''یہ تو قیامت کی نشانی ہے کہ طوائفیں بھی اغوا ہو رہی ہیں۔''

''اسے تھانے لے چلو۔'' ڈی آئی جی نے میری جانب اشارہ کیا۔

''مگر ڈی آئی جی صاحب یہ تو سائرہ کی رخصتی کے بعد سے یہیں ہے میری نظروں کے سامنے۔'' نانی نے کہا۔

''طوائفوں کی گواہی پر کون اعتبار کرتا ہے۔'' ڈی آئی جی غصے سے کانپتی آواز میں بولا تھا۔

''طوائف کی گواہی نہ مانیں لیکن آپ کے گھر کے باہر جو کیمرے لگے ہیں، ان سے جو فلمیں بنی ہیں ان کی گواہی تو مانو گے۔'' میں نے کہا اور ڈی آئی جی کچھ دیر بغلیں جھانکتا رہا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ کیمرے لگے ہیں اور ان سے فلمیں بنی ہیں؟''

''کچھ دن قبل جب میں چھوٹی خالہ کو چھوڑنے آیا تھا تو میں نے کیمرے دیکھے تھے اور کیمروں کی موجودگی کا مطلب یہ ہوا کہ فلم بھی بنی ہوگی۔'' میں نے ایک [illegible] لیکن ڈی آئی جی کے ساتھ کھڑے سپاہی نے پوری قوت سے تھپڑ مارا۔ ''فلسفہ بولتا ہے۔'' اس نے تھپڑ مارنے کے ساتھ ہی کہا تھا۔

''مجھے تھپڑ پڑنا تھا کہ نانی شیرنی کی طرح آگے بڑھی تھیں اس کے ساتھ ہی میری والدہ نے ماموں کا ریوالور نکال لیا اور ڈی آئی جی پر تان لیا۔ میں غیر متوقع طور پر تھپڑ کھانے کے بعد وہیں زمین پر گر گیا تھا لیکن جیسے ہی صورتِ حال تبدیل ہوئی تو میں وہیں پڑا رہا تھا۔ میری والدہ اور دونوں خالائیں مجھ پر جھک گئی تھیں جیسے وہ مجھے مزید پٹنے سے بچانا چاہتی ہوں۔

''پولیس نے ایک بار پہلے بھی کوشش کی تھی اسے گرفتار کرنے کی مگر یہ جب بھی معصوم تھا اور اب بھی جرم کسی اور نے کیا ہے اور آپ کا نشانہ یہ معصوم بچہ ہے۔'' نانی دہاڑی تھیں۔

''یہ بچہ نہیں بہت کمینہ ہے۔'' ڈی آئی جی اب بھی غصے سے کانپ رہا تھا اس کے پچیس لاکھ تو ڈوبے ہی تھے وہ خواب جو اس نے سائرہ کے ساتھ گزارنے کے دیکھے تھے وہ خواب بھی ادھورے رہ گئے تھے۔

''ہم نے تمہارے حوالے لڑکی کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ ہم نے کر دی اب تم اس کی حفاظت نہ کر سکے تو ہم قصوروار کہاں سے ہو گئے؟''

''لڑکی تو میں برآمد کر ہی لوں گا لیکن مجھے پچیس لاکھ واپس چاہئیں۔'' ڈی آئی جی کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''دھمکی دینے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ آپ عدالت میں کیا کہیں گے کہ کس بات کے پچیس لاکھ دیے تھے؟'' میں نے کہا اور ڈی آئی جی کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

''بڑا وکیل بنا پھر رہا ہے؟'' ڈی آئی جی کا مخاطب میں تھا۔

''مل جائے گی تجھے تیری رقم۔'' نانی نے کہا۔

''آپ نے اسے رقم واپس کی تو یہ اغوا کا کیس بھی آپ پر بنا دے گا۔'' میں نے نانی سے کہا۔ ''بہتر ہوتا کہ آپ ماموں سرفراز کو بلوا لیتیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''صحیح کہہ رہے ہو تم۔'' نانی نے مجھ سے اتفاق کیا۔

''وہ دہرے قتل کا ملزم ہے۔'' ڈی آئی جی نے رخنہ ڈالنے والے انداز میں کہا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے یاد دلاتا کہ وہ ماموں کے [illegible] ہے۔ ڈی آئی جی نے ساتھ کھڑے سپاہی سے کہا۔ ''میری ایس ایچ او سے بات کراؤ۔''

اس کے بعد ماموں کے آنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ ایس ایچ او انہیں ہتھکڑیوں میں لے کر آ گیا تھا۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟'' ماموں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''جو لڑکی میرے بندے یہاں سے لے کر گئے تھے، اسے کچھ لوگ میرے گھر کے گیٹ سے اٹھا کر لے گئے۔''

''اس گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا آپ لوگوں نے؟'' ماموں نے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔

''نمبر تو نوٹ کر لیے تھے لیکن وہ گاڑی چوری کی تھی۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''پھر تو آپ کو ملزم اپنی صفوں میں تلاش کرنا چاہیے۔'' ماموں نے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ڈی آئی جی نے بھڑکتے ہوئے انداز میں کہا۔

''جب آپ نے دس پندرہ منٹ میں یہ معلوم کر لیا کہ گاڑی چوری کی تھی تو یہ معلوم کرنے میں بھی آپ کو دیر

pklibrary.com

افشاں آفریدی اور **نایاب جیلانی** کے متاثر کن قسط وار ناول ایک نئے موڑ پر

سعدیہ رئیس کا منی ناول **میں انمول** کا خوب صورت اختتام

عورت کہانی میں پڑھیے **فرحین اظفر** کے قلم کا ایک دلکش شاہکار

روحیلہ خان کے انوکھے ناولٹ **بوجھ** کا اختتامی حصہ

شیریں حیدر کی خصوصی کاوش **وہ ہجر جو ہم پر لازم تھا** کی صورت

نگہت سیما کے ماہرانہ انداز بیاں سے مرصع مکمل ناول **میں اور فارہ**

معروف اسکالر **اختر شجاعت** کی **زہد و تقویٰ** پر روح پرور تحریر

شائستہ زریں کی محنت اور لگن کا آئینہ دار سروے **کورونا وائرس** خدشات و توقعات

اس کے علاوہ

سالِ نو کی مناسبت سے دل پزیر افسانے...... تحریر نگاروں میں **روبینہ یوسف**، **قرۃ العین سکندر**، **تسلیم شیخ** و دوسرے شامل ہیں

آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعر و شاعری، خوش ذائقہ، حسن نکھاریے، معلومات سے پُر تراشے اور گوشۂ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے......

pklibrary.com

نہیں لگے گی کہ اتنا باہمت کون ہوسکتا ہے جو ڈی آئی جی کے گیٹ سے ڈی آئی جی کی پسندیدہ لڑکی کو اغوا کر لے۔'' ماموں نے کہا۔

''یہ تم نے کیا کہا تھا کہ ہمیں اپنی صفوں میں تلاش کرنا چاہیے۔'' ڈی آئی جی نے ماموں سے سوال کیا۔

''ایک عام آدمی تو ڈی آئی جی کے گھر کے سامنے سے سر جھکا کر گزرتے ہوئے بھی خوف زدہ ہوتا ہے چہ جائیکہ کہ وہ رائفلوں کے ساتھ آئے اور آپ کی پسندیدہ لڑکی جس کے لیے آپ نے لاکھوں دیے ہوں اسے اغوا کر کے لے جائے......'' ماموں کہتے ہوئے رک گئے تھے جیسے انہوں نے وقفہ دیا ہو۔

''میری بات آج نوٹ کر لیں کہ یہ مخبری کا کیس ہے۔'' ماموں نے فقرہ مکمل کیا۔

''اب تم مختلف بات کر رہے ہو۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ سائرہ یہاں سے نکلی ہے اور اتنی دیر میں آپ کے گھر تک پہنچی؟'' ماموں نے کہا اور ڈی آئی جی سوچ میں پڑ گیا لیکن جب بولا تو اس کا انداز مختلف تھا۔

''جو فلم کیمرے نے بنائی، اس کے مطابق وہ چار افراد تھے اور وہ ہماری گاڑی کے پہنچنے سے پہلے ایک ٹھیلے کے ساتھ وہاں موجود تھے جیسے ہی ہماری گاڑی وہاں پہنچی، انہوں نے ٹھیلے سے رائفلیں نکالیں اور سیدھے اس طرف لپکے تھے جہاں وہ لڑکی موجود تھی اور اسے ہاتھ سے کھینچ کر دوسری گاڑی میں سوار کیا اور وہ بھی آرام سے بیٹھ گئی۔''

''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ سائرہ بھی اُن سے ملی ہوئی تھی؟'' ماموں نے سوال کیا اور ڈی آئی جی نے ایک مختصر وقفے کے بعد جواب دیا۔ ''کیمرا تو یہی بتا رہا ہے۔''

''اگر سائرہ اس میں شامل تھی تو آپ اسے اغوا نہیں کہہ سکتے۔'' ماموں سرفراز نے دلیل دی۔

''اس کا مطلب کیا میں یہ سمجھوں کہ سائرہ شہر سے باہر نہیں گئی۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''یہ ایک پولیس والا ہی اس نظریے سے سوچ سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' ڈی آئی جی نے سوال کیا۔

''اغوا ہونے والی ہمیشہ مزاحمت کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر سائرہ نے مزاحمت نہیں کی تو وہ اغوا کرنے والوں کے ساتھ شامل تھی۔'' میں نے کہا۔

''وہ گاڑی جس میں وہ بٹھائی گئی تھی وہ بھی غلط تاثر دینے کے لیے استعمال ہوئی تھی۔'' ماموں نے بات آگے بڑھائی۔

''تاثر تو یہی ملتا ہے کہ وہ جلد سے جلد شہر چھوڑنا چاہتے تھے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ ڈی آئی جی کا موبائل بج گیا۔ ''ہاں یہی نمبر ہے۔'' ڈی آئی جی نے سننے کے بعد کہا۔

''گاڑی مل گئی؟'' ماموں نے سوال کیا۔

''اس علاقے میں گشت تیز کر دو۔'' ڈی آئی جی نے فون پر حکم دیا۔

''گاڑی ملی کہاں سے؟'' ماموں نے سوال کیا۔

''جیکب لائنز کا تھانہ ہے جہاں سے وہ چوری ہونے والی کار ملی ہے۔'' ڈی آئی جی نے جواب دیا۔

''عادی مجرم لگتے ہیں۔'' ماموں نے تبصرہ کیا۔

''کیسے کہہ سکتے ہو؟'' ڈی آئی جی کا سوال تھا۔

''چھوٹی گلیوں میں کار تلاش کرنا آسان نہیں ہے تو مجرم کیسے تلاش ہوں گے۔''

''کار تو نمائش پر سے ملی ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''اس سے تو اس شبہے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ ملزم پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کی شعوری کوشش کر رہے ہیں۔'' ماموں نے کہا۔

''تم ہر زاویے سے مجرموں کی بڑائی ہی نکال لیتے ہو۔'' ڈی آئی جی نے کہا اور ماموں مسکرا دیے۔

''آپ پولیس والوں کی بڑائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ماموں کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

''تم دیکھ لینا کہ وہ کتنے بھی چالاک بن جائیں، قانون کے ہاتھ ان تک پہنچ ہی جائیں گے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

میں نے دل میں کہا۔ ''اللہ نہ کرے۔'' مگر زبان سے یہی کہا۔ ''ایسا ہی ہوگا۔''

ماموں میرے اس فقرے پر کچھ بوکھلا گئے لیکن انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ڈی آئی جی کا... موبائل ایک بار پھر بول پڑا تھا، اس نے کچھ دیر سننے کے بعد کہا۔ ''نشتر پارک کے علاقے سے ایک نئی کار چوری ہوئی ہے۔''

''کار کا نمبر۔'' ماموں نے سوال کیا۔
''تم نے سنا نہیں، میں نے کہا نئی کار چوری ہوئی ہے۔ یعنی وہ رجسٹرڈ بھی نہیں تھی۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔
''یہ نشتر پارک نمائش کے پاس ہی ہے نا؟'' ماموں نے کہا اور ڈی آئی جی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
''یعنی جہاں انہوں نے پرانی چوری شدہ کار چھوڑی وہیں سے نئی کار لے اُڑے۔'' ماموں نے کہا۔
''اپلائیڈ فار رجسٹریشن پر وہ کوئی سی بھی نمبر پلیٹ لگا کر آسانی سے نکل جائیں گے۔'' میں نے کہا اور ڈی آئی جی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔
ڈی آئی جی نے وائرلیس پر پیغام نشر کروایا کہ ایک نئی کار میں ایک لڑکی فرار ہوئی ہے جو دلہن کے جوڑے میں ہے۔ میں یہ سوچنے لگا کہ پلان کے مطابق تو سائرہ کو ڈونا کے گھر کپڑے تبدیل کرنا تھے اور ڈونا کی بہن کو ساتھ لینا تھا۔ میں نے ماموں کی طرف دیکھا، وہ بھی شاید یہی سوچ رہے تھے کیونکہ جونہی ہماری نظریں ملیں، وہ مسکرا دیے تھے۔
ڈی آئی جی نے مجھ پر پابندی لگا دی تھی کہ میں شہر تب تک نہیں چھوڑوں گا جب تک وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔ تین روز اسی میں گزر گئے۔ پولیس صرف چھاپے مارتی رہی اور اخبار کے اول صفحے پر سائرہ کے اغوا اور پولیس کی ناکامیوں کی داستانیں چھپتی رہیں۔ پانچویں روز میں ڈی آئی جی کے پاس گیا۔
ماموں سرفراز بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے ہی بات شروع کی۔ ''سر جی اس بچے کو کیوں روکا ہوا ہے؟'' ماموں نے کہا لیکن ڈی آئی جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ اطلاع مجھے خلیل کے فون سے مل گئی تھی کہ وہ تینوں پنڈی پہنچ گئے ہیں اور اب وہ خلیل کے گھر پر ہیں۔
جس روز ماموں نے میری وکالت کی تھی، اس کے اگلے روز میں ایک بار پھر تھانے پہنچا تو ڈی آئی جی نے کہا۔
''تجھے کہاں جانا ہے؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔
''سر میں بغیر بتائے بھی جا سکتا تھا لیکن میں نے آپ کا حکم مانا۔'' میرے لہجے میں کچھ بغاوت محسوس کی گئی تو ڈی آئی جی نے کہا۔ ''جہاں بھی جاؤ مجھے روزانہ بارہ بجے فون کر کے بتانا کہ تم کہاں ہو۔''
''دن کے بارہ بجے یا رات کے بارہ بجے۔'' میں نے سوال کر دیا۔
''دن میں تو ہم مصروف ہوتے ہیں۔ تقریباً روز ہی عدالت میں پیشی ہوتی ہے۔''
''ٹھیک ہے جناب۔''
اسی روز میں نے کراچی چھوڑ دیا۔ اسلام آباد ائرپورٹ پر اترتے ہی میں نے سنتھیا کو فون کیا اور اپنی آمد کی اطلاع دی۔ خلیل نے بتایا کہ رات دس بجے کی ہماری فلائٹ ہے۔ اس وقت سات بج رہے تھے۔ میں نے وہیں ائرپورٹ پر قیام کیا۔
''نو بجے کے قریب خلیل کے ساتھ وہ دونوں خواتین آتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ خلیل نے سنتھیا کو تینوں ٹکٹ اور پاسپورٹ تھمائے اور خود مجھ سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا دل اس وقت تک بُری طرح دھڑکتا رہا جب تک ہم قطر ائرویز کے طیارے میں سوار نہیں ہو گئے۔ بارہ بجے ہم قطر پہنچ چکے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ڈی آئی جی کو فون کرنا ہے لیکن دونوں خواتین نے مجھے روک دیا۔
''اسے یہ معلوم کرنے میں کہ کال کس ملک سے ہو رہی ہے، منٹ بھی نہیں لگے گا اور اس کے بعد اسے یہ معلوم کرنا اور بھی آسان ہو جائے گا کہ کس ائرلائن کا طیارہ قطر میں اترا ہے۔ اس کے بعد ساڑھے تین گھنٹوں کا استنبول میں قیام ہے۔ ڈی آئی جی یہ معلوم ہوتے ہی ترکش پولیس کو ایکٹیو کر سکتا ہے۔''
میں نے ان دونوں کے دلائل کے آگے ہتھیار پھینک دیے۔ استنبول میں طیارہ اترا تو ہم تینوں ہی مطمئن تھے کہ اب ہم پاکستانی پولیس سے دور ہو گئے ہیں۔ تین گھنٹے ائرپورٹ پر ہی قیام کیا اور کچھ کھانے کے بعد پھر سے طیارے کی جانب چل دیے۔
ان دونوں سے چھپ کر میں نے بوتھ سے ماموں کو فون کر دیا۔
''پہنچ گئے؟'' انہوں نے مختصر سوال کیا۔
''ابھی تو استنبول میں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''میں عمر کو فون کر دیتا ہوں، وہ ائرپورٹ پر ریسیو کر لے گا۔''
''اس کی پہچان؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔
''جو کسی بھی افریقن کی ہو سکتی ہے۔'' ماموں کا جواب تھا۔
اگلے دس منٹ میں ہم پھر طیارے میں تھے۔ سمندر کے اوپر سے طویل سفر کے بعد جب اعلان ہوا کہ ہم ٹورنٹو پہنچ گئے ہیں تو میں نے سرگوشی کے انداز میں انہیں بتایا کہ عمر ہمیں لینے ائرپورٹ پر آ سکتا ہے لیکن ہم

میں سے کوئی بھی پہل نہیں کرے گا۔ ہم ٹورنٹو ائرپورٹ پر اترے لیکن سامان آنے میں کافی دیر لگی۔ امیگریشن کی طرف بڑھے تو سنتھیا سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے سائرہ اور سب سے آخر میں، میں یعنی حماد تھا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر بہت رش تھا وہیں کاؤنٹر پر ایک کالا افریقن بھی کھڑا تھا۔ ہم اس سے نظریں چرا کر آگے بڑھ گئے، اس نے ہماری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک لہر ضرور ابھری لیکن اس نے ہمیں مخاطب نہیں کیا۔ آہستہ آہستہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ہم لاؤنج سے باہر نکل آئے۔

لاؤنج سے باہر آتے ہی سنتھیا نے ایک ٹیکسی روکی اور دونوں خواتین اس ٹیکسی میں سوار ہو گئیں۔ میں ابھی ٹیکسی روکنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ پولیس نے اس کالے حبشی کو پولیس کار میں سوار کروایا۔ میں نے ٹیکسی روکنے میں دیر نہیں لگائی اور آگے جانے والی ٹیکسی کا پیچھا کرنے کو کہا۔ اگلی ٹیکسی جس میں وہ دونوں خواتین سوار تھیں، ایک مکان کے باہر رکی تو میں نے بھی اپنی ٹیکسی رکوائی۔

''بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ مکان ڈونا کی خالہ کا مکان ہے جو برسوں پہلے پاکستان سے کینیڈا شفٹ ہو گئی تھیں اور اب پوری طرح کینیڈین تھیں۔ اپنی بھانجی کو کینیڈین امیگریشن دلوانے میں بھی اس خاندان کا ہاتھ تھا۔

ہمیں وہاں رہتے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ معلوم ہوا کہ کینیڈین گورنمنٹ نے اپنے وزیر کو اس لیے گرفتار کیا تھا کہ ماضی میں وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث رہا تھا۔ اس پر یہ بھی الزام تھا کہ اس نے بحیثیت وزیر ان لوگوں کو بھی ویزے جاری کیے تھے، جو ان ویزوں کے حق دار نہیں تھے۔ میں نے ڈونا کی خالہ کے خاندان کی مدد سے ہی وہاں ایک کرائے کا مکان لے لیا اور ہم تینوں اس مکان میں شفٹ ہو گئے۔

ہمیں اپنے مکان میں شفٹ ہوئے چار دن ہی ہوئے تھے کہ میں نے سائرہ سے نکاح کرنے کی بات کی تو اس نے کہا۔ ''میں تیار ہوں لیکن ایک درخواست ہے کہ میرے ساتھ اس سے بھی نکاح کر لیں جس نے میرا اس طرح ساتھ دیا کہ آج ہم کینیڈا میں موجود ہیں۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے اس بھالو سے بچایا اور مجھے قابل عزت زندگی کی طرف لائے ہو۔'' سائرہ کی اس ڈیمانڈ پر میں حیران رہ گیا۔

''تمہاری اُس سے اس سلسلے میں بات ہوئی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے پہلے اس پر غور کیا تھا پھر استنبول میں اس سلسلے میں بات کی تھی۔'' سائرہ نے کہا۔

''اس نے کہا کہ میں کسی مسلمان کو شریک حیات بنانے کا تصور نہیں کر سکتی تھی لیکن جب تم نے اس سے کینیڈا چلنے کی بات کی بقول اس کے اس رات اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ تم سے ہی شادی کرے گی۔ اگر اسے اس کے لیے اپنا مذہب چھوڑنا پڑا تو چھوڑ دے گی۔''

اگلی صبح ہم تینوں نے ناشتے پر اس مسئلے پر بات کی اور اس کا جواب وہی تھا جو سائرہ نے بتایا تھا۔

میں ایک ہی دن میں دو بیویوں کا شوہر ہو گیا۔ عدالت نے ایک گھنٹے میں ان دونوں کو میری بیویاں تسلیم کر لیا۔

ہم گھر پہنچے تو پہلے ڈونا کی بہن نے اپنی سوکن کا کمرا سجایا، صبح جب میں سائرہ کے کمرے سے نکلا تو وہ میرے قریب آئی اور سرگوشی کی۔ ''آج میری باری ہے۔'' اس نے کہا اور میں مسکرا دیا۔

اس رات سائرہ نے اپنی سوکن کا کمرا سجایا۔

''آج کینیڈا میں رہتے ہوئے ہمیں پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ اپنی امیگرنٹ بیوی کی وجہ سے میں بھی امیگرنٹ ہو چکا ہوں ہمارے پانچ بچے ہیں۔

عمر کی گرفتاری کے بعد ہم پر کچھ دن سختی سے گزرے تھے لیکن دونوں خواتین نے جاب کر لی اور زندگی آرام سے گزرنے لگی اور اب تک گزر رہی ہے اور شاید آئندہ بھی گزر جائے گی۔ اب تو ہم نے ایک پیٹرول پمپ بھی لے لیا ہے جس کا پیٹرول کم اور ٹک شاپ زیادہ چلتی ہے۔

ٹک شاپ پر سب سے زیادہ بریانی بکتی ہے جو دونوں بیویاں بناتی ہیں۔ بریانی میں مارجن آف پرافٹ بھی زیادہ ہے اس لیے زندگی سکون سے گزر رہی ہے۔

اپنے محلے اور گھر والوں سے بھی کبھار فون پر بات ہو جاتی ہے۔ دو سال پہلے ڈی آئی جی نے بھی کینیڈا کا چکر لگایا تھا اور سائرہ کو دیکھ کر صرف ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا تھا...... عمر بڑھنے کے ساتھ سائرہ خوب صورت ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا زیادہ وقت پیٹرول پمپ پر گزرتا ہے کیونکہ جب وہ پمپ پر ہوتی ہے تو سیلز بڑھ جاتی ہے......

❖❖❖

باغی کٹھ پتلی

یعقوب بھٹی

خنجر کے... تلوار کے اور گولی کے زخم وقت کے ساتھ بھر جاتے ہیں... مگر زندگی سے اگر کوئی جان سے گزر جائے تو اس کی واپسی ناممکن... اس کی تنہا اور بے بس زندگی کا خانہ بھی کسی ہم سفر سے خالی تھا... چارسُو بس رات ہی رات تھی... رات کے ان مہیب سناٹوں میں فقط موت کا تعاقب جاری تھا... دغاباز اور فریب کاروں کو انجام تک پہنچانے کا عزم کر چکا تھا... انتقام اور اقتدار کے جنون نے اسے پھر سے رواں دواں کر دیا تھا... دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے وہ دو، دو محاذوں پر گھات لگائے بیٹھا تھا...

زیرزمین ہلچل مچادینے والے سرپھرے جانباز کی سنسنی خیز کارروائیاں...

جسپال سنگھ عرف جیری نے لگ بھگ تین سال بعد ممبئی میں قدم رکھا تھا۔ اس شہر بے مثال کی آلودہ ہوا کو ایک گہری سانس کے ذریعے سینے میں بھرتے ہوئے اسے اپنایت کا احساس ہوا۔

جیری ایک کثیرالمنزلہ عمارت کے رہائشی اپارٹمنٹ کی بالکونی میں کھڑا تھا۔ شام کے ڈھلتے سائے میں ممبئی حدِ نگاہ تک اس کے سامنے قالین کے مانند بچھا تھا۔ وہی کثیرالمنزلہ عمارتیں، بے ہنگم ٹریفک، فضا میں دھند کے مانند

چھایا دھواں اور اس میں جلتے، بجھتے بلند عمارتوں پر لگے سائن بورڈ، ان تین سالوں میں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہاں وہ خود ضرور بدل گیا تھا۔ اس تبدیلی کے احساس سے سینے میں زہریلا دھواں سا بھرنے لگا تھا۔

وہ اندر بیڈروم میں آ گیا۔ مٹی مٹی سی یادیں سر اٹھانے لگیں۔ چھم سے ذہن کی اسکرین پر سانولی سلونی سی شردھا سنگھ کی شبیہہ ابھر آئی جس کی سیاہ آنکھوں میں جیسے ستارے سے کوٹ کر بھرے تھے جس کی خاموشی بھی بولتی تھی۔ جس کی زلفوں کے سائے میں گزرا وقت جیری کے سینے میں ان مٹ نشان چھوڑ گیا تھا۔

ذہن کی اسکرین پر منظر بدلا۔ اپنے خوابوں کی تعبیر کے رنگ آنکھوں میں سجائے...... ٹھنڈے سے ممبئی کی فلمی دنیا تک کا سفر کرنے والی شردھا سنگھ ٹوٹی پھوٹی گڑیا کے مانند پتھریلے فرش پر پڑی تھی۔ بظاہر اس نے دسویں منزل سے اپنے فلیٹ سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔

وہ منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ جیری کے سامنے ابھر آیا تھا۔ جیری نے اپنی آنکھیں شدت سے میچ لی تھیں مگر یہ منظر تو دماغ کی اسکرین پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے فریج کھولا اور یخ بستہ بیئر کا ٹن کھول کر حلق میں انڈیل لیا۔ تربیت یافتہ دماغ نے تھوڑی ہی دیر میں تلخ یادوں پر قابو پا لیا تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور اپنی ٹیم کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اس کی ٹیم گزشتہ 34 دنوں سے انڈیا میں مصروفِ عمل تھی۔

☆☆☆

نئی دہلی میں ''را'' کے ہیڈکوارٹر میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ جسپال سنگھ عرف جیری...... کالی کٹ کی ساحلی پٹی پر دیکھا گیا تھا۔

مچھی ہٹ پر تعینات را کے ایک ایجنٹ نے اسے نہ صرف شناخت کر لیا تھا بلکہ اس کے فنگر پرنٹ بھی محفوظ کر لیے تھے۔ اس سلسلے میں ایک ہنگامی اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ معاملہ اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ را کے نئے چیف کو اس بارے میں بریفنگ دی جا رہی تھی۔

را کے ہیڈکوارٹر کے ایک مخصوص کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ جدید ترین پروجیکٹر سے نکلنے والی شعاعوں نے سامنے لگی اسکرین پر ایک تیس سالہ وجیہہ نوجوان کی تصویر بنا دی تھی۔

پس منظر سے را کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی آواز ابھری۔

''یہ ہے جسپال سنگھ المعروف جیری۔ 2 سال 8 مہینے اور 7 دن پہلے یہ ہمارے بہترین ایجنٹس میں سے ایک تھا۔ اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا کیا جاتا تھا۔ درجن بھر سے زائد اندرون و بیرونِ ملک مشنز کی کامیابی کا کریڈٹ اسے جاتا ہے۔ معاملہ فہمی، دلیری، دوراندیشی اور خطرے کو بھانپ لینے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔ بھیس بدلنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پلاسٹک بم تیار اور استعمال کرنے میں یکتا ہے۔ ہاتھ پیروں کا استعمال بھی خوب کر لیتا ہے۔ آج بھی شاید اس کی کمی کوئی پوری نہیں کر پایا۔'' ڈپٹی کے لہجے میں تاسف در آیا تھا۔

اسکرین پر منظر بدل گیا۔ جیری کی ایک اور مسکراتی ہوئی تصویر سامنے تھی۔

ڈپٹی کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ ''ایک معمولی سے واقعے نے ہماری ہی تراشی ہوئی مورت کو ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔''

حاضرین میں سے کئی نے پہلو بدلے۔

ڈپٹی کی بریفنگ جاری تھی۔ ''نیپال سے لانچ ہونے والے ایک پاکستانی ایجنٹ کے تعاقب میں فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے تین افراد اور ہماری ٹیم کی لپیٹ میں آگئے۔ بدقسمتی سے ان تین افراد میں شامل ایک لڑکی، جیری کی گرل فرینڈ تھی۔ تعاقب کرنے والی ٹیم کا انچارج تھوڑا سا جوشیلا اور ''پوتر نسل'' کا ہندو تھا۔ اس نے نہ صرف پوری سکھ اقلیت کو گالیاں دیں بلکہ انہیں ''دیش دروہی'' بھی قرار دیا۔ اس کے بعد نہ صرف اس ٹیم نے اس لڑکی شردھا کے ساتھ جنسی زیادتی کی بلکہ بدترین تشدد کا نشانہ بھی بنایا پھر ان تینوں کو ہلاک کر کے خودکشی کا رنگ دے دیا گیا۔ بعد کی تحقیقات میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ پاکستانی ایجنٹ نے ان تینوں کے فلیٹ میں پناہ نہیں لی تھی بلکہ ساتھ والے ایک ہندو پارسی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اس دوران میں اس لڑکی شردھا کا موبائل فون جیری کے ہاتھ لگ گیا جس کے بعد وہ جوالہ مکھی کی طرح پھٹ پڑا۔ اس واقعے کی ریکارڈنگ اس موبائل میں تھی۔ جیری کو شانت کرنے کی کافی کوشش کی گئی۔ شاید وہ شانت ہو بھی جاتا مگر ٹیم انچارج نے نہ صرف اس سے معافی مانگنے سے انکار کیا بلکہ ان کی آپس میں جھڑپ بھی ہو گئی۔ ٹیم انچارج کا کلّہ مضبوط تھا۔ اس کے خلاف ہونے والی انکوائری بھی ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ ایک دن جیری گن کے ساتھ اس ٹیم انچارج کے گھر میں گھس گیا۔ ٹیم انچارج رگھوبل اور دیگر دو افراد اس کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد جیری

اور ''را'' کے درمیان آنکھ مچولی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے دو اور بہترین ایجنٹس کا خون اس کی گردن پر ہے۔ پھر وہ انڈیا سے غائب ہو گیا۔ سری لنکا اور پھر کیوبا میں دیکھا گیا۔ اس کے بعد امریکا اس کا مسکن ٹھہرا۔ یہاں اس نے منظم جرائم میں ملوث ایک بین الاقوامی شہرت کی حامل مافیائی قسم کی تنظیم جوائن کر لی۔ جس کے بعد سے وہ اسی تنظیم کے ساتھ ہے۔ مصدقہ خبر ہے کہ اندرونِ ملک ایف بی آئی اور بیرونِ ملک سی آئی اے بھی اس مافیا تنظیم کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتی ہے۔''

اسکرین پر پھر منظر بدلا تھا۔ بلیو جینز اور چمڑے کی بھوری جیکٹ جیری کے کسرتی جسم پر خوب جچ رہی تھی۔ قدرے سنولائی رنگت پر بھوری آنکھیں اور ہاتھ میں چھوٹے کیلبر کا پسٹل۔ وہ کسی فلم کے ہیرو... کے مانند نظر آ رہا تھا۔ یہ حالیہ تصویر امریکا کی تھی۔

''را'' کے چیف نے پہلی دفعہ بریفنگ میں مداخلت کی۔ ''ہمارے ایجنٹس کا قاتل اب تک ہماری گرفت سے دور کیوں ہے؟'' چیف کے کھردرے لہجے میں بڑی تپش تھی۔ وہ بھی انتہا پسند ہندو تھا اور جسپال سنگھ، جیری کے لیے اس کے سینے میں نفرت کا بڑا سا چشمہ رواں ہو گیا تھا۔

ڈپٹی نے سامنے رکھے پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''اس کی فائل آج بھی کھلی ہے۔ امریکا میں ہمارا ڈیسک مسلسل اس کے تعاقب میں ہے۔ جلد یا بدیر وہ ہماری گرفت میں ہوگا۔''

ایک اسسٹنٹ نے قدرے دبی سی آواز میں کہا۔ ''سر! اب تو وہ انڈیا میں آ دھمکا ہے۔ ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ آپ مجھے ٹاسک دیں۔ چند دنوں میں ہی وہ آپ کو یہاں پڑا ملے گا۔''

چیف نے تعریفی نظر اس اسسٹنٹ پر ڈالی جبکہ تجربے کی بلند ترین سیڑھی پر کھڑے ڈپٹی نے اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ امریکا میں ہوتا تو بہتر تھا۔ نہ جانے وہ کون سے نامعلوم مقاصد لے کر انڈیا آیا ہے۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتا ہے را جیسی بلا اس کے مسلسل تعاقب میں ہے۔''

اس دفعہ چیف نے ڈپٹی کو گھورا۔ ''وریندر صاحب! آپ، جیری کو کچھ زیادہ ہی ہوا نہیں بنا رہے؟''

ڈپٹی ہونٹ بھینچ کر خاموش رہا۔

چیف شیخی بگھارنے والے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوا۔ ''شیرول صاحب، جیری والے کیس کی فائل آپ سنبھال لیں۔ مجھے جلد از جلد وہ زندہ یا مردہ را کے ہیڈ کوارٹر میں چاہیے۔''

شیرول نامی اسسٹنٹ کا چہرہ چمکنے لگا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیماً سر جھکایا۔ ''حکم کی تعمیل ہوگی سر۔''

ڈپٹی بے بسی سے ہونٹ چبانے لگا پھر اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر شیرول! مناسب سمجھیں تو آپ ...... اے پلس کیٹگری کے آنند راؤ کو ضرور اپنی ٹیم میں شامل کر لیجیے گا۔ وہ متعدد بار جیری کی ٹیم میں جونیئر پارٹنر رہا ہے۔''

شیرول کا انداز برقرار رہا۔ ''آپ کے حکم کی بھی تعمیل ہوگی۔''

اسکرین پر پھر ایک بار منظر بدلا تھا۔ جیری کی یہ کسی خوشگوار لمحے کی تصویر تھی۔ وہ ہنس رہا تھا۔ را کے ڈپٹی ڈائریکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ انہی پر ہنس رہا ہے۔

☆☆☆

جیری اور اس کی ٹیم جو بظاہر عام نظر آنے والے موبائلز فون اور لیپ ٹاپ استعمال کر رہے تھے، وہ بے حد خاص تھے۔ ان کا استعمال صرف باہمی رابطے اور معلومات کے تبادلے کے لیے ...... ہو رہا تھا۔ موبائلز فون اور لیپ ٹاپس براہِ راست ایک خاص مواصلاتی سیارے سے منسلک تھے۔ وہ لوگ کوئی بھی مقامی سیلولر نیٹ ورک استعمال نہیں کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ امریکا میں بیٹھے دو اپنے کام میں یکتا ہیکرز انڈیا کی داخلی سلامتی کے ذمّے دار اداروں اور را کے مرکزی کمپیوٹرز میں پہلے ہی نقب لگا چکے تھے۔ جیسے ہی جیری کی فائل نئی رپورٹ کے ساتھ کاپی ہوئی، وہ راز میں نہیں رہی۔

جیری کو ایک میل موصول ہوئی جسے پڑھتے ہی جیری کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نے جگہ بنا لی۔ اس کی بھوری آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔ ''لگتا ہے میرے بعد را نے واقعی ترقی کر لی ہے۔'' اس نے فوراً ہی اپنا ٹھکانا تبدیل کیا اور پھر موبائل اٹھایا اور اپنے نائب اینڈی سے رابطہ کیا۔ اس کی آواز سنتے ہی جیری نے کہا۔ ''میری انڈیا میں آمد راز نہیں رہی۔''

''اوہ...... یہ کیسے ہوا؟'' اینڈی حیران ہوا۔

''بس، کسی کی کھلی آنکھیں ''را'' کے کام آ گئی ہیں۔ خیر یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ تم متبادل پلان پر کام شروع کر دو۔''

اینڈی نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''اس کے لیے

صرف دو گھنٹے کا وقت چاہیے۔''

جیری بولا۔ ''گڈ! میں پھر نکل رہا ہوں۔''

صبح سویرے جیری ایک تیز رفتار ٹرین سے نئی دہلی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

را کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر شیر دل راد ھے بھی آنند راؤ کی صلاحیتوں سے خوب واقف تھا۔ اس نے فوراً ہی آنند راؤ کو طلب کیا اور جیری کی فائل اسے تھما دی۔

فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے آنند راؤ کے جسم میں میٹھی سی سنسنی دوڑ ہو گئی۔ اس نے فائل بند کر کے انگڑائی لی۔ ''جیری صاحب! آپ کے ساتھ کھیل کا مزہ آئے گا۔''

اس نے سب سے پہلے اس ایجنٹ کو طلب کیا جس نے پچھلے ہفتہ میں جیری کو شناخت کیا تھا۔ معاملے کی اہمیت کے پیش نظر اس ایجنٹ کو پہلے ہی ہیڈ کوارٹر بلا لیا گیا تھا۔

آنند راؤ کے چھوٹے سے کمرے میں ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا شخص داخل ہوا۔ جس نے سلیقے سے سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے پر پتلی سی مونچھیں تھیں۔ اس کی جلد دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا زیادہ وقت ساحلی آب و ہوا میں گزرا ہے۔ بھی چیشے میں وہ مچھیرے کے روپ میں رہتا تھا۔ اس کا نام اردل حسین تھا۔

آنند راؤ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اردل نے اب تک آنند راؤ کے بارے میں صرف سنا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر اس پر رعب سا طاری ہو گیا تھا۔ اپنی ٹانگوں کی لرزش کو سنبھالتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد آنند راؤ اپنے مقصد کی طرف آیا۔ ''تم نے متاثر کیا ہے مجھے اردل! میں حیران ہوں تم نے جیری جیسے بہروپ بدلنے کے ماہر کو پہچان کیسے لیا؟''

آنند راؤ کے تعریفی کلمات نے اردل کا سینہ پھلا دیا، وہ بولا۔ ''میں تو اسے اتفاق ہی سمجھتا ہوں سر! میں نے جیری صاحب کو کشتیاں پھلانگتے دیکھا۔ وہ بھی مچھیرے کے حلیے میں تھے۔ ایک چوڑے پاٹ والی کشتی کو پھلانگتے ہوئے انہوں نے کشتی کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر دونوں ٹانگیں برق کے مانند لہرائیں اور ٹانگوں کو قینچی جیسی شکل دی تو میرے لاشعور میں بے نام سی شبیہ ابھری۔ میں نے کسی اور کو بھی متعدد بار اس طرح ٹانگوں کو حرکت دیتے دیکھا تھا۔ اس ادھیڑ عمر کے مچھیرے کی پھرتی نے مجھے پہلے ہی ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا۔''

آنند راؤ خاموشی سے اردل کے چہرے پر نظریں جمائے تھا جو اس منظر میں جیسے ڈوب سا گیا تھا۔ اردل کی زبان رواں تھی۔ ''جیری صاحب تو یہ جا اور وہ جا...... مگر مجھے مخمصے میں ڈال گئے پھر اچانک ہی میرے دماغ میں روشنی سی بھر گئی۔ میں نے جیری صاحب کے ساتھ ایک مشن پر نیپال کے پہاڑی سلسلے میں چند دن گزارے تھے۔ وہ ایک پتھر سے دوسرے پتھر پر پھلانگتے ہوئے ٹانگوں کو بالکل ایسے ہی حرکت دیتے تھے۔ میرے تو جسم میں بجلی سی بھر گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ جیری صاحب ہیڈ کوارٹر کو مطلوب ہیں۔ میں نے مزید تسلی کے لیے ان کے فنگر پرنٹ اٹھا لیے جس کشتی کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے جست بھری تھی، وہ جگہ گریس سے آلودہ تھی۔ ان کے پرنٹ بے حد واضح تھے۔''

آنند راؤ کی آنکھوں میں تحسین ابھری۔ ''تمہارا مشاہدہ شاندار ہے۔ مجھے پسند آئے ہو تم، میں چاہتا ہوں تمہیں اپنی ٹیم میں شامل کرلوں۔''

اردل کا سیاہ چہرہ چمکنے لگا۔ ''آپ کی نگاہ کا کمال ہے سر! آپ جیسی افسانوی شہرت کے حامل آفیسر کی ٹیم میں شامل ہونا میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔''

آنند راؤ نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''یہ تو ہو گیا مگر یہ بتاؤ تم نے اپنے طور پر جیری کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی؟''

اردل کے چہرے پر سایہ سا آ گیا، وہ بولا۔ ''فنگر پرنٹ محفوظ کرنے کی غرض سے میں ان کا تعاقب نہیں کر سکا۔ ویسے بھی وہ میرے شعور کی گرفت میں آنے سے پہلے منظر سے غائب ہو چکے تھے پھر بھی میں نے مقامی کاؤنٹر کو متحرک کر دیا تھا۔ مجھے فوراً ہیڈ کوارٹر طلب کر لیا گیا۔ مقامی کاؤنٹر کی کارکردگی سے میں لاعلم ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم تیار رہو۔ ممکن ہے ہمیں ساتھ ہی کالی کٹ کا سفر کرنا پڑے۔''

تھوڑی دیر بعد آنند راؤ، شیر دل راد ھے کے کمرے میں تھا۔

چھوٹتے ہی اس نے کہا۔ ''سر! کالی کٹ کے مقامی کاؤنٹر کی کیا رپورٹ ہے؟ جیری کو شناخت کرنے والے ایجنٹ کا کہنا ہے کہ اس نے مقامی کاؤنٹر کو متحرک کر دیا تھا۔''

شیر دل نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''تم بیٹھو، ابھی پتا کر لیتے ہیں۔''

اس نے اپنے سیکریٹری کو ضروری ہدایت دی اور پھر

pklibrary.com

آنند راؤ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بے پروائی سے کرسی پر نیم دراز چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”وہی جو سب کے ذہنوں میں سوال گردش کر رہا ہے۔ جیری کی انڈیا آمد کی ممکنہ وجہ حالانکہ دنیا میں سب سے خطرناک سرزمین اس کے لیے انڈیا کی ہی ہے۔“

شیر دل نے خیال آرائی کی۔ ”ممکن ہے وہ کسی ذاتی کام سے آیا ہو اور اب واپسی کے لیے پر تول رہا ہو مگر اس سے پہلے اسے ہماری گرفت میں ہونا چاہیے۔“

آنند راؤ کے اسٹانس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ ”نہیں ذاتی کام کوئی بھی نہیں ہوسکتا۔ کہیں زمین میں اُس کا خزانہ بھی دفن ہوتا تو وہ اس کے لیے بھی نہ آتا۔ ماں، باپ اور دو چھوٹی بہنوں کی پلین کریش میں ہلاکت کے بعد اس کی ذات اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔“ اچانک ایک خیال آنے پر آنند راؤ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”جیری اب بکاؤ مال ہے۔ کہیں ہمارے دشمنوں کے پیٹ میں خالصتان کی تحریک کو زندہ کرنے کی مروڑ تو نہیں اٹھی۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے جیری کو ہائر کیا ہو۔ اس میں ویسے بھی ”قومیت“ کے جراثیم زور پکڑ چکے ہیں۔“

شیر دل بولا۔ ”تم دور کی کوڑی لائے ہو۔ تمہاری بات میں وزن ہے مگر یہ مفروضہ دل کو لگ نہیں رہا۔ مت بھولو کہ جیری فری لانسر نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہے جو بعض حکومتوں سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ دوسرا خالصتان تحریک کے تنِ مردہ میں سانس پھونکنا لونگ ٹرم پالیسی ہے۔ جو براہِ راست ہماری قومی سلامتی سے متصادم ہے۔“ پھر شیر دل کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اور ہمیں اس بات کی گارنٹی امریکن اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ دے چکا ہے کہ وہ ہر اس فصل کا سدِباب کرے گا جو ہماری قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہوگی۔“ طنزیہ مسکراہٹ میں آنند راؤ بھی شریک ہوا اور دوبارہ سے اپنے پرانے اسٹانس میں چلا گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”جیری جس تنظیم کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ اور اب تک کیا کرتی رہی ہے؟“

شیر دل نے ٹیبل پر پڑی ایک فائل اس کی طرف سرکائی۔ ”تمہارے آنے سے پہلے میں اسی سے متعلق یہ واشنگٹن ڈیسک کی طرف سے موصول.... رپورٹ ہی دیکھ رہا تھا۔ منظم ڈکیت گروہ سے ترقی کرتے ہوئے وہ تنظیم ایک مکمل مافیا بن چکی ہے۔ اب امریکا میں صرف وہ منشیات، کیسینو اور لوگوں کو سود پر رقم دینے کا کام کرتی ہے اور امریکا سے باہر وہ سونے، پلاٹینیم اور فارن کرنسی پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بھاری ترین معاوضے پر اس سے امریکا اور اسرائیل کے علاوہ دنیا میں کہیں بھی کوئی بھی غیر قانونی کام لیا جاسکتا ہے۔ درپردہ امریکی اور اسرائیلی خفیہ اداروں کی آشیرباد اسے حاصل ہے۔ اپنے مقاصد کے لیے یہ ادارے اسے استعمال کرتے رہتے ہیں۔“

آنند راؤ نے سیدھا ہوتے ہوئے چٹکی بجائی۔ ”پھر تو مسئلہ حل ہے۔ جن اداروں کا آپ نے ذکر کیا وہ تو ہمارے ”فطری اتحادی“ ہیں۔ ہم نہ صرف اُن سے مدد مانگ سکتے ہیں بلکہ جیری کی حوالگی کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔“ وہ خاصا پُرجوش نظر آنے لگا تھا۔

شیر دل دھیمے سے مسکرایا۔ ”میرے بچے! اپنے ہی ایک ”باغی کٹھ پتلی“ کے خلاف مدد کی درخواست را جیسے ادارے کے منہ پر کالک مل دے گی۔ ہم عصر ہم پر بیٹھ کر نجی محفلوں میں ہنسیں گے اور ملکی آئین کے تابع کوئی بھی ادارہ کسی بھی سطح پر تسلیم نہیں کرتا کہ جرائم پیشہ گروہوں سے ہمارا رابطہ ہے جیسے ہم ”بمبئی انڈر ورلڈ“ کے لوگوں کو استعمال کر لیتے ہیں اور اپنے ہاتھ بھی صاف رکھتے ہیں، سمجھے میری بات۔“

آنند راؤ سر ہلا کر رہ گیا پھر بولا۔ ”تو پھر آپ کا کیا خیال ہے؟“

”فی الحال کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ جیری کا کوئی ذاتی مقصد بھی ہوسکتا ہے اور اس کی تنظیم کے لیے ہمارے ملک بھی ”ہاٹ اسپاٹ“ کافی ہیں۔ تم فی الحال اپنی توجہ جیری کو کھوجنے پر دو۔“

”ٹھیک ہے۔ کالی کٹ سے آنے والی رپورٹ دیکھ لیں پھر میں کالی کٹ روانہ ہوتا ہوں۔“

☆☆☆

جیری، دہلی کے علاقے گنج ماڑی میں ایک پرانی سی ورکشاپ میں تھا۔ ورکشاپ سے زیادہ یہ جگہ پرانی گاڑیوں کا قبرستان لگتی تھی۔ یہاں اس کے لیے 98 ماڈل کی ایک نئی پینٹ ہوئی ماروتی تیار تھی۔

جیری نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر پہلے انجن اسٹارٹ کیا پھر ڈیش بورڈ میں موجود گاڑی کے کاغذات کا جائزہ لیا۔ مطمئن ہو کر اس نے اسٹیئرنگ پر آلٹریشن کیے گئے نئے بٹنوں میں سے ایک بڑے سے بٹن کو دبایا۔ فوراً ماروتی کی ہیڈ لائٹس کے عین درمیان سے اسٹیل کی ایک راڈ

pklibrary.com

باہر نکلنا شروع ہوگئی۔ جیری نے بٹن پر دباؤ برقرار رکھتے ہوئے سیٹ سے قدرے اٹھ کر باہر نظر ڈالی۔ راڈ تین فٹ تک باہر نکل آئی تھی۔ راڈ کے بالائی سرے پر چار مربع انچ کی چاقو کی دھار جیسی ہم رنگ پلیٹ نصب تھی۔

جیری نے پہلا بٹن چھوڑ کر دوسرا دبایا۔ اس بٹن پر ایرو کا نشان اوپر کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ فوراً ہی دہری تہ کے اندر موجود دوسری راڈ حرکت میں آئی اور بالائی سرے پر نصب چار انچ کی پلیٹ اوپر اٹھنے لگی اور ایک فٹ سے زائد اوپر اٹھ گئی۔

جیری کے ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ورکشاپ کھلنے کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔ جیری نے ماروتی میں بیٹھے بیٹھے ہی کپڑے تبدیل کرلیے۔ وہ اس وقت یورپین سیاح کے حلیے میں تھا۔ کپڑے تبدیل کرکے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دہلی کی سڑکوں پر دفتروں کا رخ کرنے والوں کا ازدحام شروع ہونے والا تھا۔

جیری نے باہر نکل کر ورکشاپ کا گیٹ کھولا اور ماروتی کو باہر لے آیا۔

☆☆☆

را کا رول چیف امیت کمار ٹھیک آٹھ بج کر بیس منٹ پر اپنی جان سے پیاری ماروتی 98 کی عقبی نشست پر تھا۔ اس گاڑی کی قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمت اس گاڑی کے بلٹ پروف شیشوں کی تھی۔

امیت کمار کا پرانا ڈرائیور ایک جدید ترین گائیگر سے گاڑی کو مکمل چیک کرچکا تھا۔ گائیگر اس نے گیراج ہی میں بنی ایک الماری میں رکھا اور پھر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ”کیا حال ہے تمہاری پتنی کا اب کاکا؟“

کاکا نامی ڈرائیور نے افسردہ سے انداز میں کہا۔ ”کوئی فرق نہیں پڑا صاحب! بستر کی ہوکر رہ گئی ہے۔“ ساتھ ہی اس نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے مزید کہا۔ ”بچے چھوٹے ہیں ابھی۔ بھگوان جانے کیا ہوگا آگے۔“

امیت کمار نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”حوصلہ رکھو ڈاکٹر پرکاش سے میری بات ہوئی تھی۔ تمہاری پتنی کے حوالے سے وہ خاصا پُرامید ہے۔ ایسا کرو بچوں کے لیے گاؤں سے فی الحال کسی کو بلالو۔“

کاکا نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔ ”جی صاحب! میری بڑی سالی اپنے بچوں کے ساتھ آج کل میں پہنچنے والی ہے۔“

امیت کمار نے تسلی تشفی کی باتیں کیں جس سے کاکا کو خاصی ڈھارس بندھی۔ سرکاری کوٹھی سے آفیسرز کالونی کی سڑک پر آتے ہی کاکا نے گاڑی میں نصب آپریٹس آن کرکے ہیڈکوارٹر کو اپنی روانگی کی اطلاع دی۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی آفیسرز کالونی کے پُرسکون ماحول سے نکل کر ٹریفک کے ازدحام میں شامل ہوگئی۔ کاکا روٹین ورک کے تحت آپریٹس پر مسلسل ہیڈکوارٹر سے رابطے میں تھا۔

گیٹ وے والے چوراہے سے اوور ہیڈ برج پر چڑھتے ہوئے اپنے ہی میک اور ماڈل کی ماروتی کو امیت کمار نے تعریفی نظروں سے دیکھا جس نے دائیں طرف سے ٹرن لیا تھا اور اوورہیڈ برج پر آچڑھی تھی۔ گاڑیوں کی آنکھ مچولی کے درمیان وہ ماروتی ان کے بالکل عقب میں آگئی۔

امیت کمار نے سامنے لگے آئینے میں ماروتی کے ڈرائیور پر نظر ڈالی۔ خلاف توقع ایک قدامت پرست ادھیڑ عمر کے ہندوستانی کے بجائے بھورے بالوں والے نوجوان یورپین ڈرائیور کو دیکھ کر اسے خاصی حیرت ہوئی۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں ماروتی ٹریفک سگنل پر آگے، پیچھے رک گئیں۔ عقب والی ماروتی کو اپنی گاڑی کے بالکل ساتھ جڑا دیکھ کر امیت کمار کو بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اس نے کاکا سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”یہ ماروتی والا انگریز بالکل سر پر ہی چڑھ آیا ہے۔“

کاکا نے عقبی آئینے میں دیکھ کر سر ہلایا۔ ٹریفک سگنل ابھی تک سرخ تھا۔

امیت کمار نے آئینے میں دیکھا۔ بھورے بالوں والا یورپین بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ یورپین کی بھوری آنکھوں سے آنکھیں ٹکراتے ہی امیت کمار کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ایسے لگا یہ بھوری اور چمک دار آنکھیں اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہیں۔ کاسہ سر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اس نے دوبارہ دھیان سے یورپین کی طرف دیکھا۔ اس دفعہ وہ منہ موڑے اسٹیئرنگ پر انگلیاں نچا رہا تھا۔ شناسائی کا کوئی دیرپا تاثر نہ ابھرا تو امیت کمار نے اس کی طرف سے توجہ ہٹالی۔

سگنل سبز ہوا تو گاڑیوں اور بسوں کا رکا ہوا سمندر دوبارہ سے بہہ نکلا۔ اگلے چوراہے سے عقب والی ماروتی، سرسوتی ہائٹس کی طرف مڑ گئی۔

امیت کمار کا دماغ ابھی تک ان بھوری اور چمک دار آنکھوں میں الجھا ہوا تھا۔ لوگ سبھا کی عمارت کے پہلو سے نکل کر گاڑی را کے ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والی قدرے ویران سڑک پر مڑی تو کاکا نے قدرے دبی سی آواز میں کہا۔ ''صاحب! ہیڈ کوارٹر میں اُڑتی سی خبر سنی ہے کہ جیری صاحب دوبارہ ہندوستان آدھمکے ہیں۔ یہ بات درست ہے کیا؟''

امیت کمار کے دماغ میں جیسے دھماکا سا ہوا۔ بھوری اور چمک دار آنکھیں اسے یاد آگئیں کہ کس کی تھیں۔ وہ حلق کے بل چلایا۔ ''گاڑی روکو، وہی کم بخت ماروتی میں ہمارے عقب میں تھا۔''

کاکا نے بوکھلا کر بریک پیڈل دبایا۔ ''تیز رفتار گاڑی لہرائی۔ عقب میں کوئی نہیں تھا۔ ورنہ ٹکر ہو جانا یقینی تھا۔

''فوراً گاڑی سے نکلو۔'' امیت کمار چلایا۔ اس کا ہاتھ گاڑی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے لہرا کر گاڑی رک گئی مگر باہر نکلنا امیت کمار اور کاکا کی قسمت میں نہیں تھا۔ گاڑی کے پہیے ساکت ہوتے ہی گاڑی کے نیچے آنکھیں چندھیا دینے والی چمک نمودار ہوئی۔ اگلے پل زوردار دھماکا ہوا اور ماروتی 198 اپنے سواروں سمیت ہوا میں ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔

☆☆☆

کالی کٹ سے آنے والی رپورٹ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مقامی ڈیسک جیری کا کھوج، کھرا لگانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ کیسے کالی کٹ پہنچا؟ اور پھر کہاں گیا؟

رپورٹ میں تھا کہ مچھیروں کو چیک کیا جا رہا تھا۔ قیاس تھا کہ کھلے سمندر سے مچھیروں کی کسی کشتی کے ذریعے ہی وہ کالی کٹ پہنچا تھا۔

آنند راؤ نے رپورٹ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالی ہی تھی کہ کالی کٹ سے نئی رپورٹ آگئی۔ یہ سی سی ٹی وی کیمرے کی فوٹیج تھی جس میں ایک ادھیڑ عمر کے مفلوک الحال شخص کو دیکھا جا سکتا تھا جو کالی کٹ ریلوے اسٹیشن پر لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی زد میں آیا تھا۔ ایک فوٹیج میں وہ ایک لمبی لائن میں لگا ہوا تھا۔ جہاں نان اسٹاپ اور تیز رفتار رائے پرتاب میل کی ٹکٹوں کا کاؤنٹر تھا۔ رائے پرتاب میل کالی کٹ سے ممبئی جاتی تھی اور درمیان میں صرف صفائی، پانی اور ایندھن کے لیے جسوال کے قصباتی اسٹیشن پر 30 منٹ کے لیے رکتی تھی۔

اردل نے بطور جیری...... اس مفلوک الحال شخص کو پہچان لیا تھا۔ ریل کے سفر سے صاف ظاہر تھا کہ جیری کی کالی کٹ کے بعد نئی منزل ممبئی تھا۔ جسوال نامی قطعی غیر اہم قصبے میں اس کا کیا کام ہو سکتا تھا۔

آنند راؤ نے کالی کٹ کے ڈیسک انچارج کی فون پر ماں، بہن ایک کر دی تھی۔ اگر کالی کٹ کے ریلوے اسٹیشن کے کیمروں کی فوٹیج بروقت چیک کر لی جاتی تو اس طویل سفر کے دوران جیری کو بہ آسانی چھاپا جا سکتا تھا۔ نہیں تو ممبئی ریلوے اسٹیشن پر اس کا ''شاندار'' استقبال کیا جا سکتا تھا۔

جیری اب ڈھائی کروڑ انسانوں کے سمندر میں تھا جہاں اسے کھوجنا ناممکن حد تک مشکل تھا۔

آنند راؤ فوراً حرکت میں آیا۔ ممبئی ڈیسک کے انچارج سے اس نے خود بات کی اور کالی کٹ سے نئی آنے والی رپورٹ کی روشنی میں انچارج کو ایک ٹاسک سونپ دیا۔

اگلے دو منٹ میں وہ، شیرول کے آفس میں تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے کہا۔ ''جیری، ممبئی میں ہے۔ اس کا جو بھی ذاتی یا گروہی مقصد ہے، اس کا مرکز یقیناً ممبئی ہی ہے۔ میں ضرور اسے اس کے بل سے باہر کھینچ لاؤں گا۔''

اس کے انداز نے شیرول کو بھی پُرجوش کر دیا۔ ''مجھے پورا یقین ہے تمہاری صلاحیتوں پر...... پوری طاقت سے اس پر جھپٹو اور پیٹ چیر کر آنتوں سے کھینچ کر یہاں لے آؤ۔''

آنند راؤ بولا۔ ''اگر ذاتی مقاصد کو کچھ دیر کے لیے بھول جائیں اور صرف گروہی مقاصد کو سامنے رکھیں تو آپ کے خیال میں جیری کے مافیائی گروہ کا ممبئی میں کیا ٹارگٹ ہو سکتا ہے؟'' شیرول نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ بات اس نے بڑے پتے کی، کی تھی۔ چند لمحے وہ گہری سوچ میں رہا پھر بولا۔ ''سینٹرل ریزرو آف فارن کرنسی بینک، جہاں اربوں ڈالرز پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ جنوبی ایشیا کا دوسرا بڑا سونا اور پلاٹینیم کا ذخیرہ بھی ہمارے پاس ہے۔ یہ بھی ممبئی میں ہے۔ اس کے علاوہ بھی دو قدرے چھوٹے پوائنٹس ہیں جن میں اس گروہ کی دلچسپی ہو سکتی ہے۔''

آنند راؤ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارے قومی اثاثوں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے۔ ان کی سیکورٹی فول پروف ہے۔ پھر مہا بھارت کوئی معمولی افریقی یا لاطینی امریکا کا دیش نہیں ہے۔ ہم اپنے مجرموں کا پوری دنیا میں تعاقب اور نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سب اس گروہ کے سامنے بھی ہوگا۔ ہمارے قومی اثاثوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ان کے منصوبہ ساز ذہن ایک ہزار دفعہ ضرور سوچیں گے۔'' پھر اس کا انداز پُرخیال ہوا۔

''دماغ کے گھوڑے کو کسی اور طرف دوڑائیں سر، کسی کی ذاتی دولت، سونے کا ذخیرہ، ممبئی کو ارب پتیوں کا شہر کہتے ہیں سر، کچھ اور سوچیں۔''

شیرول کے چہرے پر آنند راؤ کے لیے تحسین ابھری۔ وہ بالکل ٹھیک سوچ رہا تھا۔ شیرول بولا۔ ''ایسے تو بہت سے لوگ نکل آئیں گے۔ لیکن کوئی بہت بڑا ٹارگٹ میرے تو دماغ میں نہیں آرہا۔''

آنند راؤ بولا۔ ''لیکن میرے دماغ میں آچکا ہے۔''

شیرول نے چونک کر اس پر نظریں جمادیں۔

شیرول کے تاثرات کا جائزہ لے کر آنند نے مزید کہا۔ ''کچھ دن پہلے میں نے ایک خبر سنی تھی کہ دنیا کے دوسرے امیر ترین فرد ہمیش راج...... جسے لاتعداد اسٹیل ملز کی ملکیت کے سبب دنیا بھر میں ''آئرن مین'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے ذاتی سونے کے ذخیرے کی حفاظت کے لیے کسی سوئیڈن کمپنی سے ملین ڈالرز کا کوئی الیکٹریکل حفاظتی نظام خریدا ہے۔ اس آئرن مین کی بھی کوئی خبر لیں۔ وہ بھی ٹارگٹ ہوسکتا ہے۔''

شیرول سیدھا ہو بیٹھا۔ ''تم بالکل صحیح نہج پر جارہے ہو۔ آئرن مین یقیناً جیری کے گروہ کا ٹارگٹ ہوسکتا ہے۔ اسے سونا جمع کرنے کا خبط ہے۔ اس کے ذخیرے میں دو، تین ارب ڈالرز کا سونا ہونا معمولی بات ہے۔''

آنند راؤ نے کہا۔ ''لگتا ہے مجھے ممبئی جانا ہوگا۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ شیرول نے ناگواری سے فون کو گھورا اور پھر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف جو سننے کو ملا اس نے شیرول کے تاثرات بڑی تیزی سے تبدیل کردیے۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

اس تبدیلی نے آنند راؤ کو بھی بے چین کردیا۔

شیرول خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔ ''میں آرہا ہوں۔'' ساتھ ہی اس نے کرسی چھوڑ دی۔

''کیا ہوا سر۔'' آنند راؤ کی بے چینی آواز بن کر ابھری۔

''جیری، دہلی میں ہے اور وہ کوئی سونے وغیرہ کے چکر میں نہیں ہے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے امیت کمار کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔''

آنند راؤ کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ، شیرول کے ساتھ لپکا۔

شیرول نے مزید کہا۔ ''وہ انتقام کی آگ سینے میں لے کر انڈیا آیا ہے۔ امیت کمار اس تحقیقی کمیٹی کا انچارج تھا جس نے جیری کی گرل فرینڈ والے کیس کی تحقیقات کی تھیں۔''

''تمہیں اب ممبئی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

آنند راؤ کے سینے میں اپنے سابق سینئر کے لیے الاؤ سے بھڑک اٹھے تھے۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے شیرول اپنے موبائل فون پر چلا رہا تھا۔ ''اس کتے کا ''وائس میسج'' تمام سیلولر نیٹ ورکس پر ڈالو۔ پورے علاقے کی کالز ریکارڈ چیک کرو۔ کوئی نہ کوئی کلیو ضرور ملے گا۔''

آنند راؤ نے مایوسی سے سر کو منفی جنبش دی۔ وہ جانتا تھا کہ جیری کوئی بھی مقامی سیلولر نیٹ ورک استعمال نہیں کرتا۔

☆☆☆

جیری واپس ممبئی آگیا تھا۔ اگلا ٹارگٹ وہ اپنے نائب اینڈی کو سونپ آیا تھا۔ اب وہ ایک سیاہ فام نوجوان کے روپ میں تھا۔ گھنگھریالے بال، چوڑی ناک، موٹے ہونٹ اور گہری سیاہ رنگت۔ ہونٹوں پر سوجن کے لیے جو جیل اس نے استعمال کی تھی۔ اس کے سبب ہونٹوں پر جلن کا احساس جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ نتھنوں میں چبھتے ہوئے اسپرنگ بھی مسلسل عدم اطمینانی کا باعث تھے مگر جیری نے ان سب باتوں کے ساتھ رہنے کا جینا سیکھ لیا تھا۔ آنکھوں کی بھوری رنگت چھپانے کے لیے بھی اس نے سیاہ لینز لگا رکھے تھے۔ ایک خاص قسم کی جیل نے اس کے سارے سانولے وجود کو قدرتی سیاہ رنگت دے دی تھی۔

نیکر اور ٹی شرٹ میں ملبوس، سرخ رنگ کا جدید قسم کا چشمہ لگائے.. وہ ایک چھوٹی موٹر بوٹ کی ریلنگ تھامے بظاہر ڈوبتے سورج کا نظارہ کررہا تھا۔

موٹر بوٹ کا ناخدا...... بوٹ کو پُرسکون سمندر کی لہروں پر جیسے اُڑائے جارہا تھا۔ ممبئی کا ساحل جیسے کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ اس موٹر بوٹ کے علاوہ بھی کئی موٹر بوٹس تھیں جو اُن کے اردگرد ایک ہی سمت میں سفر کررہی تھیں۔ چند بوٹس میں طرح دار قسم کی خواتین بھی نظر آرہی تھیں۔

جلد ہی ڈوبتے سورج کے عکس میں ایک دیوہیکل بحری جہاز کا ہیولا نظر آنے لگا۔ جو کھلے سمندر میں لنگر انداز تھا۔ سبھی بوٹس کا رخ اسی بحری جہاز کی طرف تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں بحری جہاز کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ یہ ایک پرانا کروز شپ تھا، جسے زبردست تبدیلیوں کے ساتھ عیاشی، تفریح اور غیر قانونی کھیلوں کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔ اس کروز شپ کی ملکیت ممبئی انڈر

pklibrary.com

ورلڈ کے پاس تھی۔

جیری والی موٹر بوٹ نے پہاڑ کے مانند بلند کروز شپ کے گرد ایک چکر لگایا۔ شپ کے بائیں پہلو میں کئی مربع میٹر پر محیط پلاسٹک کا تیرتا ہوا پلیٹ فارم تھا جو شپ سے منسلک تھا۔ اسی پلیٹ فارم سے ہوائی جہاز پر چڑھنے کے طرز جیسی پلاسٹک کی سیڑھیاں شپ کے پہلے عرشے تک جا رہی تھیں۔

سورج غروب ہونے تک شپ اور پلیٹ فارم روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ پلیٹ فارم پر نصف درجن کے قریب شپ کے سرمئی چست وردیوں والے مسلح سیکیورٹی اہلکار موجود تھے جن میں دو خاتون اہلکار بھی تھیں۔

جیری نے چشمہ اتار کر ٹی شرٹ کے گریبان میں اُڑس لیا تھا۔ موٹر بوٹ اسے پلیٹ فارم پر اتار کر واپس لوٹ گئی۔ دیگر آنے والے مہمان بھی یکے بعد دیگرے پلیٹ فارم پر اتر رہے تھے۔ بنا جنس کی تفریق کے سبھی مہمانوں کی جامہ تلاشی ہو رہی تھی۔

آنے والے مہمان چھوٹی چھوٹی لائنوں کی ترتیب میں آ گئے۔ خواتین کی لائن علیحدہ تھی۔ ہر کوئی اپنی باری پر ایک کارڈ پیش کرتا جس کے معائنے اور جامہ تلاشی کے بعد اسے آگے جانے کی اجازت دی جاتی اور وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ جاتا۔

پیش کیے جانے والے کارڈز کی زیادہ تر رنگت سبز اور پیلی تھی۔ تھوڑی دیر میں جیری کی باری بھی آ گئی۔ اس نے نیکر کی جیب سے پرس نکالا اور سخت پلاسٹک کا مخصوص قسم کا کارڈ نکال کر کرخت چہرے والے اہلکار کو تھما دیا۔

سرخ کارڈ دیکھتے ہی گارڈ چونکا۔ اس نے گہری نظروں سے جیری کے مضبوط جسم پر نظر ڈالی اور اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ جیری نے بازو کھول کر تانگیں پھیلا دیں۔

حاضرین میں سے جس نے بھی سرخ کارڈ دیکھا تھا، ان کی نگاہوں کا مرکز جیری تھا۔ بعض تو اسے نظروں ہی نظروں میں تولنے بھی لگے تھے۔ دو خواتین نے تو لگاوٹ بھری نظروں سے اس کی طرف مسکراہٹیں بھی اچھالی تھیں۔

جامہ تلاشی کے بعد اہلکار نے سرخ کارڈ اسے واپس تھماتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”پہلے عرشے میں کیبن نمبر 8 میں رپورٹ کرو۔“ واضح طور پر اس نے جیری کو غیر ملکی ہی سمجھا تھا۔ اپنے بہروپ کی کامیابی پر جیری کے اطمینان میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سیڑھیاں چڑھ کر شپ پر آ گیا۔

شپ پر اس کا پہلا استقبال میوزک کی آواز نے کیا۔ وسیع عرشے پر میزیں لگی تھیں جن پر درجنوں زن و مرد براجمان تھے۔ سامنے اسٹیج تھا جس پر تین لڑکیاں فلمی میوزک پر تھرک رہی تھیں۔

عیاشی اور تفریح کے لیے مخصوص اس شپ کی یہ ”یلو انٹری“ تھی جو سب سے کم درجہ تھا۔ اس کے بعد سبز اور اس سے بھی اوپر ”گولڈن“ انٹری بھی تھی۔ ”ریڈ انٹری“ شپ کے نیچے وسیع و عریض تہ خانوں کے لیے تھی۔ جہاں غیر قانونی کھیلوں کا انعقاد ہوتا تھا جن میں سرفہرست فری ریسلنگ کے مقابلے ہوتے تھے۔ ریڈ کارڈ کے حامل ان مقابلوں میں براہِ راست حصہ لے سکتے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی نامور اسٹریٹ فائٹرز ان مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان مقابلوں پر ہونے والا سٹا بعض اوقات کروڑوں روپے تک چلا جاتا تھا۔ خاص خاص موقعوں پر غیر ملکی مہمان بھی یہ مقابلے دیکھنے اور سٹا لگانے کے لیے آتے تھے۔

جیری نے اطراف پر نظر دوڑائی۔ کیبن نمبر 8 سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کیبن میں چلا گیا۔ کیبن فرش میں نصب فولادی فرنیچر سے آراستہ باقاعدہ دفتر سا لگتا تھا۔ فولادی میز کے عقب میں بھاری جسم کا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا جس کے سیاہ رو چہرے پر زخموں اور کٹ کے درجن بھر سے زائد نشان تھے۔ تمغوں کی طرح سجے یہ نشان اس کے گزرے کل کی داستان سنا رہے تھے۔

جیری اُسے جانتا تھا۔ جیلو دادا کے نام سے معروف یہ شخص ممبئی کا مانا ہوا چاقو باز تھا۔ اب غالباً ریٹائر ہو کر اس کرسی پر بیٹھا تھا۔ جیلو دادا کے پہلو میں ایک سانڈ کے مانند پلا ہوا نوجوان ایسے انداز میں کھڑا تھا کہ تنگ جینز اور ٹی شرٹ میں اس کے ورزشی جسم کے رگ و پٹھے خوب نمایاں تھے۔ دونوں کی نظریں جیری پر تھیں۔

جیری نے افریقی لہجے اور انگریزی میں کہا۔ ”ہیلو، میں چیڈوک ہوں۔ ماریطانیہ سے یہاں کچھ پیسے کمانے کے لیے آیا ہوں۔“

جیلو دادا نے اس پر نظریں جمائیں۔ ”ویزا لے کر آئے ہو؟“

جیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں...... لنکا سے فیری کے ذریعے۔“

”اپنے ملک سے بھاگے ہوئے ہو؟“

جیری نے سرخ کارڈ نکال کر میز پر رکھا۔ ”مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں صرف ”کام“ کی بات ہوتی ہے۔“

جیلو دادا نے دور سے ہی کارڈ پر نظر ڈالی۔ اس کا

pklibrary.com

مفروضہ تھا کہ اپنے ملک سے بھاگا ہوا ایک جرائم پیشہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔ ”سوری مسٹر چیڈوک، مجھے سوالات کرنے کا واقعی کوئی حق نہیں ہے۔“ پھر اس نے لہجہ بدلا۔ ”پیسا کمانے کی خواہش اچھی بات ہے مگر میں افریقہ کے درجنوں اسٹریٹ فائٹرز کو شکل سے پہچانتا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر شناسائی کا کوئی تاثر نہیں ابھر رہا۔ میں نہیں چاہتا تمہاری واپسی اسٹریچر پر ہو۔“

اس دوران جیری ایک کرسی پر بے پروائی سے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سوچا اگر مجھے پہچان لیتے تو اب تک تمہارا پیشاب خطا ہو چکا ہوتا۔ زبان سے وہ بولا۔ ”شکل پر نہ جاؤ، چاہو تو میرا ”کام“ دیکھ سکتے ہو۔“

جیلو دادا کے چہرے پر دلچسپی نمایاں ہوئی۔ ”تمہاری خود اعتمادی متاثر کن ہے۔“ پھر اس نے اپنے پہلو میں کھڑے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ روفی ہے۔ ہمارا ایک قابل اعتماد لڑاکا۔ اگر تم تین منٹ تک اس کے سامنے ٹک جاؤ تو میں، بی کیٹگری میں لے سکتا ہوں تمہیں۔ اپنی مرضی سے لڑو تو فی فائٹ ایک لاکھ ہندوستانی روپیا اور ”ہماری مرضی“ سے لڑو تو دو لاکھ۔“

جیری نے جیلو دادا کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں اور میز پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر اسے میں تیس سیکنڈ سے کم وقت میں ڈھول چٹا دوں تو اے کیٹگری مل سکتی ہے مجھے؟“

جیلو دادا نے چونک کر اسے دیکھا جبکہ روفی کے چہرے پر خون کی گرمی چمک اٹھی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا مگر حکم کا غلام تھا، خاموش رہا۔

جیلو دادا نے نظروں میں اسے تولنے کی کوشش کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔ ”اپنا دعویٰ سچ ثابت کرو تو اے کیٹگری تمہاری۔ اور اگر تم بڑبولے ثابت ہوئے تو روفی کے ہاتھوں ہونے والی اپنی ٹوٹ پھوٹ کے خود ذمے دار۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے روفی کی طرف دیکھا جس نے دانت نکال دیے تھے۔

جیری نے کرسی چھوڑی۔ ”یہیں یا کہیں اور چلنا ہے؟“

اس کے اعتماد نے جیلو دادا کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اگر واقعی یہ لڑکا اتنا اچھا فائٹر تھا تو تہلکہ مچا سکتا تھا۔

اس دفعہ روفی کو خود پر قابو نہ رہا۔ وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ”چھری کے نیچے دم تولے کا لیے، تھوڑی دیر میں تیری بیکٹری ناک کے راستے باہر آ جائے گی۔“

جواب میں جیری نے مسکرا کر اسے نظر انداز کر دیا۔ اس مسکراہٹ نے روفی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

پندرہ منٹ بعد وہ تینوں جہاز کے تہ خانوں والے پورشن میں تھے۔ ایک وسیع تہ خانہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہاں جمنازیم بھی تھا جہاں درجن بھر سے زائد فائٹرز روزمرہ کی مشقت میں مصروف تھے۔ ایک طرف رنگ بنا ہوا تھا۔ جہاں ایک تومند گنجا ٹریز ایک فی میل فائٹر کے ساتھ مصروف تھا۔ نیکر میں ملبوس سفید فام فائٹر اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کا خوب استعمال کر رہی تھی۔ اس کی ربڑ بین میں جکڑی سنہری پونی ٹیل بار بار ہوا میں لہراتی تھی اور ٹریزا اپنے چہرے کی طرف لپکتی اس کی ٹانگ کو بازو پر چڑھے ”گارڈ“ پر روک لیتا تھا۔ ایک مخصوص داؤ کی پریکٹس چل رہی تھی۔

یہاں ان تینوں کو دلچسپی سے دیکھا گیا تھا۔

انہیں رِنگ پر چڑھتا دیکھ کر گنجا ٹریزا اور لڑکی نے اپنی مشق روک دی اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

جیلو دادا نے بلند آواز میں کہا۔ ”مجھے تھوڑی دیر کے لیے یہ رِنگ خالی چاہیے۔ یہاں ان دونوں فائٹرز کے درمیان ایک دوستانہ مقابلہ ہونے جا رہا تھا۔“

گنجے نے تنے ہوئے رسوں کے درمیان سے جھک کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں، ہمارا سیشن تو ویسے بھی ختم ہونے جا رہا تھا۔“

لڑکی نے البتہ حلق سے ایک للکاری جیسی پرجوش آواز نکالی تھی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے روفی اور جیری کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے مشقت سے تمتماتے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بڑی بے باکی سے روفی کو آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ ”دھیان سے روفی! اس لڑکے میں زبردست قسم کا ”اسپارک“ نظر آ رہا ہے مجھے۔“

روفی نے رِنگ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”نکالتا ہوں اس کا اسپارک ابھی۔“

لڑکی نے ایک گرسنہ نظر جیری کے جسم پر ڈالی۔ ”لڑکے! یہ چشمہ مجھے تھما دو۔“

جیری نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ گریبان میں اُڑسا چشمہ لڑکی کو تھما دیا۔ وہ بھی رِنگ سے باہر نکل گئی۔

جیلو دادا کی بلند آواز نے سبھی کو متوجہ کر لیا تھا۔ اپنی مشقیں چھوڑ کر فائٹرز رِنگ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ جیری اجنبی تھا۔ ظاہر ہے ان کی تمام تر سپورٹ روفی کے لیے تھی۔ ان کے فحش اور تضحیک آمیز فقروں کو نظر انداز کرتا ہوا جیری رِنگ میں آ گیا۔ روفی پہلے سے ہی رنگ میں تھا۔

جیلو دادا نے ایک اسٹاپ واچ طلب کی اور پھر خود بھی رِنگ میں داخل ہو گیا۔ ”ٹانگوں کے درمیان کوئی ضرب نہیں

لگائے گا۔ اس کے علاوہ اس فائٹ کے کوئی اور ضوابط نہیں ہیں۔"

لڑکی دوبارہ اچھل کر رِنگ پر چڑھ آئی تھی اور رسّے کو تھام کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی نگاہوں کا محور جیری تھا۔ واضح طور پر وہ، اس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کا گنجا ٹریزبھی ایک طرف سینے پر ہاتھ باندھے مقابلہ شروع ہونے کا منتظر تھا۔

جیلو دادا نے ریفری کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے ان دونوں کے درمیان بازو وا کر کے ایک، دو، تین بولا اور ایک سنسنی خیز مقابلے کا آغاز ہوگیا۔

روفی ایک محتاط اور ٹھنڈے دماغ کا لڑاکا تھا مگر اس "نئے لڑکے" نے جس انداز میں اس کو نیچا دکھانے کا کہا تھا، اس نے روفی کے دماغ کو سلگتے ہوئے انگارے میں تبدیل کر دیا تھا۔ چھوٹتے ہی وہ توپ کے گولے کے مانند جیری کی طرف آیا۔ اس کے ہتھوڑے کے مانند برستے گھونسوں کو جیری نے دائیں، بائیں کٹ کر اور بازوؤں پر روکا۔ ساتھ ہی اس نے پاؤں سے جیری کے گھٹنے کے عقب میں ضرب لگانا چاہی تو جیری طرح دے گیا مگر اس کوشش میں وہ لڑکھڑایا تو روفی کا ایک گھونسا گردن کے قریب لگا۔ جیری رسّوں سے جا ٹکرایا۔

روفی کے حامیوں نے زوردار تالیوں اور جیری کے لیے تضحیک آمیز جملوں کے ساتھ روفی کو داد دی۔ رسّوں سے ٹکراتے ہی جیری کے قریب ایک سرگوشی ابھری۔ "تم، اسے دھول چٹا سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے تم پر۔" یہ وہی فائٹر لڑکی تھی۔

اس ضرب نے روفی کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر ڈکراتا ہوا جیری کی طرف دوڑا۔ اس کا ارادہ جیری کے سینے پر بازو کی زوردار ضرب کے ساتھ اسے رِنگ سے باہر پھینکنے کا تھا مگر اگلے ہی لمحے جو کچھ ہوا، وہ حاضرین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

جیری برق کی طرح خود پر جھپٹتے روفی کی طرف لپکا۔ اسی پل اس کا جسم قوس کے مانند لہرایا۔ ہوا میں اچھل کر نیچے آتے ہوئے اس کا پاؤں روفی کی گردن کے عقب میں پڑا اور اسے ساتھ لیے نیچے آیا۔ اگلے ہی پل روفی منہ کے بل رِنگ میں پڑا اینٹھ رہا تھا۔ جیری متوازن ہو کر اپنے قدموں پر آ گیا۔

حاضرین میں سے کئی کے دہن سے تحیر آمیز آوازیں بلند ہوئیں۔ جیلو دادا بھی اسٹاپ واچ ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا کھڑا تھا۔

روفی چند لمحے اینٹھنے کے بعد بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ پاؤں کے بعد رِنگ کے فرش کی دہری ضرب نے اس سے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔

جیلو دادا نے اسے سیدھا کیا تو اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ زندہ تھا۔ جیری چاہتا تو یہ ضرب اس کی گردن بھی توڑ سکتی تھی۔

جیلو دادا نے بلند آواز میں جیری کی فتح کا اعلان کیا۔ حاضرین نے اس دفعہ کھلے دل سے جیری کے لیے تالیاں بجائی تھیں۔ چند لمحے پہلے جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا، اس نے جیری کی "کلاس" ثابت کر دی تھی۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ جوش سے تالیاں پیٹتی فائٹر لڑکی رِنگ میں داخل ہوئی اور جیری کے گلے لگ گئی۔ اگلے ہی پل اس نے جیری کو چوم لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" بوکھلا کر جیری نے اسے دور ہٹایا۔ لڑکی کی حرکت نے چھوٹے سے مجمع کو شوخ کر دیا۔ اس دفعہ "ہو...... ہائے" کے شور نے تہ خانہ سر پر اٹھا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جیری اور جیلو دادا ایک آراستہ و پیراستہ آفس نما کیبن میں تھے۔ یہاں انتظامیہ کے دو اور فرد بھی موجود تھے۔ چہرے مہرے سے وہ بھی جیلو دادا کے قبیل کے ہی لگتے تھے۔ یہاں جیری نے باقاعدہ ایک معاہدہ سائن کیا اور اسے براہِ راست اے کیٹگری کے مقابلوں میں حصہ لینے کا اہل قرار دے دیا گیا۔

طے شدہ معاوضے کا ایک حصہ "ٹیکو کرنسی" کی صورت میں جیری کے حوالے کر دیا گیا۔ پلاسٹک کے یہ چھوٹے چھوٹے چپس ہی تفریح اور عیاشی کے لیے اس شپ پر کرنسی کے طور پر استعمال ہو سکتے تھے۔ رہنے کے لیے ایک کشادہ کیبن بھی بالائی عرشے پر جیری کے حصے میں آیا تھا۔

جیلو دادا، اسے خود کیبن تک چھوڑنے آیا۔ کیبن میں آتے ہی وہ پھیل کر ایک دیوار گیر صوفے پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بولا۔ "بھئی، میں پہلی دفعہ تمہارے کیبن میں آیا ہوں، مجھ سے کچھ پینے، پلانے کا تو پوچھ لو۔"

جیری نے چیڈوک کا بہروپ جاری رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ میں یہاں کے معاملات سے واقفیت نہیں رکھتا۔ کیا ہمیں کچھ لینے کے لیے بار روم تک جانا ہوگا؟"

جیلو دادا نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "نہیں میرے بچے، تم دنیا بھر کی ہر نعمت اس کیبن میں بھی منگوا سکتے ہو۔" اس نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پڑے ایک انٹرکوم کی

pklibrary.com

طرف اشارہ کیا اور پھر ایک آنکھ دبائی۔ ''تمہاری جیب میں پیسا ہے ''ہر چیز'' سمجھتے ہو نا تم؟''

جواب میں جیری نے دانت نکالتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

جیلو دادا کی فرمائش پر اس نے روم سروس کو مہنگی ترین جن کا آرڈر دیا۔ اپنے لیے اس نے کم پوائنٹ الکوحل والی بیئر منگوائی تھی۔

روم سروس کے لیے آنے والی ایک پٹاخا سی مدراسی لڑکی تھی۔ جس کا سڈول جسم سفید رنگ کی چست وردی میں پھنسا پھنسا سا تھا۔

اسے دیکھ کر رنگین مزاج جیلو دادا نے گول گول آنکھیں گھمائیں اور لڑکی جب سرو کر کے جانے لگی تو بے تکلفی سے اس کی پشت پر ایک چپت لگاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''کیا مست چھوکری ہے۔'' بظاہر اس حرکت کا لڑکی نے بُرا نہیں منایا اور مسکراتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی۔

جن حلق سے اترتے ہی جیلو دادا کی ورم زدہ آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے اور اس کی زبان قینچی کے مانند چلنے لگی۔ جیری صرف ''ہوں...... ہاں......'' کرتا رہا۔

جیلو دادا کو اس بات کا احساس ہوا تو اس نے حسب عادت اپنی نگاہیں اس پر جمائیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا تجربہ ہے کہ تم بے حد گہرے ہو۔ اب تک کی گفتگو میں، میں نام کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جان پایا۔'' پھر اس نے اپنے صندوق جیسے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''جیلو دادا، یاروں کا یار ہے! تم کھب سے گئے ہو دل میں۔ کھل جاؤ...... دادا تمہیں ہاتھ کے چھالے کے مانند رکھے گا۔ کوئی مائی کا لال تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ قانون، شانون سب اپنے گھر کی لونڈی ہے...... سمجھے۔'' جن نے معدے میں جاتے ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔

جیری کو اندازہ ہو گیا کہ وہ، اس کے ماضی کے بارے میں تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ تجسس کوئی بھی رنگ دکھلا سکتا تھا۔ اسے مطمئن کرنا ضروری تھا۔ اس نے بیئر کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''تمہارے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں۔'' پھر وہ قدرے تردد سے بولا۔ ''میرے بارے میں جتنا کم جان پاؤ گے، میرے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔ یوں سمجھو موریطانیہ کی پولیس کے علاوہ انٹرپول کو بھی میں مطلوب ہوں۔ ایک بڑی ذاتی دشمنی بھی پوری طاقت سے میرے تعاقب میں ہے۔''

اس کے چپ ہوتے ہی جیلو دادا نے اپنا جال پھیلایا۔ ''تم، میرے پاس رہ جاؤ۔ تمہیں ''نکھار'' کر بہت بڑا اسٹریٹ فائٹر بنا دوں گا۔ آج سے تمہارا دشمن میرا دشمن شمار ہو گا۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اس کے بعد پورے ممبئی کے انڈر ورلڈ کو اپنی پیٹھ پر کھڑا پاؤ گے۔''

جیری کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے۔

لوہے کو گرم دیکھ کر جیلو دادا نے ایک اور ضرب لگائی۔ ''پیسا تمہارا عاشق'' ہو گا۔ پری پیکر حسینائیں، تمہاری راہ دیکھیں گی۔ ایک سپر لگژری لائف تمہاری منتظر ہے۔ میرے بچے! تمہارے چھپے ٹیلنٹ کو میری آنکھ دیکھ رہی ہے۔ روتی ایک منتخب لڑاکا ہے۔ بی، کیٹیگری میں پچھلے تین ماہ سے اس نے کوئی فائٹ نہیں ہاری۔ جس طرح اسے چت کیا ہے تم نے۔ اس لمحے سے میں تمہارا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ لاؤ، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

جیری معاملات کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اس نے تذبذب کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیلو دادا کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''بے شک تمہاری پیشکش بہت بڑی ہے اور تمہارے خلوص سے بھی انکار نہیں ہے مگر مجھے سوچنے کا موقع دو، مجھے یقین ہے تمہارا پلڑا بھاری رہے گا۔''

جیلو دادا کی اچھی بھلی تھیں۔ شکار دام میں آ ہی چکا تھا۔ اس نے فراخ دلی سے کہا۔ ''سوچو، ضرور سوچو...... تمہارے پاس ٹائم ہی ٹائم ہے۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں شیلا کو تمہارے پاس بھیج دیتا ہوں۔ تمہیں یہاں کے طور طریقے بھی سمجھا دے گی اور تنہائی بھی دور کر دے گی۔'' اس نے ایک دفعہ پھر عامیانہ انداز میں آنکھ دبائی۔

جیری جس مقصد کے لیے یہاں آیا تھا، اس میں کسی کو سر پر مسلط نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

جیلو دادا نے پھر اس پر نگاہیں جمائیں اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کہیں اُس رنگ والی گوری کی بے باکی تو نہیں بھا گئی۔''

جیری نے دانت نکالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسی بات نہیں۔ میں ابتدائی دو، تین فائنس تک ''عورت'' سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔''

جیلو دادا نے ستائشی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''اچھی بات ہے۔ جم، تمہارے لیے چوبیس گھنٹے حاضر ہے اور ہاتھ، پاؤں سیدھا کرنے کے لیے وہاں لڑکے بھی ہوں گے۔ میں چلتا ہوں، میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔''

اس کی تقلید میں جیری پہلے ہی اپنی نشست چھوڑ چکا تھا۔ دروازے کے پاس سے جیلو دادا نے رخ پلٹا۔

''تمہاری بہتری کے لیے مشورہ دوں گا۔ برنگ والی لڑکی ضرور تمہارے پیچھے لگے گی۔ اس سے ذرا بچ کر ہی رہنا۔ بڑی تیز طرار چیز ہے۔ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے اور کتر بھی لیتی ہے۔''

''اس مشورے کا شکریہ، میں احتیاط کروں گا۔''

جیلو دادا کیبن سے باہر نکل گیا۔

جیری نے اطمینان سے بستر پر بیٹھ کر انٹرکام پر روم سروس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مترنم سی نسوانی آواز ابھری۔ ''آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

جیری بولا۔ ''میں اپنے ساتھ کوئی ڈھنگ کے کپڑے نہیں لا سکا۔ کیا میرے لیے مناسب کپڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں سر! نسوانی آواز نے خوش دلی سے کہا۔ ''مگر اس کے لیے آپ کو خود ہی تکلیف کرنا ہو گی۔ گراؤنڈ ون پر باقاعدہ ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ آپ وہاں سے من چاہی خریداری کر سکتے ہیں۔''

جیری نے شکریہ ادا کر کے رابطہ منقطع کیا اور نیکر کی جیب میں پڑے ہوئے کوئنز کو سہلاتا ہوا۔ کیبن سے باہر آ گیا۔

باہر تاریکی اتر چکی تھی۔ تاریک سمندر میں تیرتے روشنیوں کے اس جزیرے پر رنگینیاں اپنے پورے شباب کے ساتھ بیدار ہو چکی تھیں۔

موسم خوشگوار تھا۔ سمندری ہوا جذبات کو خوب ترنگ دے رہی تھی۔ زیادہ تر افراد جوڑوں کی شکل میں تھے، فلمی میوزک پر جھوم رہے تھے۔ کچھ اکیلے، دکیلے ہاتھوں میں جام تھامے ریلنگ سے لگے سمندر کی تاریکیوں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔

جیری پہلے عرشے، جسے گراؤنڈ ون بھی کہا جاتا تھا، آیا تو یہاں دلچسپی کے ڈھیروں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر ناچنے والی لڑکیوں کی جگہ فلم انڈسٹری کے دو درمیانے درجے کے کامیڈین جو غالباً میاں، بیوی بھی تھے۔ حاضرین کو اپنے ذومعنی جملوں سے خوب محظوظ کر رہے تھے۔ شوہر، بیوی کو میکے بھیجنا چاہ رہا تھا اور ''شکی مزاج'' بیوی اس کے لیے راضی نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ اُڑتے فقرے جیری کی سماعت سے بھی ٹکرائے۔ اپنے بہروپ کی کامیابی کے لیے اس نے مسکراہٹ دبالی تھی۔ یہ اس کی محتاط فطرت کا تقاضا تھا۔ کوئی بھی دیکھنے والی آنکھ ایک افریقی کو ہندی کے ذومعنی جملوں سے محظوظ ہوتا دیکھ کر حیران ہو سکتی تھی اور حیرانی، ہمیشہ سے تجسس کو جگاتی رہی ہے۔

درمیانے سائز کا ڈپارٹمنٹل اسٹور...... خواتین کی ضروریاتِ زندگی سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے نمبر پر شراب تھی۔ بمشکل ایک کونے میں کچھ مردانہ ملبوسات نظر آئے تو جیری نے ادھر کا رخ کیا۔ جیری ہینگر میں لٹکے کپڑوں کو الٹ پلٹ رہا تھا کہ ایک مانوس نسوانی آواز ابھری۔ ''میں کچھ مدد کروں؟''

جیری نے بے ساختہ نگاہیں اٹھائیں۔ یہ وہی فائٹر لڑکی تھی۔ اس کی سڈول ٹانگیں بلیو جینز میں پھنسی ہوئی تھیں۔ مردانہ ٹائپ کی کھلی شرٹ نے اس کے نشیب و فراز کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کر دیا تھا۔ پونی ٹیل میں جکڑے بال اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ ملیح چہرہ، ہلکی نیلی آنکھیں۔ جیری بے اختیار اسے دیکھے گیا۔ اس کے ہاتھ میں جیری کا ہی چشمہ تھا۔ جسے وہ ہلکے سے گھما رہی تھی۔

جیری کی محویت کو محسوس کر کے وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ اپنی قوتِ تسخیر پر اس کا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ وہ جیسے ہوا میں لہراتی ہوئی جیری کے قریب آ گئی۔

جیری نے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ضرور، مگر تم Kiss تک کر چکی ہو مجھے اور ابھی تک ہم متعارف بھی نہیں ہوئے، کتنی عجیب بات ہے۔''

اس لمحے کا خیال بھیگی پھوار کے مانند لڑکی کے چہرے پر اترا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''میں، کیلین بر ہو۔ تم کیلی کہہ سکتے ہو مجھے۔ میرا تعلق آسٹریلیا سے ہے مگر انڈیا، میرا فیورٹ ملک ہے۔ میں یہاں آتی، جاتی رہتی ہوں اور ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان بھی بول لیتی ہوں۔'' اس نے ایک ہی سانس میں اپنا طویل تعارف کروا دیا۔

جیری نے اس کا گداز ہاتھ تھام لیا۔ میں، چیڈوک ہوں۔ میرے خیال میں اتنا کافی رہے گا۔'' اس نے کیلی کے دوسرے ہاتھ میں سے چشمہ پکڑ لیا۔

کیلی نے کندھے اچکائے۔ ''جیسے تم مناسب سمجھو، مجھے صرف تمہاری دوستی عزیز ہے۔'' باقی اس کے ہاتھ نے جیری کو بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ خوب گھل مل گئے۔ کیلی، اس سے بطور فائٹر خاصی متاثر تھی۔ جیلو دادا کی طرح اس کا بھی خیال تھا کہ جیری ''اسٹریٹ فائٹ'' کی دنیا میں تہلکہ مچا سکتا ہے۔ کپڑے پسند ہونے، ٹرائی روم میں تبدیل ہونے اور رقص کا ایک دور لینے کے بعد جیری جان چکا تھا کہ کیلی کے اس کے قریب آنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کا اور جیلو دادا کا

pklibrary.com

طریقہ مختلف تھا مگر مقصد ایک ہی تھا۔

بالائی عرشے پر ڈنر کرتے ہوئے جیری، کیلی کی خود سپردادا‌ؤں کے سامنے ہتھیار پھینکنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

وہ رات کیلی نے جیری کے کیبن میں گزاری تھی۔

☆☆☆

شہر میں جگہ جگہ نصب سیکیورٹی کیمروں کے علاوہ ہر وہ کیمرا جو انٹرنیٹ سے منسلک تھا۔ اس کے مالک کی بے خبری میں ''را'' اسے بھی استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ایک سیکیورٹی کیمرے نے دونوں ماروتی کے تقریباً ''چپک'' جانے اور پھر پیچھے والی ماروتی کے درمیان سے فولادی راڈ، جس کے اوپر والے پلیٹ نما حصے پر سیاہ رنگ کا میگنٹ بم رکھا ہوا تھا۔ آگے والی ماروتی کے نیچے غائب ہونے کا منظر ریکارڈ کر لیا تھا۔ وہ راڈ جب واپس آئی تو میگنٹ بم غائب تھا۔

امیت کمار کے آخری الفاظ بھی ریکارڈ پر تھے۔ پیچھے والی ماروتی میں اس نے جیری کو شناخت کر لیا تھا اور یہی شناخت را کے ہیڈ کوارٹر کو... تباہی سے بچا گئی۔

فرانزک رپورٹ کے مطابق میگنٹ بم میں نصب ایک چپ نے بم کے ایکٹو ہونے کے بعد جیسے ہی رفتار زیرو ہوئی تھی، بم کو پھاڑ دینا تھا۔ جس چوراہے پر بم ماروتی میں نصب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد را کے ہیڈ کوارٹر تک درمیان میں کوئی ٹریفک سگنل نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ ماروتی کو زیرو لیول کی بریک ہیڈ کوارٹر کی پارکنگ میں ہی لگتی۔

امیت کمار ایک کائیاں شخص تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ماروتی کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس لیے اس نے ڈرائیور کو رکنے کا کہا تھا مگر اس وقت تک فرشتہ اجل اس کی طرف جست بھر چکا تھا۔

سیکیورٹی کیمروں سے جیری والی ماروتی کے کئی فوٹیج ملے تھے۔ دو، تین میں جیری بھی نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔ پورے شہر میں ماروتی اور جیری والے حلیے جیسے شخص کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔

کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد جیری کے حلیے والے تین مشکوک افراد بھی را کے ہیڈ کوارٹر لائے جا چکے تھے جن میں سے کوئی بھی جیری نہیں ثابت ہوا تھا پھر جیری والی ماروتی کا بھی سراغ مل گیا۔ وہ پرانی دہلی کے دھوبی گھاٹ کے ایک گدلے پانی والے تالاب میں پائی گئی تھی۔

ممبئی کے ڈیسک نے بھی خاطر خواہ کارکردگی دکھائی تھی۔ کالی کٹ سے آنے والی ٹرین اور پھر ممبئی ریلوے اسٹیشن پر انہوں نے جیری کے فوٹیج حاصل کر لیے تھے۔ ممبئی میں بھی اس نے اپنا حلیہ برقرار رکھا تھا البتہ اس نے اسٹیشن کے قریب ایک سرائے میں نہا دھو کر کپڑے صاف ستھرے پہن لیے تھے۔

جگہ جگہ لگے کیمرے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ متعدد پراپرٹی ڈیلرز سے ملا اور ایک کثیر المنزلہ بلڈنگ میں ایک ماہ کے ایڈوانس کرائے کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ لینے میں کامیاب رہا۔ بلڈنگ کے کیمروں نے اسے متعدد دفعہ بلڈنگ سے نکل کر سامنے والے ریستوران میں جاتا دکھایا۔ ریستوران میں لگے کیمروں میں بھی اس کی واضح فوٹیج تھی۔

پھر ایک رات اچانک اس نے اپارٹمنٹ چھوڑ دیا۔ اپنے بیگ کے ساتھ وہ خاصی عجلت میں تھا۔ آخری دفعہ اسے دھرم شالا کی جھونپڑ پٹی کے نزدیک ایک بیکری کے کیمرے نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

اب اسے ایک نئے حلیے کے ساتھ دہلی میں دیکھا گیا تھا جہاں امیت کمار وارد ہوا تھا وہ دوبارہ سے کسی جن کے مانند غائب تھا۔

مزید پیش رفت کی خاطر جیری کے یورپین سیاح والی فوٹیج ممبئی ڈیسک کو بھیج دی گئی تھی۔ دہلی میں بھی اس سے ملتے جلتے حلیے والے شخص کی تلاش ہنوز جاری تھی۔

آنند راؤ کا دماغ برقی گھوڑے کے مانند بیک وقت مختلف سمتوں میں دوڑ رہا تھا۔ جیری نے ممبئی والا اپارٹمنٹ خاصی عجلت میں چھوڑا تھا۔ اس حوالے سے اس نے متعلقہ پراپرٹی ڈیلر یا مالک کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ دونوں بھی اب زیر تفتیش تھے۔

بلڈنگ سے نکلتے ہوئے جیری کے انداز میں واضح عجلت تھی۔ سیکیورٹی کیمروں کا یقیناً اسے بھی اندازہ تھا۔ غالباً اس لیے اس نے ایسے علاقے کا رخ کیا تھا جہاں ان کیمروں کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ یقیناً یہاں اس نے اپنا حلیہ دوبارہ سے تبدیل کیا تھا اور سیکیورٹی کیمروں کو دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔

جیری کا اچانک اپارٹمنٹ چھوڑنا، آنند راؤ کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ بادی النظر میں تو یہی لگ رہا تھا کہ اسے کسی طرح سے یہ خبر مل گئی تھی کہ ''را'' اس کی موجودگی سے واقف ہو گئی ہے۔ اگر ایسا تھا تو یہ سسٹم کی تباہ کن خامی تھی۔ ایسا کسی کالی بھیڑ کے سبب ہی ممکن تھا۔

pklibrary.com

ایک خیال آنے پر آنند راؤ چونک سا گیا۔ اس نے کالی کٹ سے آنے والی رپورٹ کا دوبارہ جائزہ لیا۔ رپورٹ دیکھتے ہی اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ کالی کٹ سے رپورٹ ہیڈ کوارٹر کو موصول ہونے کے ٹھیک دس منٹ کے اندر ہی جیری نے ممبئی والا اپارٹمنٹ چھوڑ دیا تھا۔ خون، آنند راؤ کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ یقیناً ہیڈ کوارٹر میں کوئی کالی بھیڑ تھی جس نے اس رپورٹ سے متعلق جیری کو خبردار کر دیا تھا جس کے سبب اس نے فوراً اپنا ٹھکانا تبدیل کر دیا تھا۔

اس نے فون پر فوراً شیر دل کو اس یقینی خدشے سے آگاہ کیا تو وہ بھی اس خیال سے متفق ہو گیا۔ اس بارے میں تفتیش شروع ہوئی تو یہ نااہلی سامنے آئی کہ متعلقہ تین افراد سے یہ خبر سینہ گزٹ کے سبب ہیڈ کوارٹر کے نچلے درجے کے ملازمین تک پھیل چکی تھی۔ یہ ایک ہاٹ خبر تھی جو بھی جیری کے نام اور کام سے واقف تھا، اسے اس خبر سے خاصی دلچسپی تھی۔

آنند راؤ ہاتھ مسلتا رہ گیا۔ کمپیوٹر سیکشن سے متعلقہ افراد پرانے تھے اور ان کی وفاداری ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ وہ صرف اپنے حلقوں میں زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکے تھے۔ ان کی سرزنش کر کے آئندہ محتاط رہنے کی وارننگ دی گئی۔

آنند راؤ کی سوچوں کا سلسلہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ ممبئی سے دہلی کا طویل سفر اور پھر چند گھنٹوں ہی میں آنند راؤ پر کامیاب وار...... جیری اتنی جلدی آکر ماروتی کا بندوبست، اس میں مطلوبہ ٹیکنیکل تبدیلی اور سب سے بڑھ کر امیت کمار کی ریکی نہیں کر سکتا تھا۔

آنند راؤ سیدھا ہو بیٹھا۔ یقیناً ماروتی کا بندوبست وغیرہ اور امیت کمار کی ریکی کسی ''اور'' نے کی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ جیری اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں جن سے اس کا رابطہ تھا اور وہ اس کے سہولت کار تھے مگر سامنے میز پر رکھی ایک مختصر سی فائل اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

جدید ترین ''وائس میچ'' سسٹم نے کسی بھی لینڈ لائن یا سیلولر نٹ ورک میں جیری کی آواز نہیں پکڑی تھی۔ وہ جتنی بھی آواز تبدیل کرنے کی کوشش کرتا، سپر کمپیوٹر سے منسلک اس سسٹم کو دھوکا دینا ناممکن تھا۔

آنند راؤ کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ جیری کوئی بھی مقامی سیلولر نیٹ ورک استعمال نہیں کر رہا تھا۔

ایک خیال آنے پر اس نے را کے مواصلاتی ونگ کے انچارج سے رابطہ قائم کیا اور چھوٹتے ہی کہا۔ ''مجھے گزشتہ 48 گھنٹوں میں دہلی سے ہونے والی ہر سیلائٹ فون کال کا ریکارڈ چاہیے۔''

''انچارج انڈو 3 اور انڈو 4 کے لنک سے ہونے والی ہر لیگل کال کا ریکارڈ...... 30 منٹ میں آپ کو مل جائے گا۔''

آنند راؤ کا حلق کڑوا ہو گیا۔ ''اِن لیگل کالز کے ریکارڈ کے لیے مجھے آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر سے مدد لینی ہوگی۔''

''آپ ناراض ہو گئے صاحب! میرا ونگ اپنی صلاحیت کے مطابق ہی کام کر رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے سفارت خانے اپنے سیلائٹ کے تھرو اپنے ممالک سے رابطے میں رہتے ہیں۔ وہاں تک میری رسائی نہیں ہے۔''

آنند راؤ نے جھنجلا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

دماغ چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ جیری بھرپور تیاری کے ساتھ انڈیا میں نازل ہوا ہے۔ جیری ہمیشہ سے ایک قدم آگے رہتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

اچانک ہی ایک نیا خیال برق کوندے کے مانند آنند راؤ کے دماغ میں لپکا۔ کالی کٹ سے جیری، ممبئی کیا کرنے گیا تھا؟ جبکہ اس کا ٹارگٹ تو نئی دہلی میں تھا پھر جیسے ہی اسے یہ خبر ملی کہ را اس کی انڈیا میں آمد سے واقف ہو گئی ہے۔ وہ ممبئی سے سیدھا راجدھانی آ ٹپکا اور امیت کمار کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

سوال یہ تھا کہ کالی کٹ سے براہِ راست راجدھانی آنے کے بجائے وہ ممبئی کیوں گیا اور اپنی موجودگی آشکار ہوتے ہی راجدھانی آ گیا۔ وہ براہِ راست کالی کٹ سے راجدھانی کیوں نہیں آیا؟

آنند راؤ کا دماغ تیزی سے دو جمع دو...... چار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ، شیر دل کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''میں ممبئی جا رہا ہوں۔ وہ یہاں نہیں ملے گا۔''

شیر دل حیران ہوا۔ ''ممبئی میں صرف خاک چھاننے کو ملے گی۔ میں نے شردھا سنگھ والے کیس سے وابستہ سبھی لوگوں کے گرد جال بچھا دیا ہے۔ یہاں رہ کر اس جال کا شکنجہ سخت کرو، امیت کے بعد وہ جیسے ہی کسی اور کو نشانہ بنانے کی

کوشش کرے گا، گرفت میں آجائے گا۔'' آخر میں اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔

آنند راؤ کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ''وہ بھنکا رہا ہے ہمیں۔ وہ بھرپور تیاری کے ساتھ آیا ہے اور مجھے یقین ہے اس کے ساتھ اس کی گروہی ٹیم بھی ہے۔ میں اس کے کام کرنے کے طریقہ کار سے واقف ہوں۔ وہ اپنی ٹیم کو پہلے سے ہراول کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ امیت صاحب والے کیس میں بھی دیکھ لیں، وہ ممبئی سے چلا اور یہاں اس کے لیے تمام انتظامات مکمل تھے۔'' اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ ''وہ ہمیں بھنکا رہا ہے سر، وہ ممبئی میں اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کے لیے موجود تھا جیسے ہی اسے پتا چلا ہمیں اس کی موجودگی کی خبر ہوگئی ہے، اس نے بیک اَپ منصوبے کے تحت راجدھانی آکر امیت صاحب کو نشانہ بنایا۔ ہماری توجہ، طاقت اور افرادی قوت کو اس طرف لگا کر وہ یقیناً اپنے شکار پر نظریں گاڑے رہا۔ اس کا مقصد صرف ذاتی انتقام ہوتا تو وہ کالی کٹ سے سیدھا راجدھانی آتا، ممبئی وہ...... لینے نہیں گیا تھا۔'' روانی میں آنند راؤ کچھ ناقابلِ اشاعت لفظ بول گیا۔

شیروں کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ آنند راؤ کا تجزیہ دل کو لگ رہا تھا۔

اس کے تذبذب کو محسوس کرکے آنند راؤ بولا۔ ''آپ یہاں کا محاذ سنبھالیں۔ میں ممبئی دیکھتا ہوں۔ مقامی ڈیسک کو استعمال کرلوں گا اور آپ ڈوریاں ہلادیں۔ میں چاہتا ہوں ''آئرن مین'' میری میزبانی کرے۔''

''تمہارے دماغ میں آئرن مین والا سوتا کچھ زیادہ ہی گہرائی میں نہیں اتر گیا؟''

آنند راؤ مسکرایا۔ ''ایسا ہی سمجھ لیں، مجھے یقین ہے جیری کی منزل وہی ہے۔''

☆☆☆

جیری اپنا خاص موبائل فون ساتھ لایا تھا۔ کیلی کے جاگنے سے پہلے اس نے اینڈی کو ایک خاص میسج کردیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے جوتے کی ایڑی گھمائی۔ کھوکھلی ایڑی میں اس کی خاص ضرورت کا مختصر سامان تھا۔ اس نے ایک ننھی سی ٹیوب سے بے رنگ جیل نکال کر اپنے ہونٹوں پر لگائی۔ جلن کے احساس کے ساتھ ہونٹوں کی کم ہوتی سوجن بڑھنے لگی۔

باتھ روم کے آئینے میں جیری نے ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیا۔ بالوں کا گھنگھریالا پن برقرار تھا۔ جسم اور چہرے کی رنگت بھی ٹریٹ منٹ نہیں مانگ رہی تھی۔ مطمئن ہوکر اس نے جوتے کی ایڑی اپنی جگہ پر بٹھادی۔

جیری باہر عرشے پر آگیا۔ صبح کی تازہ ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ریلنگ سے لگ کر ان ''سی ایگل'' کا نظارہ کرنے لگا جو جہاز کے وسیع و عریض کچن کے باہر رکھے ڈبوں پر بار بار جھپٹ رہے تھے۔ ان کی تیز آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

شپ کے قریب سے ایک جدید قسم کا درمیانے سائز کا بحری جہاز گزر رہا تھا۔ بگلے جیسے سفید براق جہاز پر یو، این، اے کا مخصوص نشان اور جھنڈا تھا۔ جہاز کے عرشے پر ایک بڑا سا فولادی رسّے کا گولا سا نظر آرہا تھا۔ غالباً یہ جہاز ریسکیو وغیرہ کے لیے تھا۔

آہٹ پر وہ چونکا۔ جیلو دادا قریب آچکا تھا۔ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کیسی گزری رات بچّے؟''

جیری نے دانت نکالے۔ ''اس لڑکی نے مجھے اپنے عہد پر قائم نہیں رہنے دیا۔''

جیلو دادا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اسے بے شک استعمال کرو مگر خود کو استعمال ہونے سے بچاؤ۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

جیری نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

جیلو دادا نے مزید ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''میں نہیں چاہتا یہ لڑکی کسی چکر میں پھنسا دے تمہیں، بہت بڑی قلم ہے یہ۔''

جیری نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''رات اس کی حرکتوں نے مجھے کچھ سوچنے، سمجھنے ہی نہیں دیا، چلتا کرتا ہوں اُسے۔''

''تمہارے حق میں یہی اچھا ہے، میں نیچے جارہا ہوں۔ تم بھی آجاؤ، ذرا مل کر ہاتھ پاؤں سیدھے کرتے ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں ناشتا کرکے آتا ہوں۔''

''ناشتا تو میں نے بھی نہیں کیا، آؤ ساتھ ہی کرتے ہیں۔''

ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے ٹریننگ سینٹر میں آگئے۔ کل والے واقعے کے بعد جیری کی شہرت ہوگئی تھی۔ دیگر فائٹرز اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔

وارم اَپ ہونے کے بعد جیلو دادا اسے رِنگ میں لے گیا اور اپنے تئیں اسے داؤ پیچ سکھانے لگا۔ جیلو دادا کے

ساتھ کھیلتے ہوئے جیری نے محسوس کیا کہ ایک پہاڑ جیسے جسم، گہری سیاہ رنگت اور سرخ آنکھوں والا فائٹر جو غالباً تامل تھا، اسے بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ جیری نے اسے نظرانداز کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تامل فائٹر رِنگ کے نزدیک آ گیا اور جیلو دادا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دادا! اس گدھے کو ذرا میرے ساتھ تو دو، دو ہاتھ کرنے دو۔ رونی کے ساتھ والا بیڈ اس کے لیے خالی پڑا ہے۔'' ہندی میں ہونے والی اس گفتگو سے خود کو لاتعلق ظاہر کرنے کے لیے جیری نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھا۔

جیلو دادا بولا۔ ''تجھ سے آگے کا چھوکرا ہے۔ یہ نہ ہو وہ بیڈ تیرے حصے میں آ جائے۔''

تامل اچھل کر رِنگ میں چڑھ آیا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ پانچ منٹ کی اجازت دے پھر دادا! مدراسی چوڑی نہ بنایا تو اپنی ڈور تیرے ہاتھ دوں گا۔ بے شک بندر کی طرح نچاتے پھرنا۔''

جیری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہہ رہا ہے یہ؟ دیکھ رہا ہوں کافی دیر سے گھور رہا ہے مجھے۔''

جیلو دادا کو تامل کی آفر پسند آ گئی تھی۔ اس نے جیری سے کہا۔ ''یہ لڑنا چاہتا ہے تم سے۔ یہ رونی کا گہرا دوست ہے۔ بڑی ''خفس'' کھائے ہوئے ہے تم پر۔

جیری نے بڑی سختی سے منع کرنے کا ارادہ کیا مگر اچانک ہی اس نے ارادہ بدل لیا۔

درمیانی عمر اور بھاری جسم کا ایک خوب گورا چٹا شخص ابھی ابھی ٹریننگ سینٹر میں وارد ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ٹریک سوٹ تھا اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھرموس لٹک رہا تھا۔ یقیناً وہ شخص ورزش کرنے کی غرض سے آیا تھا۔

جیری اسی گورے چٹے شخص کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس کے ''دیدار'' کی امید ضرورت سے زیادہ ہی جلدی پوری ہو گئی تھی۔ اس شخص کا نام آر۔ ایل۔ ٹوبا تھا۔

ٹوبا جمنازیم والے حصے کی طرف بڑھ گیا۔

جیری نے جیلو دادا سے کہا۔ ''آنے دو اس بڑبولے کو۔ اس کی آنکھوں کی سرخی...... زرد کرتا ہوں ابھی۔'' ساتھ ہی اس نے تامل کو گھورتے ہوئے ایک فحش اشارہ کیا۔

تامل کے تمتماتے چہرے پر زلزلہ سا نمودار ہوا۔ وہ منہ سے ''گند'' اگلتا ہوا اچھل کر رسّے پر چڑھا اور اگلے ہی پل اُڑتا ہوا جیری پر جھپٹا۔

جیری کو اس کے وزن کے سبب اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بمشکل آگے کی طرف گرتے ہوئے خود کو تامل کی زد سے بچایا۔

تامل نے ہوا میں پینترا بدلا۔ وہ پشت کے بل نیچے گرا۔ اگلے ہی پل وہ رول ہو کر دوبارہ سے اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اس کے لیے چند تالیاں بجی تھیں۔

جیلو دادا جلدی سے ایک کونے میں ہو گیا۔ جیری اور تامل آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو تولتے ہوئے مقابل آ گئے تھے۔

رِنگ کے گرد تماشائی اکٹھے ہونے لگے تھے۔ جیری نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ٹوبا بھی اس طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

اس دفعہ بھی حملے میں پہل تامل نے کی۔ اس نے جیری کی ٹانگوں کی طرف جھپٹنے کا جھانسا دیا اور پھر کندھے کی ضرب لگانا چاہی۔ وہ، اس سے دس گنا پھرتی کا مظاہرہ کر کے بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ جیری نے بہترین فٹ ورک کے ساتھ نہ صرف خود کو اس حملے سے بچایا بلکہ اس کا ہاتھ برق کوندے کے مانند لہرا کر تامل کی گدی پر جما تھا اور اگلے ہی پل تامل توپ سے نکلے گولے کے مانند رسّوں سے ٹکراتا ہوا رِنگ سے باہر جا گرا۔

اس دفعہ داد و تحسین اور تالیاں جیری کے حصے میں آئی تھیں۔ جیلو دادا کا جوش و خروش بھی عروج کو پہنچ گیا تھا۔

جیری نے دوبارہ کن انکھیوں سے ٹوبا کی طرف دیکھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

نیچے گرنے کے بعد وہ اچھل کر دوبارہ اوپر آیا۔ اس موقع پر جیری چاہتا تو محض ٹانگ کی ایک ضرب سے اسے دوبارہ رِنگ بدر کر سکتا تھا مگر اس نے تامل کو رِنگ میں آنے کا موقع دیا۔

یہی وقت تھا جب کیلی ٹریننگ سینٹر کے دروازے پر نظر آئی۔ وہ نہا کر بڑی اجلی اجلی سی نظر آ رہی تھی۔ صورتِ حال کا ادراک ہونے میں اسے لحظہ لگا پھر اچانک اس کی نظر ٹوبا پر پڑی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ یہ بڑی ہیجانی تبدیلی تھی۔ حیرت انگیز طور پر رِنگ کی طرف آنے کے بجائے وہ، ٹوبا کی طرف بڑھ گئی۔

اگلے تیس سیکنڈ میں جیری نے تامل کی کئی ضربات کو بلاک کیا تھا۔ اس بات نے تامل کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے دفاع سے بالکل ہی غافل ہو گیا تھا۔ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ اور پرکھ رہی تھیں کہ جیری، اس سے چوہے

بلی کا کھیل، کھیل رہا ہے۔

اگلے چند لمحوں میں اس کھیل کا اختتام ہو گیا۔ اپنے سینے کی طرف آتی تامل کی برق رفتار ٹانگ کو جیری نے ہوا ہی میں تھام کر بے توازن کر دیا۔ تامل کے نیچے گرنے سے پہلے جیری کا پاؤں اس کے منہ پر وزنی ہتھوڑے کے مانند لگا۔ تامل کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ اس کے منہ سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا تھا۔ دو، تین دانت بھی یقیناً اسے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو جیری نے اس کے گھٹنے پر ضرب لگا کر دوبارہ گرا دیا اور اس کا ایک بازو تھام کر مروڑا تو وہ ذبح ہوئے بکرے کے مانند تڑپنے لگا۔ گند اُگلنے والے منہ سے خون اور کراہیں نکل رہی تھیں۔

جیری نے بازو کو ایک اور چکر دیا تو کراہیں، چیخوں میں بدل گئیں۔ اس نے تیزی سے فرش پر ہاتھ مار کر اپنی شکست تسلیم کر لی۔

جیلو دادا نے آگے بڑھ کر جیری کو روکا۔ ”بس کر میرے بچے! اس کے لیے بہت ہو گیا ہے۔“ ہیجان کے سبب اس کی آواز لرز رہی تھی اور بھی کئی افراد رِنگ میں آ گئے تھے۔

جیری نے تامل کا ہاتھی کی سونڈ جیسا بازو چھوڑ دیا۔ اس نے دیکھا کہ کیلی اور ٹوبا تیزی سے ٹریننگ سینٹر کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ کیلی مسلسل بولے جا رہی تھی اور اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

جیلو دادا سے بمشکل جان چھڑا کر جیری اپنے کیبن میں آیا تو کیلی آ دھمکی۔ آتے ہی وہ گلے کا ہار بن گئی۔

”میں بہت زیادہ خوش ہوں۔“ اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں جیری کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

جیری نے جوابی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس خوشی کی وجہ؟“

”تمہاری پہلی فائٹ کے فوراً بعد میں نے انڈیا کے سب سے بڑے ”فائٹ میکر“ کے سامنے تمہاری بہت زیادہ تعریف کی تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ تم سے مل کر تمہارا ”کام“ دیکھ لے مگر وہ چکنی مچھلی کے مانند ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔“

جیری کے دل کی دھڑکن خفیف سی بڑھ گئی۔ اس نے کیلی کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ”تم خواہ مخواہ میرے لیے ہلکان ہوتی رہیں۔ مجھے کسی فائٹ میکر سے ملنے کی خواہش بھی نہیں ہے۔“

”تم سمجھو گے نہیں بے وقوف، وہ بندہ تمہیں راتوں رات سُپر اسٹار بنا سکتا ہے۔“ کیلی کی زبان فراٹے بھرنے لگی۔ ”خوشی کی بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے اتفاقاً اس بندے نے ٹریننگ سینٹر میں تمہارا کام دیکھ لیا ہے۔ اب وہ خود تم سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ شاید تم نے دیکھا ہو، سفید سور جیسا ایک بندہ بھی وہیں تھا۔ میں اس کے ساتھ تھی۔“

اس کی مثال پر جیری مسکرایا۔ ”ہاں، تمہارے ساتھ دیکھا تو تھا۔“

”تم ابھی میرے ساتھ اسے ملنے کے لیے چل رہے ہو۔“

”میرا، جیلو دادا وغیرہ سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس بندے کی کسی پیشکش کا میں خیر مقدم کیسے کر پاؤں گا؟“ جیری متذبذب ہوا۔

کیلی نے اسے کھینچ کر کھڑا کیا۔ ”تمہارا کام صرف اس بندے سے ملنا ہے۔ معاملات طے ہو گئے تو باقی سب وہ سنبھال لے گا۔“

”مگر......“

کیلی نے اس کی بات کاٹی۔ ”کوئی، اگر، مگر نہیں۔ تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔“ اس نے اٹھلا کر کہا تو جیری نے ہتھیار ڈال دیے۔ منزل خود چل کر اس کی طرف آ رہی تھی۔

وہ کیلی کے ساتھ جہاز کے سب سے اوپری حصے میں آ گیا۔ یہاں خاص، خاص لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں، جنہیں اپارٹمنٹ کہا جاتا تھا۔

ایک گارڈ سے واسطہ پڑنے کے بعد وہ دونوں ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ مکمل پرائیویسی کے ساتھ یہ حصہ شپ سے بالکل علیحدہ تھا۔ ایک دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے جہاز کی ریلنگ کے قریب لان چیئرز اور میز پڑی تھی۔ ٹوبا بنفس نفیس ایک چیئر پر براجمان تھا۔ وہ ابھی تک ٹریک سوٹ میں تھا۔ میز پر اورنج جوس کا جگ اور متعدد گلاس سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ اس منظر سے تھوڑا دور چھوٹا سا گلاس روم اور متعدد کیبن نما رہائشی کمرے نظر آ رہے تھے۔

ٹوبا نے بڑی خوش دلی سے جیری کو خوش آمدید کہا۔ کیلی نے باہمی تعارف کروایا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تو گفتگو کا آغاز ٹوبا نے کیا۔ ”کیلی کے منہ سے تمہاری تعریفیں سن کر میں سمجھا تھا کہ یہ مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہے مگر صبح تمہیں رِنگ میں لڑتا دیکھ کر لگا کہ تمہاری تعریف کرنے میں کیلی نے کنجوسی کا مظاہرہ کیا ہے۔“

کیلی نے مسکراتی نظروں سے جیری کی طرف دیکھا،

جیری بولا۔ ''یہ کیلی اور آپ کی نظروں کا کمال ہے۔ ورنہ مجھ میں کچھ خاص کمال نہیں ہے۔''

ٹوبا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ کمال کی نظریں بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔''

جیری نے ٹوبا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ٹوبا کی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھوں میں ہرگز دوستانہ تاثرات نہیں تھے۔

جیری بولا۔ ''کیا دیکھ لیا ان کمال کی نظروں نے؟''

ٹوبا نے کرسی پر پھیلتے ہوئے دھماکا کیا۔ ''یہی کہ تم نے اپنا حلیہ بدل رکھا ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو دکھانے کی کامیاب کوشش کر رہے ہو۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' جیری جیسے جھٹکے سے اکھڑ کر کھڑا ہوگیا۔ ''کیا کہہ رہا ہے یہ موٹا...... کیلی؟''

جواباً کیلی کے ہاتھوں میں ایک ننھا سا پسٹل چمکنے لگا۔ اس کے تاثرات یکلخت تبدیل ہو گئے تھے اور ہونٹوں پر بڑی پُراسراری مسکراہٹ تھی۔ وہ پسٹل سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس اداکاری کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تمھیں نقصان پہنچانا ہمارا مقصد نہیں ہے۔''

جیری کو اندازہ ہو گیا کہ صیاد خود ہی دام میں آ گیا ہے۔ وہ [illegible] سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے۔'' پھر وہ کیلی سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے ٹریپ کیا ہے مجھے؟''

کیلی بولی۔ ''نہیں، تمہارے بدلے حلیے نے ٹریپ کروایا ہے تمھیں۔'' اس کے پسٹل کا رخ جیری کی پیشانی کی طرف ہوگیا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں سفاکی ہلکورے لے رہی تھی۔ ''ٹوبا سر... کچھ سوالات کریں گے تم سے، سر مطمئن ہو گئے تو دوستانہ ماحول بحال ہو جائے گا ورنہ تمہاری آنکھوں کے درمیان گولی اتارتے ہوئے افسوس ہوگا مجھے۔''

تجزیے نے جیری کو چونکا دیا۔ اس کا جسم سنسنا اٹھا تھا۔ کیلی کا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ گولی چلانے میں وہ ذرا بھی نہیں ہچکچائے گی۔ یقیناً وہ عام لڑکی نہیں تھی۔

ٹوبا بولا۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے، کیلی ایک اسرائیلی ایجنسی کی میک اپ آرٹسٹ کے ساتھ اسسٹنٹ کے طور پر کئی مہینے کام کر چکی ہے۔ اسے تم پر شک ہوا کہ تم نے حلیہ بدل رکھا ہے۔ یہ تمہارے قریب آئی اور جب اس نے ناک کے نتھنے پھلانے والے اسپرنگ دیکھے تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔''

جیری نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی۔ اس نے مشن کے دوران عورت سے دور رہنے کا عہد کیا تھا۔ عہد ٹوٹا تھا تو ساتھ بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

ٹوبا نے مزید کہا۔ ''کیلی کا کہنا ہے کہ تمہارے بال سیدھے کر دیے جائیں۔ نتھنوں سے اسپرنگ نکال دیے جائیں، تمہارے سوجے سوجے ہونٹ معمول پر آجائیں تو ''افریقی'' کے اندر سے ایک خوب صورت ''ایشیائی'' برآمد ہوسکتا ہے۔''

کیلی نے لقمہ دیا۔ ''آنکھوں میں بھی اس نے لینز ڈال رکھے ہیں۔''

ٹوبا نے گلاس میں اورنج جوس انڈیلا اور گلاس جیری کی طرف سرکایا۔ ''کون ہو تم؟'' اس کی چمک دار آنکھوں میں فولاد اتر آیا تھا۔ کیلی کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھ گیا تھا۔ ان اعصاب شکن لمحوں کا سارا دباؤ جیری پر تھا۔

جیری نے اطمینان سے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ''پہلے میں ایک سوال کرنا چاہوں گا تم سے۔'' جیری نے یہ فقرہ ہندی میں ادا کیا تھا۔ ''میرے بدلے ہوئے حلیے سے تمھیں [illegible] ہے؟''

کیلی گرجی۔ ''بکواس بند کرو، جواب دو۔ تمہارے پاس صرف دو سیکنڈ ہیں۔''

ہندی سنتے ہی ٹوبا کے چہرے پر کامیابی چمکی تھی۔ وہ کیلی سے مخاطب ہوا۔ ''اسے تھوڑا وقت دو لڑکی، مجھے یقین ہے یہ تعاون کرے گا۔''

کیلی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ جیری کی سوالیہ نظریں ٹوبا پر جمی تھیں۔ اس نے جوس کا ایک اور گھونٹ لیا۔

ٹوبا بولا۔ ''تم جانتے ہو یہ شپ اس وقت انڈر ورلڈ اور جرائم کی دنیا کے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ ویسے تو یہ انتظامیہ کی ذمے داری ہے کہ وہ مشکوک افراد پر نظر رکھے مگر بہت سے لوگ اپنی سیکیورٹی کے حوالے سے حساس ہوتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ ہمیں اردگرد نظر رکھنا پڑتی ہے۔''

جیری نے اطمینان محسوس کیا۔ یہاں آنے کا اس کا مقصد ٹوبا سے ملاقات ہی تھا۔ یہ مقصد قدرے مختلف طریقے سے پورا ہو گیا تھا۔

ٹوبا کا لہجہ دوبارہ فولادی ہوا۔ ''تمہاری خواہش پوری ہوئی۔ کوشش کرنا یہ خواہش ''آخری'' نہ ثابت ہو...... کون ہو تم؟''

جیری گلاس میز پر رکھتے ہوئے آگے جھکا۔ ''اس کُتیا

pklibrary.com

کو منظر سے غائب کرو، میں تم سے ملنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ اس سرگوشی نے کیلی کو بے چین کر دیا۔ اس نے اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کیا۔

ٹوبا نے ان سنی کر دی۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ ''آخری بار پوچھ رہا ہوں، کون ہو تم؟''

''کیا تم چاہتے ہو تمہارا موتر اس کتیا کے سامنے خطا ہو؟'' اس دفعہ جیری اپنی اصل آواز میں بولا تھا۔

ٹوبا کے چہرے کے عضلات پھڑکنے لگے۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ لیموں کے مانند زرد ہو گیا۔ وہ کیلی سے مخاطب ہوا۔ ''کیلی! تم اندر جاؤ۔''

آنے والی تبدیلی نے کیلی کو بھی ششدر کر دیا تھا۔ وہ، جیری کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی ایک کیبن میں غائب ہو گئی۔

ٹوبا نے ایک ڈری، ڈری سی نظر جیری پر ڈالی۔

''آ...... پ...... جیری صاحب ہی ہیں نا؟''

''کوئی شک؟''

ٹوبا نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔ ماضی کے بہت سے منظر اس کی نظروں کے سامنے ابھر آئے تھے۔ اس نے بیٹھی سی آواز میں کہا۔ ''صاحب، کچھ تبدیل ہو گیا۔ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔''

جیری نے دوبارہ جوس کا گلاس اٹھایا۔ ''تبدیلی تو تجھ میں بھی آئی ہے ٹوبے، میں انڈیا سے بھاگا تو، تُو ایک کنگال فلم ڈائریکٹر کا کنگلا اسسٹنٹ تھا۔ تیرا کام فلم ہیروئن بننے کے خواب دیکھنے والی لڑکیوں کو اپنی چرب زبانی سے رام کر کے ان کی دلالی کرنا ہے۔''

توہین کے احساس سے ٹوبا کا چہرہ سیاہ ... پڑ گیا مگر سامنے بیٹھی شخصیت کے سحر نے اسے مکمل طور سے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

جیری نے ایک گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ ''تین سال بعد واپس آیا ہوں تو، تو انڈیا کا سب سے بڑا فائٹ میکر ہے۔ اسٹریٹ فائٹ کے سجنے والے میلوں میں تیرے فائٹر اکثر نظر آتے ہیں جو تیرے اشارے پر ہارا ہوا مقابلہ جیت بھی سکتے ہیں اور جیتا ہوا ہار بھی...... لڑکیوں کے بعد فائٹرز کی دلالی۔''

''بس کرو، جیری صاحب! اور کتنا ذلیل کرو گے۔''

جیری مسکرایا۔ ''سوری بھول گیا تھا کہ تو اب بہت بڑا آدمی بن گیا ہے آر، ایل ٹوبا صاحب۔''

ٹوبا نے ہاتھ باندھ دیے۔ ''آپ حکم کریں، آپ کے لیے تو صرف ٹوبا ہی ہوں...... پہلے والا۔''

''آپ نے کہا۔ آپ ملنا چاہتے تھے مجھ سے۔'' ٹوبا کے اوسان بحال ہونا شروع ہو گئے تھے۔

جیری اٹھ کر ریلنگ کے قریب چلا گیا۔ خاصے فاصلے پر یو، این، او کا سفید جہاز بھی لنگر انداز تھا۔ خاصے فاصلے سے وہ کھلونے کے مانند نظر آ رہا تھا۔

ٹوبا نے بھی اس کی تقلید کی۔

جیری نے سمندر پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ''تیرا اصل دھندا کیسا چل رہا ہے؟''

''کک...... کیا مطلب؟'' ٹوبا بوکھلا گیا۔

''کک...... کون سا دھندا؟ فائٹنگ کلب والا ہی تو دھندا ہے میرا۔''

''تو جانتا بھی ہے مجھے...... پھر بھی نا سمجھ بن رہا ہے۔ گزشتہ تین مہینوں سے تجھ پر کام ہو رہا ہے۔''

ٹوبا کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

جیری نے ریلنگ چھوڑ کر اس کے کندھوں پر بازو پھیلایا۔ ''چل چھوڑ...... یہ بتا میرے بارے میں، تجھے تازہ ترین جانکاری کیا ہے؟''

ٹوبا نے تھوک نگل کر حلق تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ اڑتی سی خبریں سنی تھیں۔ انڈیا سے بھاگنے کے بعد کیوبا میں ایک بہت بڑے گینگسٹر سے آپ کی ٹسل چلی تھی۔ پھر وہ آپ کے ہاتھوں مارا گیا۔ سری لنکا میں بھی گنگوا تامل کا گینگ آپ کے ہاتھوں برباد ہوا۔ پھر سنا کے آپ امریکن مافیا میں شامل ہو گئے ہیں۔''

جیری نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا۔ ''تسلی سے بیٹھ کر جوس پی۔ تو نے جو سنا ہے وہ پانچ فیصد بھی نہیں ہے۔ میری پشت پر جو غارت گر قوت ہے اس سے ٹکر لیتے ہوئے انڈین سرکار کو بھی دانتوں پسینا آ جائے گا۔''

''مم...... میں تھوڑی الکحل لینا چاہوں گا۔''

''کیوں نہیں، ساتھ کوئی طاقت کی دوا بھی لے۔ اگلے چند منٹ میں تو جو کچھ سنے گا، اس کے لیے خاصی توانائی درکار ہے تجھے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ بیٹھے تھے۔ ٹوبا تمبا کو نوشی ترک کر چکا تھا اور آج کل اپنا وزن گھٹانے کی کوشش میں تھا۔ اعصابی کشیدگی نے اسے دوبارہ تمبا کو نوشی کی طرف مائل کر دیا۔ جیری سے اجازت لے کر اس نے سگریٹ سلگایا۔ ایک، دو طویل کش لے کر وہ بولا۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس صورت میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس

100 روپے

ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

''تین ماہ سے مجھ پر کیا کام ہو رہا ہے؟''

''اچھا سوال ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تیرا دماغ کام کرنے لگ گیا ہے۔'' جیری نے مزید کہا۔ ''میرے سامنے تو پڑھی کتاب کے مانند ہے۔ تو نے فائٹنگ کلب کی آڑ میں زبردست صلاحیتوں کے حامل افراد کا ایک گروہ بنا رکھا ہے۔ کیلی کی کارکردگی بتاتی ہے کہ یقیناً وہ بھی اسی گروہ کی رکن ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''میں سن رہا ہوں۔'' ٹوبا نے ایک طویل کش لیا جس طوفان نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی، اس سے فرار ممکن نہیں تھا۔ اس کا سامنا کرنے کا ارادہ باندھنے کے بعد وہ خود میں قدرے اعتماد محسوس کر رہا تھا۔

جیری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔ ''گزشتہ 2 سال 3 مہینے میں ڈکیتی کی کم از کم 6 بڑی وارداتوں کا کریڈٹ تیرے گروہ کو جاتا ہے۔''

ٹوبا کو لگا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا ہے۔ دل ڈوب سا گیا۔ بمشکل اس نے خود کو سنبھالا۔

جیری کہہ رہا تھا۔ ''دبئی سے اسمگل ہو کر آنے والا سیٹھ رام پیارے کا سونا، سونے سے بھری ہوئی پوری دو الماریاں تو ڈکار گیا۔ جو تا [illegible] کے قلعے [illegible] یا [illegible] گیا۔ [illegible] اور [illegible] مشہور زمانہ نوادرات کا ذخیرہ بھی تو [illegible] حاجی عبدالکریم کے قیمتی موتی......''

ٹوبا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ''بس کریں، مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟''

''یہ ملین ڈالرز کا سوال ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے یہ بات تیرے گوش گزار کر دوں کہ ان وارداتوں کے دوران جو خون کی ہولی کھیلتا رہا ہے اس کے سبب قانون نافذ کرنے والے ادارے بُو گیر کتوں کے مانند تیرے تعاقب میں ہیں، بلیک مارکیٹ میں جو کچھ تو نے بیچا ہے، اس کا ریکارڈ بھی مجھے میسر ہے۔''

ٹوبا کو نادیدہ زنجیریں خود کو جکڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے کرۂ ارض آکسیجن سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے گہرا سانس لینے کی کوشش کی۔ ''آپ غالباً مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔''

جیری مسکرایا۔ ''تو جانتا ہے یہ میرا کیلبر نہیں ہے۔''

''تو پھر میرا پچھوڑا کھودنے کا کیا مطلب ہے؟''

''اس طرف بھی آتے ہیں مگر اس سے پہلے یہ جاننا تیرے لیے بہت ضروری ہے کہ کینیڈا میں تیری سرمایہ کاری اور فیملی...... میری ہتھیلی میں ہے جب چاہوں انہیں سمیٹ

لوں۔'' جیری نے مٹھی پھیلا کر بند کی۔
اس دفعہ ٹوبا کے خون نے قدرے اُبال مارا۔ ''بات فیملی تک جائے گی تو چاند پر آپ بھی نہیں رہتے جیری صاحب! را کو آپ بھی مطلوب ہیں۔ میں شاید بچ جاؤں، آپ کا بچنا محال ہوگا۔''
''تیرے خون کی گرمی پسند آئی مجھے۔''
ٹوبا نے گہرا سانس لیا۔ ''سوری جیری صاحب! بات فیملی پر آئی تو میرا دماغ گھوم گیا۔'' اس نے انگلی میں دبا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔
جیری بولا۔ ''کوئی بات نہیں، یہ سب بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ تجھے محسوس ہو کہ تیرے بھاگنے اور دھوکا دینے کا ہر راستہ بند ہے۔''
''کیسا دھوکا؟'' ٹوبا حیران ہوا۔
''ملین ڈالرز والے سوال کی طرف آئیں گے تو اس سوال کا جواب بھی تجھے مل جائے گا۔''
''تو پھر اس طرف آؤنا صاحب۔''
جیری نے ایک لمحے کے ڈرامائی وقفے کے بعد کہا۔ ''میں جن لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں۔ وہ گزشتہ نصف صدی کا سب سے بڑا ''شکار'' انڈیا میں کھیلنا چاہتے ہیں۔ سب انتظامات مکمل ہیں۔ پندرہ فیصد حصے پر میں چاہتا ہوں تو بھی شامل ہو جائے۔''
ٹوبا کو اپنی توانائیاں لوٹتی محسوس ہوئیں۔ تمام تر واہمے اور پُراندیش وسوسے پل بھر میں ہوا ہو گئے۔ وہ بشاشت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کے ساتھ کام کرنا میرے لیے فخر کا باعث ہے۔ حصے کی مجھے زیادہ پروا نہیں ہے۔ کچھ اس شکار کے بارے میں بتائیں۔'' اس کے اقرار نے جیری کو خوش کر دیا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو ٹوبا نے گرم جوشی سے تھام لیا۔
جیری بولا۔ ''رام سری کے جزائر کے بارے میں جانتے ہو؟''
ٹوبا کی چمکتی ہوئی نگاہیں جیری کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہاں، ممبئی کے ساحلوں سے 60 کلومیٹر دور سمندر میں، دو بڑے جزیرے اور ایک ٹاپو ہے جسے رام سری کے جزائر کہا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں سنا تھا کہ سیاحوں کے لیے ان جزائر میں بڑی کشش ہے۔ دبئی کی ایک فرم سمندر کے اوپر سے وہاں تک ریل کے لیے پُل وغیرہ کے ٹینڈر کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔''
جیری نے کہا۔ ''مزید کچھ؟''
''ہاں، یہ بھی سنا تھا کہ وہاں کسی پرانی قوم کے آثار وغیرہ دریافت ہوئے ہیں جنھیں دیکھنے کے لیے پوری دنیا کے سیاح کھنچے چلے آ رہے ہیں اور......'' اچانک ہی ٹوبا کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ دونوں جزائر میں سے ایک جزیرے کی ... ایک تہائی ملکیت ہمیش راج کے پاس تھی۔ دنیا کا امیر ترین آدمی جسے بیرونِ ملک ''آئرن مین'' اور انڈیا میں سونے کا پجاری کہا جاتا تھا۔ ہمیش راج کی رہائش اور سونے کا ذخیرہ اسی جزیرے پر تھا۔ ٹوبا نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''آپ کی نظر ہمیش راج کے سونے پر ہے؟''
''ہاں۔'' جیری نے مختصر جواب دیا۔
ٹوبا نے نیا سگریٹ سلگایا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی لرزش نمایاں تھی۔ ''کوئی اور ہوتا تو میں پاگل سمجھتا اُسے۔ جو کچھ سنا ہے اور جو تھوڑا بہت کھوج لگایا ہے، اس حساب سے تو اس سونے کے پجاری کا سونا لوٹنا دیوانے کا خواب اور سراسر آتما ہتھیا ہی ہے۔''
''اس کا مطلب ہے تیری بھی پہلے سے اس سونے پر نظر ہے؟''
ٹوبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اقرار کیا۔ ''سوچا تھا مگر پتھر بھاری تھا، چوم کر چھوڑ دیا۔''
''پتھر اٹھانے کا بندوبست ہو چکا ہے، تیاری پکڑ...... میں پورا پلان تیرے ساتھ شیئر کرتا ہوں۔''

☆☆☆

ممبئی کی زمین کو چھوتے ہی آنند راؤ کے اندر کا درندہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس کی منزل سمندر میں واقع ایک جزیرے پر ہمیش راج کی عظیم الشان رہائش گاہ تھی۔ ہمیش راج کے بیڑے کے ایک ہیلی کاپٹر نے صبح اسے پک کرنا تھا۔ آج کی رات اس کی تھی۔ اس نے انڈر ورلڈ کے ایک بندے کا نمبر ملایا۔ اس کا نمبر شناسا تھا۔ دوسری طرف سے ایک بھاری سی مردانہ آواز نے مؤدبانہ انداز میں اس کی خیریت دریافت کی۔
''آنکھوں کی دکھن کیسی ہے اب تیری، اتنا سارا ''مال'' دیکھ کر تو ضرور اچھی ہو گئی ہوگی حاجی۔''
حاجی خوشامدانہ انداز میں ہنسا۔ ''بس، خدا کی کرپا ہے، آنکھیں اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہیں۔''
آنند راؤ نے مزید کہا۔ ''حاجی، تیرے تو صدقے جانے کو دل چاہتا ہے۔ برما سے پورا جہاز ہی بھر لایا ہے چھوکریوں کا، کمال ہے تو بھی۔''

حاجی کی آواز دب گئی۔ ''آپ کی دَیا ہے صاحب، ورنہ میری مجال کہاں تھی۔''

آنند راؤ کا لہجہ بدلا۔ ''میرے مطلب کا بھی کوئی دانہ ہے؟''

حاجی کا لہجہ بھی بدل کر دلال کا ہوا۔ ''بالکل صاحب، تین دانے میں نے چھانٹ کر علیحدہ کر دیے تھے۔''

''تو پھر چکھا۔''

''آجاؤ صاحب، بوٹ بھیجتا ہوں۔ جہاز پر خوب ہلے گلے کی رات ہے۔ چوکھرا لوگوں کے تھوڑا ہاتھ بھی دیکھ جاؤ۔ ایک نوا (نیا) چھوکرا آیا ہے۔ حبشی ہے اس کی بڑی دھوم ہے۔''

''بھیج بوٹ، کافی دن ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں چلائے۔ زنگ سا لگ گیا ہے۔'' آنند راؤ نے انگڑائی لی۔ ''کیا خیال ہے وہ حبشی چھوکرا...... میرے سامنے ٹک جائے گا؟''

''آپ کے سامنے کون ٹک سکتا ہے صاحب، ویسے چھوکرے میں کرنٹ ہے۔ بی کلاس کے دو بندے اس نے 30 سیکنڈ میں لٹا دیے ہیں۔''

آنند راؤ کو دلچسپی محسوس ہوئی۔ ''چھوکرے کو فکس کرلے۔ پہلے دو، دو ہاتھ اور پھر ''تیسرا ہاتھ'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

حاجی خبیثانہ انداز میں ہنسا۔ آنند راؤ نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

جیری کا کام ہو گیا تھا۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ اور اپنا ضروری سامان لینے کے بہانے اس نے شپ چھوڑ دیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ٹوبا اور کیلی بھی ایک تیز رفتار بوٹ کے ذریعے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی دوسری ملاقات ٹوبا کے ایک بے حد خفیہ ٹھکانے پر ہونے والی تھی۔ اس ملاقات میں گروپ کے دیگر افراد بھی شریک ہونے والے تھے۔

3 گھنٹے بعد ٹوبا اور کیلی کے علاوہ گروپ کے دیگر چار لڑکے بھی خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے پھر جیری بھی آ گیا۔

جیری کا یہ اندازہ درست تھا کہ کیلی بھی مخصوص گروپ کی ممبر ہے۔ باقی چاروں لڑکے بھی فائٹر اور ہر طرح کے ہتھیار چلانے میں مہارت رکھتے تھے۔

جیری نے پلان شیئر کرتے ہوئے کہا۔ ''دوستو! ہمارا کام کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اصل کام ان لوگوں کو کرنا ہے جو ہماری پشت پر ہیں۔ ٹوبا نے آپ سب کو اس بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہوگا۔''

ایک اسمارٹ سا لڑکا بولا۔ ''ٹوبا صاحب ہمیں مختصر تو بریف کر چکے ہیں۔ ہم سب بے حد پرجوش ہیں اس شکار کے لیے مگر اندھے کنوئیں میں چھلانگ بھی نہیں لگانا چاہتے۔ آپ...... پلیز پلان شیئر کریں۔''

جیری بولا۔ ''اندھے کنوئیں میں تو کوئی بھی چھلانگ لگانا نہیں چاہتا۔ آپ لوگ مطمئن ہوئے تو پھر ہی اگلا قدم اٹھائیں گے۔ نہیں تو اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے گا۔''

کیلی نے بے آواز تالی بجائی۔ ''یہ بہت اچھی بات کی تم نے۔ شروع ہو جاؤ، تمہیں سننے کو ہم سب بے تاب ہیں۔''

جیری بولا۔ ''رام سری نام کے دو جزائر ہیں اور ایک ٹاپو۔ ایک جزیرے پر مایا تہذیب کے اب تک کے سب سے بڑے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ حکومت نے وہیں ایک میوزیم بنا دیا اور دیگر تفریحات مہیا کر دیں۔ دنیا بھر کے سیاحوں کا تیزی سے رخ اس طرف ہو رہا تھا۔ یہاں بھی سیکیورٹی کا زبردست انتظام ہے۔ ہمارا اس جزیرے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لیے اس کی سیکیورٹی پر ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ آثار قدیمہ والے جزیرے کو چھوڑ کر اب آتے ہیں ٹاپو کی طرف۔ یہ ٹاپو ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ اس ٹاپو پر ایک متروک لائٹ ہاؤس ہے۔ ٹاپو ہمارے لیے کیوں اہم ہے؟ اس کا ذکر آگے آئے گا۔''

جیری نے حاضرین پر نظر ڈالی۔ سبھی پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ دلچسپی اور سنسنی سب کے چہروں پر نمایاں تھی۔

جیری نے پلان کو آگے بڑھایا۔ ''دوسرا جزیرہ نسبتاً بڑا ہے۔ اس کے ایک چوتھائی حصے کی ملکیت بھیشم راج کے پاس ہے۔ یہ حصہ تقریباً ایک کلومیٹر ہے۔ اس ایک کلومیٹر کے گرد 8 فٹ اونچی کنکریٹ کی دیوار ہے۔ نصف ساحل ہے جس پر مخصوص فاصلے پر حفاظتی برجیاں بھی بنی ہوئی ہیں جن میں جدید اسلحے سے لیس دو، دو گارڈز آٹھ آٹھ گھنٹوں کی 3 ٹرمز میں ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے برجیوں میں گارڈز 24 گھنٹے موجود رہتے ہیں۔ ایک جرمن کمپنی کے بنائے سسٹم سے حفاظتی برجیاں اپنے کنٹرول روم سے ہمہ وقت رابطے میں رہتی ہیں۔ داخلی گیٹ فولادی ہے۔ جہاں کم از کم چھ گارڈز ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ نصف حصہ جو ساحلی ہے اس طرف سیکیورٹی کا انتظام اور بھی سخت ہے۔ گارڈز موٹر بوٹس پر چوبیس گھنٹے سمندر میں رہتے ہیں۔ چار حفاظتی

pklibrary.com

چوکیاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پہاڑی پر آبزرور پوسٹ بھی ہے جہاں سے دور تک نظر رکھی جاسکتی ہے۔ سمندر کی ایک شاخ خاص رہائشی حصے تک آتی ہے جہاں اس نے ایک بڑی سی جھیل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمیش راج تو کم ہی یہاں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے خاص ملکی وغیر ملکی مہمانوں کا اس جنت ارضی پر تانتا بندھا رہتا ہے۔

''سیکیورٹی کے یہ معاملات تو سمندر کے اوپر کے تھے۔ اب چلتے ہیں سمندر کے اندر۔ یہاں بھی زبردست سیکیورٹی ہے۔ الیکٹرونک نظام زیرِ آب معمولی سی معمولی حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ اس کی سمندر کی گہرائیوں میں دیکھنے کی صلاحیت 10 کلومیٹر ہے۔ اس کے علاوہ سمندر کی جو شاخ رہائشی حصے تک ہے۔ اس کی سمندر والی سمت زیرِ آب فولادی جال ہے جس کے سبب انسان تو انسان کوئی بڑا سمندری جانور بھی اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ نگرانی کے کتے اور ڈرونز بھی ہیں۔ یہ ڈرونز اندھیرے میں دیکھنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان سب کو کنٹرول کرنے والا ''کنٹرول روم'' رہائشی عمارت کے تہ خانے میں ہے۔ جس کا اپنا جنریٹر اور ایک اسٹینڈ بائی جنریٹر بھی ہے۔ باقی بجلی کا اپنا نظام ہے۔ ہر جگہ اسٹینڈ بائی جنریٹر بھی ہیں۔''

ایک اور لڑکا بولا۔ ''اتنی سیکیورٹی تو ہمارے پردھان منتری کی بھی نہیں ہے۔''

جیری بولا۔ ''صحیح کہہ رہے ہو لیکن یہ ساری سیکیورٹی دنیا کے امیر ترین آدمی کی ہے جس کے پاس 2.3 ارب ڈالرز کے سونے کا ذخیرہ ہے۔''

تقریباً سبھی کے چہروں پر تحیر نمایاں ہوگیا تھا جبکہ ٹوبا کا دماغ 2.3 ارب ڈالرز کے سونے میں سے اپنے 15 فیصد کا حساب لگانے میں لگ گیا تھا۔ جتنا کچھ بھی تھا، دماغ چکرا دینے والا تھا۔

جیری نے مزید کہا۔ ''رہائشی عمارت کے ساتھ ایک چھوٹی سی عمارت ہے جسے بلاشبہ دنیا کی جدید ترین عمارت کہا جاسکتا ہے۔ یہاں ہر فولادی دروازہ ہمیش راج کی وائس کمانڈ پر کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ یہاں حال ہی میں ایک سویڈن کمپنی نے اپنا ایڈوانس ترین الیکٹرانک سسٹم نصب کیا جس کے سبب اس عمارت کے پچاس گز کے دائرے میں ہمہ قسم کا بارود ڈیٹونیٹر نہیں پکڑتا۔ کسی قسم کا ریموٹ کام نہیں کرتا۔ اس پچاس گز میں ہر قسم کا لاسلکی نظام بھی فیل ہو جاتا ہے۔ اس عمارت میں صرف ہمیش راج ہی داخل ہوسکتا ہے یا جسے وہ چاہے۔ باقی ایسی کسی بھی کوشش کرنے والے کو لیزر شعاعیں کاٹ کر رکھ دیں گی۔''

یہ سب سننے کے بعد ہر چہرے پر مایوسی نمایاں ہوگئی تھی۔

ٹوبا نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا۔ ''یہ ہمیش راج کے حفاظتی انتظامات تھے، ان سب کے توڑ کا ہمارے پاس کیا انتظام ہے؟''

جیری بولا۔ ''اب اس طرف آتے ہیں۔ مہمانوں کو کسی قسم کی ذہنی کوفت سے بچانے کے لیے سیکیورٹی کا سارا زور بیرونی باؤنڈری کے آس پاس ہی ہے۔ ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ باؤنڈری وال میں داخلے کا ہے اور یہ سب سے بڑا مسئلہ حل ہوچکا ہے۔''

''کیسے؟'' ایک اور لڑکے کے دہن سے بے ساختہ نکلا۔

جیری مسکرایا۔ ''ہمیش راج کے محل میں ایک بہت خاص قسم کا سوئمنگ پول زیرِ تعمیر ہے۔ جس کے لیے خاص قسم کا ماربل، لائٹس اور دیگر سامان اسپین اور اٹلی سے خاص طور پر منگوایا گیا ہے۔ پانچ کنٹینرز پر مشتمل یہ سامان ممبئی پورٹ سے روانہ ہوچکا ہے۔ یہ کنٹینرز جزیرے پر پہنچیں گے پھر انہیں ٹرکوں پر بار کر کے محل میں لایا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہم سب اپنے خاص قسم کے سامان کے ساتھ ایک کنٹینر میں ہوں گے۔''

کیلی جلدی سے بولی۔ ''میں کیوں نہیں؟ اور محل میں داخلے کے وقت کنٹینرز کو چیک نہیں کیا جائے گا؟''

جیری بولا۔ ''تمہاری ڈیوٹی کہیں اور ہوگی۔ بے شک چیک کیا جائے گا۔ داخلی گیٹ سے پہلے ایک جدید سسٹم انہیں مکمل طور پر اسکین کرے گا مگر کنٹینر میں نصب ہمارا اس سے بھی جدید سسٹم، داخلی گیٹ والے سسٹم کو دھوکا دے گا اور ہم بہ آسانی محل کے اندر بنے گودام تک پہنچ جائیں گے۔''

کیلی کا چہرہ جوش سے تمتما اٹھا۔ ''بہت شاندار..... مگر میری ڈیوٹی کیا ہے؟''

جیری کو یہ مداخلت ناگوار گزری لیکن کیلی کے ساتھ گزاری ایک رات نے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ سا پیدا کر دیا تھا اور وہ کوئی بدمزگی بھی نہیں چاہتا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔ ''ستی رہو، تمہاری ذمے داری خود ہی سامنے آجائے گی۔''

ٹوبا نے گھور کر کیلی کو دیکھا تو کیلی کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا۔

جیری نے مزید کہا۔ ''دونوں جزیروں پر دو سیلولر کمپنیوں نے سروس مہیا کر دی ہے مگر محل کی سیکیورٹی کی طرح ہم بھی اپنے نیٹ ورک سے رابطے میں رہیں گے۔ آپریشن آپ سب کو مہیا کر دیے جائیں گے۔ میں بے جا طور پر انسانی جانوں کا زیاں نہیں چاہتا۔ محل سے کافی فاصلے پر تین دور مار خاص قسم کی مشین گنز نصب کی جا چکی ہیں جو ریموٹ کنٹرولڈ ہیں۔ ان کا کنٹرول کیلی کے پاس ہوگا جس سے وہ وقفے وقفے سے محل کی جانب فائرنگ کرتی رہے گی اس کے علاوہ 250 گرام ٹی، این، ٹی سے بھرے ہوئے 12 عدد ڈرونز بھی کیلی کے پاس ہوں گے جنہیں وہ ایک ایک منٹ کے وقفے کے بعد محل کی بیرونی باؤنڈری سے باری باری ٹکرائے گی۔ اس دوران وہ متروک لائٹ ہاؤس کی بلندی پر رہے گی اپنی ضرورت کے سب سامان سمیت۔

''لائٹ ہاؤس کی بلندی ڈرونز کے مؤثر استعمال کے لیے کیلی کے لیے بھرپور معاونت فراہم کرے گی۔ پہلے فائرنگ اور پھر دھماکے۔ ہم یہ تاثر دینے میں بھرپور کامیاب رہیں گے کہ محل پر بھاری جمعیت کے ساتھ حملہ ہو گیا ہے۔ پہلی گولی کے ساتھ ہی ہماری پیٹھ پر موجود خاص لوگ محل کے پورے سیکیورٹی [illegible] لیں گے۔ [illegible] سامنے سے عمارت [illegible] سونے [illegible]...... ساتھ ہی سیلولر نیٹ ورک کو بھی جام کر دیا جائے گا۔ اس وقت سارے لوگوں کی توجہ باہر کی جانب مبذول ہوگی۔ سسٹم جام ہو جانے کے سبب وہ لوگ باہر سے امداد بھی طلب نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت ہم حرکت میں آئیں گے۔''

اس موقع پر ٹوبا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''مداخلت کی معافی چاہتا ہوں مگر کسی طرح محل میں موجود لوگ بیرونی مدد مانگنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ معذرت کے ساتھ کہوں گا 500 میٹر سے بھی کم فاصلے پر دوسرا جزیرہ ہے۔ وہاں سیکیورٹی بھی زبردست ہے۔ وہاں سے کمک آ گئی تو پھر؟''

جیری نے بے پروائی سے کہا۔ ''پروا نہیں، انہیں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا وہاں کیا ملے گا؟ کیلی لائٹ ہاؤس میں ہوگی۔ ہم باؤنڈری وال کے اندر۔ ہم اپنے حصے کا کام تیزی سے نمٹائیں گے اور پھر نکل جائیں گے۔''

پہلے والے لڑکے نے نقطہ اعتراض اٹھایا۔ ''اتنے سونے کے ساتھ نقل و حرکت آسان نہیں ہوگی۔ ایگزٹ پلان کیا ہے؟''

جیری بولا۔ ''سوالات اور اعتراضات کا سیشن بعد میں رکھ لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے سارا پلان جان لینے کے بعد سارے سوالات کے جواب مل جائیں گے۔''

لڑکے کے اعتراض اٹھانے کے بعد آپس میں جو چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں، وہ دم توڑ گئیں۔ اس موقع پر ٹوبا نے کہا۔ ''میں سب کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ اب آپ کے علاوہ کسی کی زبان حرکت میں نہیں آئے گی۔''

جیری نے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔'' پھر گہرا سانس لے کر وہ دوبارہ پلان کی طرف آیا۔ ''ہم گودام میں سے کنٹینر والے ٹرک پر ہی حرکت میں آئیں گے۔ ہم ٹرک کو سونے والی بلڈنگ سے سو گز قریب لے جائیں گے۔ اس موقع پر تم سب لوگ مجھے بیک اپ دو گے۔''

کیلی خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ بے ساختہ بولی۔ ''اور تم کیا کرو گے؟''

ٹوبا دہاڑا۔ ''کیلی......''

جیری نے ٹوبا کو روکتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں، لڑکیوں کو اپنی زبان پر قابو نہیں ہوتا۔''

ایک مشترکہ قہقہہ پڑا اور لمحے پہلے والا کشیدہ ماحول فوراً ہی ہوا ہو گیا۔ کیلی بھی خجل سی ہو کر رہ گئی۔

جیری بولا۔ ''میں سونے کی بلڈنگ [illegible] ٹوبا [illegible] 200 گز [illegible] ہے۔ پورٹیبل ٹیوب سے فائر ہونے والا یہ خاص الخاص راکٹ اس بلڈنگ کی فولادی دیواروں کو چیر پھاڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب اس پلان کا سب سے سیکرٹ حصہ شیئر کرنے جا رہا ہوں۔'' اس نے باری باری سب کے چہروں پر نظر ڈالی جہاں سنسنی اور تجسس یکجا ہو گئے تھے۔

جیری بولا۔ ''سونے والی بلڈنگ جتنی زمین سے اوپر ہے اس سے دگنا نیچے سمندر سے ملی ہوئی ہے۔ سویڈش کمپنی کے سسٹم میں ایک الیکٹرونک خاص قسم کی خودکار آبدوز بھی شامل ہے۔ بلڈنگ کی پہلی فولادی دیوار ٹوٹتے ہی ایک خودکار نظام حرکت میں آ جائے گا جو سارا سونا اس الیکٹرونک آبدوز میں منتقل کر دے گا۔ دوسری دیوار ٹوٹتے ہی آبدوز اس سونے سمیت سمندر کی گہرائیوں میں چلی جائے گی جہاں وہ اڑتالیس گھنٹے رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا کنٹرول ہمیش راج کے پاس ہوگا یا جس کے حوالے اس نے وہ سسٹم کیا ہوگا۔''

''کیا زبردست نظام ہے کوئی جان جوکھم میں ڈال کر سونے تک پہنچ بھی جائے تو اس کے ''دیدار'' سے بھی محروم رہے گا۔''

"پھر...... ہم اس سونے کو کیسے حاصل کریں گے؟" یہ سوال کرتے ہوئے ٹوبا کے چہرے پر مایوسی در آئی تھی۔

جیری بولا۔ "سونے کے سمندر میں جاتے ہی ہمارا کام ختم۔ اس موقع پر ہمارے خاص دوست حرکت میں آئیں گے۔ سویڈش سسٹم کو توڑتے ہوئے وہ آبدوز کا کنٹرول سنبھال لیں گے اور پھر وہ سونا ہمارا ہے۔"

ایک اور لڑکا بولا۔ "کیا سونے والی آبدوز کا سسٹم ہیک کرنا کوئی آسان کام ہے؟"

جیری نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بے حد مشکل کام ہے مگر جدید سے جدید نظام کا بھی توڑ تو ہوتا ہی ہے۔ سیر پر سوا سیر کی مثال ایسے ہی مواقع کے لیے ہے۔ تم لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آبدوز کو اپنے کنٹرول میں لینے کا عملی تجربہ ہو چکا ہے۔ ہمارے خاص دوستوں کے لیے یہ اب معمولی سا کام ہے۔"

اس کے بعد وہاں جشن کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد امکان نظر آتے ہی وہ بے حد خوش ہو گئے تھے۔ کیلی بے اختیار ہو کر جیری کے گلے لگ گئی تھی۔

ٹوبا شیمپین کی بوتل نکال لایا۔ "ایک جام، جیری صاحب کے "خاص دوستوں" کے نام۔" جوش و خروش کم ہوا تو جیری بولا۔ "اب یہ بھی جان لو کہ ہماری وہاں سے بہ حفاظت واپسی کیسے ہوگی۔"

ایک لڑکا جوش سے بولا۔ "جاننے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً ایگزٹ پلان بھی بے عیب ہوگا۔"

جیری نے کہا۔ "نہیں جاننا بے حد ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے لیے تمہیں مشق کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔"

ایک ایک جام چڑھانے کے بعد وہ سب ترنگ میں آ گئے تھے۔

جیری نے دوبارہ اسٹارٹ لیا۔ "سیٹھ رام پیارے کی سونے سے بھری لانچوں پر شب خون مارتے ہوئے میری معلومات کے مطابق تم لوگوں نے سمندر کے اندر سے حملہ کیا تھا۔ میرے علم کے مطابق تو تم لوگ انڈر واٹر چلنے والے پورٹیبل اسکوٹر اور آکسیجن سلنڈر کے استعمال سے واقف ہو۔"

ٹوبا نے سب کی طرف سے جواب دیا۔ "یہ سب ہماری روزمرہ کی ٹریننگ کا حصہ ہے، ہم مایوس نہیں کریں گے آپ کو۔"

جیری بولا۔ "مجھے اس بات کا یقین تھا تو دوستو! انڈر واٹر چلنے والے پورٹیبل اسکوٹر اور آکسیجن سلنڈر، ماسک وغیرہ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ماسک نہیں بلکہ جدید ترین واٹر پروف ہیلمٹ ہیں۔ اس کے علاوہ کسی ناگہانی سے نمٹنے کے لیے انڈر واٹر کام آنے والی رائفلیں ہیں۔ سمندر سے آگے والی شاخ...... سونے والی بلڈنگ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ اپنا کام نمٹا کر ہم سمندر میں کود جائیں گے۔ ہیلمٹس میں نصب سسٹم ہمیں آپس میں رابطے میں رکھے گا۔ لیزر کٹر سے حفاظتی جال کو کاٹ کر ہم سمندر میں ہوں گے۔ ہمارا رخ لائٹ ٹاور کی طرف ہوگا۔ جہاں سے کیلی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائے گی۔ پورٹیبل انڈر واٹر چلنے والے اسکوٹرز کی مدد سے ہم بڑی تیزی سے کھلے سمندر میں نکل جائیں گے۔ یہاں ہمیں پک کرنے کے لیے جہاز پہلے سے موجود ہے۔ بین الاقوامی سمندر میں پہنچتے ہی کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔ جہاز ہمیں اومان کی بندرگاہ تک لے جائے گا۔ یہاں تمہارے حصے کا سونا یا ہارڈ کیش جو تمہارے حصے کے مساوی ہوگا تمہارے حوالے کر دیا جائے گا اور دنیا کے جس کونے میں چاہو گے، تم لوگوں کو وہاں پہنچا دیا جائے گا۔"

ٹوبا کے ساتھ ساتھ باقی سب کے چہرے بھی خوشی سے چمک اٹھے تھے۔ آنے والے کروڑوں ڈالرز کے خیال سے وہ ابھی سے ہواؤں میں اُڑنے لگے تھے۔

ٹوبا نے لرزتے ہاتھوں سے نئے جام بھرے۔ "جیری صاحب کی صحت اور ہمارے ان دوستوں کے نام جو خداداد ذہانت اور برتر ٹیکنالوجی کے ساتھ ہماری پشت پر ہیں۔"

جیری نے جام اٹھاتے ہوئے کہا۔ اب سے لے کر مشن کی تکمیل تک ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔"

☆☆☆

آنند راؤ شپ پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے حلیہ تبدیل کر رکھا تھا۔ یہاں حاجی نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد حاجی نے اسے تینوں لڑکیاں دکھائیں، ان میں سے ایک کو آنند راؤ نے شب بسری کے لیے منتخب کر لیا۔

اس وقت وہ حاجی کے آفس میں بیٹھے تھے۔ آنند راؤ بولا۔ "بلاؤ، اپنے افریقن چھوکرے کو...... دو، دو ہاتھ کرنے سے پہلے ایک ملاقات ہی ہو جائے۔"

حاجی نے قدموں میں بچھ جانے والے انداز میں کہا۔ "ابھی حاضر کرتا ہوں۔" اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا

pklibrary.com

کر ایک نمبر پریس کیا۔

”وہ حکم کریں حاجی صاحب!“ دوسری طرف سے جیلو دادا کی مؤدبانہ آواز ابھری۔

”نئے افریقی چھوکرے کو تو لے کر میرے آفس میں آؤ۔“

جیلو دادا نے کہا۔ ”وہ تو اپنا ضروری سامان اور پاسپورٹ وغیرہ لینے ساحل پر گیا ہے۔ کافی دیر ہو گئی ہے اب تک تو آجانا چاہیے تھا اُسے...... میں پتا کرتا ہوں اس کا۔“

حاجی کی پیشانی پر بل پڑ گیا۔ ”میں انتظار کر رہا ہوں۔“

ریسیور رکھتے ہوئے حاجی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”چھوکرا ابھی جہاز پر نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ اتنے میں آپ کو اس کی ویڈیوز دکھاتا ہوں۔ اس کے کرنٹ کا کچھ اندازہ ہو جائے گا آپ کو۔“

”دکھاؤ۔“ آنندراؤ نے دلچسپی لی۔

حاجی نے لیپ ٹاپ آن کیا۔ ملٹی میڈیا میں جا کر اس نے ایک ویڈیو سلیکٹ کی اور پھر لیپ ٹاپ آنندراؤ کی طرف گھما دیا۔

یہ سی سی ٹی وی کیمرے کی ریکارڈنگ تھی اور معیار خاصا اچھا تھا۔

آنندراؤ کی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ وہ دلچسپی اور محویت سے سیاہ فام لڑکے کا فٹ ورک دیکھنے لگا۔ اچانک ہی وہ بُری طرح چونکا۔ لڑنے کا یہ انداز تو اس کا جانا پہچانا تھا پھر جس خاص انداز میں سیاہ فام نے روفی کو ناک آؤٹ کیا، اس کے بعد تو شک و شبے کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

آنندراؤ کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسکرین پر نظر آنے والا سیاہ فام بلاشک و شبہ اس کا سابق سینئر پارٹنر جیری ہی تھا جس کی تلاش میں وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

جیری کی اس جہاز پر موجودگی اس کے لیے بے حد حیرت کا باعث تھی۔ یہاں اس کی موجودگی کے مقاصد کا پتا لگایا جا سکتا تھا۔ آنندراؤ کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ جیری کا جو بھی ٹارگٹ ہے وہ ممبئی ہی میں ہے۔

آنندراؤ نے اپنے تاثرات پر قابو رکھتے ہوئے لیپ ٹاپ دوبارہ حاجی کی طرف گھما دیا۔ ”واقعی چھوکرا تو خاص ہے۔ ہاتھوں کے مقابلے میں پاؤں اچھے چلاتا ہے۔ اس کے ساتھ کھیلنے میں مزہ آئے گا۔“

حاجی کی باچھیں پھیل گئیں۔ ”بس صاحب! آپ ذرا ہاتھ ہلکا رکھنا، میرے لیے یہ چھوکرا بہت قیمتی ہے۔ ”سرپرائز پیکج“ ہے۔ بڑے بڑے برج الٹ دے گا یہ۔“

”بے فکر رہو، میں صرف ہاتھ، پاؤں کی اینٹھن ہی دور کروں گا۔“ آنندراؤ نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ ”میں ذرا باہر کی تازہ ہوا کھاتا ہوں۔ تم خود چھوکرے کا پتا کرو۔“

حاجی نے اس کے ساتھ ہی نشست چھوڑ دی تھی۔ ”میں ابھی حاضر کرتا ہوں اُسے۔“

دل میں طوفان دبائے آنندراؤ عرشے پر آ گیا۔ اپنی سیاہ کاری چھپانے کے لیے اس نے حلیہ بدلا تھا۔ اس کے سبب جیری کا اسے فوراً پہچان لینے کا امکان نہیں تھا۔ البتہ اسے، جیری پر یہ ایڈوانٹیج تھا کہ جیری کا سیاہ فام والا حلیہ اسے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

آنندراؤ نے اپنا جدید ترین سیٹلائٹ فون نکالا۔ یہ بالکل عام اسمارٹ فون جیسا تھا۔ را کے ممبئی ڈیسک کے دو چاق و چوبند ایجنٹ اس نے شپ پر بلا لیے۔

جیری کا انتظار طول پکڑ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ انتظار مایوسی میں بدلنے لگا۔ آنندراؤ کو یقین ہو چلا تھا کہ جیری اپنا نامعلوم مقصد پورا کر کے شپ کو چھوڑ گیا ہے۔ حاجی وغیرہ سے کھل کر بات کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ دونوں ایجنٹ شپ پر پہنچ گئے تھے۔

آنندراؤ نے معاملے کو کھنگالنا شروع کیا تو تھوڑی ہی دیر میں معاملہ کھل کر اس کے سامنے آ گیا۔ کیلی کے توسط سے ٹوبا کے ساتھ جیری کی ملاقات...... آنندراؤ کے علم میں آ گئی۔

جیری کی طرح ٹوبا اور کیلی بھی شپ سے غائب تھے۔ ممبئی کا ڈیسک اپنی پوری قوت کے ساتھ ٹوبا اور کیلی کی کھوج میں لگ گیا۔ یقینی طور پر جیری بھی انہی کے ساتھ تھا۔

آنندراؤ جس مقصد کے لیے شپ پر آیا تھا، وہ پسِ پشت رہ گیا تھا۔ اس نے شپ چھوڑ دیا۔ دونوں ایجنٹ البتہ شپ پر رہ گئے تھے۔ جیلو دادا کی نشاندہی کے بعد انہیں فوراً ہی جیری کی ٹانگ میں گولی مارنے کا آرڈر تھا مگر آنندراؤ کو یقین تھا کہ وہ اب لوٹ کر شپ پر نہیں آئے گا۔

صبح کا ہیلی کاپٹر آنندراؤ کو لینے کے لیے پہنچ چکا تھا مگر وہ روانگی کے حوالے سے شش و پنج کا شکار تھا۔ اس دوران دہلی سے شیرول کی کال آ گئی۔ ”تم وہاں ٹاک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہو اور یہاں اس کتے نے امیش یادیو کو اڑا

pklibrary.com

دیا ہے۔"

آنند راؤ اس طرح کے لہجے کا عادی نہیں تھا۔ وہ ناگواری سے بولا۔ "وہ ممبئی ہی میں ہے اور میں اس کی شہ رگ تک پہنچنے والا ہوں۔ وہ بھٹکا رہا ہے ہمیں۔ یادیو صاحب کو ضرور اس کے کسی چیلے، چانٹے نے ٹارگٹ کیا ہے۔" پھر اس نے ٹاٹ ٹوئیاں والا بدلا چکایا۔ "آپ نے تو شاید شردھا سنگھ والے کیس سے وابستہ سبھی افراد کی سیکیورٹی کا فول پروف انتظام کیا تھا نا؟"

شیرول زہرخند لہجے میں بولا۔ "ہاں، مگر محترم یادیو صاحب کو اپنی ایک ماں سے ملنے جانا تھا۔ اپنے ہی لوگوں کو دھوکا دے کر وہ نکل گیا اور پھر مارا گیا۔" شیرول یا تو طنز تک پہنچ نہیں پایا تھا یا پھر اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

آنند راؤ نے افسوس کا اظہار کیا۔

شیرول بولا۔ "تمہیں یقین ہے کہ تم اسی کمینے کے ہی پیچھے ہو نا؟"

"سو فیصد...... تفصیلات کا وقت نہیں ہے۔ میں جلد ہی اس کی منڈھی (سر) لے کر ہیڈکوارٹر آؤں گا۔"

"وش یو گڈ لک لڑکے، تمہاری تصویریں مجھے بھی آگئی ہے۔ میں زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ بھجوا [illegible] تمہیں [illegible] کامیاب کرے۔" شیرول نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس دوران ممبئی ڈیسک کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ ٹوبا وغیرہ کا سراغ مل گیا تھا۔ آخری دفعہ ایک بڑی سی بوٹ میں ٹوبا اور کیلی کو رام سری کے جزائر کی جانب جاتا دیکھا گیا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جن میں ایک سیاہ فام بھی تھا۔

آنند راؤ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہونے جا رہا تھا۔ جیری، آئرن مین کے سونے ہی کے چکر میں تھا۔

رام سری جزائر پر ممبئی ڈیسک کے نصف درجن ایجنٹ ٹوبا وغیرہ کو کھوجتے پھر رہے تھے۔

کشمکش و پیچ کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ آنند راؤ ہیلی کاپٹر میں جا بیٹھا جو اسے لے کر ہمیش راج کے محل کی طرف اڑ گیا۔

ہیلی پیڈ پر اس کا استقبال پروٹوکول آفیسر کی ایک سروقد، نوجوان اسسٹنٹ نے کیا۔ چہرے پر جیسے علیحدہ سے رکھے ہونٹ دعوت گناہ دیتے محسوس ہو رہے تھے۔ جوڑے میں بندھے بال، جن سے ایک قدیمی زیور نکل کر کانوں سے منسلک تھا جوڑے سے نکلی آوارہ لٹیں، آنند راؤ کے اندر چھپے بھوکے درندے کا امتحان لے رہی تھیں۔ اس لڑکی نے اپنا نام رجنی سہنا بتایا تھا۔ وہ، آنند راؤ کو لے کر ایک چھوٹی سی اوپن الیکٹرک گاڑی میں آ بیٹھی۔

مرکزی عمارت ہیلی پیڈ سے خاصی دور تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھی۔ اس کے قرب کی خوشبو آنند راؤ کے حواس پر سوار ہونے لگی۔ اس طرف سے توجہ ہٹانے کی غرض سے وہ اردگرد کے نظارے میں محو ہو گیا۔

آنند راؤ نے بہت سی خوب صورت اور وسیع و عریض رہائش گاہیں دیکھی تھیں مگر اس محل کی سج دھج سب سے نرالی تھی۔ انتہائی ہموار گھاس کے وسیع قطعات سے دیسی اور بدیسی پھولوں کی انتہائی ترتیب والی کیاریاں، جہاں درجنوں مالی مصروفِ عمل تھے۔ مور، نایاب نسل کے پرندوں کی کئی خوب صورت ترین اقسام، مصنوعی آبشاریں ان کے نزدیک کیں کیں کرتی خوب صورت رنگین بطخیں اور ان کے ننھے ننھے مخملی سے بچے۔ غرض ہر طرف خوب صورتی بکھری پڑی تھی۔

آنند راؤ نے دل ہی دل میں تسلیم کیا کہ بلاشبہ اس جگہ کو دولت کی طاقت نے جنت ارضی میں تبدیل کر دیا ہے۔

مرکزی [illegible] درختوں کے عقب سے محل کی مرکزی عمارت بھی اپنی جھلک دکھانے لگی۔ گرینائٹ کے اونچے گول ستون، اونچی چھتیں، تکونی کنگرے، اطالوی طرز کی بڑی کھڑکیاں۔ دور سے چار منزلہ عمارت سرمئی بادلوں کے ایک ڈھیر کے مانند نظر آ رہی تھی۔ بظاہر ایک ہی عمارت کے کئی حصے تھے۔ ایک حصہ خصوصی مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ آنند راؤ کے حصے میں دوسری منزل کا ایک وسیع و عریض کمرا آیا۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز، آرائشی غالیچے، براس نیک کا قیمتی فرنیچر، مدھم اور تیز ہو جانے والی اٹالین لائٹس اور جہازی سائز کا باتھ روم، جس میں موتی جیسی شکل اور چمک دمک رکھنے والا باتھ ٹب بھی تھا۔ کمرے سے منسلک بالکونی بھی تھی۔ رجنی، آنند راؤ کے ساتھ ہی کمرے میں آئی تھی اور کمرے میں دستیاب تمام سہولیات اور ان کے استعمال سے بڑی روانی سے اسے آگاہ کیا تھا۔

کمرے کی تنہائی میسر آتے ہی آنند راؤ کے وجود میں چھپا درندہ بے قابو ہونے لگا۔ آنند راؤ نے اس پر بمشکل کنٹرول کیا ہوا تھا۔

کمرا دکھانے کے بعد رجنی نے دل آویز مسکراہٹ

کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر رکھے انٹرکام کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو آپ اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ راج محل میں مہمانوں کی ہر ضرورت اور خواہش پوری کرنے کا احسن انتظام ہے۔'' رجنی، اس کی نگاہوں کی تپش پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔

آنند راؤ نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''آپ کے کہنے کا مطلب ہے میں جو بھی خواہش کروں، پوری ہو جائے گی؟'' اس نے رجنی کے متناسب سراپا پر نظر جمائیں۔

رجنی کو اندازہ تھا کہ گفتگو کا رخ کس طرف مڑ رہا ہے۔ اسے بھی اس ہینڈسم اور خاص مہمان میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ آنند راؤ کے ذومعنی سوال سے اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے لگاوٹ بھری نظروں سے آنند راؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی جناب! کوئی بھی خواہش۔''

آنند راؤ کے لیے آمادگی کا سگنل تھا یہ اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ''تو میری پہلی خواہش تمہیں پانے کی ہے۔''

جواب میں رجنی نے سر جھکا لیا۔ آنند راؤ نے بڑھ کر اسے بانہوں میں لے لیا۔ تھوڑی دیر میں رجنی ہانپی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ''پلیز! میں رات میں آجاؤں گی۔ ابھی کرنل ویر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

آنند راؤ نے گہری سانس لے کر خود کو قابو میں کیا۔ وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا۔ وہ سب سے اہم تھا۔ اس کی گرفت کمزور ہوئی تو رجنی چکنی مچھلی کے مانند اس کی گرفت سے نکل گئی۔

آنند راؤ کچھ دیر بعد نیچے تہ خانے میں کنٹرول روم میں تھا۔ یہاں اس کا استقبال کرنل ویر پرتاب سنگھ نے کیا۔ کرنل ویر ریٹائرڈ کرنل تھا۔ کارگل وار کے دوران وہ زخمی ہوا اور سینے پر بہادری کے کئی میڈل سجا کر آرمی سے ریٹائرڈ ہو گیا۔

کرنل کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کو اس نے بڑے اہتمام سے رنگا ہوا تھا۔ اوپر کو اٹھی مونچھیں، بھاری جسم، اونچا قد اور ٹانگ میں معمولی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ وہ ایک دبنگ شخصیت کا مالک تھا۔

رجنی واپس جا چکی تھی۔ آنند راؤ اور کرنل ویر آمنے سامنے بیٹھ چکے تو گفتگو کا آغاز کرنل نے کیا۔ ''را جیسے معتبر ترین ادارے کی جانب سے ملنے والی تھرسٹ وارننگ نے راج صاحب کو خاصا پریشان کر دیا ہے۔ را کے تعاون اور آپ کی آمد کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔ راج صاحب بھی اپنی بے پناہ مصروفیت میں سے وقت نکال کر تشریف لا رہے ہیں۔ امید ہے کل کسی وقت وہ راج محل میں رونق افروز ہوں گے۔''

آنند راؤ بولا۔ ''ہمیشہ راج صاحب! ہمارے دیش کا فخر اور اثاثہ ہیں۔ ان کی جان و مال کی حفاظت بھی ہمارا فرض ہے۔''

کرنل ویر کی گھنی بھنوؤں کے نیچے آنکھوں میں اندیشے جاگے۔ ''تھرسٹ وارننگ کے بارے میں کوئی نئی اطلاع بھی ہے؟''

''میں یہی بتانا چاہ رہا تھا آپ کو...... نئی اطلاع ہے کہ جو بین الاقوامی جرائم پیشہ گروپ...... راج صاحب کے سونے پر ہاتھ صاف کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے، وہ حرکت میں آچکا ہے۔ آپ لوگ ریڈ الرٹ پر چلے جائیں۔ فی الحال میں چاہتا ہوں یہ رپورٹ آپ تک رہے۔ جرائم پیشہ گروپ سے میں خوب واقفیت رکھتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے کچھ افراد کو انہوں نے ضرور خرید رکھا ہوگا۔ کالی بھیڑوں کے امکان کو ذہن میں رکھیں اور مجھے سیکیورٹی پر تفصیلی بریفنگ دیں۔''

کالی بھیڑوں کے امکان نے کرنل کو حقیقت میں پریشان کر دیا۔ اس نے فوراً اپنے دو نائبین کو بلا کر انہیں سیکیورٹی کے معاملات سخت کرنے کے آرڈر جاری کیے اور پھر آنند راؤ کو بریف کرنا شروع کر دیا۔ کنٹرول روم سے شروع ہونے والا یہ سفر ایک الیکٹرک گاڑی میں طویل تر ہوتا چلا گیا۔ ساری تفصیل جانتے ہوئے آنند راؤ خاصا مطمئن ہو گیا۔ سیکیورٹی کا انتظام فول پروف تھا۔ دوسری طرف جیری کی صلاحیتوں سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔ اس کا پلان بھی یقیناً بے عیب ہوگا۔ وہ اچانک ہی اپنے شکار پر جھپٹتا تھا اور لمحوں میں مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتا تھا۔ آنند راؤ دل ہی دل میں اس کی صلاحیتوں سے خائف بھی تھا۔

گھومتے گھومتے وہ اس گنبد نما روپہلی عمارت کے قریب پہنچ گئے جہاں 2.3 ارب ڈالرز کا سونا محفوظ تھا۔ مقبرے جیسی یہ عمارت ایک اونچے چبوترے پر بنی تھی۔ یہ ہر طرف سے بند تھی۔ بظاہر اس میں داخلے کا بھی کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔

عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے آنند راؤ کا وجود سنسنا اٹھا۔ یہاں سونے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ''راج صاحب کا سونا اسی عمارت میں ہی ہے نا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

کرنل نے اثبات میں جواب دیا۔

''سیکیورٹی پلان میں آپ نے اس عمارت کی

سیکیورٹی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بظاہر اس عمارت کے گرد کوئی سیکیورٹی گارڈ بھی نظر نہیں آرہا۔''

کرنل عجیب سے انداز میں مسکرایا۔''اس عمارت کی حفاظت کی ذمے داری ہماری نہیں ہے۔ راج صاحب کے بقول یہ عمارت اپنی حفاظت خود کرسکتی ہے۔''

آنند راؤ کا ذہن خود بخود ایڈوانس سوئیڈش سسٹم کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے اپنے سونے کی حفاظت کے لیے ہمیش راج نے کیا، کیا انتظامات کر رکھے تھے۔

جھیل کے قریب آنند راؤ نے الیکٹرک گاڑی رکوالی۔ اس کے حساب سے سیکیورٹی کا یہ سب سے کمزور پہلو تھا۔ اگر جیری، الیکٹرانک سسٹم میں گڑبڑ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو راج محل میں داخلے کا سب سے آسان ذریعہ سمندر ہی تھا۔

آنند راؤ نے الیکٹرونک سسٹم سے زیادہ انسانی قوت پر بھروسا کرنے کے لیے کرنل کو کہا اور جھیل کے اطراف اضافی نفری تعینات کروادی۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ ایک پُرنشاط شب کے تصور سے ہی آنند راؤ کو نشہ ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

جیری اور اس کی ''بی ٹیم'' راج محل کے اندر کامیابی سے اپنے ساز و سامان سمیت پہنچ چکی تھی۔ جیری کی امریکا سے آنے والی ''اے ٹیم'' بھی حرکت میں آچکی تھی۔

اپنے پلان کی تفصیلات بتاتے ہوئے جیری نے بی ٹیم کو یہ غلط اطلاع دی تھی کہ راج محل کے سیکیورٹی سسٹم کے ساتھ ساتھ سیلولر نیٹ ورک کو بھی جام کر دیا جائے گا۔ درحقیقت اس کے پلان میں سیلولر نیٹ ورک کو جام کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

وسیع و عریض گودام میں جیری اور اس کی پوری ٹیم پوری طرح سے فعال تھی۔ رات کے بارہ بجتے ہی ایک ہنگامہ خیز شب کا آغاز ہوگیا۔

تمام ضروری سامان کنٹینر کے اندر تھا۔ ٹوبا نے کنٹینر کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا کیلاش تھا۔ باقی لڑکے کنٹینر کے اوپر چڑھ گئے تھے۔ وہاں سے وہ زیادہ بہتر طریقے سے کنٹینر پر ہونے والے کسی بھی ممکنہ حملے کو روک سکتے تھے۔ سب کے پاس بہترین رائفلز کے علاوہ دستی بم بھی تھے۔ جیری، کنٹینر کے اندر تھا۔ اس نے رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ اس نے ایک بڑا سا فائبر کا صندوق کھولا۔ اس صندوق میں پورٹیبل توپ جسے ٹیوب کہا جاتا تھا اور 3 عدد RB80 ٹوماہاک راکٹ تھے۔ تباہی کے علمبردار ان راکٹس کا نظارہ بڑا ہیبت ناک تھا۔ ان کی سرخ چونچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے دل دہل جاتا تھا۔

جیری نے بڑی مشاقی کے ساتھ باری باری ان راکٹوں پر ''ٹوماہاک'' نصب کیا۔ برمے جیسی یہ خوفناک ایجاد امریکا کی تھی۔ یہ موٹی سے موٹی فولادی چادر کو کاٹ کر راکٹ کو اندر لے جاتا تھا۔ جہاں پھٹ کر راکٹ مطلوبہ نتائج دیتا تھا۔

ٹوماہاک سے لیس پہلا راکٹ اس نے ٹیوب میں لوڈ کر دیا۔ اب اس کا کام ٹیوب کو کندھے پر رکھ کر ٹریگر دبانا تھا۔ کنٹینر کا دروازہ علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

اپنی تیاری مکمل کرتے ہی جیری نے سب سے پہلے کیلی سے رابطہ کیا۔ وہ بھی ریڈی تھی۔ باقی سب لوگ بھی تیار تھے۔ گودام کا دروازہ کھول دیا گیا۔

جیری نے اپنے خاص فون پر ایک پیغام بھیجا۔ ساٹھ سیکنڈ سے کم وقت میں اس پیغام کا جواب آگیا۔ جیری نے مدھم آواز میں اپنے کندھے سے لٹکتے آپریٹس میں کہا۔ ''سسٹم ہیک ہوگیا ہے کیلی، فائر!''

کیلی کی جوش سے بھری آواز سنائی دی۔ ''اوکے باس۔''

اس کے ساتھ ہی پُرسکون رات کا سکوت شدید فائرنگ سے درہم برہم ہوگیا۔ تین مشین گنز کا فائر آتے ہی محل کے محافظوں میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

''ٹوبے! نکالو ٹرک کو۔'' جیری نے ہدایت دی۔

کنٹینر ٹرک ایک جھٹکے سے ریورس ہوا اور گودام سے باہر نکل آیا۔ گیئر تبدیل ہوتے ہی ٹرک بدمست ہاتھی کی طرح آگے بڑھا اور گودام کے لکڑی کے مرکزی گیٹ کو توڑتا ہوا باہر آگیا۔ اس کی تمام تر لائٹس آف تھیں۔

اسی وقت فضا پہلے دھماکے سے تھرتھرا اٹھی۔ باؤنڈری وال پر ایک برجی کے قریب زبردست چکاچوند کے ساتھ آگ بھڑک اٹھی تھی۔ کیلی کا پہلا ڈرون اپنے ہدف سے ٹکرا چکا تھا۔

گودام کے سامنے والی سڑک راج محل کے مرکزی گیٹ کی طرف جارہی تھی۔ اس گیٹ پر بیرونی فائرنگ کا شدید دباؤ تھا۔ محافظ اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق ٹوبا نے ٹرک کا پاور اسٹیئرنگ گھمایا۔ ٹرک پھولوں کے قطعات کو روندتا ہوا گھاس کے میدان میں آگیا۔ ٹوبا نے اپنا پاؤں ایکسلریٹر

پر رکھ دیا تھا۔ ٹرک برق رفتاری سے اپنے ہدف کی طرف بڑھا۔ گاہے بگاہے ٹرک کے اوپر سے فائرنگ ہوتی رہی اور راستے میں ہونے والی معمولی مزاحمت دم توڑتی رہی۔ دو جگہوں پر دستی بم بھی استعمال ہوئے۔

ٹرک جب سونے والی بلڈنگ کے قریب پہنچا تو اس کے نصف ٹائر ناکارہ ہو چکے تھے۔

سو گز کا اندازہ لگاتے ہی جیری چلّایا۔ ''ٹرک کو دائیں طرف کاٹ کر روک دو۔''

ثوبا نے ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران کئی دفعہ فضا دھماکوں سے تھرتھرائی تھی۔ کیلی اپنی ڈیوٹی بخوبی نبھا رہی تھی۔

جیری نے نئی ہدایت جاری کی۔ ''سب لوگ ٹرک کے اطراف پوزیشن سنبھالیں۔ میں اپنا ''کام'' کرنے لگا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے راکٹ بردار ٹیوب اٹھالی۔ سونے سے بھری روپہلی عمارت اس کے سامنے پوری طرح عیاں تھی۔

☆☆☆

فائرنگ کی آواز سنتے ہی آنند راؤ کی سبھی حسیں بیدار ہو گئیں۔ اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ کھیل شروع ہو گیا ہے۔ پل بھر میں وہ بستر سے باہر تھا۔ رجنی بھی ابھی جاگ رہی تھی۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''یہ...... یہ فائرنگ کہاں ہو رہی ہے؟''

آنند راؤ کے پاس جواب دینے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے کپڑے پہنے۔ کولٹ سنبھالتے ہوئے انٹرکوم اٹھایا۔ وہ ڈیڈ تھا۔ اسے پھینک کر آنند راؤ نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ فائرنگ اور دھماکوں سے لگتا تھا جیسے کسی فوج نے راج محل پر حملہ کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر میں وہ نیچے کنٹرول روم میں تھا جہاں کرنل دیر سر تھامے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کنٹرول روم کی تمام تر اسکرینوں پر جھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنند راؤ کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ سیکیورٹی سسٹم کو ہیک کر لیا گیا ہے۔

کنٹرول روم میں داخل ہوتے ہی آنند راؤ نے کہا۔ ''کرنل! کھیل شروع ہو چکا ہے اور آپ یہاں سر پکڑے بیٹھے ہیں۔''

کرنل نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ پریشانی کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ تنی ہوئی مونچھیں لٹک سی گئی تھیں۔ ''کیا کروں؟ اچانک ہی پورا سسٹم بیٹھ گیا ہے۔ کسی سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا۔'' سیدھے سادے فوجی نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''آپ کے سسٹم پر سائبر اٹیک ہوا ہے۔ یہاں سے نکل کر اپنے لوگوں کی کمان کریں۔ یہ گوریلا وار جیسا حملہ ہے۔ حملہ آور بھرپور طاقت سے گیٹ یا دیوار توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں یا پھر گھس چکے ہیں۔ باؤنڈری وال کے اس طرف نظر رکھنے کا نظام بھی فیل ہو چکا ہے۔''

کرنل نے کہا۔ ''ہاں، یہ کام ہم ڈرونز سے لیتے تھے۔ وہ بھی فیل ہو جانے والے نظام کا حصہ ہیں۔'' کرنل کے انداز میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔

''بیرونی مدد مانگنے کا کیا ذریعہ ہے؟''

کرنل نے چونک کر اپنا موبائل فون نکالا۔ سگنل دیکھ کر اس کے چہرے پر امید چمکی۔ ''موبائل فون کے سگنل آرہے ہیں۔ دوسرے جزیرے پر چالیس سے زیادہ تربیت یافتہ گارڈز ہیں۔ وہاں سے مدد مانگتے ہیں۔ انہوں نے عقب سے حملہ کیا تو ان لٹیروں کو درمیان میں پیس کر رکھ دیں گے۔''

آنند راؤ چلّایا۔ ''فوراً مدد مانگیں۔'' ساتھ ہی اس نے اپنے سیٹلائٹ فون پر قریبی نیول بیس سے رابطہ کر کے وہاں سے بھی مدد مانگ لی۔

کرنل بھی اپنے موبائل پر مصروف ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس کے دونوں نائبین کے پاس بھی موبائل تھے۔ ان سے بھی رابطہ ہو گیا تھا۔ رپورٹس حوصلہ افزا تھیں۔ حملہ آور ابھی تک اندر گھسنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

اسی وقت ایک بوکھلایا ہوا اہلکار کنٹرول روم میں داخل ہوا۔ اس نے عمارت میں موجود حملہ آور ٹرک کے متعلق اطلاع دی۔ اور یہ بھی بتایا کہ ٹرک سونے والی عمارت کی طرف گیا ہے۔

یہی وقت تھا جب ایک زوردار دھماکے کی گونج سنائی دی۔ یہ دھماکا پہلے والے دھماکوں سے سو فیصد زیادہ قوت کا تھا اور باؤنڈری وال کے اندر ہی ہوا تھا۔ اس دھماکے کی شدت سے تو ایک لمحے کے لیے عمارت بھی تھرتھرا گئی تھی۔

آنند راؤ کے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ اسی لمحے فضا میں تیز سائرن کی آواز بھی ابھرنے لگی تھی۔

پہلے راکٹ نے تسلی بخش کارکردگی دکھائی تھی۔ سونے والی عمارت کی پہلی والی دیوار میں چار فٹ چوڑا شگاف پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فضا سائرن کی تیز آواز سے گونج اٹھی تھی۔

شگاف کے دوسری طرف سرخ جلتی بجھتی روشنی میں دوسری دیوار نظر آرہی تھی۔ جیری، ٹیوب میں دوسرا راکٹ

pklibrary.com

لوڈ کرنے میں لگ گیا۔

سائرن کی مہیب آواز نے گارڈز کو سونے والی بلڈنگ کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ قریب موجود گارڈز تو اتر سے ٹرک پر فائرنگ کر رہے تھے جس کا موثر ترین جواب آرہا تھا۔ گاہے بگاہے نفاذ دستی بم کے دھماکوں سے بھی گونج اٹھتی تھی۔

جیری نے ٹیوب کندھے پر رکھی اور ہاک آئی میں سے شگاف سے نظر آنے والی دوسری حفاظتی دیوار کا نشانہ لیا۔ نشانہ باندھ کر اس نے ٹریگر دبایا تو تیز سرسراہٹ کے ساتھ ٹوماہاک سے لیس راکٹ اپنے پیچھے آگ اور گیس کی لکیر چھوڑتا برق کے مانند پرواز کر گیا۔

ایک سیکنڈ کے لیے تیز رگڑ کی آواز ابھری اور پھر بے پناہ شدت والا دھماکا ہوا۔ سونے والی عمارت کے اندر نیلے شعلے سے بھڑک اٹھے تھے۔

کامیاب نشانے کے بعد جیری چلایا۔ ”جو جہاں چڑھ سکتا ہے چڑھ جائے...... ٹوبا...... جھیل کی طرف نکل چلو۔“

باہر موجود لڑکوں کو ٹرک پر چڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ٹرک کے اندر ہی گھس آئے۔ ٹرک نے جھٹکا لیا اور تیزی سے بڑھا۔ پہرے داروں کے سبب وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ٹرک کے آگے بڑھتے ہی فائرنگ میں شدت آگئی۔ وہ سب پیچھے لیٹ گئے تھے۔ فائرنگ کی شدت سے ٹرک کی باڈی تھرتھرا اٹھی تھی۔

ٹرک کے اندر ہونے کے سبب جیری وغیرہ کی فائرنگ پاور کم ہوگئی تھی۔ البتہ ٹوبا کے ساتھ بیٹھے کیلاش کی رائفل گاہے بگاہے گرج رہی تھی۔

جیری نے لیٹے لیٹے تیسرا راکٹ بھی لوڈ کر لیا۔ مقصد پورا ہو چکا تھا۔ یہ راکٹ اس نے ہراس پھیلانے کے لیے لوڈ کیا تھا۔

ٹرک جلد ہی فائرنگ کی شدت سے نکل آیا اور نایاب پھولوں، پودوں کو روندتا ہوا جھیل کی طرف بڑھا۔ یہاں لکڑی کے ہٹس بنے ہوئے تھے۔ ان سے ٹکراتا ہوا ٹرک جھیل کے قریب پہنچ گیا۔

اسی وقت ٹرک کی چھت پر کوئی کودا اور پھر اگلے چند سیکنڈ میں ٹرک رک گیا۔ آپریٹس پر ایک چیخ ابھری تھی اور دھینگا مشتی کی آوازیں آرہی تھیں۔ ٹوبا غراتے ہوئے کسی سے گتھم گتھا تھا۔

اسی وقت ٹرک کے کھلے حصے سے ایک بڑی سی فوجی گاڑی نظر آئی... جو تیزی سے اسی طرف آرہی تھی۔ جیری نے گھٹنے کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”باہر نکل کر ٹوبا کو دیکھو۔“

لڑکے، ایک دوسرے کو فائرنگ کا کور دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔

جیری نے فوجی گاڑی کا نشانہ لے کر راکٹ داغ دیا۔ طاقتور راکٹ کے سامنے وہ گاڑی معمولی ہدف تھا۔ گاڑی آگ کے گولے میں تبدیل ہوگئی۔

خالی ٹیوب وہیں چھوڑ کر جیری بھی ٹرک سے باہر آگیا۔ ٹرک کی اوٹ میں ٹوبا اپنا بازو دبائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے جبکہ ٹرک کے کیبن میں کیلاش کی لاش پڑی تھی۔ اس کی گردن سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔

لڑکے ایک طرف اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کا ہدف پام کا ایک درخت تھا جس کے عقب سے گاہے بگاہے گولی گرجتا تھا۔

جیری، ٹوبا کے قریب چلا گیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی اور اندر ہی تھی۔ اس نے بتایا کہ کسی کمانڈو ٹائپ کے بندے نے ٹرک کے کیبن کی چھت سے لٹک کر اسے ٹانگیں ماری تھیں اور کیلاش کو گردن میں گولی ماری تھی۔ ٹوبا نے اس کا کمان والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس دوران ٹرک رکنے پر وہ بندہ بندر کے مانند دوسری کھڑکی سے کود گیا تھا۔ دھینگا مشتی کے دوران ہی حملہ آور کے پستول سے نکلنے والی گولی ٹوبا کے کندھے کا بوسہ لے گئی تھی۔ اب وہ حملہ آور پام کے ایک درخت کے پیچھے تھا۔ لڑکے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ جھیل کے کونوں کھدروں سے جہاں سے فائر آرہا تھا، اس کا بھی جواب دے رہے تھے اور دستی بم بھی برسا رہے تھے۔ جھیل کے آس پاس سے مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔

جیری نے آپریٹس میں کہا۔ ”پام کے درخت والے کو میں دیکھتا ہوں۔ تم لوگ جھیل میں اترو لیکن میرے آنے تک گہرائی میں نہ جانا۔ میرا سلنڈر وغیرہ بھی لے لو۔ اگلی ملاقات جھیل میں ہوگی۔“

اس کی ہدایت کی روشنی میں سب ٹرک کی طرف سمٹنے لگے۔

جیری درختوں کی اوٹ لے کر پام کے درخت کی طرف بڑھا۔ حملہ آور کی جانب سے فائرنگ کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔ جیری تھوڑی دیر بعد ان درختوں کے جھنڈ میں تھا۔ جہاں چھپا حملہ آور ان کی واپسی کے راستے میں آگیا تھا۔ اچانک ہی جیری کو خطرے کا احساس ہوا۔ ایک سایہ سا جھپٹا

اور ہاتھ پر لگنے والی طوفانی ضرب کے سبب جیری کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ اگلے ہی پل کولٹ کا وزنی دستہ جیری کے سر کی طرف لپکا۔ بالکل آخری لمحے پر جیری نے ہاتھ درمیان میں ڈال کر اس طوفانی ضرب کی شدت کم کی پھر بھی اس کے سر پر خاصی ضرب آئی تھی۔ درد کی تیز لہر دوڑ گئی تھی۔ حملہ آور جو بھی تھا فنونِ حرب وضرب میں یکتا تھا۔

سر پر لگنے والی ضرب سے جیری لڑکھڑایا تو سینے پر لگنے والی ٹانگ نے اسے دور اچھال دیا۔ ساتھ ہی ایک جانی پہچانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''یقیناً مجھے ''جیری صاحب'' کی ٹھکائی کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ کاش کولٹ میں آخری گولی بچ جاتی تو ''جیری صاحب'' کو آنجہانی کرنے کا اعزاز بھی میرے حصے میں آتا۔''

جیری کا دماغ پھرکی کے مانند گھوم گیا تھا۔ حملہ آور کی تابڑ توڑ ضربات کو اس نے بمشکل بلاک کیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ راج محل میں برستی گولیوں اور دھماکوں کی گرج کے درمیان درختوں کے ایک جھنڈ میں اس کی راہ روکنے والا اس کا سابق جونیئر آنند راؤ ہے۔

ہتھوڑے کے مانند گھونسے برساتے ہوئے آنند راؤ برق رفتاری سے پھرکی کے مانند گھوما۔ اس نے ٹانگ سے جیری کی ٹانگوں پر ضرب لگانا چاہی تھی مگر اب جیری سنبھل گیا تھا۔ اس نے جست بھری اور آنند راؤ کے اوپر سے کود گیا۔

آخری لمحے میں آنند راؤ نے بھی جھک کر خود کو جیری کی ضرب سے بچایا تھا۔ جھیل کی طرف سے ابھی تک فائرنگ کی تھوڑی بہت آوازیں آ رہی تھیں۔

اگلا لمحہ جیری کا تھا۔ آنند راؤ کے اوپر سے جست بھرتے ہی اس نے ایک درخت سے ٹھہر لی۔ درخت پر پاؤں جما کر وہ برق کے مانند پلٹا اور اس کے دونوں جڑے ہوئے پاؤں آنند راؤ کے کندھے پر لگے۔ آنند راؤ توپ کے گولے کے مانند لکڑی کے ایک چھوٹے سے جھونپڑے سے جا ٹکرایا۔ یہ جھونپڑا مرغابی ٹائپ کے پرندوں کا تھا، وہ کرکراتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگلے پل وہ دونوں ایک دفعہ پھر آمنے سامنے تھے۔ جیری بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میرے ''نقشِ پا'' کو میرا ایک جونیئر ہی ڈھونڈ پایا ہے۔''

پینترا بدلتے ہوئے آنند راؤ نے کہا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہوا جیری صاحب، گھٹنے ٹیک دو۔''

جیری نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میرے راستے میں نہ آتے تو میں جا چکا ہوتا۔''

''یہاں سے سونا لے جانا ناممکن ہے۔ جزیرے کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی آنند راؤ جیری کی نیچے پڑی رائفل پر جھپٹا۔

جیری نے بھی ہوا میں جست بھری اور ہوا ہی میں آنند راؤ کو کمر سے تھام کر رائفل سے دور کر دیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں حیوانوں کی سی وحشت سے ایک دوسرے کو رگیدنے لگے۔

آنند راؤ کی دو وحشیانہ ٹکروں نے جیری کی نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ اس موقع سے آنند راؤ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کے ہاتھ ٹوٹنے والے جھونپڑے کا ایک ڈنڈا نما ٹکڑا آ گیا۔ اگلے ہی پل وہ ٹکڑا جیری کی گردن میں پھنسائے عقب سے پورا زور لگا رہا تھا۔

جیری کی آنکھوں کے آگے ستارے سے ناچنے لگے۔ قوتِ مدافعت تیزی سے کمزور ہونے لگی۔ آنند راؤ نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تیرا آخری وقت آ گیا ہے۔'' ساتھ ہی اس نے ڈنڈے پر دباؤ بڑھا دیا۔

جیری نے ہاتھ پاؤں مارے مگر آنند راؤ نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ جیری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

اسی وقت ایک فائر کی آواز گونجی۔ جیری کے کان کے قریب آنند راؤ کی تیز سسکاری سی ابھری اور ساتھ ہی اس کی گردن پر ڈنڈے کا جان لیوا دباؤ ختم ہو گیا۔

فائر کرنے والا ٹوبا کا ہی ایک لڑکا اجے تھا۔ اجے نے بڑی تیزی سے درختوں کے ادھر اُدھر فائر کیے۔ آنند راؤ کی برق رفتاری اور چھٹی حس اس کے کام آئی تھی۔ سینے پر آنے والی گولی اس نے بازو پر وصول کی تھی اور پھر چھلاوے کے مانند درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کوئی ہتھیار لگ جاتا تو وہ زخمی ہونے کے باوجود ان کا راستہ روکنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

جیری نے کھانستے ہوئے کہا۔ ''اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں نکلنا ہے۔''

اجے کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ جیری نے اپنی رائفل اٹھالی۔

اجے بولا۔ ''آپ کو دیر ہو گئی تو ہمیں فکر ہوئی۔ یہ اچھا ہوا کہ میں بروقت پہنچ گیا۔''

''ہاں، تم میری جان بچانے کا باعث بنے ہو۔'' جیری نے کھلے دل سے تسلیم کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب جھیل کی تہ میں تھے۔ ٹوبا کا بازو زخمی تھا مگر پورٹیبل اسکوٹر کے سبب اسے زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔ اسکوٹر اسے انڈر واٹر تیز رفتاری سے کھینچے جا رہا تھا۔

اگلے چند منٹ میں وہ کھلے سمندر میں تھے۔ کیلی کو لینے کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھے۔

اچانک واٹر پروف ہیلمٹ میں ٹوبا کی گھبرائی آواز ابھری۔ ''مم...... میری آکسیجن ختم ہو رہی ہے۔''

جیری نے فوراً اپنے ہیلمٹ کا ایک بٹن دبایا۔ اب اس کے اور ٹوبا کے درمیان ہونے والا مکالمہ جنرل فریکوئنسی ہونے کے باوجود کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

جیری بولا۔ ''ٹوبے، سمندر کی گہرائی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جب سانس بھی رک رہا ہو۔ کیا محسوس ہوتا ہے؟''

''مم...... میں سمجھا نہیں...... جیری صاحب......'' اس کی گھٹی گھٹی خوف زدہ آواز ابھری۔

جیری نے زہر خند انداز میں کہا۔ ''یاد کرو...... جب بھنڈرے سے آنے والی ایک سادہ سی لڑکی کو فلمی ہیروئن بنانے کے خواب دکھا کر اور 3 مہینے اس کا خوب استحصال کرنے کے بعد جب تو نے اسے بیچ منجدھار میں چھوڑا تھا تو اس نے بھی بالکل ایسا ہی محسوس کیا تھا جیسا آج تو کر رہا ہے۔''

''دھوکا۔'' ٹوبا چلّایا۔

''ہاں، دھوکے باز کے ساتھ دھوکا۔ چیک کرنے کے بہانے میں نے تیرے سلنڈر والی نوزل لیک کر دی۔ ابھی تو تیرے بازو سے نکلنے والا خون...... خون آشام مچھلیوں کو تیری طرف......''

جیری کا فقرہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ٹوبا کی چیخ سنائی دی۔ اس پر چھوٹی شارک کے ایک گروہ نے حملہ کر دیا تھا۔ ٹوبا کی آخری چیخیں بڑی دردناک تھیں۔

ٹوبا کی طرف خاموشی ہوتے ہی جیری نے دوبارہ رابطہ بحال کر دیا اور بولا۔ ''ساتھیو! یہ بتاتے ہوئے مجھے بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ اشوک کے بعد ٹوبا صاحب بھی ہم میں نہیں رہے۔ بازو سے نکلنے والے خون کے سبب شارکس نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ آپ کو خوف زدہ ہونے سے بچانے کے لیے میں نے تھوڑی دیر کے لیے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ ان کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔''

کیلی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مگر وہ تو آکسیجن کی کمی کا ذکر کر رہے تھے۔''

''ہاں، شارک کے حملے کے باعث ان کے سلنڈر کی نوزل کٹ گئی تھی۔''

اس کے بعد افسردہ سی خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ یو، این، او کا تیز رفتار ریسکیو جہاز تھا۔ جیری وغیرہ کے پہنچتے پہنچتے اس کی ''اے ٹیم'' بھی اپنا کام نمٹا کر جہاز پر پہنچ گئی۔ منصوبے کے عین مطابق جب راج محل سے میوزیم والے جزیرے سے مدد طلب کی گئی تو وہاں موجود زیادہ تر گارڈز کو راج محل کی طرف دوڑایا گیا جس کا فائدہ اٹھا کر ''اے ٹیم'' نے مایا تہذیب کے شاید سونے سے بھی قیمتی نوادرات کا صفایا کر دیا تھا۔

اگلی رات جہاز کے ایک کیبن میں کیلی، جیری کے سینے پر سر رکھے کہہ رہی تھی۔ ''میں، تمہارے ساتھ امریکا جاؤں گی۔''

اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے جیری کا دماغ ستاروں سے بھی کہیں دور ایک ستارہ آنکھوں والی لڑکی کے خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ اپنے کام کے ساتھ ساتھ اس نے ستارہ آنکھوں والی لڑکی کی زندگی چھین لینے والے اور اس کی زندگی برباد کرنے والے تمام کرداروں کو بھی کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔

یقیناً اس ستارہ آنکھوں والی لڑکی کی روح کو ضرور کچھ نہ کچھ چین ملا ہوگا۔ طمانیت کے احساس کے ساتھ جیری نے آنکھیں موند لیں۔

اسپتال میں بستر پر لیٹا آنند راؤ بڑبڑایا۔ ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی جیری صاحب جلد ہی تم مجھے امریکا میں پاؤ گے۔''

اس کہانی کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ ٹھیک ایک مہینے بعد اٹلی کے ایک دور دراز جزیرے پر کامیابی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ جیری کی مافیائی تنظیم کے بڑوں کے علاوہ اس جشن میں مایا تہذیب کے نوادرات کا خریدار پیرو سے تعلق رکھنے والا ارب پتی آنندے موساگا بھی شریک تھا۔ ہاں اس جشن میں ایک ہندوستانی بھی تھا۔ جسے دنیا ''آئرن مین'' کے نام سے جانتی تھی۔ اس نے چوری ہو جانے والے سونے کا انشورنس کمپنی سے کلیم بھی لے لیا تھا اور ایڈوانس الیکٹرونک سسٹم کی خالق فرم کے خلاف بھی 5 ارب ڈالرز کے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس کے وکلا کے پینل کو یقین تھا کہ وہ یہ کیس جیت جائیں گے۔

❖❖❖